پاکستان کی اصل کہانی

1968-69ء کا انقلاب

لال خان

مترجم: اسد پتافی

www.struggle.com.pk

دنیا بھر کے محنت کشو! ایک ہو جاؤ!

’جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں‘

نام کتاب: پاکستان کی اصل کہانی۔۶۹-۱۹۶۸ء کا انقلاب

مصنف: لال خان

مترجم: اسد پتافی

دوسرا ایڈیشن: اگست 2009ء

تعداد اشاعت: 1100

ناشر: طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز 105 منگل مینشن رائل پارک لکشمی چوک لاہور

فون: 042-6316214 فیکس: 042-6365659

پرنٹرز: یاسر عمیر

صفحات: 516

قیمت: 495

سرورق تصویر: بشکریہ ’’دختر مشرق‘‘

email:pakistan@marxist.com

www.marxist.com

www.struggle.com.pk

فہرست

باب نمبر 1 ایک انقلابی عہد 31

(انقلابی تحریکوں سے سرشار دنیا)

مصر 34

انڈونیشیا 36

انقلاب کے ترقی یافتہ ممالک پر اثرات 37

فرانس: مئی 1968ء تاریخ کی سب سے بڑی انقلابی عام ہڑتال 38

پرامن سماجی تبدیلی 43

یورپ انقلابی موجوں کی زد میں 45

اٹلی کا ''گرم موسم خزاں'' 46

آئرلینڈ 48

میکسیکو 53

چیکوسلواکیہ 55

امریکہ، ویتنام جنگ اور ریڈیکلائزیشن 62

دوسرے خطوں میں ہونے والے واقعات 67

سابقہ نوآبادیاتی ممالک پر اثرات 68

نتائج 70

باب نمبر 2 برصغیر کا خونی بٹوارہ 75

(پاکستان کے جنم کی تکلیف)

مزاحمت اور غداریاں 78

کمیونسٹ پارٹی 84

بائیں بازو کی زوال پذیری 90

مزاحمت اور انقلاب 96

بغاوت کے بعد 100

کابینہ مشن پلان 107

معصوموں کا قتل عام (بٹوارے کے بعد) 112

باب نمبر 3 بورژوا جمہوریت کی نااہلی۔۔۔ایک ناکام آغاز 119

(فوجی اقتدار اور ابھرتا طوفان)

تشخص کا بحران 121

کشمیر 124

جناح 126

1954ء کے انتخابات 127

انکل سام سے رسم وراہ 129

مغربی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی 133

1958ء 134

فوجی راج 135

جمال عبدالناصر 137

میکارتھر 138

ایوب خان 139

داخلہ اور معاشی پالیسی 142

نئے صنعتکار 144

سرمایہ دارانہ مفادات کی عوامی مفادات پر برتری 146

بدعنوانی اور جبر 148

جنگ 149

انقلاب 151

باب نمبر 4 انقلاب کا آغاز 157

(جب سوشلسٹ فتح اتنی قریب آ گئی تھی)

انقلاب کی پہلی چاپ 158

عوام کا ابھار 165

طلبہ بغاوت کے شعلے 167

1967ء کی ریلوے ہڑتال، انقلاب کا نقطہء آغاز 170

طوفانی واقعات کی ابتدا 172

کسانوں کی بغاوت 178

بائیں بازو کے صحافیوں کی جدوجہد 183

فوج میں بے چینی 188

باب نمبر 5 انقلاب کی گواہی 195

(1968-69ء کی انقلابی بغاوت کے سپاہی)

عثمان بلوچ (کراچی) 196

ڈاکٹر مبشر حسن (لاہور) 206

ذاکر حسین (مالاکنڈ) 209

منو بھائی (راولپنڈی) 211

معراج محمد خان (کراچی) 213

پرویز ملک (اٹک) 215

منظور رضی (کراچی) 217

پروفیسر محمد یحییٰ (ڈیرہ اسماعیل خان) 219

شاہد محمود ندیم (لاہور) 223

جام ساقی (حیدرآباد) 234

خاور نعیم ہاشمی (لاہور) 237

کنیز فاطمہ (کراچی) 239

الیاس خان (ملتان) 241

کرامت علی (کراچی) 242

باب نمبر 6 جنگ، جبر اور اصلاح پسندی 249

(ایک زائل ہوئے انقلاب کے اسباق)

یحییٰ خان کی حکومت 250

پاکستان پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی 255

جنگ	261
یحییٰ کی رخصتی۔ بھٹو کی آمد	267
تصادم	275
تجزیہ	278
باب نمبر 7 بائیں بازو کی قیادت کا بحران (پاکستان پیپلز پارٹی کا ابھار)	**289**
سٹالنزم اور ماؤازم	290
لینن اور ٹراٹسکی	292
سرمایہ دار اور افسر شاہی	298
طلباء	300
چین اور پاکستان	301
بکھرا ہوا بایاں بازو	304
پاپولزم اور بھٹو	305
پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام	308
نظریاتی ابہام	312
بھٹو کی گرفتاری اور بائیں / دائیں بازو کی جدوجہد	319
نچلی سطح پر تنظیم بنانے کی کوششیں	324
بائیں بازو کی کمزوری	329
مراعات یافتہ سرمایہ داروں کا کنٹرول	330
بلوچستان	332
نتیجہ	336

باب نمبر 8 آمریت اور جمہوریت 347

(اقتدار بدلتے ہیں، محنت کشوں کے حالات نہیں)

ضیائی آمریت 350

ایم آر ڈی اور سندھ 353

افغانستان 356

بے نظیر بھٹو 359

بے نظیر بھٹو کی رخصتی 363

اشرافیہ 365

بے نظیر کی واپسی 369

میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل 371

نواز شریف 373

کارگل جنگ 375

پرویز مشرف 377

وکلاء تحریک 391

بے نظیر بھٹو کا قتل 393

پیپلز پارٹی اور رجعتی دائیں بازو کا اختلاط 395

سیاسی اور معاشی بدعنوانی 400

باب نمبر 9 1968/69ء کے انقلاب کا تجدید عہد 413

(انقلابی سوشلزم کا تناظر)

مشترک اور ناہموار ترقی 415

ملاؤں کا بدلتا ہوا کردار	421
پارلیمنٹ کا کردار	424
سوشلزم کے مقاصد	428
سٹالنزم	429
ریاست	433
غیر ملکی جارحیت	434
بین الاقوامیت	438
آج کی صورتحال	441
ریاض لوند	446
ایک سوشلسٹ مستقبل کے لیے جدوجہد	448
ضمیمے	**461**
پاکستان فوج کا کردار	463
پاکستان کے امیر ترین افراد کی فہرست 2007ء	479
پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور 1970ء (خصوصی اقتباسات)	497
☆ حوالہ کتب	507
☆ مصنف کے بارے میں	513
☆ مصنف کی دیگر تصانیف	515

اِنتساب

1968-69ء کے مزدوروں' نوجوانوں اور دہقانوں کی نسل کے نام جس نے اپنی جرات اور عزم سے تاریخ کی کسوٹی پر یہ ثابت کیا کہ اِس سرزمین پر سوشلسٹ انقلاب ایک زندہ حقیقت کے طور پر برپا کیا جاسکتا ہے۔

اظہارِ تشکر

میں چند ایسے ساتھیوں کا ممنون ہوں جن کی انتھک کاوشوں کے بغیر اس کتاب کا منظر عام پر آنا شاید ممکن نہ ہوتا۔ کامریڈ آدم پال جس نے دن رات کی محنت سے انگریزی اور اردو ایڈیشنوں کو ٹائپ سیٹنگ سے لے کر پروف کی غلطیاں لگانے تک اس کتاب کی اشاعت میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ لندن میں کامریڈ ہیری وٹیکر نے نہایت ہی مہارت سے انگریزی ایڈیشن کا پروف کیا۔ پرانے دوست فریڈ ویسٹن جس نے مختلف موضوعات پر مواد فراہم کیا اور سیاسی تناظر استوار کرنے میں معاونت کی۔ کامریڈ ممتاز نواز مستوئی (ڈوڈی) نے تحقیق میں بہت مدد کی۔ کامریڈ ثقلین شاہ جس نے اس کتاب کی ڈیزائنگ' لے آؤٹ اور سرورق تخلیق کیا۔ کامریڈ رنگ الٰہی نے اپنی مخصوص لگن اور انتھک محنت سے خصوصاً اردو ایڈیشن کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ کامریڈ عابد جس نے کامریڈ آصف بٹ کے ساتھ مل کر اس کتاب کی چھپائی اور ترسیل میں بے حد جانفشانی سے کام کیا۔ کامریڈ اسد پتافی جس نے نہایت ہی نامساعد حالات میں اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ کامریڈ پارس جان جس نے نہ صرف ترجمے کو مزید بہتر کیا بلکہ اردو ایڈیشن کی زبان کو بلاغت دی۔ میرے پیارے دوست اور ساتھی جوناتھن کلائین جس کے محبت بھرے اصرار اور ہمت افزائی نے اس کتاب کو تحریر کرنے میں بہت مدد کی۔ آخر میں، میں تین دہائیوں سے اپنے دوست' ساتھی اور استاد کامریڈ ایلن وڈز کا ممنون ہوں جس نے نہ صرف اس کتاب کا تعارف لکھا بلکہ مسلسل حوصلہ افزائی کی جس سے میں اس کام کی تکمیل کر سکا۔

لال خان

جنوری 2009ء

پیش لفظ

تاریخ کے عظیم ترین نظریات ہمیشہ حقیقی زندگی کے واقعات کی کسوٹی پر پرکھے گئے ہیں۔ مارکسزم کے نظریات کی سچائی اور درستگی کو کائناتی طور پر تسلیم کروانے کیلئے اکتوبر کی سرزمین پر عظیم بالشویک انقلاب کی فتح درکار ہوئی۔ دیوار برلن کے گرنے اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد کے عرصے میں حالیہ عالمی سرمایہ دارانہ بحران اور مالیاتی سرمائے کے زوال نے ایک مرتبہ پھر عالم کی توجہ انقلابی مارکسزم کے نظریات کی جانب مبذول کروائی ہے۔

عام وقتوں میں سماج کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی نفسیات کا متعین اور اس پر غالب حکمران طبقات کی رجعتی اخلاقیات اور اقدار ہی رہتے ہیں۔ تمام تصادم، تبدیلیاں، واقعات، سوچیں، سماجوں اور ملکوں کی پہچان اشرافیہ کے مفادات اور مالیاتی سرمائے کے جبر کی ضروریات کے مطابق تشکیل دی جاتی ہے۔

عالمی پیمانے پر پاکستان کی تاریخ اس کا کردار اور بطور ملک اسکی تعریف اسی حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ مختلف بیرونی اور ملکی تاریخ دانوں نے جو یہاں کی تاریخ مرتب کی ہے اور بورژوا دانشوروں اور ماہرین نے جو تجزیے کیے ہیں وہ حکمران طبقات کے مفادات کو مدنظر رکھ کر استوار کیے گئے ہیں۔ اس سماج کی تاریخ سے اہم پہلوؤں کو یا تو دبایا گیا ہے یا پھر مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بہت سے غیر اہم مسئلوں کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

حقائق کو مسخ کرنے کی ان کوششوں میں ذرائع ابلاغ کے ساتھ نام نہاد بائیں بازو کے خود ساختہ مورخین بھی شامل تھے۔ جن کا سب سے بڑا شکار پاکستان کا 69-1968ء کا انقلابی ابھار تھا جس کو کچھ لوگوں نے ایوب خان کے خلاف احتجاج تصور کیا اور کچھ نے آمریت کے خلاف جمہوریت کی بحالی کی تحریک یا محنت کشوں کے اپنے مطالبات منوانے کی جدوجہد قرار دیا۔ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس عوامی انقلابی ابھار کا کردار واضح طور پر سوشلسٹ تھا جس نے انقلاب آفرین حالات پیدا کر دیئے تھے۔ اس تحریک نے نہ صرف موجودہ نظام کو چیلنج کیا، آمریت کو للکارا، بلکہ سیاسی نظم و نسق کو تہہ و بالا کر دیا تھا

اور سب سے بڑھ کر مالکانہ حقوق کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس انقلابی کیفیت نے عوام میں ایک ایسی خواہش، تڑپ اور جذبہ پیدا کر دیا تھا جو اجتماعیت کے شعور کے ساتھ آگے بڑھ کر محنت کشوں کی ملکیت اور سیاسی حاکمیت قائم کر کے بڑی صنعتوں پر جمہوری غلبہ حاصل کرنے کی ہمت اور معیشت پر معاشرے کی حاکمیت کی جرات بھی دکھا سکتا تھا۔

اس کتاب میں ہم یہ سب نمایاں طور پر واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ سارا شعور پاکستان کے محنت کشوں، نوجوانوں کی موجودہ نسل اور ان کی ہم عصر دنیا تک پہنچ جائے۔ کچھ مصنفین نے تاریخ کے اس شاندار انقلابی ابھار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ اور یہ کتاب اس تاریخی ابھار کے انقلابی کردار کو پوری طرح واضح کرنے کیلئے ہے جو سوشلسٹ فتح کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔

بہت سے ساتھیوں اور دوستوں نے گزشتہ تین دہائیوں میں مجھے ہمت دلائی اور مشورہ دیا کہ اس فریضے کو سرانجام دوں مگر بعض دیگر اہم مصروفیات آڑے آئیں مگر اب موجودہ غیر یقینی حالات، شدید بحران اور پاکستان کے محنت کشوں کی بے پناہ مشکلات سے جنم لینے والے آزمائشی لمحوں میں اس کی تصنیف اور اشاعت ناگزیز ہوگئی ہے۔

پاکستان ان دنوں بنیاد پرستوں، دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کا مرکز سمجھا جا رہا ہے۔ اس کے وجود میں آنے کا مقصد ایک مذہبی ریاست قائم کرنا بیان کیا جاتا ہے۔ فوجی حکومتوں، مارشل لاؤں، دباؤ، گھٹن، لاقانونیت، جرائم، بددیانتی اور عدم استحکام کے طویل سلسلے بھی سب پر ظاہر اور عیاں ہیں۔ پاکستان کی نئی نسل کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان حالات کا بھرپور شعور رکھتی ہے۔ اسلامی بنیاد پرست حالات کو ازمنہ اولیٰ کے تاریک دور میں لے جانا چاہتے ہیں جب کہ سامراجی اور ان کے گماشتے یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور بہتر حاکمیت سے سارے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔

پاکستان کے عوام کو ان دونوں کا تلخ تجربہ ہے جن سے گزرتے ہوئے انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ لوٹ مار، تشدد، تباہی اور بربادی دیکھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں نوجوانوں، محنت کشوں اور کسانوں کی اتنی زیادہ تحریکیں کیوں چلی ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اپنے طریقوں سے سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ، جاگیرداروں کے ظلم وستم اور استحصال سے نجات پانے کے لئے تھیں۔ 1968-69ء کی انقلابی تحریک ان تمام تحریکوں سے نمایاں اور منفرد تھی جو سوشلسٹ فتح آسانی سے حاصل کر سکتی تھی۔

پاکستان کے عوام نے ظلم وستم، تشدد، استحصال کے طویل ادوار سے گزرنے کا تلخ تجربہ کیا ہے۔ان ادوار کے خلاف وہ بہت مرتبہ آتش فشاں تحریکوں سے بھی گزرے ہیں۔ پاکستان کی سرکاری کہانی اس کے حاکموں اوران کے کاسہ لیسوں کی کہانی ہے۔مگراب پاکستان کی اصل کہانی جواس ملک کے محنت کشوں نے اپنے خون پسینے اورآنسوؤں سے لکھی ہے پیش کرنے ضرورت ہے۔

پاکستان کے زیردست محنت کشوں کا ایک اپنا مشن ہے۔خود اپنی بیداری اور شعور کا مشن۔انہوں نے ایک تاریخی فریضہ سرانجام دینا ہے۔ایک سوشلسٹ انقلاب کو کامیاب بنانے کا فریضہ۔انہوں نے اپنے طبقے کے مفاد میں بہت سی جنگیں لڑیں ہیں۔ بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ان گنت خاموش بہادروں نے سوشلسٹ انقلاب کی فتح کے لئے لازوال جدوجہد کی ہے، نسل درنسل زخم سہے ہیں وہ پھراٹھیں گے، ایک اور جنگ لڑیں گے غلامی اوراستحصال سے نجات پانے کی جنگ۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔ان کو بھی اپنی کہانی سنانی ہے۔یہی پاکستان کی اصل کہانی ہے!

لال خان

لاہور۔30اکتوبر2008ء

تعارف

پاکستان کے 1968/69ء کے انقلاب کے حوالے سے لال خان کی یہ نئی کتاب ''پاکستان کی اصل کہانی'' عالمی مارکسزم کے نظریاتی خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ 1968ء میں یورپ کی توجہ فرانس کے شاندار انقلابی واقعات پر مرکوز تھی مگر مجھے پاکستان کی فقید المثال تحریک اچھی طرح یاد ہے جس نے مجھ پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے، میں نے اس وقت اس تحریک کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ہمارے جریدے ''پرسپیکٹوز'' (Perspectives) میں ''پاکستان، غداری کی زد میں آیا ہوا انقلاب'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ میرا یہ تعارف بھی اسی مضمون کے زیادہ تر مواد پر مبنی ہے۔

1968ء کے آغاز میں ایوب خان کی فوجی آمریت ایشیائی حکومتوں میں ایک نمایاں مستحکم حکومت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی تھی۔ وہ دس سالوں تک ایک 'مرد آہن' کے طور پر پاکستان پر حکمرانی کرتا رہا جس نے اپنے تئیں پاکستانی سماج کو انتشار سے بچایا تھا۔ ایک کلاسیکل بونا پارٹسٹ انداز میں اس نے مغرب و مشرق کی بڑی عالمی متحارب طاقتوں کے مابین تعلقات میں توازن پیدا کیے رکھا۔ ابھی وہ برطانیہ و امریکہ سے امداد لے رہا ہے تو ابھی روس و چین اس کی مدد کر رہے ہیں۔ مگر خاص طور پر چین کے ساتھ تعلقات نے اسے بہت فوائد مہیا کیے نہ صرف بھاری امداد اور تجارت کی شکل میں معاشی بلکہ سیاسی طور پر بھی کہ اس تعلق کی برکتوں سے ایوب آمریت کو 'ترقی پسند' حکومت کا تخلص میسر آ گیا۔ چینی افسر شاہی نے ایوب آمریت کی بھرپور حمایت کی۔ چواین لائی نے 1965ء کے دھاندلی زدہ الیکشن میں کامیابی پر ایوب خان کو مبارکباد پیش کی۔ جب اسی سال پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو چین نے پاکستان کی یہ کہہ کر مدد کی تھی کہ یہ ایک 'عوامی جنگ' ہے۔ یہ سب کچھ نامعقول جذباتی وجوہات کی بنیاد پر کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ دوسری طرف روس بھارت کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ امداد پرانے اصول 'میرے دشمن کا دشمن میرا دوست ہے' کے تحت فراہم کی گئی۔

عالمی سطح پر ایوب حکومت کی کامیابی اپنی گہری تہوں میں معاشی و سماجی بحران لیے ہوئے تھی۔ کوئی

شک نہیں کہ معیشت مثالی ترقی کر رہی تھی اور اس کی شرح 5% سالانہ کو پہنچی ہوئی تھی مگر یہ ترقی صرف مغربی پاکستان کی حدود میں ہی تھی جبکہ اس کا مشرقی حصہ جواب بنگلہ دیش بن چکا ہے، اس سے محروم تھا اور وہاں ناامیدی اور نیم جاگیردارانہ پسماندگی کا راج تھا۔ یہ صوبہ دو فصلوں پر انحصار کیے ہوئے تھا جن میں ایک چاول (جس کا دارومدار سیلاب پر ہوتا تھا) اور دوسری پٹ سن جس کی عالمی منڈی میں بہت زیادہ مانگ تھی کیونکہ اسے پلاسٹک سمیت دوسری سنتھیٹک اشیا کی تیاری کیلئے کام میں لایا جاتا تھا۔ مغربی صوبے میں جو زیادہ انڈسٹریلائزڈ ہو چکا تھا، دولت کا اجتماع خطرناک حدوں کو پہنچ چکا تھا۔ ایک طرف بدنام زمانہ بائیس خاندان ملک کی صنعتی دولت کے 66 %، انشورنس کے 79 % اور بینکنگ کے 80% کے مالک بن چکے تھے تو دوسری طرف اسی مغربی پاکستان میں ہی اوسط فی کس آمدنی 35 پونڈ سالانہ تھی جبکہ مشرقی پاکستان کے اندر تو یہ اس سے بھی بدتر 15 پونڈ سالانہ تھی۔ آبادی کی اکثریت کی اس قدر محرومی اور غربت نے ایک دھماکہ خیز کیفیت پیدا کر دی تھی جسے محض ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔ 1967ء کے آخر تک مختلف علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے تھے جو کہ جنوری میں پھر سے شروع ہو گئے۔ ان میں بنیادی ایشو جعلی الیکشن تھا جو ایوب نے بنیادی جمہوریت کے نام سے متعارف اور مسلط کیے تھے۔ یہ ایک ایسی دھوکہ دہی تھی جس کے تحت الیکشن کا حلقہ انتخاب 80000 خود ساختہ بیسک ڈیموکریٹس افراد کو بنانا مقصود تھا۔ یہ 'بنیادی جمہوریے' (بی ڈی ممبر) دراصل حکومت کی کٹھ پتلیاں تھے۔

انقلاب

1968ء کے ابتدائی مہینوں میں پاکستان بڑی عوامی تحریکوں کی زد میں آ چکا تھا جن میں عوام کی سبھی پرتیں شریک تھیں۔ بورژوا پریس اسے 'مخلوق راج' قرار دے رہا تھا۔ صحیح تو کہا جا رہا تھا ان طفیلی حکمرانوں کی جانب سے جو عوام پر حکمرانی کر رہے تھے؛ بے چارے عوام؛ مزدور اور کسان جو سماج کی ساری دولت پیدا کیا کرتے ہیں انہیں مخلوق ہی کہا جائے تو بہتر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ انقلاب اچانک سامنے نہیں آیا، اس کی تیاری کب سے سماج میں ہو رہی تھی۔ بظاہر استحکام کے عین نیچے بے چینی و اضطراب آہستہ آہستہ مگر یقین کے ساتھ پنپتے جا رہے تھے۔

17 جنوری کو پولیس نے ڈھاکہ میں مظاہرین پر فائر کھول دیے جس سے درجنوں افراد ہلاک ہو گئے۔ 24 جنوری کو شہر ایک عام ہڑتال کے باعث مفلوج ہو کر رہ گیا، طلبہ کو سنبھالنے کیلئے فوج طلب کر

لی گئی۔ پھر صحافیوں کی طرف سے 24 گھنٹوں کی ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا جو حکومت کی طرف سے ''ایمرجنسی لا'' مسلط کیے جانے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔(یہ قانون جنگ کے دوران نافذ کیا گیا تھا مگر اب اسے ''اندرونی دشمنوں'' کے خلاف بروئے کار لایا جا رہا تھا)۔عوام کے بپھرتے غم و غصے سے گھبرا کر ایوب حکومت نے مراعات کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔خاص کر طلبہ کے ساتھ اس کی ہمدردیاں اچانک ابھرنے لگیں۔اس نے یونیورسٹیوں میں طلبہ تنظیموں پر لگی پابندی اٹھالی۔مگر ایوب نے مراعات اور اصلاحات میں بہت دیر کر دی تھی۔یہ لوگوں کو مطمئن اور پرسکون کرنے کی بجائے ان کو مزید بھڑکاتی چلی گئیں۔اس کیفیت کو بھارت میں ہونے والے مڈٹرم الیکشن میں مغربی بنگال میں یونائٹڈ فرنٹ کی کامیابی نے اور بھڑکا دیا۔اس کے اثرات پاکستان کی مشرقی سرحدوں کے اندر تک سرایت کر آئے۔جس سے نئی سرکشی کے امکانات کا خدشہ بڑھنے لگا۔ایوب نے بادل نخواستہ مشرقی پاکستان میں سے گرفتار اپوزیشن لیڈر شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر دیا۔بحران سے بچنے کی حتمی کوشش کے طور پر ایوب ملک کی اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ ملنے کو راضی ہو گیا جنہیں اس نے 1965ء میں ''پانچ بلیاں قرار دیا تھا جو اپنی اپنی دم اپنے اپنے منہ میں دبائے پھرتی تھیں''۔مگر اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات میں بائیں بازو کی پارٹیوں کو باہر ہی رکھا گیا۔

تمام تر بحران میں بورژوا اپوزیشن DAC نے خود کو انتہائی بے بس اور لاچار ثابت کیا۔کراچی کی کاک ٹیل پارٹیوں میں پیش کیے جانے والے 'آئینی اصلاحات' کے مطالبات کو سڑکوں پر نکلے ہوئے عوام گھاس نہیں ڈال رہے تھے۔طلبہ جو اس تحریک کے روح رواں بنے ہوئے تھے،انہوں نے محنت کش طبقے کی طاقت کو اپنے ساتھ ملا لیا۔مغرب کے سنجیدہ سرمایہ دار جریدے بے بسی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔مغربی بنگال میں یونائٹڈ فرنٹ کی کامیابی اور پاکستان میں عوام کی سرکشی نے 'اکانومسٹ' کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا ''اگر ایشیا کے کسی شہری حصے میں انقلاب کی تڑپ واضح دکھائی دے رہی ہے تو وہ کلکتہ ہے مگر مشرقی پاکستان کے شہر بھی اس سے کم پیچھے نہیں ہیں''۔

فروری اور مارچ میں سارے ملک کو ہڑتالوں کی ایک بہت بڑی لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔13 فروری کو دس سالوں میں پہلی بار لاہور میں سرخ پرچم لہراتے نظر آئے، 25000 سے زائد ریلوے مزدور سڑکوں پر مارچ کرتے اور نعرے لگاتے نکل پڑے تھے ''ہم چین کے عوام کے ساتھ ہیں' سرمایہ داری مردہ باد''۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے مزدور اور کسان سماج کو بدلنے پر

تیار ہو چکے تھے۔ بدقسمتی سے کوئی مارکسی پارٹی موجود نہیں تھی جو اس انقلابی دھارے کو اس کے منطقی انجام تک لے جاتی۔

پیکنگ کی حمایتی نیشنل عوامی پارٹی، نیپ کی مزدوروں اور کسانوں کی وسیع پرتوں میں حمایت اور اثرات موجود تھے۔ مگر وہ انقلابی پروگرام سے عاری تھی چنانچہ عوام کو انقلاب کیلئے منظم و متحرک کرنے کی بجائے اس چین نواز سٹالنسٹ پارٹی نے دائیں بازو کی مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے ساتھ بلاک تشکیل دینے کا مطالبہ کر دیا۔ ماؤاسٹ کسان لیڈر مولانا بھاشانی نے جلسوں میں پر جوش تقریریں کیں اور حکمرانوں کو خانہ جنگی سے خبردار کرتے ہوئے دھمکی دے دی کہ ''الیکشن میں حصہ لینے والوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا جائے گا''۔ لیکن یہ تقریریں اور اس کے سبھی الفاظ محض الفاظ ہی رہے، عملاً کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں کسانوں نے زمینوں کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا اور انہوں نے جرائم پیشہ افراد، دیہی سربراہوں اور ایوب حکومت کی بنیادی جمہوریت کیلئے مرکزی کردار ادا کرنے والے کلکٹروں کو سزائیں دینی شروع کر دیں۔ عوام کے موڈ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بورژوا لیڈر مجیب کو بھی ڈھاکہ کے طالبعلموں کے مطالبات کے تیار کردہ پروگرام کی حمایت کرنی پڑ گئی کہ صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا، اور سیٹو، سینٹو جیسے سامراج حمایتی معاہدوں سے تعلق ختم کر دیا جائے گا۔

ایک شاندار تحریک

بورژوازی کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ پاکستان انقلاب کی دہلیز پر پہنچ چکا ہے۔ وہ کچھ غلط بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ پاکستان کے تاجروں نے اپنی رقم بیرون ملک منتقل کرنے پر بھاری رقوم خرچ کرنی شروع کر دیں۔ دو ہفتوں کے دوران ہی سٹرلنگ کی بلیک مارکیٹ میں قیمت 21 روپے سے 30 روپے پر پہنچ گئی۔ جبکہ سونے کی قیمت میں 40% اضافہ ہو گیا۔ برطانوی سرمایہ دار پریس نے بھی پاکستان کی تشویشناک صورتحال کی نشاندہی کی اور کہا کہ حکومت کی خود کو سنبھالنے میں ناکامی واضح ہو چکی ہے۔

ریاستی عملداری ریت کے ذروں کی طرح بکھر چکی تھی۔ ساری قوت مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی اور جس طرح 1936ء میں سپین میں ہوا تھا جہاں مزدوروں' کسانوں کو جلد ہی ''الیکشن پروگرام'' کی حامل جمہوریت سمیت سبھی حکمرانہ چالبازیاں سمجھ آ گئی تھیں، یہاں بھی یہی ہوا

مزدوروں، کسانوں، نوجوانوں کو سب سمجھ آ گئی تھی۔ دس سالوں تک نکمے نکھٹو سیاستدان اپنا سارا زور لگا کر جو نہیں کر سکے تھے، اسے عوام کے انتھک انقلابی عمل نے ممکن بنانا شروع کر دیا تھا۔ پھر ان بورژوا سیاستدانوں کا کردار کیا رہ گیا تھا؟ یہی کہ پرولتاریہ اور کسان اقتدار کسی ''لیڈر'' کے حوالے کر دیتے۔

24 فروری کو 'فنانشل ٹائمز' نے بتایا کہ کراچی میں سینئر افسروں کا کورٹ مارشل کیا جا رہا ہے کیونکہ انہوں نے حکم عدولی کی تھی اور حکم یہ تھا کہ مظاہرین پر گولی چلا دی جائے۔ 'دی ٹائمز' نے صورتحال کے بارے میں لکھا کہ ''ہر شعبے میں ہڑتالیں ہو رہی ہیں، تجارت ہو یا کوئی ادارہ، ڈاکٹروں سے لے کر ریلوے اور ریاستی انجینئروں تک، ہر سڑک ہر گلی میں عوام کے مارچ ہو رہے ہیں۔ پچھلے پندرہ دنوں سے ڈھاکہ میں پولیس کی وردی تک نظر نہیں آئی''۔

سرمایہ دارانہ نقطہء نظر سے پاکستان کی صورتحال قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ حکومت کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ حکومت چلانے والے ہوا میں معلق ہو چکے تھے۔ پولیس فورس شل ہو چکی تھی جبکہ فوج متذبذب تھی۔ تحریک نے ہر شعبے ہر ایک ادارے کو اپنے اثرات میں لے لیا تھا اور سماج کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک کلاسیکل انقلاب کے سبھی عوامل موجود تھے سوائے ایک انقلابی قیادت کے۔

ایسی صورتحال کے ہوتے ہوئے اگر اسے قیادت میسر آ جاتی تو سماج کی تبدیلی کا عمل آسانی سے تکمیل پا سکتا تھا۔ لیکن یہ صرف پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کی ہی بدقسمتی نہیں تھی فرانس اور اٹلی میں بھی ان کے مزدور اور کسان بھائیوں کو بھی قیادت کی تنگ نظری، نااہلی اور بزدلی نے ناکامی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ پاکستان کے سٹالنسٹوں کی طرف سے عوام کی شاندار کامیاب جدوجہد کے باوجود اقتدار کو قبضے میں نہ لے کر ردانقلاب کو کھلا موقع فراہم کیا گیا۔

پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کی اس قدر شاندار اور حقیقی جدوجہد کو جتنا خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے اور یہ کسی طور بھی فرانس اور اٹلی میں ان کے طبقاتی بھائیوں کی طرف سے چلائی جانے والی عظیم تحریکوں سے کم اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ درست قیادت کی فراہمی اسے اقتدار سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ لیکن پھر اٹلی فرانس کی طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خرابی، کمزوری قیادت میں تھی نہ کہ تحریک چلانے والوں میں۔ نہ تو بھٹو نہ ہی نیپ، کوئی بھی اقتدار سنبھالنے کو تیار نہیں تھا۔ اسی کمزوری نے ہی یحییٰ کی فوجی بغاوت کو موقع فراہم کر دیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی

پاکستان پیپلز پارٹی یکم دسمبر 1967ء کو قائم ہوئی تھی اس کا پروگرام سوشلسٹ تھا اور اسکی بنیادی دستاویزات میں کہا گیا کہ تمام پیداواری ذرائع کو قومی ملکیت میں لے کر ایک عوامی ملیشیا تشکیل دی جائے گی۔ ذوالفقار علی بھٹو جو بے نظیر بھٹو کا والد تھا، نے ایوب خان کی مخالفت شروع کی ہوئی تھی جبکہ ماسکو اور پیکنگ کے چاہنے والے 'ترقی پسند' ایوب خان کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ بھٹو مزاحمت کی علامت بن کر سامنے آتا گیا۔ ہر چند کہ وہ سندھ کا ایک وڈیرہ ہی تھا اور ایوب کابینہ میں وزیر خارجہ بھی رہ چکا تھا۔ اس کے باوجود بھی اس نے سوشلزم کا نعرہ بلند کیا اور بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی۔ 1968/69ء کی تحریک کی موجوں پر سوار ہو کر پیپلز پارٹی معتبر و مقبول ہو چکی تھی۔ بھٹو نے سوشلزم کے نفاذ کیلئے نعرہ بلند کیا، اسے کچھ لوگوں نے ایک 'خطرناک انقلابی' قرار دے دیا۔ لیکن سب سے سنجیدہ بورژوا جریدوں کے نزدیک ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ 'دی ٹائمز' نے اپنے قارئین کو سنسنی خیز مواد فراہم کرنے کے ارادے سے ایک رپورٹر کو بھٹو سے انٹرویو کرنے کیلئے بھیجا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ''کراچی میں اپنے گھر میں سگار پیتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا کہ اس کا سوشلزم کا تصور چین کے سوشلزم کا نہیں بلکہ سکینڈے نیویا کا سا ہے۔ پاکستان کے چین کے ساتھ جو قریبی تعلقات قائم ہیں وہی بہت ہیں''۔ (دی ٹائمز۔ 26 فروری 1968ء) 'اکانومسٹ' نے اس کے بارے میں لکھا ''بھٹو کے بارے میں وہی بات ذہن میں رکھی جائے جو بہت پہلے نہرو کے بارے میں کہی گئی تھی (یعنی یہ روسیوں کے نزدیک چینی ہے'')۔

1968ء کی تحریک کے کئی لیڈر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ 1970ء کے الیکشن میں عوام نے بھاری تعداد میں پیپلز پارٹی کو ووٹ ڈال کر کامیابی سے ہمکنار کر دیا کیونکہ وہ سماج میں تبدیلی کے آرزومند تھے اور پارٹی کے سوشلسٹ پرگرام سے متاثر تھے۔ ان کے پاس دو ہی متبادل تھے یا تو وہ سرمائے کی ذلت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں یا پھر سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کا رستہ اپنا لیں مگر بھٹو اور اس کے دائیں بازو کے ساتھی ایسا نہیں کر سکے۔ کچھ ریڈیکل قسم کی اصلاحات ضرور کی گئیں مگر وہ سماج کو بدلنے میں ناکام رہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے سمجھوتے کر لیے گئے اور یوں فوج کو اقتدار پر قبضے کا موقع فراہم کر دیا گیا۔

ہر انقلاب کے دوران ایسے مواقع آیا کرتے ہیں جب عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان سے دھوکہ کیا جارہا ہے جس پر وہ خود ہی قدم اٹھانا شروع کر دیا کرتے ہیں۔روس میں جولائی 1917ء میں یہی ہوا تھا یا پھر جنوری 1919ء میں جرمنی میں سپارٹکسٹ موومنٹ کے دوران بھی ایسا ہوا تھا۔مئی ستمبر 1972ء کے دنوں میں بھی یہی ہوا جب پرولتاریہ اپنے مطالبات منوانے کیلئے سڑکوں پر نکل آیا۔یہ تحریک پاکستانی پرولتاریہ کے پیٹرو گراڈ، کراچی میں پورے جوبن سے ابھری۔حکومت نے تحریک کو کچلنے کا تہیہ کرلیا۔لانڈھی میں مزدوروں کے ایک مظاہرے پر گولی چلا دی گئی جس سے درجنوں مزدور ہلاک ہو گئے۔اس واقعے سے مزدور مایوس ہوگئے یوں ردانقلاب کیلئے رستہ ہموار ہوتا چلا گیا۔بائیں بازو کے خلاف موقف لے کر پیپلز پارٹی حکومت نے پنڈولم کو دائیں بازو کی طرف دھکیل دیا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بحران کے عروج کے وقت پارٹی تقسیم ہوگئی۔ہمیشہ کی طرح سے، یہاں بھی مسئلہ مشرقی پاکستان کی آزادی کا تھا بھٹو کی طرف سے اس سوال پر کوئی سمجھوتہ کرنے سے انکار کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستانی بورژوازی اور فوج کی خواہشات اور ان کے مفادات کے تابع ہو چکا ہے۔اس کا نتیجہ ایک ہولناک تباہی کی شکل میں نکلا۔پہلے پاکستان تقسیم ہوگیا اور بعد میں بھارت کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی اور پھر اس کے بعد بھٹو ناگزیر طور پر فوجی اور رجعتی طاقتوں کے ہتھے چڑھ گیا جنہوں نے اسے بحرانوں کے بھنور میں پھنساتے ہوئے پہلے اقتدار سے الگ کیا اور بالآخر اسے تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔پاکستان کی رجعتی ردانقلابی اشرافیہ نے اسے شکار کرلیا تھا۔لیکن وہ اس کے ساتھ ہی اپنی مصالحانہ پالیسیوں کا بھی شکار ہوا کہ اس نے رجعتی قوتوں کے ساتھ تعلق استوار کرنے کی کوشش کی تھی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے عوام ایک بار پھر فوجی آمریت کی سیاہ طویل رات کی تاریکیوں میں ڈبو دیے گئے۔

1968ء کا ورثہ

ضیاء الحق کی آمریت ایوب اور یحییٰ کی آمریتوں سے بدرجہا بدترین تھی۔امریکی سامراج کی مکمل آشیرباد کے ساتھ اس وحشی حکومت نے ظلم اور جبر کی سب حدیں توڑ دیں۔بدترین آمریت کی بدترین شکلیں، ذلت آمیز بدعنوانی کے ساتھ کراہت انگیز مذہبی منافرت اور بربریت، یہ اس ضیائی دور کا چہرہ تھا جس نے لاہور کی عظیم روایتی ثقافت کو برباد کر ڈالا، جبکہ مذہبی انتہاپسندی نے دانش وحکمت کو پاتال میں دھکیل دیا۔یہی وہ دور تھا جس میں امریکہ مکمل طور پر پاکستان کا آقا بننے میں کامیاب ہوگیا جس نے اس

کی فوج کو افغانستان میں بیدردی سے استعمال کیا۔تب سے اب تک پاکستان وافغانستان کے عوام اس عہد ظلمت کی سزائیں بھگتتے چلے آرہے ہیں۔

طیارے کی تباہی جس میں ضیا مرا تھا،شاید سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے کچھ عناصر کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ تھا۔1988ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی دوسری بار بے نظیر بھٹو کی قیادت میں برسر اقتدار آئی مگر اس نے فوج اور حکمران طبقات کے ساتھ مصالحت کی پالیسی اختیار کی جس نے محنت کش طبقے کی مایوسی کو اور بھی گہرا کر دیا اور انہیں مزید شکستوں سے دوچار کر دیا۔پارٹی قیادت کی طرف سے 'فری مارکیٹ' کی پالیسیوں اور ڈاؤن سائزنگ،نجکاریوں،بے روزگاری اور غربت کی شرح میں اضافے نے عوام کی بدقسمتی کو مزید گہرا کر ڈالا۔جمہوریت کے تجربے ایک بار پھر مشرف آمریت کے تسلط کو سامنے لے آئے۔پاکستان ایک اتھاہ مایوسی کی دلدل میں دھکیلا جا چکا ہے۔بے پناہ ذرائع وسائل کے باوجود اس کی معیشت تباہ و برباد کر دی گئی ہے۔مالیاتی حوالے سے یہ کنگال ہو کر دیوالیہ پن کی زد میں آچکا ہے۔غربت اور بے روزگاری انتہاؤں کو پہنچی ہوئی ہے۔امریکی سامراج کی رجعتی پالیسیوں اور زوال پذیر پاکستانی حکمرانوں کی لوٹ مار کی وجہ سے بنیاد پرستی اور تاریکی کی قوتوں کو ابھرنے کے مواقع دے دیئے گئے ہیں۔بربریت اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے جس نے سماج کو نگلنا شروع کر دیا ہے۔

پاکستانی عوام کو درپیش خطرات کا ایک بدترین مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب 27 دسمبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو کو وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔یہ سب اس خطرے سے نمٹنے کیلئے کیا گیا جو پیپلز پارٹی کی لیڈر کے آنے سے ایک عوامی ابھار کی شکل میں سامنے آچکا تھا۔عوام اپنے مسائل کے حل کیلئے پیپلز پارٹی کا رستہ دیکھ رہے تھے کہ شاید ان کی زندگی کی تلخیاں اور ذلتیں کم ہو جائیں،شاید ان کے بھی دن بدل جائیں۔وہ ''روٹی کپڑا اور مکان'' کیلئے ترس رہے تھے تڑپ رہے تھے۔رجعتی اور سامراجی طاقتیں مزدوروں کسانوں کی تحریک کو تہس نہس کرنے کیلئے سب کچھ کر جایا کرتی ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت ہر ممکن کوشش کرے گی کہ مزدوروں کسانوں کی 1968/69ء کی انقلابی روایت کو سرے سے بھلا دیا جائے۔اگرچہ یہ انہی مزدوروں کسانوں کی روایت ہی تھی جس کی بدولت پیپلز پارٹی کو طاقت بھی ملی اور حکومت بھی۔یہ لوگ سب کچھ بھول چکے ہیں اور کچھ بھی نہیں سیکھ سکے۔یہ پیپلز پارٹی کی سوشلسٹ روایات سے منہ پھیر چکے ہیں،یہ ایسا تاثر دیتے ہیں جیسے پارٹی کی کوئی بنیادی دستاویز ہے ہی نہیں۔یہ تو ایک ایسے وقت اور ماحول میں سرمایہ داری کو بچانے کی

کوشش کررہے ہیں جہاں سرمایہ داری کا عالمگیر بحران اسے ناممکن بنا چکا ہے۔ یہ کیفیت پیپلز پارٹی کو ایک نئی شکست سے دوچار کردے گی جس سے رجعتیت لامحالہ پھر سے مسلط ہوجائے گی۔ ان حالات میں آنے والے دنوں میں عوام ایک نیا دھماکہ کر کے دکھا سکتے ہیں، ایک نیا 1968ء یقینی طور پر سامنے آ سکتا ہے۔

امریکی فلسفی جارج سنٹیانا نے کہا تھا کہ 'جو تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتا، بالآخر اسے دہرانے پر مجبور ہوجاتا ہے'۔ میرا استاد اور کامریڈ ٹیڈ گرانٹ اس مقولے کو بہت اہمیت دیا کرتا تھا۔ جتنا تاریخ کو جاننا آج ضروری ہو چکا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا' خاص طور پر انقلابات کی تاریخ۔ پاکستان کا 1968/69ء کا انقلاب بھی بیسویں صدی کے عظیم واقعات میں سے ایک تھا۔ یہ تاریخ کئی قیمتی اور اہم اسباق سے بھری ہوئی ہے اور لال خان کی یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، انہی اہم قیمتی اسباق کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ ہر انقلابی کیلئے لازمی ہے کہ وہ انتہائی غور کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

آج 1968/69ء کی روایات کو مارکسی رجحان ''طبقاتی جدوجہد'' بھرپور قوت وتوانائی کے ساتھ سامنے لا رہا ہے۔ 1980ء میں ہالینڈ میں جلاوطن ایک گروپ نے اس کی بنیاد رکھی تھی، اب ''طبقاتی جدوجہد''، خاص طور پر پچھلے دس سالوں میں خاطر خواہ قوت اور اثرات کا حامل ہو چکا ہے۔ یہ پاکستان میں واحد حقیقی انقلابی رجحان ہے جس نے وسیع عوامی بنیادیں تعمیر کر لی ہیں۔ لال خان کی قیادت میں، اور مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ میرا دوست میرا کامریڈ ہے، اس رجحان نے مستقل مزاجی کے ساتھ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے الٹرا لیفٹ فرقہ پرستی اور بے اصول موقع پرستی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔

پاکستان کے لوگوں کے سامنے دو راستے ہیں؛ سوشلزم یا پھر بربریت۔ ''طبقاتی جدوجہد'' اور عالمی مارکسی رجحان IMT ایک ساتھ مل کر پاکستان، برصغیر اور ساری دنیا میں سوشلزم کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ 1968/69ء کے عظیم انقلاب کو برپا کرنے والے بہادر مزدوروں کسانوں اور نوجوانوں کو سب سے بہترین خراج تحسین صرف یہی ہے کہ ہم اس جدوجہد کو جاری رکھیں اور اسے ایک سوشلسٹ فتح تک لے کر جائیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایسا کر کے رہیں گے۔

ایلن وڈز

لندن 20 اکتوبر 2008ء

ایک انقلابی عہد

انقلابی تحریکوں سے سرشار دنیا

''جو عناصر ایک بے مثال معاشی عروج کو پیدا کر رہے تھے وہی عناصر تھے جو معاشی بربادی اور سماجی بغاوتوں کے ابھرنے کے سامان بھی پیدا کرتے جا رہے تھے''

(ٹیڈ گرانٹ، 1913-2006ء)(1)

انقلابی ادوار تاریخ کے غیر معمولی لمحات ہوا کرتے ہیں۔ یہ روز روز کا معمول نہیں ہوا کرتے۔ 1968/69ء کے دو سال بھی انسانی تاریخ کا ایسا ہی ایک دور تھا۔ یہ کیفیت صرف پاکستان کی ہی نہیں تھی کہ عوام کے انقلابی ابھار کی سرکش موجوں نے 7 نومبر 1968ء سے لے کر 26 مارچ 1969ء کو ناقابل شکست ایوب آمریت کے خاتمے تک جدوجہد کی فقید المثال تاریخ رقم کرتے ہوئے ریاست کو چیلنج کر دیا تھا بلکہ تحریک سوشلسٹ انقلاب کی منزل کے قریب پہنچ گئی تھی۔ یہ وہ لمحے تھے جب سارے کرہ ارض پر، ہر براعظم پر انقلابی تحریکیں چھائی ہوئی تھیں۔

دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد دنیا بڑی انقلابی تحریکوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ یالٹا، تہران اور پوٹس ڈیم میں سٹالن، روزویلٹ، ٹرومین اور چرچل کے مابین ہونے والے معاہدے ان تحریکوں کے ساتھ غداری کے مترادف تھے۔ ان معاہدوں کے بعد مزدور تحریکوں کی کمیونسٹ قیادت نے

انقلابات کے ساتھ غداریاں کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو ان سماجوں میں اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ بھارت، اٹلی، فرانس اور جرمنی اس کی بڑی مثالیں ہیں۔ تاہم بعد از جنگ کے سرمایہ دارانہ نظام کے عروج اور اس کے نگران ونگہبان کے طور پر امریکی سامراج کے ابھار، اور اس کے ساتھ ہی سٹالن زدہ سوویت یونین میں ہونے والی ترقی نے مشرقی اور مغربی یورپ سمیت جدید سرمایہ دار ملکوں میں ایک ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اسی دوران ہی تیسری دنیا اور سابقہ نوآبادیاتی ملکوں میں سامراجی استحصال کی شدت میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا اور ان ملکوں کی مقامی بورژوا قیادت اتنی بدعنوان ہو چکی تھی کہ انقلابی ابھار ان ملکوں میں ابھرتے رہے اور کئی ایک ملکوں میں انہوں نے سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔

ان میں سب سے اہم 1949ء میں ہونے والا چین کا انقلاب تھا۔ مارکسی نقطہء نظر سے یہ 1917ء کے بالشویک انقلاب کے بعد انسانی تاریخ کا دوسرا بڑا واقعہ تھا تاہم یہ کلاسیکل مارکسی بنیادوں پر رونما نہیں ہوا تھا جیسا کہ روس میں لینن، ٹراٹسکی اور بالشویک پارٹی کی قیادت میں ہوا تھا۔ 1949ء کا چینی انقلاب جو کسانوں کی سرخ فوج کے ذریعے برپا ہوا تھا سوشلزم کی ایک شکل تھی جس میں محنت کش طبقے کا کوئی نمایاں مرکزی جمہوری کردار نہیں تھا جس کے ذریعے منصوبہ بند معیشت کو چلایا جاتا۔ جس طرح سے روس میں ہوا تھا جہاں کم از کم پہلے پانچ سے سات سالوں تک معیشت کی منصوبہ بندی میں مزدوروں کا کردار مرکزی تھا۔ پیکنگ کی نئی حکومت کے خدوخال 1917ء کے روس سے نہیں بلکہ 1949ء کے بگڑے ہوئے سٹالنسٹ روسی ماڈل سے مشابہت رکھتے تھے۔ 50 اور 60 کی دہائیوں میں ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک کے اندر انقلابات کے ذریعے جاگیرداری اور سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکا گیا۔ اگرچہ ان کے ماڈل بھی سٹالنسٹ روس یا ماؤاسٹ چین کی طرز پر ترتیب دیے گئے تھے اور سماجی تبدیلیوں کا عمل بھی گوریلا کاروائیوں یا پھر انقلابی فوجی افسروں کی بغاوتوں کے ذریعے سرانجام دیا گیا تھا۔ ان انقلابات نے جو شکل اور نوعیت اختیار کی ان سے پرولتاری بونا پارٹسٹ ریاستیں سامنے آئیں۔ جن ممالک میں اس قسم کی مخصوص تاریخی شکلیں ابھر کر سامنے آئیں ان میں چین، کیوبا، ویتنام، لاؤس، کمبوڈیا، شام، ایتھوپیا، یمن، موزمبیق، انگولا، صومالیہ، افغانستان سمیت کچھ اور ملک ہیں جو ان سے کچھ مختلف رہے۔ خطرناک حد تک افسر شاہانہ بگاڑ کے باوجود ان حکومتوں کا کردار ترقی پسندانہ تھا کیونکہ انہوں نے جاگیرداری اور سرمایہ داری کو اکھاڑ دیا تھا۔ انہوں نے کم سے کم سرمائے کے

حاوی کردار اور مرکزی معیشت پر سے نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا تھا۔لیکن یہاں ایک سوویت مزدور جمہوریت کی کمی اور ''ایک ملک میں سوشلزم'' کے تنگ نظر متعصب نظریے کی بدولت اور اس سے بھی بڑھ کر ان ملکوں کے روس یا پھر چین پر بھاری انحصار نے انہیں بھی روس اور مشرقی یورپ میں سٹالنزم کے انہدام کے بعد منہدم ہونے پر مجبور کر دیا۔

مگر اس سب کے باوجود بھی جنگ کے بعد کے عرصے میں انقلابات کا سلسلہ کسی طور نہیں رکا، کئی جگہوں پر نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ملکوں کے اندر یہ تحریکیں قومی آزادی کی جکڑ بندیوں سے بھی باہر نکل چکی تھیں۔ان ملکوں میں یہ تحریکیں ''قومی جمہوری انقلاب'' کی حدود و قیود پھلانگ گئی تھیں۔سلطنت روم کے زوال کے بعد نسل انسانی کی شاید یہ سب سے بڑی تحریک تھی۔اپنی وسعت اور تاثیر میں یہ اتنی شدید تھی کہ سامراجی تسلط کو اس سے بڑے چیلنج کا شاید ہی کبھی سامنا کرنا پڑا ہو۔کسی حد تک بڑے ملکوں میں جہاں ماسکو یا چین نواز کمیونسٹ پارٹیاں اتنی بڑی نہیں تھیں، یا جہاں وہ ان تحریکوں کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں، اور ان تحریکوں کو قومی جمہوری انقلاب تک ہی محدود کرنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہی تھیں وہاں ایک نئے سیاسی مظہر کا جنم ہوا۔یہ نیا مظہر پاپولرازم تھا۔

ارجنٹائن سے مصر تک اور انڈونیشیا سے لے کر پاکستان تک پاپولرازم جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا چلا گیا۔یہ بنیادی طور پر بائیں بازو کی قیادت کی سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کی ناکامی کا ہی نتیجہ اور عکاس تھا۔جو ایک طرف قومی جمہوری انقلاب کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی تو دوسری طرف قومی بورژوازی کی اپنے فرائض پورے کرنے میں نااہلی کی وجہ سے سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکی۔جبکہ ان ملکوں کے عوام خود کو محرومیوں، غربت، سرمایہ دارانہ استحصال اور سامراجی لوٹ مار سے نجات دلانے کی جستجو میں تڑپ رہے تھے۔ان ملکوں میں چلنے والی تحریکوں پر حاوی ہونے والی مقبول قیادت زیادہ تر فوجی اشرافیہ کے اندر سے ہی برآمد ہوئی تھی۔کم از کم ان کی صلاحیتیں سٹالنسٹ لیڈروں سے زیادہ تھیں جن کی مدد سے وہ ان تحریکوں کے مزاج اور کردار کو سمجھ رہے تھے۔اور یوں یہ مقبول لیڈر، بائیں بازو کی روایتی قیادت کے مقابلے میں ان بڑی عوامی سرکشیوں کی نبض پر ہاتھ رکھنے میں بھی کامیاب ہو رہے تھے۔مگر یہ مقبول قیادت کسی طور مارکسزم اور انقلابی سوشلزم سے آگاہی نہیں رکھتی تھی یا پھر ان سے واقفیت انتہائی کم اور نہ ہونے کے برابر تھی۔وہ عوامی تحریکوں اور ان کی جدوجہد کی شاندار صفات اور جوش و جذبے سے متاثر ہوتے چلے جا رہے تھے۔مارکسزم سے اپنی بنیادی

ناواقفیت کے باوجود یہ لیڈر سوشلسٹ قرار دیے جانے لگے کیونکہ انہوں نے ریڈیکل انقلابی نعرے اور مطالبے اپنا لیے تھے جو عوام کے انقلابی مزاج کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے اور جو سماج کو بدلنے کی لگن میں تاریخ کے دھارے میں متحرک ہو چکے تھے۔ نیچے سے عوام کے شدید دباؤ نے ان مقبول لیڈروں کو ریڈیکل اقدامات کرنے پر مجبور کر دیا جن میں بڑے پیمانے پر نیشنلائزیشن، سنجیدہ زرعی اصلاحات جیسے کچھ اور اقدامات تھے جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو ہلا کر رکھ دیا مگر یہ ریڈیکل اقدامات نظام کو اکھاڑ پھینکنے کیلئے نہیں کیے گئے تھے۔

مصر

ان لیڈروں میں سے ایسے بھی تھے جو سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کی منزل تک اپنا سفر لے جانا چاہتے تھے۔ مصر میں کرنل جمال عبدالناصر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جو 1956ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کو شکست دینے اور نہر سویز کو نیشنلائز کرنے کے بعد ساری معیشت کو ہی نیشنلائز کرنا چاہتا تھا۔ سویز جنگ کے دوران سامراجیوں کو مصری فوج کی طرف سے انتہائی دلیرانہ جوابی کاروائی کا سامنا کرنا پڑا جس کی قیادت پاپولسٹ لیڈر جمال کر رہا تھا اور جس کے پیچھے اس کی پرجوش عوام اپنے جذبے اور ولولے سمیت متحرک تھی۔ سویز جنگ 29 اکتوبر 1956ء کو شروع ہوئی تھی، یہ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کا ایک مشترکہ منصوبہ تھا جس کا مقصد حکومت کو گرانا اور جمال کو اقتدار اسے الگ کرنا تھا۔ مگر سامراجی اپنے مقاصد میں بری طرح ناکام رہے۔ اور ان کو سمجھ آ گئی کہ وہ دن چلے گئے جب یہ اپنی کسی بھی نوآبادیات میں اپنی مرضی مسلط کرتے تھے اور جو کہتے تھے وہی ہوتا تھا۔

1955ء سے لے کر 1957ء تک جمال نے مصر کے سب غیر ملکی بینکوں اور انشورنس کمپنیوں سمیت کئی دوسرے اداروں کو نیشنلائز کر لیا تھا۔ طاقت کی اس مرکزیت کو دیکھتے ہوئے جمال چاہتا تو انقلاب کر سکتا تھا مگر جب اس نے اپنا نمائندہ روس بھیجا اور ان دنوں روس کے قائد برزنیف سے اپنے اقدامات کیلئے منظوری اور امداد چاہی تو اسے بری طرح سے جھاڑ دیا گیا۔ برزنیف نے قرار دیا کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مکمل خاتمے کا قدم اٹھانے سے (خواہ یہ ایک بگڑی ہوئی سٹالنسٹ شکل میں ہی تھا) مشرق وسطیٰ کے اندر طاقتوں کا توازن خراب ہو جائے گا۔ اور اس کی وجہ سے بہت مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ پہلے ہی سرد جنگ کے باعث امریکہ روس کے مابین معاملات اچھے نہیں جا رہے۔

روس اور چین دونوں ملکوں کی قیادت نے کئی نو آدیاتی انقلابات کے ساتھ اسی قسم کا کردار ادا کیا۔ مصر اپنے پرولتاریہ اور اپنی معیشت کے اعتبار سے مشرق وسطیٰ کا ایک انتہائی اہم ملک تھا اور ہے۔ اس ملک میں اگر سرمایہ داری کو ختم کر کے وہاں منصوبہ بند معیشت قائم کر دی جاتی، اگرچہ یہ بالائی سطح سے متعارف کرائی جاتی، تو اس سے پورے خطے میں معیاری تبدیلی واقع ہو سکتی تھی۔ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ''قومی سوشلزم'' نے تباہ کن کردار ادا کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بچ جانے سے مصر میں سماجی بحران شدید ہوتا چلا گیا بلکہ مصری سرمایہ داروں کی نااہلی اور نقاہت نے ناصر کی مقبولیت کو گھن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا اور وہ عوامی تائید و حمایت سے محروم ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عرب قومی پرستی کی طرف جھکنے اور عرب قوم پرستی کو فروغ دینے پر مجبور ہو گیا۔ مگر قوم پرستی کسی طور بھی مصر اور مشرق وسطیٰ کے عوام اور محنت کش طبقے کی محرومیوں اور ضرورتوں کا نہ حل تھی نہ کوئی مداوا کر سکی۔ اس کا نتیجہ سامنے آنا شروع ہو گیا اور ناصر کی سماجی و سیاسی کمزوری خارجی سطح پر سامنے آنی شروع ہو گئی۔ 1967ء میں مصر کو رجعتی اسرائیل کے ہاتھوں عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑ گیا جس نے اپنی پچھلی شکست کا بدلہ بھی لے لیا۔ اس حقارت آمیز شکست نے ناصر کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا، یہ استعفیٰ ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کیا گیا تھا۔ جس پر نہ صرف مصر کے اندر بلکہ پوری عرب دنیا میں ناصر سے ہمدردی رکھنے والے لاکھوں عوام سڑکوں پر نکل آئے جس کے بعد ناصر کو اپنا استعفیٰ واپس لینا پڑ گیا۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ پر ہے کہ 1962ء سے 1967ء کے دوران مصر میں ناصر کی اندرونی سطح پر مخالفت میں کافی شدت آ چکی تھی۔ شروع میں معیشت کے خاطر خواہ حد تک سنبھلنے کے بعد اس میں گراوٹ آنی شروع ہو گئی تھی۔ ناصر کی مخالفت کا زیادہ اظہار ملاؤں کی طرف سے تھا جن سے ناصر نے سختی سے نمٹا۔ 1969ء تک اس کی عدلیہ کے ساتھ بھی خاصی مخالفت پیدا ہو گئی تھی، اسے بھی ناصر نے سختی سے دبا دیا۔

ناصر 1970ء میں فوت ہوا جس کے بعد انور السادات نے اس کی جگہ سنبھالی۔ اگرچہ اس نے ناصر کی حکومت میں شریک لوگوں کو ہی اپنے ساتھ شامل رکھا تاہم انور نے ناصر کی معاشی پالیسیوں کو توڑنا اور بدلنا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ناصر عہد کے کئی لیڈروں کو موت کے گھاٹ اتارنا بھی شروع کر دیا۔ وہ ملک کو دوبارہ امریکی سامراج کے زیر اثر لے گیا۔ یوں ناصر کی انقلابی حاصلات کا ملیا میٹ کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جسے ہم سب کو، خاص طور پر آج کے وینزویلا کے حوالے سے، سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تب سے اب تک حکومت مغرب کے حمایتیوں کے ہاتھوں میں چلی آ رہی ہے اور جو نہ

صرف امریکی سامراج کی گماشتگی کرتے چلے آرہے ہیں بلکہ انہوں نے قابل نفرت صیہونی اسرائیلی حکمرانوں کے ساتھ بھی بہتر تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔سب سے بڑی حزب مخالف جس کا ان کو سامنا ہے وہ ''اخوان المسلمین'' ہے جو کہ ایک بنیاد پرست مذہبی جماعت ہے۔بدقسمتی یہ ہے کہ اسے امریکی سامراج نے سویز جنگ کے بعد ناصر سمیت عرب اور مسلم دنیا کے دیگر بائیں بازو کے لیڈروں کے خلاف سرگرم ہونے کیلئے تشکیل دیا تھا۔چالیس سال کے بعد آج پھر مصر کے اندر طبقاتی جدوجہد کی نئی لہریں ابھرنا شروع ہو چکی ہیں اور وہاں بائیں بازو کی قوتیں دوبارہ منظم و متحرک ہو رہی ہیں۔

انڈونیشیا

سٹالنزم کی پالیسیوں کا دوسرا بڑا تباہ کن اور المناک انجام ہمیں انڈونیشیا کے اندر وہاں کی کمیونسٹ پارٹی KPI سے تعلق رکھنے والے تقریباً پندرہ لاکھ افراد کے قتل عام کی شکل میں ملتا ہے۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں یہ پارٹی سٹالنسٹ بلاک سے باہر دنیا کی سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی تھی۔1958ء میں اس پارٹی کے کام کی نوعیت اتنی موثر تھی کہ انڈونیشیا کی 73% فوج اس کی حمایتی بن چکی تھی۔لیکن یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس پارٹی کو چینی سٹالنسٹ قیادت نے حکم دیا کہ وہ اپنی قوتوں کو تحلیل کرتے ہوئے خود کو پاپولسٹ بونا پارٹسٹ جنرل سوئیکارنو کی نیشنل پارٹی آف انڈونیشیا PNI میں ضم کر دے۔مقبول عام سوئیکارنو کے ماؤ اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔وہ سامراج مخالفت میں اپنی شعلہ بیانی کیلئے تو مشہور تھا مگر وہ بس شعلہ بیان ہی تھا اور وہ سرمایہ داری کے ساتھ جڑا رہنا چاہتا تھا۔مگر وہاں کمیونسٹ پارٹی کی مقبولیت کی وجہ سے انقلابی ابھار سر اٹھا رہا تھا۔انتہائی مختصر وقت کے اندر کمیونسٹ پارٹی ایک انقلابی سوشلسٹ پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے وہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کر سکتی تھی۔مگر پیکنگ کے حکم پر خود کو نیشنل پارٹی میں ضم کر کے کمیونسٹ پارٹی کی قیادت اپنے ڈھانچوں، کیڈروں اور ارکان کے آگے ننگی ہو چکی تھی۔یہ مہلک غلطی اس وقت اپنے نتیجے سمیت سامنے آئی جب سوئیکارنو حکومت کا اس کی نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری جنرل سہارتو نے تختہ الٹ دیا اور ایک وحشیانہ آمریت مسلط کر دی۔1965ء میں سہارتو نے امریکی سی آئی اے کی آشیرباد اور اسلامی بنیاد پرستوں کی معاونت کے ساتھ مل کر جدید انسانی تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام کیا۔یہ بھیانک اور مہلک نتیجہ تھا اس سٹالنسٹ مرحلہ وار انقلاب کے نظریے کا' جسے کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت کے ذریعے نوآبادیاتی دنیا کے

انقلابات پر مسلط کیا گیا تھا۔ سہارتو کی بربریت کی سفا کی اور تحریک کی شکست کے اثرات اتنے بھیانک اور خونریز تھے کہ وہاں کی نوجوان نسل اور محنت کشوں کو جنرل سہارتو کا مقابلہ کرنے اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنے میں 34 سال کا عرصہ لگ گیا۔

یہ کوئی اتفاق یا پھر حادثہ نہیں کہ بیشتر ملکوں کے اندر ہونے والے پرولتاری بونا پارٹسٹ انقلابات میں روس یا چین کی حمایت یافتہ کمیونسٹ پارٹیوں نے تحریک کو نام نہاد ''جمہوری مرحلے'' تک روکے رکھ کر انتہائی رجعتی کردار ادا کیا۔ یہ ایسا مرحلہ ہوتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام قائم اور مستحکم رہتا ہے۔ سٹالنسٹ بائیں بازو کی طرف سے منشویکوں کے متروک و ناکام ''دو مرحلوں کے نظریے'' Two Stage Theory پر عمل پیرا ہونے کے لاابالی پن نے ایک خلا پیدا کر دیا۔ تاریخ اور فطرت دونوں کا اصول ہے کہ یہ خلا کو پسند نہیں کرتے۔ اسی سے واضح ہو جاتا ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ تاریخ کے اس دور میں چھوڑے جانے والے اس خلا کو پاپولسٹ لیڈروں نے کس طرح پر کیا۔ ارجنٹائن میں پیرون، مصر میں ناصر اور پاکستان میں بھٹو اسی خلا کے نتیجے میں ہی منظر نامے پر ابھر کر آئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ 1968/69ء کا انقلاب اور اس کے بعد سامنے آنے والے واقعات پاپولرازم کے مظہر کی مکمل وضاحت کرتے ہیں۔

انقلاب کے ترقی یافتہ ممالک پر اثرات

1968/69ء کے دور کی تاریخی اہمیت یوں بھی ہے کہ سابقہ نوآبادیاتی ملکوں میں برپا ہونے والی انقلابی تحریکوں کی بازگشت ترقی یافتہ ملکوں میں بھی سنائی دی جہاں مزدوروں اور نوجوانوں نے تحریکیں شروع کر دی تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب بعد از جنگ کے عرصے کا سرمایہ دارانہ عروج اور پھیلاؤ زوروں پر تھا مگر اس عروج نے ڈرامائی طور پر سست رو ہونا تھا۔ جدید صنعتی ملکوں میں ترقی کی دو دہائیوں کے مسلسل عروج کے بعد اٹلی اور فرانس کے اندر نوجوانوں اور مزدوروں کی تحریکیں شروع ہو گئیں جن کا رنگ روپ انقلابی تھا۔ آئرلینڈ میں سول رائٹس موومنٹ پھٹ پڑی تھی اور امریکہ کے اندر نوجوانوں کی تحریک سامنے آ گئی۔ برطانیہ کے اندر بھی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا یہاں تک کہ جرمنی اور سویڈن جیسے ملک بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ سبھی ترقی یافتہ ملکوں میں عوام کی کسی نہ کسی شکل میں ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد سپین، پرتگال اور یونان بھی ان سے محفوظ نہیں رہ سکے جن کے نتیجے میں وہاں آمریتیں ختم کر دی گئی تھیں۔ میکسیکو نے بھی ایسے ہی ڈرامائی واقعات دیکھے یہاں تک

کہ سٹالنزم کو بھی چیکوسلواکیہ میں تحریک نے گھیر لیا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان انقلابی تحریکوں کی اکثریت کی ابتدا اور اٹھان طالبعلموں کی طرف سے ہوئی تھی۔ بنیادی طور پر یونیورسٹی کیمپس ہی ان تحریکوں کے مراکز بنے ہوئے تھے۔ اس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ طالب علم ہی کسی سماج میں موجود بے چینی کے بڑھتے ہوئے ابھار کا بیرومیٹر ہوا کرتے ہیں۔ یہ درختوں کے وہ پتے ہوتے ہیں جو طوفان کی آمد سے قبل سب سے پہلے سرسراتے ہیں۔ لیکن پھر ان تحریکوں کو حقیقی طاقت اور تقویت اس وقت ملی جب محنت کش طبقہ اور عوام جدوجہد اور انقلاب کے اس دھارے میں شریک ہوئے۔ کیفیات اور جہتوں میں فرق اور فاصلوں کے باوجود عوام کی نفسیات میں جو بات مشترک تھی وہ سماج کی تبدیلی کی خواہش تھی، وہ استحصال اور ذلتوں' اذیتوں کے حامل نظام کا خاتمہ چاہتے تھے، سماج کی سوشلسٹ تبدیلی ان کی جستجو اور جدوجہد کا محور و مرکز تھی۔ ہم کوشش کریں گے کہ حقائق سامنے لاکر اپنے اس دعوے کی سچائی ثابت کریں۔ وہ بھی ان واقعات کی روشنی میں جو ان لمحوں میں پیش آرہے تھے اور جن کے ذریعے یہ تحریکیں اپنا اظہار کر رہی تھیں۔ اس کی سب سے نمایاں اور جاندار شکلیں اٹلی' فرانس اور خود پاکستان ہیں۔

فرانس۔ مئی 1968ء تاریخ کی سب سے بڑی انقلابی عام ہڑتال

1968ء میں فرانس میں جو ہوا اس کی شدت اور حدت اس قدر گہری اور اتنی وسیع تھی کہ اس نے نہ صرف فرانس کی ریاست اور حکمران طبقات بلکہ دنیا کے ہر ایوان اقتدار کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس تحریک کی تاثیر نے دنیا بھر کے آدرش وادیوں' انقلابیوں اور تبدیلی کے خواہاں عوام کو بھی امید اور ولولے سے مالا مال کر دیا تھا۔ یہ واقعات انقلابی قوتوں اور محنت کش طبقے کی سماجی' معاشی اور سیاسی طاقت کو ابھار کر سامنے لے آئے اور انہیں تاریخی واقعات میں عملی شرکت کا موقع فراہم کر دیا۔ برطانیہ میں ''مارکسی رجحان'' کے بانی ٹیڈ گرانٹ نے فرانس کے مئی 1968ء کے انقلابی واقعات پر ایک کتابچہ لکھا تھا، ہم یہاں اس کا ایک قابل ذکر حصہ نقل کر رہے ہیں۔ ''سینکڑوں فیکٹریوں میں کوئی پرزہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ نہ ہی وہاں پبلک ٹرانسپورٹ کا ایک بھی پہیہ چل پایا۔ رجعتی اخبار ایسی سبھی خبروں کو سنسر کر رہے ہیں، یہی حالت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بھی ہے۔ فرانس کے لاکھوں مزدوروں نے اپنے ہاتھ روک لیے ہیں اور سبھی فرانسیسی سرمایہ دارانہ کمپلیکس بند ہو چکے ہیں۔

یہ ہوتی ہے وہ دیومالائی طاقت جو محنت کش طبقے کے عمل میں آنے سے عیاں ہوتی ہے۔ یہ جواب ہے ان مایوس دانشوروں اور مفکرین کے اس غلط واویلے کا کہ محنت کش طبقہ تو بے بس' بے حس اور محض چار پیسوں کا غلام ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب سیاسی طور پر ناخواندہ مزدور بھی یہ دیکھتے اور سیکھتے ہیں کہ ان کے اپنے مزدور بھائی اقتدار میں آنے والے ہیں لیکن فرانسیسی مزدور اور ٹریڈ یونین قیادت کی بزدلانہ، نیم دلانہ پالیسیوں کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ یہ وہ سبق ہے جو فرانس کے واقعات کا حاصل ہے جنہوں نے فرانس کے حکمران طبقات سمیت دنیا بھر کے استحصالیوں کو ہلا کے رکھ دیا تھا''۔(2)

یہاں ہم پھر دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح طالبعلموں نے انقلاب کے شعلے کو جنگل کی آگ میں بدل دیا تھا۔ انقلاب کی وہ لہر جس نے کام چھوڑ ہڑتالوں اور فیکٹریوں پر قبضوں کی مہم کا آغاز کیا تھا وہ طالبعلموں کی طرف سے ہی شروع کی گئی تھی۔ یہ لڑائی اس وقت شروع ہوئی جب طلبہ سوغبو نے Sorbonne یونیورسٹی میں اپنی ایک میٹنگ کر رہے تھے جس پر پولیس نے وحشیانہ حملہ کر دیا، ایسا جرمن تسلط کے بعد پہلی بار ہوا تھا کہ پولیس کسی یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے بعد طلبہ اور پولیس کے مابین جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

لندن کے جریدے ڈیلی ایکسپریس کے مطابق ''پیرس کی 80% آبادی طالبعلموں کے ساتھ مل گئی تھی۔ سینئر سیکنڈری سکول طلبہ سکولوں سے باہر نکل آئے تھے اور استادوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ زبردستی کلاس رومز کو تالے لگا کر طلبہ کو اندر بند رکھیں۔ لیکن پابندی کی یہ چال بھی کامیاب نہ ہوسکی اور اساتذہ بھی طلبہ سمیت مزدوروں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سب سے اہم اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ طلبہ مسلسل محنت کشوں کا حوصلہ بڑھا کر ان کو متحرک' منظم اور جدوجہد کیلئے برسرپیکار کرتے رہے۔ فرانسیسی کہاوت کہ ''ہم نے اس سے اچھے دن کبھی نہیں دیکھے'' ان دنوں سچ بن کر سامنے آ گئی تھی۔

طلبہ کے عزم و حوصلے اور کامیابیوں سے ہمت اور جذبہ حاصل کرنے والے نوجوان فیکٹری مزدوروں نے ان کے ساتھ مل کر 13 مئی کو لاکھوں کا مظاہرہ کر دکھایا جس سے رینالٹ Renault سمیت کئی فیکٹریوں میں کام چھوڑ ہڑتال کی ابتدا کر دی گئی۔ 13 مئی کی یہ عام ہڑتال ایک معیاری موڑ ثابت ہوا جس نے سب کچھ بدل کر اور سب کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس دن لاکھوں مزدور اور نوجوان پیرس کی سڑکوں پر نکل آئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مظاہرے کے شرکاء کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ ''اس اجتماع نے ماضی کی ہر چیز کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ سفید کوٹوں میں ملبوس ہسپتالوں کے ہر شعبے سے لوگ

اس میں شریک تھے جن کے ہاتھ میں بینر تھے اور جن پر یہ سوال درج تھا کہ وہ زخمی کہاں ہیں جن کو غائب کر دیا گیا ہے۔اس میں ہر فیکٹری' ہر ادارے' ہر شعبے کے لوگ شریک تھے۔ریلوے مزدور، پوسٹل مزدور، ایرپورٹ مزدور، پرنٹر، میونسپل مزدور، میٹل مزدور، سیلز مین، الیکٹریشن، وکلا، سیور مین، بینک ملازمین، تعمیراتی مزدور، گلاس اور کیمیکل مزدور، ویٹرز، پینٹرز، گیس مزدور، شاپ گرلز، انشورنس کلرک، سڑکوں کی صفائی کرنے والے، فلم سٹوڈیو آپریٹرز، بس ڈرائیور، اساتذہ، نئی قائم شدہ پلاسٹک انڈسٹری کے مزدور' لوگ ہی لوگ' انسانوں کا ایک سیلاب ہر طرف نظر آ رہا تھا۔جدید سرمایہ دارانہ سماج کے یہ انسان جو کسی گنتی میں نہیں آ رہے تھے، یہ ایک ایسی مجتمع طاقت تھی جو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور یہ کر بھی گزرتی لیکن اگر اس کی درست قیادت ہوتی تو''۔(3)

یونینوں کی قیادت نے سوچا کہ ہم نے میدان مار لیا اور طاقت دکھا دی ہے اور بس یہی کافی ہے۔ ان کی عام ہڑتال کو آگے لے جانے اور اسے پھیلانے کی نیت ہی نہیں تھی۔انہوں نے مظاہرے کو اپنی طاقت کا اظہار سمجھا اور بس اسی پر اکتفا کرتے ہوئے ختم کرنا مناسب سمجھا۔لیکن جب تحریک شروع ہوتی ہے تو پھر یہ اپنے رستے خود متعین کرتی ہے۔اس عام ہڑتال نے ایک چھوٹی جھیل میں بڑے اور بھاری پتھر کے گرنے کا کام کر دیا تھا۔اگرچہ یونینوں کے ساتھ صرف ساڑھے تین لاکھ مزدور ہی وابستہ تھے جبکہ مظاہرے میں دس لاکھ افراد شریک ہوئے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد ہڑتالوں اور فیکٹریوں پر قبضے کی ایک مہم سارے فرانس میں پھیلتی چلی گئی۔یہ لہر فرانس کے ایک کونے سے دوسرے تک پھیل گئی۔ صرف صنعتی ادارے ہی نہیں بلکہ بینک ملازمین، وائٹ کالر مزدوروں اور کیٹرنگ ورکرز نے اس ہڑتال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔مزدوروں کا صرف 30% یونینوں میں منظم تھا مگر اس ہڑتال میں 50% سے زیادہ مزدور شریک ہوئے جو مزدوروں کی انقلابی توانائی اور صلاحیت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہر انقلاب کی طرح اس میں بھی سماج کے اب تک سیاسی طور پر انتہائی پسماندہ و درماندہ، بے یار و مددگار چلے آنے والے حصے بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے۔غریب کسانوں نے نانتیس Nantes شہر اور دوسرے کئی قصبوں کے اردگرد طلبہ اور مزدوروں کی حمایت میں بغاوتیں کر دی تھیں۔(4) اور یہ سب مثالی نظم و ضبط سے کیا جا رہا تھا۔یہاں تک کہ بورژوا ذرائع ابلاغ نے بھی اس کو تسلیم کیا کہ ''یہ سب گریس لگی ہوئی ایسی مشینوں کی طرح سے تھے جو کام نہیں کر رہی تھیں''۔

اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود کمیونسٹ پارٹی اور CGT نے کیتھولک یونینز اور سوشلسٹ Force

Ouvriere کے ساتھ مل کر وہ کچھ کرنے سے انکار کر دیا جو نوجوان اور محنت کش چاہ رہے تھے' اقتدار پر قبضہ۔اس احسان مندی پر ''آبزرور'' نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''اس وقت کمیونسٹ یونینیں اور گال حکومت دونوں ایک ہی چیلنج سے نبرد آزما ہیں اور دونوں ہی دیوار کے ایک طرف کھڑی ہوئی ہیں''۔رجعتی جریدے Le Figaro نے بھی کمیونسٹ قیادت کی ہوشمندانہ اور مدبرانہ سیاست کو مثالی اور قابل قدر قرار دیا۔

نانتیس شہر میں مزدوروں نے پٹرول پمپوں کا کنٹرول سنبھال لیا اور کسی کو بھی پٹرول دینے سے انکار کر دیا جب تک کہ ان کے پاس ہڑتالی کمیٹیوں کی طرف سے لکھا ہوا اجازت نامہ نہ ہوتا۔(4) شہر میں صرف ایک پٹرول پمپ پر پکٹ قائم کر دی گئی جہاں ڈاکٹروں کو پٹرول دیا جاتا تھا۔کسان تنظیموں کے ساتھ روابط قائم کر کے غذائی اجناس کی فراہمی کو ممکن بنایا گیا جس کی قیمتوں کا تعین مزدور اور کسان مل کر کیا کرتے تھے۔منافع خوری سے بچنے کیلئے دکانوں پر سٹکرز لگائے جاتے تھے ''یہ دکان اجازت کے ساتھ کھولی گئی ہے؛ ہماری قیمتیں یونینوں کی طے کردہ ہیں جو مسلسل ان کی نگرانی کرتی ہیں''۔ان سٹکروں پر CGT,CFDT اور FO یونینوں کے دستخط ہوتے تھے۔عام دنوں میں 80 سینٹ میں فروخت ہونے والا دودھ 50 سینٹ میں بیچا جا رہا تھا۔آلو 70 سینٹ سے کم ہو کر 12 سینٹ میں بیچا جا رہا تھا۔گاجر بھی اسی طرح 80 سے 50 پر آ گئی تھی اور یہی کیفیت دیگر اشیا کی بھی تھی۔

طالبعلم، اساتذہ، پیشہ وارانہ خدمات سرانجام دینے والے، کسان، سائنسدان یہاں تک کہ برگر بیچنے والی لڑکیاں بھی جدوجہد میں شریک ہو گئے تھے۔پیرس میں طلبہ نے SORBONNE پر قبضہ کر لیا، جبکہ Theatre de L,Odeon پر 2500 طلبہ نے قبضہ کر لیا اور سکولوں کے طلبہ نے سکولوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔اس دوران جب سکول بند ہو چکے تھے طلبہ اساتذہ نے مل کر نرسریوں، پلے گروپوں اور مفت کھانوں سمیت ہڑتالی طلبہ کیلئے سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔اور یہ صرف طلبہ ہی نہیں تھے، سماج کی ہر پیشہ ور پرت انقلاب کے اس دھارے میں شریک اور ملوث ہو چکی تھی۔یہاں تک کہ خلابازوں نے ایک رسدگاہ کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔سیکلے Saclay میں ایک نیوکلیر ریسرچ سنٹر میں بھی ہڑتال کر دی گئی۔اس ادارے میں 10000 لوگ کام کرتے تھے جن میں محققین، ٹیکنیشن انجینئرز اور گریجوایٹ سائنسدان شامل تھے۔یہاں تک کہ گرجے بھی اس کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔لاٹن کوارٹر کے علاقے میں کیتھولک نوجوانوں نے ایک گرجے کا کنٹرول سنبھال لیا اور عوامی

مسائل پر بحث شروع کر دی۔

پیرس میں ہنگامے جاری رہے جن میں طلبہ اور مزدور پولیس کی شیلنگ اور لاٹھیوں کا بہادری سے مقابلہ کرتے رہے۔صرف ایک واقعے کے دوران 795 گرفتاریاں جبکہ 456 افراد زخمی ہوئے۔ مظاہرین نے پیرس بورس (سٹاک ایکسچینج) کو آگ لگانے کی کوشش کی جو کہ سرمایہ داری کی ایک نفرت انگیز علامت تھی۔لیون میں ایک پولیس کمشنر ایک ٹرک کے نیچے آ کر کچلا گیا۔محنت کش جب بھی کبھی متحرک ہوا کرتے ہیں تو معاملات عام ہڑتال کی روٹین سے باہر نکل جایا کرتے ہیں۔ان سب میں ایک انتہائی اہم عنصر ذرائع ابلاغ کا تھا۔عام طور پر یہ ریاست کے ہاتھوں استعمال ہونے والا طاقت کا ایک آلہ بنے رہتے ہیں۔لیکن پھر یہ ریڈیو اور ٹیلیویژن محنت کشوں کی بدولت ہی کام کرتے ہیں ۔25 مئی کو ORTF ریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشن ہڑتال پر چلے گئے جب رات 8 بجے کی خبریں نشر نہیں ہوئیں۔صحافیوں اور پبلشروں نے چھاپہ خانوں پر ایک طرح سے مزدووں کا کنٹرول قائم کر دیا۔بورژوا جریدوں کو اپنے اداریے ''چھان بین'' کرانے پڑ گئے تھے اور ورکرز کمیٹیوں کی اجازت کے ساتھ چھاپنا پڑ جاتا تھا۔قومی اسمبلی میں یونیورسٹی کے بحران اور Quartier Latin میں ہونے والی لڑائیوں پر بحث شروع کر دی گئی۔لیکن یہ ساری بحثیں غیر ضروری اور غیر متعلقہ ہو چکی تھیں۔طاقت ان کے ہاتھوں سے پھسل کر سڑکوں پر منتقل ہو چکی تھی۔24 مئی کو صدر ڈیگال نے ریڈیو، ٹیلیویژن پر آ کے ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا۔مگر اس کا ریفرنڈم محنت کشوں کی تحریک تلے آ کے دھرا رہ گیا۔جنرل ڈیگال کو اس کیلئے بیلٹ پیپر چھپوانا محال ہو گیا کیونکہ فرانسیسی پرنٹنگ مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی جبکہ ڈیگال نے یہ بیلجیم سے چھپوانے کی کوشش کی جسے وہاں کے مزدوروں نے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ بین الاقوامی یکجہتی کی صرف یہی ایک مثال نہیں تھی بلکہ جرمن اور بیلجیم کے ٹرین ڈرائیوروں نے بھی اپنی اپنی سرحدوں پر ٹرینیں روک دی تھیں تا کہ فرانس کی ہڑتال ٹوٹنے نہ پائے۔

ہر سنجیدہ سیاسی مبصر نے اس صورتحال میں موجود انقلابی کیفیت کا ذکر کیا ''فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لینے والے طوفانی واقعات کے پیچھے محض سنجیدہ نوعیت کے تحفظات یا ضرورتیں نہیں ہیں بلکہ یہ نظام حکومت کے خلاف عمومی غم و غصے کا اظہار ہے۔مزدور صرف معاشی سہولتوں کا ہی تقاضا اور مطالبہ نہیں کر رہے ہیں یا یہ کہ اوقات کار کم کیے جائیں، بلکہ یہ طلبہ کی طرح سے انقلابی کمیٹیاں تشکیل دیتے جا رہے ہیں''۔(5)

پرامن سماجی تبدیلی

برطانوی بورژوازی کے سنجیدہ جریدے ٹائمز لندن نے بھی فرانس میں ہونے والے واقعات کے انقلابی ہونے کا اعتراف کیا۔ ''فرانس کے اندر ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں جو با آسانی کسی بھی کامیاب نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ مزدوروں نے آخری حد تک جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ درمیانہ طبقہ، خاص طور پر اس کی نچلی پرتیں ہڑتال کے ساتھ خاصی ہمدرد ہو چکی ہیں۔ کئی جگہوں پر تو یہ نہ صرف شامل ہیں بلکہ آگے آگے بھی ہیں خصوصاً بحری جہازوں پر جہاں افسران تک بھی اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہڑتال میں شامل ہو چکے ہیں''۔(6) ٹائمز کو بھی تسلیم کرنا پڑ گیا تھا کہ طاقت محنت کش طبقے کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی ہے جو نظام کو بدلنے کیلئے تیار ہو چکے ہیں۔ ''فیکٹریوں، بندرگاہوں، کانوں اور سڑکوں پر حقیقی طاقت محنت کشوں کے ہاتھوں میں آ چکی ہے۔ دوہری طاقت کی ایک کلاسیکل مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ قومی اسمبلی میں ہونے والی بحث تک بھی مزدوروں کی اجازت سے ٹیلی ویژن پر نشر کی گئی ہے اور اس کا اعتراف خود ڈیگال کے ایک وزیر نے کیا ہے۔ حکومت کی روایتی طاقت کے ادارے فوج اور پولیس بھی اب اعتبار کے قابل نہیں رہے۔ پولیس تو خود ہی انقلاب کے تند و تیز شعلوں کی گرفت میں آ چکی ہے۔ ان کی یونین نے حکومت کو ایک انتباہ جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پولیس افسران ہڑتالی مزدوروں کے موقف کی مکمل تائید کرتے ہیں اگرچہ وہ قانونی تقاضوں کی وجہ سے اس مزدور تحریک میں شامل نہیں ہو سکتے مگر پبلک اتھارٹیز پہلے کی طرح سے پولیس کو مزدوروں کی اس جدوجہد کے خلاف استعمال نہیں کر سکیں گی(7) (اگر کوئی تصادم ہوا بھی تو) کئی سنجیدہ حصے، اگر اکثریت نہ بھی سہی، مزدوروں کے ساتھ جا کے شامل ہو جائیں گے۔ اگر فوج نے مداخلت کی کوشش کی تو اس میں بھی اوپر سے نیچے تک پھوٹ پڑ جائے گی۔ اس کا امکان ایک فوجی نے ظاہر کیا ہے جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ طلبہ اور مزدوروں پر حملہ کرے گا تو اس نے جواب دیا کبھی نہیں خواہ ان کا طریقہ کار کوئی بھی ہو میں ایسا کبھی نہیں کروں گا کیونکہ میں خود بھی ایک مزدور کا ہی بیٹا ہوں''۔(8) ٹیڈ گرانٹ اس بارے میں لکھتا ہے کہ کیا اس سے بھی زیادہ بہتر اور مناسب موقع کوئی اور ہو سکتا تھا کہ جب محنت کش طبقہ آرام اور سکون کے ساتھ اقتدار پر قبضہ کر سکتا ہو!

رجعتیت اس مرحلے پر انتہائی کمزور پڑ چکی تھی اور اگر فاشسٹ اور فوجی جرنیل بدمعاشوں کے

گروہوں کو تیار کر کے انہیں مزدوروں کے خلاف بھیجتے بھی تو ان کو پہلے پہل ہی ورکرز ڈیفنس گارڈز کے ذریعے چپ کرا دیا جاتا اور پھر مسلح عوام ان سے خود نمٹ لیتے۔ حکومت اور اس کی کٹھ پتلی قومی اسمبلی ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ اگر کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں ایک اونس جرات بھی ہوتی اور وہ اپنے کارکنوں، عہدیداروں یا پھر عوام کی توانائی سے لیس ہوتی تو اس کی طاقت اور اثر انگیزی میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہوتا اور محنت کشوں کی تبدیلی کی جستجو کو اپنی طاقت کا مرکز و محور بنا سکتی تھی، وہ بھی انہی کے بنائے ہوئے طاقت کے آلے یعنی ورکرز کونسلوں کے ذریعے۔

ڈیگال کی سوانح عمری ''آخری عظیم فرانسیسی .جنرل ڈیگال کی زندگی'' مرتب کرنے والا مصنف سی ولیم لکھتا ہے ''25 مئی کو ڈیگال کا موڈ انتہائی خراب تھا، وہ سٹھیا چکا تھا اس کے ایک وزیر کے مطابق اس کے قویٰ کام کرنا چھوڑ چکے ہیں اور وہ اب بوڑھا ہو چکا ہے جبکہ ایک اور وزیر نے کہا کہ وہ بے حس ہو چکا ہے اور اسے کوئی پتہ نہیں چل رہا کہ آگے کیا ہونے والا ہے! 25 سے 28 مئی تک ڈیگال مسلسل اداس و نڈھال کیفیت کا شکار رہا۔ 27 مئی تین بجے شام وزراء کی میٹنگ تھی جس کی صدارت جنرل نے کی مگر سب نے محسوس کیا کہ اس کا دل اور دماغ کہیں اور ہی تھے۔ وہ بس اپنے وزیروں کو دیکھے بغیر ان پر سے نظریں گھماتا رہا، وہ میز پر اوندھا ہو کر اپنی بانہیں پھیلائے بیٹھا رہا، اس کے شانے لٹکے ہوئے تھے جیسے وہاں کچھ ہو ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ بعد میں ڈیگال نے امریکی سفیر کو ملاقات میں بتایا 'کھیل ختم ہو چکا، کچھ ہی دنوں میں کمیونسٹ اقتدار میں ہوں گے' ''۔(9)

ٹائمز لندن اپنے اداریے میں ایک سوال اٹھاتا ہے کہ کیا ڈیگال فوج کو استعمال کر سکے گا؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہاں وہ ایک بار شاید ایسا کر سکے۔ لیکن دوسرے الفاظ میں یہ خونریز تصادم فوج کو اندر سے توڑ کے رکھ دے گا''۔ یہ تبصرہ اپنے وقت کے سرمایہ داری کے سب سے سخت گیر ترجمان جریدے کا تبصرہ تھا۔ اور یہ تبصرہ ان حالات کی مناسبت سے کسی طور بھی غلط نہیں تھا۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتنی دیوہیکل تحریک کیوں کر سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے سے رہ گئی؟ آخر کس طرح سے سوشلسٹ فتح اتنی بڑی پرولتاریہ جدوجہد کے باوجود ہاتھوں سے پھسل گئی؟ اس سوال کا جواب ہم نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا سے پوچھتے ہیں جس نے مئی 1968ء کیلئے اپنی انٹری میں لکھا ''ڈیگال بحران سے نمٹنے میں ناکام رہا، نمٹنا تو درکنار، وہ اس کی نوعیت کو سمجھنے سے بھی محروم رہا۔ تاہم کمیونسٹ اور ٹریڈ یونین قیادت نے اس کو سانس لینے کی مہلت فراہم کر دی۔

یکم مئی 2008ء کو فرانس کے انقلابی واقعات کی چالیسویں سالگرہ کے حوالے سے ایلن وڈز نے اپنے بصیرت افروز مضمون میں حسب ذیل لکھا؛

''ایک 'عام ہڑتال' دوسری ہر قسم کی ہڑتالوں سے اس لئے مختلف و منفرد ہوا کرتی ہے کہ یہ طاقت کا سوال پیدا کر دیتی ہے۔ یہ سوال نہیں کہ اجرتوں میں کتنا اضافہ ہوا ہے بلکہ یہ سوال کہ طاقت کا اصلی محور و مرکز کون ہے؟ گھر کا مالک کون ہے؟ تند و تیز واقعات نے مزدوروں کے شعور کی وسعت اور گہرائی میں برق رفتاری سے اضافہ کر دیا تھا۔ ان کو ادراک ہو گیا تھا کہ یہ ہڑتال کسی معاشی سہولت یا رعائت کیلئے نہیں بلکہ اس سے بھی بڑے کسی اور مقصد کیلئے کر رہے ہیں۔ ان کو یہ سمجھ آ چکی تھی کہ طاقت تو ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہی ہے اور ان پر وہ کمزوری بھی ظاہر و عیاں ہو چکی تھی جسے ریاست اپنی دائمی طاقت بنا کر پیش کرتی چلی آ رہی تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ کام کرنے کی ہر جگہ پر نمائندے منتخب کیے جاتے اور انہیں ہر شہر، ہر قصبے میں ہڑتالی کمیٹیوں کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا جو ایک مرکزی کمیٹی تشکیل دے کر اس کے ساتھ جڑ جاتیں جو طاقت کو اپنے کنٹرول میں لے لیتی اور پرانے فرسودہ استحصالی ریاستی ڈھانچے کو تاریخ کے کچرے میں ڈال دیتی۔ مگر یہ سب نہیں کیا گیا اور یوں محنت کشوں اور نوجوانوں کی انقلابی توانائی کو ہوا میں تحلیل کر دیا گیا ایسے جیسے بھاپ پسٹن کے بغیر ضائع ہو جایا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار مزدور تھک ہار کر اپنے اپنے کام پر لگ گئے جبکہ ریاست نے اپنی طاقت دوبارہ مجتمع کر لی اور اس نے اپنا انتقام شروع کر دیا۔ فرانسیسی محنت کشوں کی جدوجہد شکست سے دوچار کر دی گئی تھی مگر اس انقلاب کی روایات آج بھی فرانس کے عوام کے دلوں میں زندہ اور درخشندہ ہیں اور ساری دنیا ان کو اب بھی یاد کرتی ہے۔ آج سرمایہ دارانہ نظام ایک بار پھر شدید بحران کی زد میں آ رہا ہے اور پچھلے بیس سالوں سے دبے ہوئے تضادات پھٹ کر سامنے آنے والے ہیں جن کے نتیجے میں سارے یورپ میں بڑی طبقاتی لڑائیاں شروع ہو جائیں گی''۔(10)

یورپ انقلابی موجوں کی زد میں

فرانس کے طوفانی واقعات نے اپنے پڑوسی اور دیگر یورپی ملکوں کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ممالک جن کی مزدور تحریکیں اصلاح پسندی کی زد میں آئی ہوئی تھیں اور جو ملک انتہائی ترقی سے مستفید ہو رہے تھے ان میں بھی سماج کی تہوں میں موجود تضادات ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔ عالمی جنگ

کے بعد سامنے آنے والے بے نظیر سرمایہ دارانہ عروج کے باوجود اور سوشل ڈیموکریسی کی طرف سے کی جانے والی متعدد اصلاحات کے باوجود طبقاتی تضادات جو سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کا ناگزیر حصہ ہوا کرتے ہیں، وہ اپنا اظہار کرتے ہوئے سامنے آ گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوشل ڈیموکریٹک حکمرانوں کی طرف سے دی جانے والی یہ مراعات بھی خیرات میں نہیں دی گئی تھیں بلکہ یہ محنت کشوں کی سنجیدہ جدوجہد کا ہی نتیجہ تھیں۔ جیسا کہ مارکس نے قرار دیا تھا کہ ''جونہی اور جب بھی حکمران طبقہ اپنے پاؤں تلے انقلابی لرزش محسوس کرتا ہے وہ اصلاحات کرنی شروع کر دیتا ہے''۔

یورپ میں ہونے والی تیز صنعتی اور معاشی ترقی نے وہاں صنعت اور معیشت کو وسعت بھی دی اور اسے جدید بھی بنایا مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس نے وہاں طبقات کے مابین توازن کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ معیشت کی ترقی نے پرولتاریہ کی طاقت' میں بھی اضافہ کر دیا۔ اس نئے طاقتور پرولتاریہ نے 1968ء کی انقلابی کیفیت میں اپنی طاقت توانائی اور جذبے کا اظہار کر دیا تھا، فرانس کی مئی 1968ء کی تاریخی جدوجہد نے بعد میں اٹلی میں بڑی مزدور تحریکوں کو جنم دیا۔

اٹلی کا ''گرم موسم خزاں''

اٹلی بھی قریبی ممالک میں پیدا ہونے والی کیفیات سے شدید متاثر ہو رہا تھا۔ 1968ء میں وہاں ایک طلبہ تحریک متحرک تھی جس کے ساتھ مزدوروں کے کچھ حصے بھی شریک تھے مگر 1969ء میں اٹلی کا پرولتاریہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ہر شکل وصورت کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔

1950ء کی دہائی اور 1960ء کے اوائل میں اٹلی میں جو ریڈیکل معاشی وسماجی ترقی ہوئی اسے ''اطالوی معجزہ'' قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایک نسبتاً کم ترقی یافتہ معیشت کا حامل ملک تھا جہاں صنعت کا زیادہ حصہ اس کے شمال مغرب میں محدود تھا مگر یہ ایک انتہائی جدید ملک بن گیا۔ لاکھوں کی تعداد میں کسانوں کا بڑا حصہ خصوصاً جنوبی اٹلی سے شہروں کی طرف ہجرت کر گیا اور پرولتاریہ کی شکل میں ڈھل گیا۔ 1948ء میں ایک زرعی ملک اٹلی 1968ء میں زرعی نہیں رہا تھا۔ اس کے شہر تیزی سے پھلتے پھولتے اور پھیلتے رہے جس کی وجہ سے سماجی مسائل بھی جنم لیتے چلے گئے۔ اٹلی میں آگے پیش آنے والے طوفانی واقعات کی علامتیں 1958/63ء کے مابین ہڑتالوں اور مظاہروں سے برآمد ہونا شروع ہو چکی تھیں لیکن 1969ء میں عروج کو پہنچنے والی تحریک کی ابتدا 1966ء میں انجینئرنگ ورکروں کی ہڑتال سے ہوئی جو بعد میں دیگر

شعبوں میں پھیلتی گئی۔اس ہڑتال سے ہی ابتدائی انجینئرنگ ورکرز ہڑتالی کمیٹیاں سامنے آئی تھیں۔ 1967ء میں طلباء کے مظاہرے شروع ہوئے جن کے دوران کئی یونیورسٹیوں پر قبضے ہو گئے۔اسی دوران نوجوانوں اور مزدوروں کی جبلتی وحدت سامنے آتی چلی گئی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور منسلک ہوتے رہے اس وحدت اور یکجہتی نے آئندہ دنوں میں اپنا اظہار کرنا تھا۔

جس معاملے سے تنازعہ شروع ہوا وہ حکومت اور مالکان کے مابین پنشنوں پر اختلاف کی شکل میں سامنے آیا۔ 1967ء میں یونین نے اس معاملے پر ہونے والی ہڑتال ختم کرنے کی کال دی اور اس کا خیال تھا کہ نیچے تحریک خاموش ہو جائے گی مگر یونین کو آگے چل کے ایک جھٹکے سے دو چار ہونا پڑا۔ 1968ء میں ہڑتالوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جس پر یونینوں نے کوشش کی کہ ریفرنڈم کرا کے کام چلا لیا جائے مگر نیچے مزدوروں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بغاوت کی پہلی نشانی تھی جو یونینوں کو نیچے اپنے مزدوروں سے ملی۔جس کے نتیجے میں یونینوں کو عام ہڑتال کی کال دینی پڑی جو انتہائی کامیاب رہی جس کی توقع خود یونین قیادت کو بھی نہیں تھی۔اگلی بڑی لڑائی علاقائی اجرتوں کے تنازعے پر شروع ہوئی۔عالمی جنگ کے بعد سے مالکان نے اجرتوں کا ایک نیا نظام رائج کیا تھا جس کے تحت جنوب کے مزدوروں کو شمال کے مزدروں کے مقابلے میں کم اجرتیں دی جاتی تھیں۔ 1968ء میں مزدوروں نے اس امتیاز کے خلاف مطالبات پیش کیے۔نومبر 1968ء میں پنشنوں اور اجرتوں میں امتیاز کے خلاف ایک طاقتور عام ہڑتال کی گئی۔ 1969ء میں مالکان کی فیڈریشن نے اجرتوں میں فرق کو ختم کرنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

ہر ہڑتال اور ہر مظاہرے کے بعد حکومت مالکان اور مزدوروں کو سمجھوتے پر مائل ہونا پڑ رہا تھا اور مراعات ملتی جا رہی تھیں جس سے مزدوروں کا اعتماد بڑھتا چلا جا رہا تھا۔مزید حصول کیلئے وہ مزید طلب کرتے چلے گئے۔مزدور طبقے کو اپنی اہمیت اور طاقت کا ادراک ہوتا چلا گیا، اس سارے عمل کے دوران ہی فرانس میں طوفانی واقعات کا ظہور ہوا۔جن کی وجہ سے اطالوی مزدوروں کے اعتماد اور جوش و جذبے کو اور بھی تقویت مل گئی۔اٹلی کے وہ مزدور بھی جو اب تک کسی مظاہرے یا ہڑتال میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ بھی سرگرم عمل ہو گئے۔پسماندہ ترین علاقوں کی فیکٹریاں بھی ہڑتالیں کرنے لگیں۔خواتین کی بہت بڑی تعداد مظاہروں، ہڑتالوں میں شریک ہوتی چلی گئی جو اپنے مرد مزدور ساتھیوں کے جذبے اور حوصلے بڑھاتی رہیں۔اس ریڈیکلائزیشن سے فیکٹری کونسلیں بنتی چلی گئیں جنہیں فیکٹری کے مزدور منتخب کیا کرتے تھے

وہ بھی واپس بلائے جانے کے اختیار اور حق کے ساتھ۔ 1969ء کے سرما میں ان کمیٹیوں نے نیچے سے جدوجہد کا آغاز کر دیا جس سے روایتی یونینوں کی قیادت کی بالادستی ختم ہوتی چلی گئی۔ پہلے پہل فرقہ پرست لیفٹ نے سمجھا کہ شاید اس سے روایتی یونینوں کا خاتمہ ہی ہو گیا ہے مگر یہ ان کی شدید کج فہمی تھی۔ 1967/68ء کے دوران یونینوں کی ممبر شپ میں دوگنا اضافہ ہوا تھا۔ نیچے سے ایک انقلابی تحریک کے دباؤ نے یونینوں کی قیادت کو سامنے آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جو کچھ اب تک ''غیر سرکاری'' ہوتا چلا آ رہا تھا وہ اب ''سرکاری'' ہوتا جا رہا تھا۔ قیادت کو اپنے ورکروں کو مطمئن اور خوش کرنے کیلئے انقلابی تقریریں کرنی پڑ گئی تھیں۔ انہیں زبانی اور عملی طور پر لیفٹسٹ ہونا پڑ گیا تھا۔ لیڈر شپ کی اس ریڈیکلائزیشن نے مزدوروں کی بھاری تعداد کو یونینوں کی ممبر شپ کی طرف مائل کر دیا کیونکہ وہ جدوجہد کرنے کے موڈ میں تھے۔ ٹریڈ یونین قیادت ایک ایسے شیر پر سوار ہو چکی تھی جس پر سے اترنا محال ہو چکا تھا۔

اٹلی اور فرانس کی تحریکوں میں فرق یہ تھا کہ فرانس میں یہ مکمل عروج تک پہنچ کر فیکٹریوں پر قبضے کر چکی تھی۔ سوائے نظام کو اکھاڑ پھینکنے کے، مزدوروں کے بس میں جو کچھ بھی تھا وہ انہوں نے کر کے دکھا دیا تھا۔ کچھ ہفتوں تک جاری رہنے والی یہ تحریک اپنے انجام تک انتہائی زوروں سے لڑی جانے والی جنگ تھی۔ عروج کی انتہاؤں کو پہنچنے والی فرانسیسی تحریک اپنی قیادت کے ہاتھوں زوال کا شکار ہوئی۔ اٹلی کی تحریک اگرچہ اس عروج تک نہیں پہنچ پائی جہاں فرانس کی تحریک پہنچی تھی مگر یہ سالوں متحرک رہی یعنی پورے دس سال۔ یہ ایک انتہائی غیر معمولی صورتحال تھی جو بالآخر 1979ء میں اس وقت اپنے انجام کو پہنچی جب اسے انتخابی میدان میں شکست کا سامنا کرنا پڑا جب کمیونسٹ پارٹی نے الیکشن میں کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس انجام کیلئے اطالوی بورژوازی کو بہت عرصے تک سازشوں، ٹریڈ یونین قیادت کے ساتھ مصالحتوں اور مزدوروں کیلئے مراعات کی شکل میں بہت کچھ کرنے کا موقع مل گیا تب جا کر صورتحال ان کے کنٹرول میں آ سکی۔

لیکن یہ سب کچھ ایک حقیقت کو ضرور واضح کرتا ہے اور وہ محنت کش طبقے کی بے پناہ طاقت ہے۔ اٹلی میں محنت کش ایک نہیں دس بار اقتدار پر قابض ہو سکتے تھے۔ وہاں صرف ایک کمی تھی اس قیادت کی کمی جو یہ کر سکتی۔ المیہ یہ ہے کہ ایسی قیادت تھی ہی نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک شکست کھا گئی۔ یہی نہیں بلکہ ایک ایسا عہد شروع ہوا جس کے بعد مسلسل محنت کشوں کی حاصلات پر حملے ہوتے رہے۔ 1980/90ء کی دہائیوں میں ہڑتالوں کی تعداد میں کمی ہوئی اور ٹریڈ یونینوں کی ممبر شپ میں کمی واقع ہوتی چلی گئی۔ اب

حالیہ دنوں میں ہم ہڑتالوں اور عام ہڑتالوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ تاریخ کا پہیہ ایک بار پھر گھوم رہا ہے اور اٹلی کا محنت کش طبقہ ایک بار پھر میدان عمل میں اترنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں کو دہرانے کی بجائے ان سے سبق حاصل کریں۔

آئرلینڈ

دنیا بھر کو متاثر کرنے والے انقلابی واقعات نے شمالی آئرلینڈ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں پیدا ہونے والے انقلابی ابھار تیزی کے ساتھ طویل اور موثر تحریکوں کو جنم دینے کا پیش خیمہ ثابت ہو جایا کرتے ہیں۔ استحصال اور محرومی کے خاتمے کی خواہش ان ابھاروں سے نئی شکتی و توانائی حاصل کرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ آئرلینڈ میں سول رائٹس موومنٹ کے معاملے میں بھی ہوا۔

ایلن وڈز نے اس کی تفصیلات کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔

''یہ تحریک واقعی عالمی صورتحال کی ہی عکاس تھی، خاص طور پر اس پر فرانس کی مئی 1968ء کی انقلابی کیفیت کے اثرات نمایاں تھے۔ یہ اپنی آئرش روایات سے جڑی ہوئی تھی۔ ''یونائیٹڈ آئرش مین'' کی بغاوت بھی 1789/93ء کے فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھی۔ 1916ء کی ''ایسٹر سرکشی'' پہلی عالمی جنگ کا براہ راست ردعمل تھی۔ شمالی آئرلینڈ کے طلبہ کا جوش و جنون کسی طور بھی ان کے فرانسیسی طالب علم بھائیوں سے کم نہیں تھا۔ سول رائٹس موومنٹ ہفتہ 24 اگست 1968ء کے دن کول آئی لینڈ سے ڈنگانن تک 2500 افراد کے مارچ سے شروع ہوئی تھی۔ پہلے تو پروٹسٹنٹ کے غنڈوں نے اس مارچ پر حملہ کر دیا۔ پھر جب یہ لوگ کریگاون پل سے گزر رہے تھے تو پولیس نے مارچ پر لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ اس لڑائی میں 88 افراد زخمی ہو گئے ان میں 11 پولیس والے بھی تھے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ IRA آئرش ریپبلکن آرمی کا اس تحریک سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ اس کی بجائے اس تحریک کا تعلق مارکسزم اور انقلابی نظریات سے تھا۔ اس تحریک میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں عناصر شامل تھے۔ 19 اپریل کو ڈیری میں ایک خوفناک جھڑپ ہوئی جس میں لوگوں نے خود پر حملہ کرنے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس لڑائی کی اصل کہانی اعداد و شمار سے ہی ظاہر ہوتی ہے جس میں 79 سویلین کے مقابلے میں 209 پولیس والے زخمی ہوئے۔ پٹرول بموں سے کیے جانے والے حملوں کے بعد اتھارٹیز نے بکتر بند گاڑیوں کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز اونیل نے استعفیٰ دے دیا اور ریفارم پروگرام کوڑے

دان میں ڈال دیا گیا۔

''18 مارچ کو سول رائٹس ایسوسی ایشن نے اعلان کیا کہ وہ اپنی جدوجہد جاری رکھے گی اور سول نافرمانی کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے گا۔ایک عبوری مطالبات کا حامل پروگرام جاری کیا گیا۔جس میں مقامی حکومت کیلئے ایک فرد ایک ووٹ، اٹھارہ سال کیلئے ووٹ کا حق، انتخابی حلقوں کیلئے آزاد باؤنڈری کمیشن کا قیام، گھروں کو مختص کرنے کیلئے ایک کھرا صاف ستھرا نظام، بلا امتیاز روزگار کا حق، B سپیشل قانون کا خاتمہ اور سپیشل پاور ایکٹ میں ترمیم کے مطالبات شامل تھے''۔

1966ء کا سال درحقیقت تبدیلی کا موڑ ثابت ہو رہا تھا اور جیسا کہ ایلن وڈز لکھتا ہے کہ ''نوجوانوں کی بڑی تعداد تحریک کا حصہ بنتی جا رہی تھی، جن کے تیور اور رنگ روپ تک انقلابی ہو چکے تھے اور جو کسی انقلابی رستے پر چلنے کے خواہاں تھے۔لیکن یہ کسی طور تحریک کی قیادت کے اندازوں اور تخمینوں سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔قیادت تناظر سے محروم تھی اور اسے آگاہی نہیں تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور کیا کرنا چاہئے۔وہ تو 1969ء کے واقعات سے حیران و پریشان رہ گئی تھی جب آئرلینڈ تیزی سے خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔12 اگست کو ڈیری کے علاقے کیتھولک بوگ سائیڈ میں رائل السٹر کنسٹیبلری RUC اور پروٹسٹنٹ مظاہرین کے مابین جھڑپوں میں حملوں کو روکنے کیلئے رکاوٹیں قائم کی گئیں۔ردانقلابی رجعتی قوتوں کے ساتھ لڑائی کے دوران سرخ پرچم ہاتھوں میں لیے مظاہرین بوگ سائیڈ ڈیری کی آزادی کے نعرے بلند کرتے رہے۔''

ان واقعات میں انقلابی رجحان و جوش و جذبہ نمایاں بھی تھا اور صاف طور پر اپنا اظہار بھی کر رہا تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ٹریڈ یونینز پر مشتمل مسلح ورکروں کی ایک دفاعی فورس تشکیل دی جاتی جیسا کہ کانولی نے آئرش سٹیزن آرمی تشکیل دی تھی''۔

''جب کوئی انقلابی قوت موجود نہیں تھی کہ جو قیادت سنبھال سکتی، تو ردانقلابی قوتوں نے یقینی طور پر اپنی گرفت مضبوط کرنی تھی اور صورتحال کو اپنے کنٹرول میں لینا ہی تھا۔شمال میں ایک انقلابی خطرے سے خوفزدہ ہو کر آئرش بورژوازی نے اسے قومی رنگ روپ دینے کی کوشش شروع کر دی۔اس مقصد کیلئے انہوں نے دانستہ آئرش ریپبلکن آرمی IRA میں پھوٹ پیدا کر دی۔اگرچہ یہ بھی ان کی دانست میں انتہائی لیفٹسٹ ہی تھی۔اس مقصد کیلئے دائیں بازو، قدامت پرستوں اور لالچی عناصر کو بھاری رقوم سے نوازا گیا۔اور ایک مدمقابل تنظیم پروویژنل IRA کھڑی کر دی گئی، بعدازاں اسے ہی ''جائز'' تنظیم قرار دیا گیا''۔

''جب چھ کاؤنٹیوں کی آبادی نے سٹارمنٹ کے جبر واستبداد کا دلیری سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور ''لا اینڈ آرڈر'' قائم کرنے والی قوتوں کے ساتھ میدان میں اتر آئی تو سٹارمنٹ کو برطانوی فوج طلب کرنا پڑ گئی تا کہ ''فسادیوں'' کے ساتھ نمٹا جا سکے۔لیکن یہ سب کچھ صرف وہاں تو نہیں ہو رہا تھا،صرف وہی نہیں تھے جنہیں فوج کی مداخلت کی ضرورت تھی۔حقیقت یہ تھی کہ دونوں آئرش اور برطانوی حکمران طبقات ڈرے ہوئے تھے کہ شمال میں کاؤنٹیوں میں پھیلی سرکشی جنوب اور برطانیہ میں نہ پھیل جائے۔چنانچہ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اس انقلابی خطرے کو ہر طریقے سے کچل دیا جائے''۔

''ڈیری میں ینگ سوشلسٹوں کی مارکسی قیادت میں بوگ سائیڈ ڈسٹرکٹ میں ڈیری سٹیزن ڈیفنس کمیٹی قائم ہو چکی تھی۔ایک اشتعال انگیز واقعے میں رائل کنسٹیبلری نے اچانک حملہ کر دیا جس سے ایک بڑے تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔بوگ سائیڈ اور کریگان کے لوگ اپنے اپنے علاقوں کے دفاع کیلئے باہر نکل آئے اور مورچہ بند ہو گئے۔سخت لڑائی کے باوجود ریاستی مسلح ادارے عوامی مورچوں کو توڑنے اور بوگ سائیڈ میں داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔وزیراعظم جیک لنچ نے ڈبلن میں آئرلینڈ کے عوام سے خطاب کے دوران اعلان کیا کہ وہ اقوام متحدہ کی امن قائم کرنے والی فورس کو طلب کرنے جا رہا ہے کیونکہ ''سٹارمنٹ'' اب کنٹرول سے باہر ہو چکا ہے۔یہ برطانیہ کیلئے کھلا پیغام تھا کہ وہ شمال میں نظم ونسق کو قائم کرنے کیلئے مداخلت کرے''۔

برطانوی حکومت نے اشارہ ملتے ہی فوری کاروائی کی۔برطانوی وزیراعظم جیمز کیلاگن کے حکم پر 14اگست 1969ء کو برطانوی افواج ڈیری میں کاروائی کیلئے بھیج دی گئیں۔ 15اگست کو فوج بلفاسٹ پہنچ گئی۔چھ متاثرہ کاؤنٹیوں میں اس ہفتے کے دوران چھ ہزار برطانوی فوجی داخل ہو چکے تھے۔کئی خود ساختہ لیفٹسٹوں سمیت بہت سے اہل دانش نے اس کاروائی کو بجا اور بروقت قرار دے دیا۔لیکن اس سے بھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔اونیل حکومت کے پانچ سالوں کے دوران فرقہ وارانہ لڑائیوں میں صرف تین افراد مارے گئے جبکہ 1969ء کے سرما میں وہاں نو افراد ہلاک ہوئے، 150افراد گولیاں لگنے سے زخمی ہوئے جبکہ 500 گھر تباہ اور 2000افراد بے گھر کر دیے گئے۔لیکن یہ سب ان سانحوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو ابھی آگے پیش آنے والے تھے''۔

''پہلے پہل تو برطانوی فوج کا کیتھولکوں نے والہانہ استقبال کیا۔مگر بہت جلد ہی برطانوی فورسز کی اصلیت اور ان کے حقیقی اہداف سامنے آنے شروع ہو گئے۔شمال میں پنپتی، پھیلتی انقلابی تحریک کا

خاتمہ ہی اس کا مرکزی ہدف تھا۔اور اس کارِ خیر میں بھی کمیونسٹوں کا خاتمہ بنیادی مقصد تھا۔اس مہم میں جنوب کے سرمایہ داروں نے ہر ممکن تعاون کیا اور اپنی تشکیل کردہ پروویژنل آئی آر اے سے بھرپور کام لیا۔آج کل تو شاید کسی کو ان کا نام تک بھی یاد نہیں رہا لیکن اس وقت انہوں نے وہ سب کچھ کیا جس سے کمیونسٹوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہو۔یہاں تک کہ کمیونسٹوں کے پاس جو کتابیں ہوتی تھیں وہ بھی جلا دی گئیں۔یہ تصور بھی محال ہے کہ ایک ہی لڑائی کے دوران برطانوی فوجی طاقت کو شکست دی جا سکتی تھی ،جیسا کہ ہم آگے پیش آنے والے واقعات میں دیکھتے ہیں''۔

''شکست سے دوچار ہوتی ہوئی رجعتیت کو فیصلہ کن ضرب لگانے کیلئے ضروری تھا کہ فرقہ پرستانہ تقسیم کا قلع قمع کیا جاتا مگر اس کیلئے لازم تھا کہ درست پالیسیاں اور طریق کار اپنایا جاتا۔کسی قیادت کی عدم موجودگی میں بھی کئی ایسے مواقع اور رستے موجود تھے جن کی مدد سے فرقہ پرستانہ منافرت کو پچھاڑا جا سکتا تھا۔اگست 1969ء میں ہارلینڈ اور ولف شپ یارڈ پر ہونے والی 9000 مزدوروں کی میٹنگ میں کیتھولکوں کی جانب سے فرقہ پرستانہ دہشت گردی کو رد کیا گیا۔ایرڈوئن سمیت کئی علاقوں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مزدوروں کا مشترکہ مارچ اور محاصرہ شروع کر دیا گیا''۔

''1969ء کے سرما تک بالی مرفی، سپرنگ ہل، ٹرف لاج، نیو بارنسلے، سپرنگ مارٹن، ہائی فیلڈ اور کلونارڈ کے علاقوں میں ''غیر فرقہ پرستانہ'' مقامی دفاعی گروپ قائم کر دیئے گئے۔اگر اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور اس پٹرولنگ کو مسلح کیا جاتا تو پھر تناظر ہی کچھ اور ہوتا، مناظر ہی مختلف ہوتے۔اس کی بجائے دونوں فرقوں کی انتہا پسند تنظیموں نے ایک دوسرے کے خلاف وحشیانہ اقدامات شروع کر دیے۔ مخالف فرقے والوں کو ان کے گھروں سے نکال نکال کر مارا اور جلایا جانے لگا اور پھر چل سو چل۔یہ مجرمانہ وحشیانہ بربریت محض اس لئے کی گئی تا کہ فرقہ واریت کو طبقاتی وحدت کے خلاف مسلط کر دیا جائے۔ سرمایہ داروں کی یہ حکمت عملی کارگر بھی رہی اور کامیاب بھی''۔(11)

جیسا کہ ہم ایلن وڈز کے تجزیے میں بھی دیکھتے ہیں، 1968ء میں آئرلینڈ میں چلنے والی سول رائٹس موومنٹ میں یہ امکانات موجود تھے کہ یہ آئرش پرولتاریہ کی انقلابی تحریک بن جائے۔جو کمی موجود تھی وہ ایک عوامی انقلابی پارٹی کی کمی تھی جو اس کیفیت میں ایک واضح رستہ دکھا سکتی۔اس کمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکمران طبقے نے کیتھولک کو پروٹسٹنٹ سے لڑا دیا اور یوں انقلابی جوش وجذبے کو فرقہ پرستانہ بربریت ومنافرت میں بدل کے رکھ دیا گیا۔

میکسیکو

1968/69ء کے انقلابی طوفان نے لاطینی امریکہ کا رخ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ یہ وہ خطہ تھا جو پانچ سو سال تک یورپ کی نوآبادی چلا آ رہا تھا اور جہاں اس تسلط کے خلاف بڑی عوامی تحریکیں چلتی چلی آ رہی تھیں۔ سامراجی حکمرانی کے تحت بیسویں صدی میں ہونے والی معاشی وسماجی طرز سے پیدا ہونے والی مشترکہ مگر ناہموار ترقی نے تضادات کو اور بھی گہرا اور شدید کر دیا تھا۔ وسطی اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک کو اس دوران بدترین وحشیانہ وسفاک آمریتوں کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ جن کے تسلط کا بڑا مقصد وہاں ابھرنے والی تحریکوں کا قلع قمع کرنا تھا جو سامراجی لوٹ مار، سرمایہ دارانہ استحصال اور آمریتوں کے خلاف سامنے آتی رہتی تھیں۔ یہ لکھنے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب وحشی آمریتیں مسلط کرنے کے پیچھے امریکہ تھا۔ دنیا کے اس خطے میں جنم لینے والی ایک کہاوت انتہائی مشہور ہے بلکہ عالمگیر شہرت اختیار کر چکی ہے جس میں سوال کیا جاتا ہے کہ ''تمہیں پتہ ہے کہ امریکہ میں فوجی بغاوتیں کیوں نہیں ہوتیں؟ جواب یہ ہے کہ اس لئے کہ امریکہ میں کوئی امریکی سفارت خانہ نہیں ہے''۔

تاریخی حوالے سے سب سے بڑی انقلابی تحریک اور سب سے بڑی وحشیانہ آمریت بھی میکسیکو میں 1968ء میں سامنے آئی۔ امریکہ کے پہلو میں واقع یہ ملک جس کی 5000 کلومیٹر سرحد امریکہ کے ساتھ ملی ہوئی ہے، چنانچہ اس کی افرادی قوت سمیت اس کے وسائل کی لوٹ مار امریکی سامراج کیلئے اہم بھی تھی اور آسان بھی۔ میکسیکو سے امریکہ کے کئی دفاعی تحفظات بھی وابستہ تھے۔ یہ تاریخی واقعات 1968ء کے اولمپکس سے کچھ پہلے ہوئے۔ ڈرامائی طور پر میکسیکو اس عرصے کی انقلابی لہر سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ دنیا بھر میں ہونے والی ترقی کی وجہ سے اس کی معیشت بھی تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ مگر پھر یہ ترقی ناہمواری میں بھی شدت سے اضافہ کرتی چلی جا رہی تھی اور امارت وغربت میں فاصلے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ میکسیکو کا صدر دنیا کو دکھاتا پھر رہا تھا کہ دیکھو ہم نے میکسیکو کو ایک جدید ملک بنا دیا ہے۔ اس ترقی کے اعزاز میں وہاں اولمپکس ہو رہے تھے۔ مگر صدر کی سوچ کے برعکس میکسیکو کے نوجوان اور مزدور کچھ اور ہی سوچ رہے تھے اور یوں دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح میکسیکو بھی اسی تاریخی انقلابی دھارے کا حصہ بن گیا۔ 27 اگست کو میکسیکو سٹی میں چار لاکھ لوگ جمع ہوئے جو صدر کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے۔

یہاں بھی تحریک نوجوانوں کی طرف سے سامنے آئی مگر جب اسے بدترین تشدد سے کچلنے کی کوشش کی گئی تو مزدور اس میں شریک ہو گئے۔ ابتدا میں دو مظاہروں سے یہ تحریک شروع ہوئی ان میں سے ایک کیوبا انقلاب کے ساتھ یکجہتی کیلئے کیا گیا تھا دوسرا پولی ٹیکنیک طلبہ کی طرف سے تھا جس میں انہوں نے اپنے اداروں میں پولیس مداخلت کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ دونوں مظاہروں کو پولیس کی طرف سے کچل دیا گیا۔ مگر اس جبر نے طالبعلموں کو گائے بنانے کی بجائے شیر بنا دیا۔ انہوں نے ملک بھر کے طلبہ کو عام ہڑتال کرنے کی کال دے دی۔ مظاہروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ابتدا میں یہ تیس ہزار پر مشتمل ہوتے تھے مگر اگلے ہی مہینے یہ پانچ لاکھ تک پہنچ گئے۔ طالبعلموں نے شعوری طور پر عام لوگوں سے ملنا شروع کر دیا، اپنے گلی محلوں، بس سٹیشنوں، مارکیٹوں میں لیفلیٹ کے ذریعے رابطے کیے گئے۔ مزدوروں نے اس کا انتہائی گرمجوشی کے ساتھ جواب دیا۔ میکسیکو سٹی میں طلبہ کے ایک ایسے ہی مظاہرے کو کچلنے کیلئے ٹینک بلا لیے گئے۔ حکومت کی ہر دلعزیزی ظاہر کرنے کیلئے صدر ڈیاز اور ڈاز نے ہزاروں سرکاری ملازمین کو جمع کر کے مظاہرے کا اہتمام کیا۔ مگر اسی مظاہرے کی ابتدا میں ہی یہ ملازمین پھٹ پڑے ''ہمیں یہاں لایا گیا ہے، ہمیں ڈیاز کی بھیڑیں بنا کر لایا گیا ہے''۔

پھر اولمپکس کی ابتدا سے محض دس دن پہلے 2 اکتوبر کو ایک نئی ریلی نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ جبکہ حکومت نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ کسی قسم کے مظاہروں کو نہیں ہونے دینا اور ان دنوں تو ملک کو ہر حالت میں پرسکون ہونا اور معاملات قابو میں ہونا ضروری تھے۔ کلچرل پلازہ میں پانچ ہزار طلبہ اور مزدور جمع ہوئے جس میں انہوں نے یونیورسٹیوں کی خودمختاری، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور سماجی انصاف جیسے جمہوری مطالبات پیش کیے۔ مگر سکیورٹی ادارے جیسے ان کے انتظار میں تھے۔ اچانک ہی مجمع میں موجود سکیورٹی کے آدمیوں نے فائرنگ شروع کر کے بھگدڑ مچا دی۔ اسے جواز بناتے ہوئے فوج نے اپنی مشین گنیں مجمع پر کھول دیں۔ ہمیشہ کی طرح سے اس ہلاکت خیزی کی درست خبر تا حال نامعلوم ہے، اس دن 150 سے لے کر 500 افراد کے مار دیے جانے کا بتایا جاتا ہے۔ سینکڑوں گرفتار اور ان گنت گم کر دیے گئے جن کا آج دن تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ اس قتل عام کا پیغام واضح تھا کہ طلبہ قیادت کو ختم کر دیا جائے جن کی وجہ سے تحریک دن بدن پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی اور اس میں سماج کی دوسری پرتیں بھی شریک ہو رہی تھیں۔

اس سال کے شروع میں ہی ہم نے عوامی جمہوریہ چین میں بھی بیجنگ اولمپکس کے انعقاد کا بڑا شور اور غلغلہ سنا جو تبت میں تحریک کو کچلنے کے پس منظر میں ہوئے۔ لیکن 1968ء میں میکسیکو سٹی میں جو حشر بپا

کیا گیا اس پر امریکہ کی طرف سے نہ تو کوئی تشویش کا اظہار کیا گیا نہ کوئی مذمت کا ایک لفظ کہا گیا۔ ظلم تو یہ ہے کہ اگلے تین سالوں تک یہ پتہ ہی نہیں چلنے دیا گیا کہ یہ واقع ہو چکا ہے۔

یہ سانحہ وقتی طور پر تحریک کو پیچھے دھکیل گیا۔ یہ وقت کی کسی تہہ میں بارود بن کر چھپ گیا۔ تاہم یہ واضح ہو گیا کہ مدتوں سے چلے آرہے ایک جماعتی راج (یعنی انسٹیٹیوشنل ریولیوشنری پارٹی PRI کے اقتدار) کے خاتمے کی ابتدا ہو گئی۔ 1968ء کی یہ تحریک ایک دراڑ ڈال گئی جس نے حکومت کا تو تختہ گول کیا ہی مگر اس کے ساتھ ہی یہ تحریک کو بھی لمبا وقفہ دے گئی، کسی ایک اور نئے عہد تک کیلئے، وہ عہد جس میں اب ہم پہنچ چکے ہیں۔ اس عہد ساز تجربے کے اسباق نئی نسلوں تک منتقل ہو چکے ہیں اور یہ اسباق 2006ء کے پچھلے الیکشن کے تجربے اور سبق کے ساتھ مل کر مزید پختہ ہو چکے ہیں، جس میں امریکی ساز باز اور معاونت کے ساتھ واضح دھاندلی کی گئی۔ میکسیکو میں عالمی مارکسی رجحان کے ساتھ وابستہ EI Militante نام کی تنظیم میکسیکو کے انقلابی لیفٹ میں موثر و معتبر قوت کے طور پر ابھر رہی ہے۔ ریاستی جبر اس پر پہلے سے ہی بڑھ چکا ہے۔ آنے والے سالوں میں یہ رجحان ایک انقلابی پروگرام اور ایک عالمی مارکسی حکمت عملی کے ساتھ لاطینی امریکہ میں سوشلسٹ انقلاب کیلئے امید کی پہلی کرن ثابت ہو سکتا ہے وہ بھی دنیا اور تاریخ کی سب سے بڑی سامراجی قوت امریکہ کے عین پہلو میں۔

چیکوسلواکیہ

دوسری عالمی جنگ کے بعد سامراجی طاقتوں نے سٹالنسٹ روس کے ساتھ معاہدے کیے جن کے بعد یورپ کو اپنی اپنی مرضی کے حلقہ اثر میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس بٹوارے کے تحت روس کو مشرقی یورپ کے زیادہ تر حصے سے نواز دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس بات کا اعتراف کر لیا گیا تھا کہ روس اب دنیا کی بڑی طاقت بن چکا ہے جس نے اب دنیا کے اس حصے پر عسکری حکمرانی کرنا تھی۔ اس معاہدے سے مشرق کا تو جو بنا سو بنا مگر مغربی یورپ میں بعد میں ہونے والے انقلابات کو قربان ضرور کر دیا گیا۔ یونان، اٹلی اور فرانس کی دلیرانہ تحریکیں شکست سے دوچار ہوئیں۔ مشرقی یورپ کے اندر بھی تحریکوں کو پسپائی ہوئی کیونکہ وہاں بھی سٹالن نے روس کی طرح کا افسر شاہانہ سوشلسٹ طرز حکمرانی مسلط کر دیا تھا۔ برطانیہ کے چالباز وزیر اعظم چرچل نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ سٹالن کے ساتھ معاہدہ پوٹس ڈیم میں ہونے والی سربراہی کانفرنس میں اکتوبر 1944ء میں طے پایا ''وہ لمحہ بزنس کا معاملہ طے کرنے کا تھا چنانچہ میں

نے کہا' آیئے اب بلقان کے بارے میں بھی کچھ آپس میں سمجھوتہ کرلیں، تمہاری فوجیں رومانیہ اور بلغاریہ میں موجود ہیں ہمارے بھی وہاں مفادات ہیں، منصوبے ہیں اور کارندے موجود ہیں، ہمیں چھوٹے طریقوں سے معاملات طے کرنے سے گریز کرنا چاہیے، جہاں تک روس اور برطانیہ کا تعلق ہے کیا خیال ہے کہ اگر 90% رومانیہ تمہارے پاس رہے، ایسے ہی یونان کا 90% ہمارے پاس رہ جائے! جبکہ یوگوسلاویہ کو 50-50 کرلیا جائے! اس دوران جب ان باتوں کا ترجمہ کیا جارہا تھا میں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا۔ 90% رومانیہ' روس، بقایا 10% باقیوں کا۔ 90% یونان' برطانیہ (امریکہ سے معاہدے کے مطابق) باقی 10% روس کا۔ یوگوسلاویہ اور ہنگری 50-50، 75% بلغاریہ' روس جبکہ باقی دوسروں کیلئے۔ میں نے وہ کاغذ سٹالن کی طرف کھسکا دیا جو اس دوران ترجمہ سن چکا تھا۔ ایک وقفہ سا آیا پھر اس نے اپنی نیلی پنسل سے کاغذ پر بڑا سا ٹک کا نشان لگایا اور اسے واپس ہماری طرف کھسکا دیا۔ اس میں بس اتنی ہی دیر لگی جتنی کسی کے بیٹھنے میں لگتی ہے۔ نشان لگا کاغذ میز کے درمیان میں رکھا تھا۔ میں نے کہا کہ کتنا عجیب وغریب اور بیہودہ لگتا ہے کہ جس طریقے سے ہم نے معاملات کو سمیٹا ہے' کتنی آسانی کے ساتھ ہم نے کروڑوں انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کاغذ کو بہتر ہے جلا دیا جائے۔ اس پر سٹالن نے کہا نہیں اسے محفوظ رکھنا چاہیے''۔ (12) چرچل مزید کہتا ہے ''سٹالن وعدے پر قائم رہا اور اکتوبر معاہدے پر کاربند رہا اور اس دوران جو کچھ بھی ایتھنز (یونان) میں کمیونسٹوں کے ساتھ ہوتا رہا اس کے بارے پراودا یا ازویسشیا میں مذمت کا ایک بیان تک بھی شائع نہیں ہوا''۔ (13)

جیسا کہ ٹیڈ گرانٹ نے 1951ء میں ''سٹالنزم؛ بعد از عالمی جنگ'' کے عنوان سے لکھا تھا ''یورپ میں روس کی عالمی جنگ میں کامیابی اور جرمنی واٹلی کے فاشزم کی ناکامی نے بڑی عوامی تحریکوں کو جنم دیا جن کی وجہ سے سارے براعظم میں ہی سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کے امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ تاہم روس کی کامیابی کے اثرات ونتائج متضاد اور پیچیدہ شکلوں میں سامنے آئے، عارضی طور پر ہی سہی مگر اس کامیابی نے سٹالنزم کو کچھ وقت کیلئے مضبوط ضرور کردیا''۔ (14)

سامراجی طاقتیں روس کی مشرقی یورپ اور ایشیا میں بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں، ایسا وہ کبھی بھی نہ کرتے یہاں تک کہ رجعتی زار روس ہوتا تو اس کو بھی یہ وقعت کبھی نہ دیتے۔ روس کی سٹالنسٹ افسر شاہی زار روس کے وحشیانہ ارادوں سے بھی کہیں زیادہ علاقے میں اپنا تسلط قائم کرچکی تھی۔ کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے اپنی شاندار کتاب ''روس انقلاب سے ردانقلاب تک'' میں اس حوالے سے تفصیل بیان

کرتے ہوئے لکھا ہے ''وہ دور جس کے دوران مشرقی یورپ میں سرمایہ داری ختم اور اس کی جگہ سٹالنزم کا رائج ہونا ایک مخصوص عمل کا شاخسانہ تھا جس کی تفصیل میں نے اس دور میں لکھی گئی دستاویزات میں اپنی تحریروں میں بیان کی تھی۔ مشرقی یورپ کے اندر نازیوں اور ان کے ساتھیوں کی شکست کے نتیجے میں ریاستی طاقت میں پیدا ہو جانے والے خلا کو فاتح سرخ فوج کی قوتوں نے آ کے پر کیا۔ ان علاقوں کی نحیف ونزار بورژوازی تھک ہار کے ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اسے ایک تو جرمن بورژوازی نے چوس لیا تھا یا پھر وہ جنگ کے دوران میں ہی نازیوں کی معمولی پارٹنر بن چکی تھی۔ مشرقی یورپ کی سرمایہ داری تو جنگ سے پہلے ہی کمزور حالت میں تھی۔ جنوبی امریکی ریاستوں کی مانند ان کی حالت بھی بڑی طاقتوں کی نیم نوآبادیات کی سی تھی۔ وہاں جنگ سے پہلے کی حکومتیں علاقے کی بالکنائزیشن کی وجہ سے جان لیوا بحران کی زد میں آ چکی تھیں اور حکمران طبقات کی نااہلی سے قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے بھی پورے نہیں ہو سکے تھے۔ یہ سب حکمران فوج اور پولیس کی ملی جلی آمریتوں کی شکل میں ہی تھے جن کی عوام کے اندر کسی قسم کی کوئی بنیادیں نہیں تھیں''۔(15)

اس سب کے باوجود مشرقی یورپ کئی بار عوامی تحریکوں کی زد میں رہا جنہوں نے افسر شاہانہ اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کی کوششیں کی تھیں۔ ان میں سب سے مشہور 1956ء میں ہنگری کی تحریک ہے جہاں ہم ایک سیاسی انقلاب ہوتا دیکھتے ہیں۔ یہ بغاوت اس وقت خون میں ڈبو دی گئی جب روسی ٹینک اس پر چڑھا دیے گئے۔ تاہم بعد ازاں 1968ء میں پھیلنے والی انقلابی کیفیت کو نام نہاد ''آہنی پردے'' بھی نہیں روک سکے تھے۔ فرانس اور دیگر ملکوں کے جوش وجذبے نے مشرقی یورپ میں افسر شاہانہ جبر وتسلط کے خلاف دبی ہوئی بے چینی کو پھٹنے کی طاقت فراہم کر دی تھی۔ مشرقی یورپ کے ان ملکوں میں چیکوسلواکیہ سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہ تحریک ''پراگ سپرنگ'' یا پراگ کی بہار کے نام سے مشہور ہوئی۔ (پراگ چیکوسلواکیہ کا دارالحکومت تھا) ایک بار پھر یہ طالب علم تھے جنہوں نے چنگاری کو آگ بنانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ ابتدا تب ہوئی جب 1967/68ء میں بجلی کی فراہمی بند ہو جانے سے ہوسٹلوں کے اندر بجلی ناپید ہو چکی تھی۔ طلبہ مارچ کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے اور ان کے ہاتھ میں ایک ہی بینر ہوتا تھا جس پر صرف اتنا لکھا ہوتا تھا کہ ''ہمیں بجلی دو''۔ ایلن وڈز نے 1968ء کے اپنے مضمون ''چیکوسلواکیہ؛ بحران سے پریشان سٹالنزم'' میں لکھا ''خفیہ پولیس نے طلبہ پر بے رحمانہ تشدد کیا جس کی وجہ سے کئی طلبہ زخمی ہو گئے۔ مگر پھر افسر شاہی اپنے ہی جبر سے خوفزدہ ہو گئی اور زخمی ہو جانے والے طلبہ کا

سرکاری خرچ پر علاج کرانے کی پیشکش کردی، اس پیشکش کا جراتمندی سے جواب دیا گیا کہ تشدد کرنے والوں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے اور ذرائع ابلاغ میں اس واقعے کی تفصیلات سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔ طلبہ نے خبردار کیا کہ اگر عوام کو حقائق سے باخبر نہ کیا گیا تو وہ خود فیکٹریوں میں جا کر مزدوروں کو حقائق سے آگاہ کردیں گے''۔

''حادثاتی طور پر تحریک کا قائد بن جانے والے ڈوبسک نے شروع میں دانشوروں اور طلبہ کی حمایت حاصل کرنے کو ترجیح دی جنہوں نے کھل کر اس کا ساتھ دیا۔ چیک افسر شاہی سہمی ہوئی تھی کہ کہیں مزدور طبقہ ان دانشوروں کی باتوں سے متاثر نہ ہوجائے۔ 1956ء میں ہنگری کے ''پیٹوفائی'' اور پولینڈ کے ''کروکڈ سرکل'' جیسے سرپھرے احتجاج نہ صرف افسر شاہی بلکہ ڈوبسک کو بھی نہیں بھولے ہوئے تھے۔ چنانچہ افسر شاہی جلد ہی دانشوروں کو مراعات دینے پر تیار ہوگئی تاکہ وہ اپنی سہولتوں سے مستفید ہونے میں مگن ہوجائیں۔ مگر یہ مراعات 1956ء میں گوملکا حکومت کی طرف سے دی گئی مراعات سے انتہائی کم تھیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں روسی افسر شاہی نے مداخلت کی کوشش کی؟''

روس میں برزنیف اور افسر شاہی کے دوسرے لیڈروں کو اس بات کا خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ چیکو سلواکیہ میں عوامی غیض وغضب کہیں پھیل نہ جائے۔ ڈوبسک کی طرف سے جلد بازی میں کی جانے والی اصلاحات سے ایک بات ثابت ہوگئی کہ وہ مرکزی کمیٹی کی رکنیت کیلئے ایک سمجھوتے کے تحت امیدوار بنا تھا اور وہ کمیٹی کے انتہائی ریڈیکل ارکان جیسا نہیں تھا۔ ان اصلاحات نے اس بے چینی کو جو مزدوروں کے اندر پنپ رہی تھی مزید مشتعل کردیا''۔

''افسر شاہی میں پھوٹ نے تلخ بحثوں، مشتعل میٹنگوں اور مظاہروں کو جنم دے دیا، تلخ بحث کا یہ سلسلہ ہر فیکٹری ہر کالج، ہر دیہات میں شروع ہوگیا۔ ہر طرف سے قراردادیں آنی شروع ہوگئیں کہ نووٹنی کو برخاست کردیا جائے اور مراعات کو یقینی بنایا جائے۔ پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ خود کمیونسٹ پارٹی کے اندر اس قسم کی تلخ بحثیں شروع ہوگئی تھیں اور سرکاری فہرست میں شامل کئی امیدواروں کو برخاست کرنے کے مطالبات آنے لگے۔ نووٹنی کے پیروکاروں نے معاملات کو اپنے اشتعال سے اور بھی ابتر کردیا۔ تحریک زور پکڑتی جارہی تھی۔ افسر شاہی اس سے گھبرا چکی تھی اور وہ اصلاحات پر اصلاحات کیے جارہی تھی''۔

چیکوسلواکیہ کی یہ تحریک پولینڈ اور ہنگری میں 1956ء میں چلنی والی تحریکوں کے مقابلے میں کسی

طور نہ منظم تھی نہ بڑی۔ ہنگری کی طرح، جہاں روس کو مداخلت کرنی پڑ گئی تھی، نہ تو یہاں ورکرز کونسلیں تھیں نہ ہی مزدور مسلح ہوئے تھے۔ چیکوسلواکیہ کا المیہ یہ تھا کہ وہاں کے عوام قیادت سے محروم، غیر مسلح اور اچانک ایک تحریک کیلئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ ڈوبسک اور اس کے ساتھی حکمرانوں نے مزدوروں کو متحد و منظم کرنے کی بجائے ملک کو کسی اور کے قبضے میں جانے دینے کو ترجیح دی۔ ڈوبسک شکست ماننے کو تیار تھا مگر تحریک کو آگے لے جانے کے حق میں نہیں تھا تاہم اپنی کم شدت کے باوجود چیکوسلواکیہ میں ہونے والے واقعات نے روس اور مشرقی یورپ کی افسر شاہی کو دہلا دیا تھا''۔

''اس کی دیکھا دیکھی مارچ میں پولینڈ میں بھی فسادات بھڑک اٹھے۔ ایک واقعے میں دس ہزار سے زائد افراد نے وزارت ثقافت کا گھیراؤ کر کے اسے تہہ و بالا کر دیا۔ مظاہرین چیکوسلواکیہ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے پولیس کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ 1956ء کی تحریک کے دوران پولینڈ کے مظاہرین قومی ترانہ گا رہے تھے مگر اس بار وہ قومی نہیں بلکہ مزدوروں کا عالمی گیت انٹرنیشنل گا رہے تھے''۔

''ان سب سے بھی دلچسپ اور شاندار سلسلہ یوگوسلاویہ میں شروع ہو گیا جہاں فرانس کے ابھار اور یوگوسلاویہ کے معاشی بحران سے متاثر ہونے والے طلبہ نے بلغراد میں افسر شاہی کی دولت اور مراعات یافتگی کے خلاف مظاہرے کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے اجرتوں کی برابری، ''سرخ بورژوازی'' کی طاقت کے خاتمے''، منصوبہ بند معیشت کو نقصان پہنچانے والی پالیسیوں کے خاتمے اور ریاستی ملکیت کو نجی ملکیت میں دینے کو واپس کرنے کے مطالبات پیش کیے۔ طلبہ نے کچھ مضافاتی علاقوں کو اپنے کنٹرول میں لے کر کچھ عرصہ ان کو چلایا بھی۔ ان کی طرف سے نکالے گئے لیفلیٹس کو مزدوروں میں بہت پذیرائی ملنے لگی۔ یہ خبریں شائع ہوئیں کہ لوگ مجمع بنا کر ان کو دلچسپی سے پڑھنے اور سننے لگے۔ لوگوں کی طلبہ کے ساتھ ہمدردیاں اتنی زیادہ ہو گئیں کہ ان پر کسی قسم کا ریاستی ردعمل ہی ناممکن ہو گیا۔ مطلق العنان مارشل ٹیٹو کو عاجزی اختیار کرتے ہوئے طلبہ مطالبات پر ہمدردانہ غور کرنے کا اعلان کرنا پڑا''۔

''ایک طرف عمومی بے چینی میں اضافے اور دوسری طرف افسر شاہی کی بڑھتی ہوئی حواس باختگی کا اظہار صوفیہ میں ہونے والے ورلڈ یوتھ فیسٹیول میں دیکھنے کو ملا جہاں سٹالنسٹ حکومت کا روایتی ڈھکوسلا پروگرام ''امن اور دوستی'' پیش کیے جانے پر تلخ بحث شروع ہو گئی جو بحث سے بڑھ کر ہنگامے میں تبدیل ہو گئی۔ بلغارین پولیس کو شرکا اور کیمرہ مینوں پر لاٹھی چارج کرنا پڑ گیا''۔

''چیکوسلواکیہ پر جارحیت کے ایک ہی ہفتے کے بعد مشرقی جرمنی سمیت مشرقی یورپ کے بیشتر

ملکوں میں سفاک سٹالنسٹ حکمرانی کے خلاف اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے''۔

وارسا پیکٹ کی حمایت میں البرخت کی جانب سے مزدوروں کو تائیدی دستخط کیلئے دی جانے والی پٹیشن کو صریحاً انکار کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ سینکڑوں افراد نے چیک سفارتخانے اور چیک نمائندوں کی دوسری جگہوں کا گھیراؤ کر لیا اور چیک حکومت کے خلاف نعرے بازی کی۔ اس کے باوجود کہ یہ جگہیں پولیس کے حفاظتی حصار میں تھیں۔ آئزن ہوٹنستادت شہر میں چار ہزار سے زائد ورکروں نے چیکوسلواکیہ پر روسی تسلط کے خلاف مظاہرہ کیا۔ البرخت پریس کی تمام تر چست چالاکیوں، مغربی نشریات کو جام کرنے اور چیکوسلواکیہ میں جرمن زبان میں شائع ہونے والے سبھی جریدوں پر پابندی کے باوجود سچائی کو مشرقی جرمنی کے مزدوروں تک پہنچنے سے نہیں روکا جا سکا''۔

''خود روس کے اندر قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت کی حیران کن ترقی کے باوجود پیداوار کے ضیاع کی شرح 30 سے 50 فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ اس راہ پر چلتے ہوئے اس سے زیادہ ترقی ممکن ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ منصوبہ بند معیشت کی اپنی ضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ طفیلی پرتوں کے کردار کو ختم کیا جائے اور لوگوں کی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے پیداوار کی جمہوری منصوبہ بندی متعارف کرائی جائے۔ ایسا ایک منصوبہ صرف اسی صورت قابل عمل اور کامیاب ہو سکتا تھا جب روس اور مشرقی یورپ کی ایک سوشلسٹ فیڈریشن قائم کر دی جاتی۔ قدیم فرسودہ سرمایہ دارانہ قومی تقسیم نے مشرقی یورپ کی پیداواری قوتوں کو جام کر دیا۔ یہ ایک تباہ کن کیفیت تھی کہ ایک سوشلسٹ ملک رومانیہ کا ایک اور سوشلسٹ ملک روس کے ساتھ کچھ علاقوں پر جھگڑا شروع ہو گیا تھا''۔

''سب سے مجرمانہ اور گھناؤنا خود روس اور چین کے مابین سرحدی تنازعہ تھا جو انیسویں صدی میں زار روس اور چین کے ایک بادشاہ کی جانب سے مصنوعی سرحدیں قائم کرنے پر جاری و ساری رہا''۔

''یہ فرسودہ و بیہودہ قدیم سرحدی تنازعات ہرگز مشرقی یورپ کے مزدوروں کی ''قوم پرستی'' کا نتیجہ نہیں تھے۔ ان سے تو اس بارے میں کبھی پوچھنے کا تکلف بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ صاف اور سادہ طور پر افسر شاہی کی حرص اور خود غرضی کا ہی نتیجہ تھے جو کہ اپنے علاقے کا ایک انچ بھی قربان کرنے کو تیار نہ تھے کہ کہیں ان کی مراعات، طاقت اور آمدنی میں دوسرے علاقے کی افسر شاہی حصے دار نہ بن جائے''۔

''1953ء سے 1956ء کے دوران سرمایہ دار اخبارات و جرائد روزانہ اپنے صفحات سیاہ کرتے رہے کہ روس کا چیکوسلواکیہ پر قبضہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کمیونزم سوائے بربریت کے کچھ بھی نہیں

ہے اور یہ بھی کہ سوشلزم اور جمہوریت کبھی بھی ایک ساتھ اکٹھے نہیں ہو سکتے''۔

'' 'مغربی جمہوریت' کے نمائندوں کے اس منافقانہ واویلے کو امریکی صدر کے مگرمچھ کے آنسو اور بھی گرمی فراہم کر رہے تھے جس نے ویتنام کے خلاف سامراجی آشیر باد سے ایک وحشیانہ جنگ مسلط کی ہوئی تھی۔ جب ان جیسے لوگوں کے منہ سے 'آزادی' اور 'جمہوریت' جیسے الفاظ ادا ہوتے ہیں تو ان کے منہ سے تعفن کی بدبو بھی ساتھ نکلنا شروع ہو جاتی ہے''۔

''مگر اب جس طریقے سے دنیا کے ہر خطے میں انقلابی تحریک پھر سے ابھرتی محسوس ہو رہی ہے اس کی نظیر شاید انسانی تاریخ میں ملنا محال ہے، ویتنام، چیکوسلواکیہ اور فرانس میں جو واقعات ہو رہے ہیں ان سے طاقتوں کے مابین توازن میں حیران کن تبدیلی واضح نظر آ رہی ہے''۔(16)

سرمایہ دارانہ نظام مغرب میں مردود ہوتا چلا جا رہا تھا، پہلے جس طرح اس نے تیزی کے ساتھ عالمی سماج کو ترقی سے روشناس کرایا تھا اب اس کی گنگا الٹی بہنا شروع ہو گئی تھی۔ اور فرانس میں ہونے والے عظیم الشان واقعات اس کا عملی ثبوت تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مشرقی یورپ میں بھی سٹالنزم کو بحرانوں نے گھیر لیا تھا جن سے نہ صرف طفیلی سٹالنسٹ افسر شاہی بلکہ مغرب کے سرمایہ دار بھی پریشان ہو چلے تھے۔ چیکوسلواکیہ کے واقعات اس بات کا واضح اشارہ دے رہے تھے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہ علامات تھیں اس زوال کی جو بعد ازاں 1989ء میں مشرقی یورپ کی حکومتوں کو پیش آیا۔ بدقسمتی سے ایک بروقت قابل اعتماد متبادل مزدور قیادت کی عدم موجودگی سے سٹالنزم کے بعد سرمایہ داری نے وہاں اپنے پنجے گاڑ دیے جس کی وجہ سے سامراج کو سانس لینے کی مہلت میسر آ گئی۔

سامراج نے روس اور مشرقی یورپ میں سٹالنزم کے زوال اور وہاں سرمایہ داری کی بحالی کو سرمائے کے بے رحمانہ استبداد کیلئے استعمال کر کے نسل انسانی کی اکثریت کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیا۔ غربت، محرومی اور ذلتوں کی ایسی نظیر بھی ملنی مشکل ہے۔ ان کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایسی نفرت و حقارت پروان چڑھ چکی ہے جو آنے والے عرصے میں بڑے پیمانے پر اپنا اظہار کر کے رہے گی۔ ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے اس وحشی نظام کو اکھاڑ پھینک کر ہی نسل انسانی اپنی بقا کا حقیقی رستہ اختیار کرے گی۔

امریکہ، ویتنام جنگ اور ریڈیکلائزیشن

1968ء کی تحریک کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ یہ خود سامراج کے اپنے بڑے مرکز امریکہ میں بھی پہنچ گئی۔ یہاں یہ سول رائٹس موومنٹ، اینٹی وار موومنٹ اور طلبہ بغاوت کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے انقلابی موڈ کی شکل میں سامنے آئی۔ اس جوش و جذبے میں اتنی طاقت تھی کہ 'جنگجو صدر لائنڈن بی جانسن' کو اپنی فوج واپس بلانی پڑ گئی۔ 31 مارچ کو صدر پر دباؤ کی یہ حالت تھی کہ اسے اعلان کرنا پڑ گیا کہ وہ اپنی دوسری بار الیکشن کمپین سے دستبردار ہو رہا ہے اور ویتنام کی آزادی کیلئے لڑنے والوں کے ساتھ بات چیت کیلئے بھی تیار ہے۔ اس اعلان کے سنتے ہی سارے امریکہ کے تعلیمی اداروں کے طلبہ خوشی سے نعرے لگاتے باہر نکل آئے۔

جیسا کہ ایلن وڈز اپنی کتاب ''مارکسزم اور امریکہ'' میں لکھتا ہے ویتنام میں جاری جنگ نے امریکہ میں صورتحال کو مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا اور یہ سب کسی سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر ہوا۔ امریکہ کو جیسے ایک حادثے نے نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس کا آغاز ایک خفیہ آپریشن سے ہوا جس میں افسروں اور مشیروں کی ایک فوج ظفر موج کو روانہ کیا گیا تا کہ وہ اپنی مرضی کی ایک بدعنوان حکومت قائم کرنے کی کوشش کر سکیں جو اپنے ہی عوام کے خلاف سرگرم ہو۔ یہ امریکی سامراج کا پرانا شیوہ چلا آ رہا ہے۔ نوڈین ڈیم کی حکومت جنوبی ویتنام میں بدترین جبر و تشدد کی ذمہ دار تھی اور ایک احساس جرم کا شکار تھی۔ اس کے خلاف احتجاج کے طور پر بدھ بھکشوؤں نے خود کو زندہ جلا دیا تھا۔ بالآخر ڈیم کو خود اس کے اپنے جرنیلوں نے گولی سے اڑا دیا''۔

''تین ہفتوں بعد امریکی صدر جان ایف کینیڈی کو بھی ہلاک کر دیا گیا، جس کی جگہ اس کا نائب صدر جانسن صدر بن گیا۔ جس نے آتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ کسی طور بھی ویتنام کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ ہمیں یہ جنگ جیتنی ہے، یہ اس کا واضح نقطہء نظر تھا۔ مگر اپنی بے پناہ طاقت، دولت اور عسکری تمکنت کے باوجود امریکہ ویتنام کی جنگ جیت نہیں سکا۔ اس کے برعکس یہ پہلی جنگ تھی جس میں امریکہ کو شکست ہوئی تھی جبکہ کوریا جنگ برابر رہی تھی۔ ویتنام کے گھنے جنگلوں میں امریکیوں کو ننگے پاؤں والوں نے مات دے دی تھی''۔

ہمیشہ کی طرح سے، ویتنام میں بھی مداخلت کیلئے امریکیوں کو کسی واقعے کی ضرورت تھی جسے جواز بنا

کر حملہ کیا جا سکے۔ بحیرہ ٹونکن کا واقعہ بھی اسی طے شدہ حکمت کا ہی شاخسانہ تھا، کہا جاتا ہے کہ بحیرے میں موجود ایک امریکی بحری بیڑے میڈوکس پر شمالی ویتنام کی طرف سے نیوی کے کسی جہاز سے فائر کیے گئے۔ کئی سالوں تک یہ یقین کیا جاتا رہا کہ کمیونسٹ جارحیت نے امریکی بحریہ کو اپنی کاروائیوں کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ یہ سراسر غلط الزام تھا۔ یہاں تک کہ خود اس وقت کے میڈوکس کے کپتان نے یہ تسلیم کیا کہ اس نے یا اس کے عملے کے کسی فرد نے شمالی ویتنام سے جہاز پر کوئی حملہ ہوتے نہیں دیکھا۔ کسی نے بھی اس طرف سے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔ ہنوئی سے ملنے والے ثبوتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شمالی ویتنام سے امریکی جہازوں پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا تھا جو اس وقت ویتنام کی حدود میں موجود تھے۔ اس کے باوجود بھی کوشش کی گئی کہ امریکی عوام کو ایک غیر ملکی جنگ کی تائید و حمایت کیلئے تیار کیا جائے اور یہ کوئی آخری بار نہیں ہو رہا تھا''۔

''اگلے روز ہی صدر جانسن نے شمالی ویتنام کے نیول مراکز اور ایک آئل ڈپو پر بمباری کا حکم جاری کر دیا۔ یہ ایک انتہائی وحشیانہ بمباری تھی جس نے ان گنت شہریوں کو ہلاک کرنے کے ساتھ ساتھ ویتنام کی صنعت اور انفراسٹرکچر کو تہس نہس کر دیا۔ صدر جانسن نے ٹیلیویژن پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ 'اگر کسی نے دوبارہ امریکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا۔ ہم نہ صرف اپنا دفاع کریں گے بلکہ معقول جواب بھی دیں گے اور آج ہم نے، جس وقت میں یہ تقریر کر رہا ہوں، ایک جواب دے بھی دیا ہے'۔ (سرد جنگ؛ جیریمی آئزک / ٹیلر ڈاؤننگ)(17)

''جانسن اور اس کے ہمنواؤں کے الفاظ میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی فوجیں ویتنام بھیجنی تھیں اور بس۔ یہی طریقہ واردات ہوتا ہے ان کا، ایسے ہی جارج بش نے نائن الیون سے بہت پہلے ہی عراق میں جارحیت کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا، وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا واویلا اپنی عوام کو اس غنڈہ گردی کا جواز فراہم کرنے کیلئے رچایا گیا''۔ ''آنے والے سالوں میں ویتنام پر نیپام بموں اور کلسٹر بموں کی برسات شروع کر دی گئی۔ امریکی طیاروں نے ویتنام پر زہریلے کیمیکلز سپرے کیے جن میں بدنام زمانہ ایجنٹ اورنج بھی جنگلوں پر سپرے کیا گیا تا کہ ویتنامی گوریلوں کی غذا کے ساتھ ان کی کمین گاہوں کو تباہ کیا جا سکے۔ کل 18 ملین گیلن زہر چھڑکا گیا۔ ابھی تک بھی امریکی فوجی جنہوں نے یہ زہریلا مواد استعمال کیا تھا وہ اس کے اثرات کے باعث بیمار ہو کر مر رہے ہیں۔ کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ جن مردوں، عورتوں اور بچوں پر یہ سب گرایا گیا تھا ان پر کیا گزری ہوگی؟ ٹیسٹوں سے پتہ چلا

ہے کہ ویتنامی شہریوں کا ڈائی اوکسین Dioxin لیول امریکی شہریوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے۔فضائی نظام کو اس زہریلے مواد سے پاک ہونے کو ابھی کئی سال اور لگیں گے۔ویتنام کی جنگ درحقیقت ایک کیمیائی جنگ تھی جو نفرت اور وحشت کے ساتھ مسلط کی گئی''۔

''امریکیوں نے ویتنام جنگ میں جتنی مقدار میں بمباری کی اتنی تو دوسری عالمی جنگ میں بھی مجموعی طور پر نہیں کی گئی تھی۔ایک دیہات پر بمباری کرنے کے بعد ایک امریکی افسر نے کہا'ہم نے قصبے کو برباد کر کے اسے بچالیا ہے'۔ان کے پھینکے ہوئے کیمیکلز آج بھی ویتنامیوں کو مار رہے ہیں۔یہی حال فلوجہ ،عراق، کے شہریوں کا بھی ہے۔جبکہ کولمبیا کے جنگلوں میں آج بھی ایسے ہی زہریلے کیمیکل چھڑکے جارہے ہیں۔وہاں منشیات کے خلاف نام نہاد جنگ کے نام پر زہریلی برساتیں کی جارہی ہیں۔اس کا نتیجہ ویسا ہی نکلے گا جیسا ویتنام میں ہوا تھا۔

مگر اس بربریت پر کوئی زبان نہیں کھول رہا''۔

''اس آپریشن کا نام 'لڑکھڑاتا طوفان' رکھا گیا تھا،ایسا لگتا ہے کہ پینٹا گان میں متعین کسی مفلوک الحال شاعر نے یہ ادبی نام تجویز کیا ہوگا جس کی ڈیوٹی یہی ہوگی کہ اس نوعیت کی ہر وحشت اور بربریت کیلئے اس قسم کے عنوان تخلیق و تجویز کرتا رہے۔اس کے بعد ہم ایک اور آپریشن 'آہ و بکا' ہوتا بھی دیکھتے ہیں۔اس قسم کے تخلیقی صلاحیتوں کے حامل اس وقت ہوتے جب سلطنت روما زوال پذیر ہو رہی تھی تو یہ تب اس قسم کے عنوان سامنے لے آتے 'مٹھاس اور روشنی سے بھرا'۔۔۔۔تاہم ناموں سے کوئی فرق نہیں پڑا کرتا،البتہ یہ سب آپریشن ناکامی سے دو چار ہوئے۔ جب کوئی قوم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اپنا سر اٹھا کر کہہ دے کہ 'نہیں' تو کوئی فوج کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو، بندوقیں اور توپیں کتنا ہی بارود کیوں نہ اگلیں، بم اور کیمیکل جتنے بھی برسائے جائیں، یہ سب کسی کام نہیں آتا۔جارج بش یہ سبق عراق سے سیکھ چکا ہوگا۔امریکی فوجی جتنے زیادہ بھیجے جاتے رہے ویتنامیوں کی مزاحمت اتنی ہی شدید ہوتی گئی اور امریکی لاشوں کی وطن واپسی میں بھی اضافہ ہوتا گیا''۔

شروع شروع میں تو امریکی حکمران امریکی شہریوں سے مزاحمت میں اضافے کے حوالے سے حقائق چھپاتے رہے۔حسب روایت اخبارات کی بھرپور معاونت کے ساتھ جھوٹ بولے جاتے اور عوام کو دھوکے دیے جاتے رہے۔لیکن پھر جیسا کہ ابراہام نے کہا تھا کہ 'تم کچھ وقت کیلئے سب لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہو اور کچھ لوگوں کو ہر وقت دھوکے میں رکھ سکتے ہو مگر تم سب لوگوں کو سارے وقت کیلئے دھوکے

میں نہیں رکھ سکتے' دھیرے دھیرے بتدریج امریکی عوام یہ جان ہی گئے کہ کیا کیوں اور کیسے ہو رہا ہے!''۔

''کوئی کبھی نہیں جان سکے گا کہ ویتنام میں صحیح معنوں میں کیا کچھ ہوا۔ مارے اور گم ہو جانے والے لاتعداد افراد سے ہٹ کر جنگ نے اور بھی کئی انسانی المیے جنم دیے۔ اندھا دھند بمباریوں' گولہ باریوں اور زہر فشانیوں کی وجہ سے دیہاتوں سے بڑی تعداد میں کسان نقل مکانی کر کے شہروں کے مضافات میں منتقل ہونے پر مجبور کر دیے گئے جہاں انہیں بے رحم غربت نے گھیر لیا۔ روایتی ویتنامی دیہی زندگی برباد کر کے رکھ دی گئی۔ نوجوان ویتنامی لڑکیاں امریکی فوجیوں کیلئے عیاشی کا سامان بن گئیں۔ بربادیوں سے جو تناؤ پیدا ہوا اس کی وجہ سے منشیات کا کلچر فروغ پا گیا جو بعد ازاں امریکی شہروں کی طرف بھی پرواز کر گیا جس نے تباہ کن نتائج پیدا کیے۔ 1971ء میں پینٹا گان نے رپورٹ کیا کہ ویتنام میں موجود تقریباً 30% امریکی فوجی ہیروئن یا افیون کے عادی ہو چکے ہیں جبکہ ماریجوانا کے استعمال کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ جنوبی ویتنام کی کٹھ پتلی حکومت نے منشیات کی تجارت کے خلاف کاروائی نہیں ہونے دی کیونکہ وہ خود اس کاروبار میں ملوث تھی اور یہی وہ حکومت تھی جسے امریکی سامراج کی بھرپور تائید میسر تھی''۔

''1967ء کے آخر تک امریکہ ویتنام جنگ پر سالانہ 20 ارب ڈالر خرچ کر رہا تھا جس سے امریکی ادائیگیوں کے توازن کا خسارہ 7 ارب ڈالر کو پہنچ گیا۔ 1968ء تک ویتنام میں امریکی فوج کی تعداد 500,000 تک پہنچ چکی تھی۔ جنگ کے اختتام تک امریکی فوج ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ انہیں سمجھ آ چکی تھی کہ وہ ایک ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جسے جیتنا ممکن ہی نہیں۔ جبکہ ویتنامی بجا طور پر قومی آزادی کے جذبے کے تحت جرات سے لڑ رہے تھے۔ پھر امریکی فوج یعنی ایک غیر ملکی فوج کے خلاف نفرت بھی ایک فطری امر تھا جس نے جارحیت کی تھی۔ ہر فوج کے اندر وحشی اور اذیت پسند عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے شہریوں پر بدترین تشدد ہر جنگ کا معمول بن جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک دلدوز واقعہ 'مائی لائے' میں ہونے والا قتل عام ہے۔ عراق کی جنگ کی طرح ویتنام جنگ کیلئے تراشے گئے جواز بھی بالآخر پاش پاش ہو کر رہ گئے''۔

''جنوری 1968ء میں صدر جانسن نے اعلان کیا کہ امریکہ جنگ جیتنے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ لیکن ابھی اس اعلان کی بازگشت ہواؤں میں ہی تھی کہ 'ٹیٹ' (Tet) حملے نے اس کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دیں۔ ویتنامیوں نے ایک سو سے زائد شہروں میں امریکیوں پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ سائیگون میں تو ایک چھاتہ بردار یونٹ امریکی سفارتخانے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سبھی مناظر امریکہ میں

ششدر عوام ٹیلیویژن سکرینوں پر دیکھ رہے تھے۔اس سے امریکی عوام پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ ہم اتنی بڑی قوت رکھنے کے باوجود جنگ جیت نہیں پا رہے ہیں۔جنگ نے صدر جانسن کا کیریر ختم کرڈالا۔ریپبلکن کے امیدوار رچرڈ نکسن نے جانسن کے نائب صدر اور صدارتی امیدوار ہوبرٹ ہمفرے کو شکست دے دی''۔(18)

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جنگ مخالف تحریک سول رائٹس موومنٹ کے ساتھ اشتراک میں تھی۔ اپریل 1968ء میں مارٹن لوتھر کنگ جونیر کو ممفس میں قتل کر دیا گیا جس کے نتیجے میں سو سے زائد شہروں کے اندر نسلی فسادات بھڑک اٹھے۔اس کے شعلے وائیٹ ہاؤس میں بھی پہنچ گئے۔اس کے چھ بلاکوں میں آگ لگا دی گئی تھی۔اس تحریک کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اسے سنبھالنے کیلئے 70000 فوجی متعین کرنے پڑ گئے۔اپریل 1968ء کی سیاہ فام بغاوت دراصل 1964ء سے رواں دواں سیاہ فام شہری بغاوت کا ہی تسلسل تھی بلکہ یہ 1950ء کی دہائی سے ہی جاری وساری تھی۔مگر 1968ء میں یہ اپنے عروج پر اس طرح پہنچ گئی کہ اس نے امریکی سماج کو اس کی بنیادوں تک ہلا کے رکھ دیا۔اسی کے ساتھ ہی نوجوانوں کی ریڈیکلائزیشن بھی ابھر کر سامنے آ گئی جو مزید فروغ پا کر انقلابی سیاست کی طرف راغب ہو گئے۔انقلابی سیاست کی طرف پیش قدمی کے اس رجحان کا اظہار ہمیں اس وقت کی ایک نامور شخصیت میلکم ایکس کی ذات میں مجسم ہوتا نظر آتا ہے جسے 1965ء میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔میلکم اپنی زندگی کے آخری سالوں میں سیاہ فام مسئلے کے طبقاتی پہلوؤں پر کام کر رہا تھا۔اور اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ نسل پرستی بھی دراصل سرمایہ دارانہ نظام کا ایک جزو لاینفک ہی ہے۔اور یہ کہ اس تعصب کو مزدوروں کو تقسیم کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور یوں یہ سرمایہ داروں کے منافعوں کیلئے خیر و برکت کا باعث بنتی چلی آ رہی ہے۔

1968ء کے فرانسیسی واقعات اور پھر ٹیٹ حملے کی شدت نے اس ساری کیفیت کو مزید گہرا کر دیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ ''امریکی دیو کے پاؤں حقیقتاً ریت کے ہی ہیں''۔اس کی عملی شہادت طلبہ احتجاج کے ابھار کی شکل میں سامنے آئی' مارچ 1968ء میں پہلا قبضہ ہاورڈ یونیورسٹی میں ہوا جس کا نتیجہ طلبہ مطالبات کو تسلیم کر لیے جانے کی شکل میں نکلا۔دوسرا واقعہ مئی میں کولمبیا یونیورسٹی میں ہوا جس میں ایک ہزار طلبہ نے یونیورسٹی پر قبضہ کر لیا۔سان فرانسسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں ساڑھے چار مہینے تک کی طویل ہڑتال ہوئی اور یونیورسٹی انتظامیہ کو مجبوراً طلبہ کے بیشتر مطالبات کے آگے سرنگوں ہونا پڑا۔طلبہ کے اس ولولہ انگیز موڈ

نے مزدوروں کو بھی سرگرم کرنا شروع کر دیا اور یوں یہ سلسلہ کہیں رکے بغیر بڑھنا شروع ہو گیا۔ جب اس نے گاڑیوں کی صنعت کو اپنی لپیٹ میں لیا تو 'وال سٹریٹ جرنل' کو اعتراف کرنا پڑا کہ ''1960ء کی دہائی کا انقلاب امریکی معیشت کے بنیادی حصے کو چھونے میں کامیاب ہو چکا ہے''۔

عام مزدوروں کی بڑی تعداد میں احتجاج میں شمولیت نے سرکاری یونینوں پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کے نتیجے میں وہ زیادہ ریڈیکل اقدامات پر مجبور ہو گئے اور یوں کئی ہڑتالیں سامنے آئیں۔ اس عرصے میں ہونے والی ہڑتالیں 1946ء کے بعد سے سب سے زیادہ ہوئیں۔ امریکی سماج میں جاری اس تحریک کی شدت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کینٹ سٹیٹ یونیورسٹی کے طلبہ کے مظاہرے پر فوج کو فائرنگ کرنی پڑ گئی جس سے چار طالبعلم ہلاک ہو گئے جو سیاہ فام نہیں تھے بلکہ گورے تھے۔ جبکہ جیکسن سٹیٹ یونیورسٹی میں دو سیاہ فام طلبہ جاں بحق ہو گئے۔ امریکہ کے 440 کیمپسوں میں ہڑتالیں ہوئیں جن میں چالیس لاکھ طلبا شریک ہوئے تھے۔ 1971ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق تیس لاکھ امریکیوں نے رائے دی کہ امریکہ کو ایک انقلاب کی اشد ضرورت ہے۔ یہ 1968ء کی تحریک کے اثرات تھے جو دنیا کے سب سے طاقتور ملک کے طلبہ اور مزدوروں پر مرتب ہوئے تھے۔

دوسرے خطوں میں ہونے والے واقعات

اس کتاب کا بنیادی مقصد پاکستان کے اندر 1968ء میں شروع ہونے والے انقلابی واقعات کی تفصیل اور تاریخ بیان کرنا ہے، جو انقلاب کا سال تھا۔ یہ اپنے وقت میں دنیا میں چلنے والے انقلابی ابھار کا ہی ایک تسلسل تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے اندر فرانس میں مئی 1968ء کی تحریک اس عہد کا عہد ساز واقعہ تھی۔ اٹلی اور میکسیکو کا ذکر بھی ہم کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ دیوہیکل امریکہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس انقلابی ابھار نے ان ملکوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا جہاں نسبتاً حالات بہتر اور معتدل تھے۔ جیسا کہ ہم برطانیہ میں دیکھ سکتے ہیں جہاں ہڑتالوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو 1971ء میں بدنام زمانہ صنعتی تعلقات آرڈیننس کے خلاف بڑی تحریک کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس وقت عوامی موڈ اتنا ریڈیکل تھا کہ ایک عام ہڑتال کی منصوبہ بندی سوچی جا رہی تھی اگر یہ ہو جاتی تو ایسا 1926ء کے بعد پہلی بار ہوتا۔

یہاں تک کہ دنیا بھر کے اصلاح پسندوں کا محبوب اور ہر دلعزیز ملک جہاں 'طبقاتی امن' اور 'طبقاتی

وحدت'ان کے بقول ہمیشہ سے مثالی چلا آرہا ہے،یعنی سویڈن بھی ابھاروں کی اس لہر سے متاثر ہو چلا تھا۔1969ء کا سارا سال کئی علاقوں میں ہڑتالوں میں گزرا۔اور یہ 1945ء کے بعد کے پچیس سالوں میں ہونے والی سخت اور شدید ہڑتالیں تھیں۔جرمنی بھی طالبعلموں کی ریڈیکلائزیشن اور مزدوروں کی گرم جوش تحریکوں کے تجربے سے گزرا۔قدرے تاخیر کے ساتھ یہ لہر سپین پرتگال اور یونان میں بھی پہنچ گئی ،اس کا سبب ان تینوں ملکوں میں سخت گیر وسفاک آمریتیں تھیں۔مگر 70 کی دہائی کے شروع میں ہی لاوا یہاں بھی ابل پڑا تھا اور دو بڑی تحریکیں سامنے آگئیں۔پرتگال کے اندر یہ انگولا اور موزمبیق کی آزادی کی تحریک کے ساتھ جڑی ہوئی تھی جس نے آمریت کا تخت اکھاڑ پھینکا۔پرتگال کے واقعات پر ٹائمز لندن نے یہاں تک لکھ دیا کہ ''یہاں اب کھیل ختم ہو چکا''۔ان کو محسوس ہو چلا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اب محفوظ نہیں رہا ہے۔سپین میں دہائیوں سے مسلط فرانکو آمریت کا دھڑن تختہ کر دیا گیا۔جبکہ یونان میں تحریک نے بدنام زمانہ کولونل حکومت کو چلتا کر دیا۔ان تینوں ملکوں میں تو یہ کیفیت ہو چکی تھی کہ اگر مزدور چاہتے اور انہیں قیادت میسر ہوتی تو اقتدار پر قبضہ کر سکتے تھے۔

سابقہ نوآبادیاتی ممالک پر اثرات

اسی عہد میں ہی ہم سابق نوآبادیاتی ملکوں میں ایک اور متوازی مظہر ابھرتا دیکھتے ہیں جس میں کئی ملکوں کے اندر سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وہاں سٹالنسٹ روس اور ماؤاسٹ چین کی طرز کی حکومتیں تشکیل پائیں۔1967ء میں جنوبی یمن میں انقلاب برپا ہوا جس پر ٹیڈ گرانٹ نے 1968ء میں اپنے مضمون ''جنوبی یمن میں نوآبادیاتی انقلاب اور خانہ جنگی'' میں لکھا کہ ''عدن سے ایک عوامی سرکشی کے بعد برطانوی سامراج کی شکست جنوبی یمن میں انقلاب کا نقطہء آغاز بنی۔مگر بورژوا جمہوریت کی وجہ سے اور عالمی سرمایہ داری کے جاری بحران اور سب سے بڑھ کر ان نوآبادیاتی ملکوں کے اپنے شدید بحران کے باعث یہ بات بہت جلد واضح ہو گئی کہ یہاں کے بورژوا، پیٹی بورژوا ڈیموکریٹس جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لئے کوئی واضح حکمت عملی اپنانے میں نااہل و ناکام ثابت ہوئے اور یوں بورژوا جمہوری انقلاب کرنے میں بھی ناکام رہے''۔

انقلابی تحریکوں کے سب سے ریڈیکل عناصر اقتدار تو اپنے ہاتھوں میں لینے پر مجبور ہو گئے مگر انہیں جنوبی یمن میں جاگیرداری وزمینداری نظام کو ختم کرنے کیلئے آگے کے اور اقدامات بھی کرنا تھے۔جنوبی

یمن نے خودکوایک مارکسی ریاست قرار دے دیا جبکہ یہ ملٹری/پولیس بونا پارٹسٹ آمریت تھی۔اس نے اپنی بنیاد ایک نیشنلائزڈ معیشت پہ رکھی لیکن اسے عوام کی اکثریت کی خصوصاً متحرک پرتوں کی تائید وحمایت حاصل تھی۔یمنی انقلابیوں کے سامنے کیوبا،روس اور چین کے انقلابات کے ماڈل موجود تھے''۔(19)

اسی طرح سے ہم 1969ء میں صومالیہ میں ایسا ہی ہوتا دیکھتے ہیں جہاں سابق پولیس چیف سیاد بارے کی قیادت میں سرکشی کی گئی۔یہاں بھی فوجی افسروں کی حکومت قائم ہوئی جو خود کو 'مارکسسٹ لینسٹ' قرار دیتی تھی اور جو روسی طرز کے ماڈل پر استوار ہونا چاہ رہی تھی۔ اسی 1960ء کی دہائی میں ہی ہم برما اور شام کے اندر ایسی ہی حکومتیں قائم ہوتے دیکھتے ہیں۔1974ء میں ایتھوپیا میں فوجی بغاوت کی گئی جس کے نتیجے میں دریگ اقتدار پر آ گیا۔اس نے بھی روسی ماڈل کا انتخاب کیا۔1974ء میں پرتگالی سامراج کی شکست کے بعد انگولا اور موزمبیق میں قائم ہونے والی حکومتوں نے بھی روسی سٹالنزم کی راہ اپنائی۔1975ء کی ٹیڈ گرانٹ کی تحریریں اس عمل کی وضاحت کرتی ہیں۔

''شام اور برما کی طرح سے ایتھوپیا انقلاب بھی فوجی افسروں کی تمناؤں اور کاوشوں کا ثمر تھا جسے ملک کے مزدوروں کسانوں کی حمایت میسر تھی،جس نے جاگیرداری کو ختم کر دیا تھا اور پھر مقامی بورژوازی کی ملکی معیشت کو ترقی دے سکنے کی نااہلی کے باعث اسے بھی بے دخل کر دیا گیا۔ملک کی اپنی پسماندگی اور فوجی پرت کی محدود ذہنی صلاحیت نے اس نئی باغی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ 'سوشلزم' قبول کر لیں۔روس، چین اور کیوبا کی طرز پر قائم فوجی اور افسر شاہانہ اقتدار کو ملکی معیشت کو فوری طور پر درکار ترقی کا رستہ سمجھ لیا گیا۔چونکہ روس اور چین کی بڑی اور تیز رفتار ترقی پسماندگی کا خاتمہ کرتی جا رہی ہے،چنانچہ سمجھ لیا گیا کہ ہمارے لیے بھی یہی جادوئی نسخہ کارگر رہے گا۔سٹالنسٹ ریاستوں کی تنگ نظر قوم پرستانہ محدودیت ان کیلئے انتہائی کشش کا موجب بنی ہوئی تھی۔یہ کشش سوشلزم کی حامل تنظیم،فوجی وافسر شاہانہ مراعات پر مبنی تھی جسے دانشور اور درمیانی فوجی پرت سماج کا فطری حصہ سمجھتی تھی''۔

نتیجتاً' ذرائع پیداوار کی ترقی سرمایہ داری اور بڑے کاروباروں کی کمزوری کی وجہ سے رک جاتی ہے۔چونکہ یہ سرمایہ داری سامراج کی غلام ہوتی ہے اس لئے ختم ہو جاتی ہے۔

مسلسل انقلاب کی ایک مسخ شدہ کوشش میں چھوٹے افسروں کی یہ پرت کچھ عرصے کیلئے تاریخ کی ایک ایسی لاشعوری ایجنٹ بن جاتی ہے جو معیشت کو ریاست کے ماتحت کرنے کا لازمی فریضہ سرانجام دیتی ہے''۔

یہ سبھی اقدامات اور عمل ترقی یافتہ ملکوں میں پرولتاری انقلاب کی تاخیر کی ہی پیداوار ہیں۔لیکن پھر یہ پھلانگیں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادوں کی کمزوری اور نقاہت کو ضرور آشکار کر جاتی ہیں۔ یہ کسی طور کوئی حادثہ نہیں کہ نوآبادیاتی ممالک میں موجود بورژوابونا پارٹسٹ آمروں اور حکمرانوں نے اپنی اپنی آزاد حکمرانیاں خیالی طرز کے 'سوشلزم' کے نام اور نعرے کے ذریعے حاصل کی تھیں۔ یہ ان شدید اثرات کا نتیجہ تھا جو روسی اور چینی انقلابات سے متاثرہ لوگوں کے ذہنوں میں سوشلزم کے تصورات کی شکل میں موجود تھے' لیکن پھر اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ان ملکوں میں سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے روس میں افسر شاہی کو اپنے عوام کو قابو میں رکھنے کا موقع میسر آتا رہا۔جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اس دوران ترقی یافتہ ملکوں کے اندر اصلاح پسند اور سٹالنسٹ پارٹیاں مضبوط ہوتی چلی گئیں لیکن پھر یہ مضبوطی دراصل ان کی تنگ نظر قوم پرستانہ کمزوری اور تنزلی کی شکل میں آشکار ہوتی رہی''۔(20)

روس میں سٹالنزم کے خاتمے اور چین میں منڈی کی معیشت کی ابتدا کے بعد یہاں کی حکومتیں سرمایہ داری کی طرف مراجعت کر چکی ہیں۔البتہ یمن جیسے کچھ علاقوں میں داخلی تنازعات اور خانہ جنگیاں بھی شروع ہو چکی ہیں۔لیکن سرمایہ داری کی طرف واپسی سے بھی ان ملکوں میں کوئی ایک مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے ہاں البتہ ان مسائل میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔جدوجہد کی ایک نئی لہر اپنے اظہار کیلئے تیار ہو رہی ہے مگر اس بار یہ لہر دنیا کو کسی اور ہی رنگ میں متاثر کرے گی۔ وینزویلا اور لاطینی امریکہ سے یہ لہر اپنا آغاز کر چکی ہے۔اور ابھی جیسا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ عالمی سرمایہ داری ایک ناخوشگوار بحران کی لپیٹ میں آ چکی ہے جو تاریخ کا سب سے گہرا بحران ہے۔سوشلزم کا تصور ایک بار پھر ہر طرف پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

نتائج

عالمی جنگ کے تقریباً پچیس سالوں کے بعد نوجوان اور مزدور تاریخ کے دھارے میں شریک اور متحرک ہوئے تھے تاکہ اپنی تقدیریں بدل سکیں اور انہیں اپنے قبضے میں لا سکیں۔اس تحریک نے انہیں اپنی طاقت کے احساس سے روشناس کرا دیا۔انہیں اپنے اندر کی پوشیدہ انقلابی صلاحیتوں کا ادراک ہوا کہ کمزور طبقات ہی دراصل حقیقی طاقت کے مالک ہوا کرتے ہیں۔اس عہد کی زندہ و تابندہ تحریکوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ انقلاب اور سماج کی سوشلسٹ تبدیلی مکمل طور پر قابل عمل بھی ہے اور ممکن بھی۔

اپنی شکست کے باوجود 1968ء کا تحریکی عہد ضائع نہیں گیا نہ ہی جائے گا۔ٹراٹسکی نے درست کہا تھا کہ ''کوئی بھی جدوجہد رائیگاں نہیں جایا کرتی''۔1968/69ء کا عرصہ تاریخ کے صفحات کی ناقابل فراموش داستان کے طور پر محفوظ ہے۔اس عہد اور اس صورتحال کی بازگشت اس کے بعد کے وقت اور موجودہ عہد میں بھی گونج رہی ہے۔ایلن وڈز نے فرانسیسی انقلاب کی چالیسویں سالگرہ پر یکم مئی 2008ء کو لکھے گئے اپنے مذکورہ بالا مضمون کو ان الفاظ میں ختم کیا ہے''ہمارے پاس فرصت نہیں ہے کہ ہم ان پیٹی بورژوا سابق انقلابیوں کی طرف کوئی دھیان بھی دیں جو اس عہد کے انقلابی رجحان کو جذباتی اور مسخرے پن کے ساتھ کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں جیسے یہ زمانہ قدیم کا کوئی قصہ ہے اور اس کا آج کی دنیا اور اس کے موجودہ حالات سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔جلد یا بدیر 1968ء کہیں نہ کہیں سے پھر سے ابھرنے والا ہے۔کون سا ایسا ملک ہے جہاں اس کے ابھرنے کے امکانات و آثار موجود نہیں! یہ فرانس بھی ہوسکتا ہے، یہ اٹلی بھی ہوسکتا ہے یہ پرتگال، سپین، یونان بھی ہوسکتے ہیں اور صرف یورپ ہی کیوں؟ ہم تو اس سے آگے ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ہماری تمنا ہے کہ ایسا ہو۔ہم اس کے ہونے کے منتظر بھی ہیں اور متمنی بھی۔ہم اس کیلئے تیار بھی ہیں اور اس کیلئے تیاری بھی کر رہے ہیں۔تاکہ اس بار یہ کامیابی کے اور کامیابی اس کے قدم چومے۔فرانس کے مرحوم انقلاب کی سالگرہ کے جشن کے اس موقع پر ہم یہ نعرہ لگاتے ہیں؛انقلاب زندہ باد''۔(21)

انقلاب قطعی طور پر روزمرہ کا کوئی معمول نہیں ہوا کرتے۔یہ اپنے اظہار کیلئے کئی سال کئی دہائیاں بھی لگا دیا کرتے ہیں۔یہ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم پچھلے گزرے واقعات سے لازمی اسباق سیکھیں،ان بڑے دیوہیکل تاریخی واقعات سے جو 1968/69ء میں سامنے آئے۔سچ تو یہ ہے کہ سب سے درست نتیجہ اور سبق ٹراٹسکی نے آج سے ٹھیک 70 سال پہلے اخذ اور بیان کیا تھا، یہ سبق آج بھی 40 سال پہلے 1968ء کی انقلابی تحریک کے حوالے سے انتہائی اہم اور فیصلہ کن سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔1938ء میں چوتھی انٹرنیشنل کی پہلی کانگریس کے موقع پر ٹراٹسکی نے کہا تھا''نسل انسانی کا تاریخی بحران آج سمٹ کر انقلابی قیادت کے بحران میں ڈھل چکا ہے''۔

اس کے دو سال بعد ہی ٹراٹسکی کو 1940ء میں میکسیکو میں سٹالن کے ایک ایجنٹ نے قتل کر دیا تھا۔دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا میں طاقتوں کا توازن مکمل طور پر بدل چکا تھا۔مغربی سامراج کو سوشل ڈیموکریسی اور محنت کشوں کی روایتی پارٹیوں کی سٹالنسٹ قیادت کی مصالحتوں اور غداریوں کی وجہ سے

وقت اور وقفہ میسر آتا رہا۔ 1948ء سے 1973ء کے عرصے کا طویل ترین سرمایہ دارانہ عروج ان عناصر میں سے اہم ترین عنصر تھا جس نے سوشل ڈیموکریسی کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جو یورپ میں انقلاب کے ممکن نہ ہونے میں ایک عنصر بنا۔ دوسری طرف روس، چین اور مشرقی یورپ کے اندر سٹالنزم کے ابھار اور فروغ نے ایک لمبے عرصے کیلئے 'کمیونسٹ پارٹیوں' کی اتھارٹی کو مضبوط بنائے رکھا۔ 1917ء کے بالشویک انقلاب نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں انسانی تاریخ میں پہلی بار منصوبہ بند معیشت کو متعارف کرایا تھا جس نے ایک بڑے عرصے تک حیران کن ترقی کے رستے کھول دیے۔ سٹالنسٹ طرز حکمرانی کے باوجود بھی اکتوبر انقلاب کی بنیادوں پر استوار ہونے والی اس طرز معیشت نے سائنس، ٹیکنالوجی اور پیداواری شعبے میں معجزانہ شرح ترقی کو جنم دیا۔ جس نے ان سٹالنسٹ ممالک میں معیار زندگی کو بدل کے رکھ دیا۔ اس کی وجہ سے کئی نظریاتی غلط فہمیاں اور طلسماتی خوش فہمیاں پیدا ہوتیں اور فروغ پاتی چلی گئیں۔ خاص طور پر نوآبادیاتی ملکوں میں اس کی بھرمار ہوگئی۔ یہ سبھی عناصر و عوامل 1968/69ء کے انقلابی ابھار کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنے اور یوں ممکنہ سوشلسٹ فتوحات شکست میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔

تاہم سٹالنزم کے انہدام کے بعد اور وحشت و بربریت کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی سفاکی نسل انسانی کو جس مقام پر اور جس کیفیت میں لے آئی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں کی اکثریت کیلئے زندہ رہنا وبال اور محال ہو چکا ہے۔ ہر گزرتا دن اس کیفیت کو مزید بد سے بدتر کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہ کیفیت زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکتی ہے، نہ رہے گی۔ نسل انسانی کو زندہ رہنے کی جستجو سے کبھی بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ میں کچھ بھی ضائع نہیں ہوا کرتا۔ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوا کرتا ہے۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے حکمران سرمایہ دار طبقات کی خونریزیاں عیاں جبکہ مزدور تحریک پر اصلاح پسندی اور سٹالنزم کی اتھارٹی اور ساکھ مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔

ایک نیا عہد ہمارے سامنے دامن کشا ہو رہا ہے جس میں ہم حقیقی انقلابی مارکسزم کے تناظر اور پیشن گوئیوں کی سچائی کو اپنے سامنے کارفرما ہوتا دیکھیں گے۔ نئی تحریکیں اور ابھار ہمارے سامنے رونما ہونے والے ہیں۔ طبقاتی جدوجہد پھر سے وقت اور تاریخ کا ایجنڈا بن چکی ہے۔ بدیر نہیں بلکہ جلد انقلابی تحریک ابھرے گی مگر تاریخ نے کبھی خود کو پہلے جیسے انداز میں نہیں دہرایا بلکہ یہ اپنا اعادہ ہمیشہ پہلے سے بڑے اور بلند انداز میں کیا کرتی ہے۔ ہم ایک نیا 1968/69ء ہوتا دیکھیں گے جو زیادہ عمومی، زیادہ عوامی، زیادہ

عالمی انداز میں ہوگا۔اور جو اپنی شدت' اپنی وسعت اور اپنی قوت میں کہیں بلند معیار کا حامل ہوگا۔اور اس بار ہم نے اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ جو غلطیاں ماضی میں سرزد ہوئیں اس بار وہ نہ ہونے پائیں، نہ ہونے دی جائیں۔اب غلطی یا غلطیوں کی گنجائش نہیں ہوگی۔

ہمارا فریضہ ہے کہ ہم عالمی مارکسی رجحان کو تعمیر کرتے ہوئے اسے کرہ ارض کی قائدانہ طاقت بنائیں۔ہمیں اسے یقینی بنانا ہے کہ سچے مارکسزم کی آواز کسی طور بھی صدا بہ صحرا بن کے نہ رہ جائے۔ہر ایک ملک میں ہمیں مارکسی رجحان کو مزدور تحریک کیلئے تسلیم شدہ قوت کے طور پر منوانا ہے۔ہمیں ہر ممکن طور پر محروموں اور نوجوانوں کے سب کچھ بدل کے رکھ دینے والے جوش وجذبے کی توانائی کو منظم کرنا ہوگا۔موجودہ حالات ایک سوشلسٹ فتح مندی اور تبدیلی کیلئے سازگار ہو چکے ہیں۔فتح کی منتظر اور تمنائی ایک طبقاتی جدوجہد سامنے آنے کو ہے۔ایک خالص کمیونسٹ مستقبل جو محروموں کو محرومیوں سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دے گا، ہمارا منتظر ہے۔

نوٹس

1۔ٹیڈ گرانٹ،ان ٹوٹ دھارا(انگریزی)،صفحہ 414

2۔فرانس میں دوہری طاقت،ملیٹنٹ کا لیف لیٹ(انگریزی)،مئی 1968ء

3۔'انقلابی تیاریاں' سے اقتباس صفحہ 12

4۔لندن ٹائمز 21.5.1968

5۔فنانشل ٹائمز،لندن 20.5.1968

6۔ٹائمز،لندن 23.5.1968

7۔ٹائمز،لندن 24.5.1968

8۔ٹائمز لندن 21.5.1968

9۔ صفحہ 464-65

10۔www.marxist.com

11۔ایلن وڈز،آئرش ریپبلکنز کے نام ایک کھلا خط،ری پبلکن ازم کی انقلابی جدلیات (آٹھواں حصہ) اکتوبر 2003ء

12۔ونسٹن چرچل،فتح اور المیہ، صفحہ 8-227

13۔ایضاً صفحہ 229

14۔ٹیڈ گرانٹ،ان ٹوٹ دھارا، صفحہ 167

15۔ٹیڈ گرانٹ،روس انقلاب سے ردانقلاب تک،(انگریزی)، صفحہ 228-227

16۔ایلن وڈز،چیکوسلواکیہ(1968): سٹالنزم،بحرانوں کی لپیٹ میں،ستمبر 1968ء

17۔جیرمی آئزکس اینڈ ٹیلر ڈاؤننگ،سرد جنگ(انگریزی)، صفحہ 216

18۔ایلن وڈز،مارکسزم اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ

19۔ٹیڈ گرانٹ،ان ٹوٹ دھارا

20۔ٹیڈ گرانٹ،آئبیریا کا انقلاب: مارکسزم اور عالمی صورتحال کا تاریخی ارتقاء، صفحہ 17،1975ء

21۔www.marxist.com،یکم مئی 2008ء

برصغیر کا خونی بٹوارہ

پاکستان کے جنم کی تکلیف

''لیبر اور کانگریس اپوزیشن، ان دونوں کے اضطراب میں کوئی حقیقی تعلق نہیں، لیکن ان دونوں کی بیک وقت موجودگی لارڈ ارون کی لیبر مسائل کی طرف خصوصی توجہ کی درست وضاحت اور اسے جواز فراہم کرتی ہے''۔

(لندن ٹائمز، 29 جنوری 1928ء)

''اب ایک ایسی صورتحال پیدا ہو رہی تھی جہاں ہم جناح کی نسبت بٹوارے کی زیادہ حمایت کر رہے تھے۔ میں نے جواہر لال کو خبردار کیا کہ اگر ہم نے بٹوارے کی حمایت کی تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تاریخ کا فیصلہ ہوگا کہ ہندوستان کو مسلم لیگ نے نہیں بلکہ کانگریس نے تقسیم کیا''۔

(مولانا ابوالکلام آزاد 1958-1888ء)(1)

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں وضاحت کر چکے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں دنیا بھر میں انقلابی لہروں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ چل نکلا تھا۔ یہ صرف ترقی یافتہ ممالک میں ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ چین جیسے پسماندہ ممالک بھی سرخ آندھی کی لپیٹ میں تھے۔ یہ واقعات عالمی سطح پر سامراج اور سرمایہ

دارانہ نظام کیلئے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے تھے۔حکمران طبقے میں ایک خوفناک سراسیمگی ہر طرف پھیل چکی تھی۔انسانی تاریخ میں محروم طبقات کی طرف سے کی جانے والی یہ شاید سب سے بڑی سرگرمی وسرکشی تھی۔نوآبادیاتی چین،افریقہ،مشرق وسطیٰ ،انڈونیشیااور برصغیر میں عوام کی یہ بیداری انتہائی بے مثال تھی۔اس شاندار تحریک میں غلاموں نے اپنے گلے سے طوق اتار کر مالکوں کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا تھااوروہ اپنی قومی آزادی کی لڑائی کیلئے متحرک ہو چکے تھے۔مارکسسٹ ان نوآبادیاتی انقلابات کی اس لئے حمایت کررہے تھے کیونکہ یہ ایک انقلابی تحریک تھی جو سامراج کے لئے شکست وہزیمت کا سامان لئے ہوئے تھی اور جو محروم انسانوں کو سر اٹھا کر جینے کا راستہ دے رہی تھی اور یوں طبقاتی جدوجہد کو نئی شکتی فراہم کررہی تھی۔

اگر برصغیر کی قومی آزادی کی تحریک درست طور پر اپنا عمل مکمل کر پاتی تو یہ صرف برصغیر کی ہی برطانوی سامراج سے آزادی تک خود کو محدود نہ رکھتی بلکہ یہ پیش قدمی کرتے ہوئے سرمایہ داری اور برطانوی راج کی گماشتہ جاگیرداری کو جڑوں سے اکھاڑتے ہوئے سماجی ومعاشی تبدیلیوں کو بھی ممکن کرسکتی تھی۔ایسا ہوجاتا تو اس سے دنیا بھر میں سرمایہ دارانہ نظام کو سنجیدہ خطرے سے دوچار کیا جاسکتا تھا۔لیکن برطانوی سامراج اپنی تیار کردہ، پروردہ اور لے پالک ہندو مسلمان قیادت کے ساتھ مل کر اس قومی آزادی کی تحریک کو نسلی ومذہبی روپ دینے میں کامیاب ہوگیا۔کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی سٹالنسٹ قیادت نے بھی اس بدترین المیے میں انتہائی مجرمانہ کردار ادا کیا۔جولائی 2001ء میں شائع ہونے والی کتاب ''Partition;Can It Be Undone'' کے دیباچے میں ٹیڈ گرانٹ (1913/2006ء) نے لکھا تھا''برصغیر کی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم برطانوی سامراج کا جرم تھا۔برطانوی سامراج برصغیر پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا تھا لیکن 1946/47ء میں برصغیر میں پھوٹنے والی انقلابی صورتحال نے برطانوی سامراج کی نیندیں حرام کردیں اوران کو یہ احساس ہوگیا کہ معاملات ان کی گرفت سے نکلتے جارہے ہیں۔برطانوی راج کی فوج زیادہ تر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی جس پر وہ بھروسہ اور تکیہ نہیں کرسکتے تھے''۔

اس تقسیم نے جدید انسانی تاریخ کی سب سے بڑی انسانی ہجرت کے المیے کو جنم دیا۔یہ ہجرت تاریخ کی سب سے بڑی خونریز ہجرت بھی تھی۔کم ازکم دس لاکھ انسانی زندگیاں اس کی بھینٹ چڑھیں جبکہ سولہ لاکھ انسانوں کو سرحدیں عبور کرکے نقل مکانی کرنی پڑی۔یہ تھا برصغیر پر دوسو سالہ برطانوی راج

کا ہلاکت خیز انجام واختتام۔ جس پالیسی کے تحت اس راج نے اپنی ابتدا کی تھی، اسی پالیسی پر ہی اس نے اپنا خاتمہ بھی کیا؛ یعنی تقسیم کرو اور حکمرانی کرو۔

برصغیر پر سامراجی تسلط اور اس کی ترقی کے تناظر کے حوالے سے سب سے پہلا سائنسی اور شاید سب سے سچا تجزیہ کارل مارکس نے اس وقت کیا تھا جب برطانوی سامراج نے اپنے قدم بھی نہیں جمائے تھے۔ مارکس نے یہ تحریر 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھی تھی۔ اس وقت کی اپنی تحریروں میں مارکس نے برطانوی راج کی معاشی وسماجی بنیادوں کی وضاحت کی تھی اور اس کے برصغیر کے مستقبل پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ 22 جولائی 1858ء کی اپنی تحریر میں مارکس نے کہا:

''اگر ہم ہندوستان کی قدیم تاریخ کو نہ بھی جانتے ہوں تو بھی یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان اس وقت برطانیہ کے شکنجے میں ہے اور وہ بھی ہندوستان کی ہی فوج کے ہاتھوں' اور وہ بھی ہندوستان ہی کی قیمت پر۔ انگلینڈ کے ہندوستان میں دو مشن تھے؛ ایک تباہ کن تھا جبکہ دوسرا ترقی پسند یعنی قدیم ایشیائی سماج کا خاتمہ کرتے ہوئے اس کی جگہ ایشیا میں مغربی سماج کی مادی بنیادیں قائم کرنا تھا۔ عرب، ترک، تاتاری اور مغل جنہوں نے کامیابی سے ہندوستان پر حکمرانی کی تھی لیکن یہ سب سر پھرے وحشی حکمران تاریخ کے ایک آفاقی قانون کے تحت اپنے سے بہتر و برتر تہذیب میں ضم ہوتے رہے اور جلد ہی ہندوستانی سماج اور اس کی تہذیب وثقافت کا حصہ بنتے گئے۔ برطانوی ہندوستان کے پہلے فاتح تھے جو کلچر میں ہندوستان سے برتر تھے۔ اس لئے وہ ہندو تہذیب کے زیر اثر نہ آسکے۔ انہوں نے یہاں کی قدیم سماجی اکائیوں کو تہس نہس کر دیا۔ برصغیر کی صدیوں پرانی دستکاری صنعت کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ یوں ہندوستان کا سماج عرصہ دراز سے جن بنیادوں پر قائم ودائم چلا آرہا تھا، اس کو اس جدید اور برتر کلچر نے تہہ و بالا کر دیا۔ برصغیر میں برطانوی حکمرانی کی ساری تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو ہمیں سوائے ایک بڑی بربادی کے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اس قدر وسیع پیمانے کی تباہی کے بعد وہاں تعمیر نو یا بحالی نہ ہونے کے برابر ہے، تاہم یہ بحالی شروع ہو چکی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی وحدت عظیم مغلوں کے دور سے کہیں زیادہ مرتکز شکل میں سامنے آئی۔ یہ بحالی کی پہلی اور ابتدائی کیفیت تھی۔ برطانیہ کی مسلط کردہ یہ وحدت اب الیکٹرک ٹیلیگراف کے ذریعے مزید مضبوط و مستحکم ہوگی۔ وہ وقت دور نہیں رہا جب ریلوے اور سٹیم انجن کی مدد سے برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان زمانی فاصلہ بہت کم ہو کر رہ جائے گا۔ برطانیہ کے حکمران طبقات کو حادثاتی طور پر ہندوستان کی ترقی کیلئے ایک عبوری مرحلے سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ برطانوی اشرافیہ

اس ملک کو فتح کرنا چاہتی ہے جبکہ اس کے تاجر اس کو لوٹنا چاہتے ہیں، اور یہاں کے کروڑ پتی اسے بیچ کے کھا جانا چاہتے ہیں۔ اس کار خیر کیلئے ہندوستان سے بہتر جگہ کوئی اور کہاں ہو سکتی ہے جہاں سب کچھ اتنی بہتات میں موجود ہے کہ یہ سب مل کر آپس میں بندر بانٹ کر سکتے ہیں۔ بورژوا تہذیب کی کامل منافقت اور اس کی وراثتی بربریت یہاں ہمارے سامنے عیاں ہوتی نظر آتی ہے۔ اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ بنی ٹھنی بجی سنوری تہذیب جب اپنی نوآدیات میں داخل ہوتی ہے تو مکمل طور پر ننگی ہو جاتی ہے''۔(2)

مزاحمت اور غداریاں

برطانوی راج کے سارے عرصے کے دوران اس کے خلاف مزاحمت کسی نہ کسی شکل میں ہوتی رہی۔ کسان بغاوتوں میں حصہ لیتے رہے۔ انفرادی عوامی ہیرو برطانوی طاقت کے ساتھ نبرد آزما ہوتے رہے جنہیں مغربی مورخین ڈاکو قرار دیتے تھے۔ افغان جنگوں سے قطع نظر، کوئی بھی عرصہ ایسا نہیں تھا جب برطانوی راج کو چیلنج نہ کیا جاتا رہا ہو۔ بیسویں صدی کے آغاز میں تو ہم مسلح افواج کے اندر بھی پرولتاری جدوجہد ہوتی دیکھتے ہیں جب سپاہی اور جہازی براہ راست سامراجی تسلط کے خلاف بغاوت اور سرکشی کرتے ہیں۔

یہ برطانیہ سے تعلیم یافتہ ہندوستانی سیاستدان ہی تھے جنہوں نے کانگریس کی بنیاد رکھی' کولن (Collin) اور لیپئر (Lapierre) کے مطابق ''ایک معزز سرکاری اہلکار نے 1895ء میں کانگریس پارٹی قائم کی۔ وائسرائے کی آشیرباد سے اوکٹاوین ہیوم نے ایک تنظیم تخلیق کرنے کا بیڑہ اٹھایا جس کا مقصد راج کے خلاف اٹھنے والی مزاحمتوں کا توڑ کرنا تھا اور اس مقصد کیلئے پڑھے لکھے طبقات کی نشوونما کرتے ہوئے معتدل مزاج، مصالحت پسند اور ذمہ دار افراد پر مبنی ایسے حضرات کی کھیپ تیار کرنا تھا جو بوقت ضرورت انڈیا کے برطانوی حکمرانوں کے ساتھ خوشگوار ماحول میں مذاکرات کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو''۔(3)

پہلی عالمی جنگ کے دوران کانگریس پارٹی نے مکمل طور پر برطانوی سامراج کی امداد اور حمایت کی۔ اس دوران کانگریس نے برطانوی راج کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے والے غدر پارٹی سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو ہونے والی پھانسیوں پر مجرمانہ خاموشی اختیار کئے رکھی۔ 1915ء اور 1916ء کے عرصے کے دوران کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاسوں میں برطانوی گورنروں کی موجودگی میں ان کی

عظیم خدمات کیلئے شاندار خراج تحسین پیش کیا۔روس میں 1917ء کے بالشویک انقلاب میں لینن کے ساتھ انقلاب کی قیادت کرنے والے لیون ٹراٹسکی (1879/1940ء) نے اپنی زندگی کی آخری تحریروں میں سے ایک میں ہندوستان کے بارے میں حسب ذیل لکھا'

''ہندوستان کی بورژوازی کبھی بھی ایک انقلابی جدوجہد کی قیادت کی اہل نہیں ہوسکتی۔یہ برطانوی سرمایہ داری کی غلام ہے اور مکمل طور پر اس کی مطیع اور حاشیہ بردار ہے۔یہ اپنی جائیدادوں کے تحفظ کیلئے سبھی حدود و قیود سے گزرنے کیلئے تیار رہتی ہے۔یہ عوام سے انتہائی خوفزدہ ہے اور برطانوی سامراج سے سمجھوتہ کرنے کیلئے مری جارہی ہے خواہ اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔یہ عوام کو اصلاحات کی لوریاں سنا سنا کر اسے نیند میں غرق رکھنا چاہتی ہے۔اس بورژوازی کا لیڈر اور پیمبر گاندھی ہے۔وہ ایک مصنوعی لیڈر اور جھوٹا پیامبر ہے۔(4)

گاندھی کو، 1910/1916ء تک کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی جانب سے'' قیصر ہند'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔جب 1947ء میں وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے ملکہ الزبتھ کی پرنس فلپ کے ساتھ شادی کے موقع پر' جسے شاہی خاندان نے اس کے بچپن سے پالا پوسا تھا، گاندھی کو برطانیہ بلایا تو اس نے انتہائی بیش بہا تحفے کے ذریعے شاہی جوڑے اور شاہی خاندان کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔YORK MW102 گاڑی' قدیمی زیورات، مغلیہ عہد کی نایاب تصاویر، جواہرات اور چاندی سے مزین پلیٹیں، یہ سب ایک ایسی لڑکی کیلئے شادی کا تحفہ تھا جس نے آگے چل کر ملکہ برطانیہ بننا تھا۔اس موقع پر گاندھی نے چرخے پر تیار شدہ خاص کپڑا (ٹی کوزی) بھی پیش کیا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے ہی چرخہ کات کر بنا تھا۔15 جنوری 1948ء کو گاندھی نے تقریر کرتے ہوئے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حق ملکیت کا دفاع کرتے ہوئے کہا'' میں کبھی بھی کسی ایسی سرگرمی کا حصہ نہیں بنوں گا کہ جس میں مالکوں کو ان کی جائیدادوں سے محروم کردیا جائے۔طبقاتی جنگ کے خلاف میں اپنی ہر قسم کی اتھارٹی اور اثر ورسوخ استعمال کروں گا۔اگر کوئی بھی آپ کو آپ کی جائیداد سے محروم کرنا چاہتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے شانہ بشانہ اس کے خلاف لڑائی میں شریک ہوں گا''۔(5)

جناح کا موقف بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔اس کا طرز بود و باش، رہن سہن، لباس اور مزاج برطانوی تھا اور انگریزوں سے ملتا تھا اور جو کسی طور بھی برصغیر کے مسلمانوں کی طرز کا نہیں تھا جن کی نمائندگی

کا وہ دعویدار تھا۔حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی انگریزوں کے ساتھ اپنا ناطہ نہیں توڑا تھا۔اپریل 1947ء میں اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اپنی بات چیت میں کہا:

''مجھے ابھی اس کی کوئی فکر نہیں کہ آپ مجھے کتنا کم دیتے ہو، جب تک کہ آپ مجھے پورے کا پورا نہیں دے دیتے ۔ میں آپ کو کوئی بھی نامعقول مشورہ نہیں دینا چاہتا لیکن آپ کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ نیا پاکستان برطانوی سلطنت سے اس کا زیرنگین رہنے کا خواہشمند رہے گا''۔

تقسیم کے حوالے سے جناح کے جوش وجذبے کا یہ عالم تھا کہ اس نے اگست 1946ء میں کہا: ''یا تو ہندوستان تقسیم ہوگا یا یہ تباہ ہوگا''۔ یہاں ہمیں جناح ایک واضح یوٹرن لیتا نظر آتا ہے، یہی جناح تھا جس نے 1933ء میں ایک ''غیر مسلم'' والڈروف ہوٹل لندن میں کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم رحمت علی کی طرف سے دی گئی دعوت میں پاکستان نام کے ملک کی تجویز پر طنزیہ قہقہہ لگایا تھا بعدازاں اس نے برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکشن کمیٹی میں بات کرتے ہوئے ایک الگ ملک کے تصور کو ایک بچگانہ خیال اور ناقابل عمل قرار دیا تھا۔(6)

80 کی دہائی میں کرسٹینا لیمب نے اپنی مشہور کتاب ''اللہ کا انتظار'' میں کہا ''اگر جناح زندہ ہوتا تو پاکستان کے سخت گیر اسلامی قوانین کے تحت سزا پا چکا ہوتا، وہ ایک ایسا سرد مزاج قوم پرست تھا جو مذہب اور سیاست کو بہرصورت ایک دوسرے سے منسلک یا منتھی کرنے کے خلاف تھا اور جو 1930ء کی دہائی کے وسط سے ہی اس بات کو فخر سے بیان کرتا رہا کہ وہ پہلے ہندوستانی ہے اور بعد میں مسلمان۔ جناح نے بعدازاں ملاؤں کے نعروں کو خود اپنے مستقبل سمیت مسلمان کاروباریوں اور زمیندار اشرافیہ کے محفوظ مستقبل کا رستہ سمجھ لیا''۔

کانگریس سے جناح کی علیحدگی کی بنیاد مذہبی نہیں تھی بلکہ طریق کار کے اختلافات تھے۔مذہب کی بنیاد پر جدائی ایک دہائی بعد کا معاملہ ہے۔نوآبادیاتی ریاست اس کیلئے ہوشیاری سے دھیرے دھیرے حالات اور رستے ہموار کر رہی تھی۔لندن میں جب ہندوستان میں جاری مزاحمتوں کے اثرات سنجیدگی سے محسوس کئے جانے لگے تو یہ سوال ابھرا کہ وہاں کوئی مقامی حکومت کی قسم کا منصوبہ عمل میں لانا ضروری ہو گیا ہے تاکہ وہاں سماجی بے چینی اور بغاوت کے رستے محدود اور مسدود کئے جا سکیں۔1932ء میں سر تھیوڈور موریسن جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا سابق پرنسپل رہ چکا تھا، نے مذہب کی بنیاد پر علیحدگی کے حق میں ایک متاثر کن مضمون لکھا۔اس مضمون میں اس نے ایک صوفیانہ خاکہ پیش کیا جو آگے چل کر

مسلمانوں کے ایک الگ قوم کے تصور کی بنیاد بنا۔

''ہندو اور مسلمان ویسی ہی دو مختلف قومیں ہیں جیسی کہ دو مختلف یورپی قومیں۔ مسلمان قوم کسی طور بھی ایک بیگانی حکومت کے تحت زندگی نہیں گزار سکتی۔ خاص طور پر ایک ایسی نام نہاد جمہوری حکومت کے تحت جو اپنے شہریوں کے ساتھ امتیاز برتتی ہو۔ مسلمانوں کو اس بات کی ضمانت دی جانی چاہئے کہ وہ اپنی تہذیبی صفات و خصوصیات کے تحفظ کیلئے خود کو تنہا نہ سمجھیں''۔(7)

مسلمانوں کیلئے الگ طریق انتخاب کا اصول قبول کیا جا چکا تھا جس سے ہندوستان میں کمیونل سیاست کو پروان چڑھانے کا عمل شروع ہوتا گیا۔ لیکن ایک الگ مسلم ملک کے طور پر پاکستان کا معاملہ، مسلم لیگ اور مسلم عوام دونوں کیلئے 1944/46ء کے عرصے میں زیادہ توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن کر سامنے آیا۔ آج وہ مورخ یا مفکر جو یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا تصور اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ مسلمان ایک الگ قوم تھے، وہ محض تاریخ کو دہرانے کا مظاہرہ کر رہے ہیں، ان سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمان کب ایک الگ قوم کے طور پر سامنے آئے تو ان مذہبی مورخین و مفکرین سے اس سوال کا کوئی متفقہ و مصدقہ جواب ملنا محال ہے۔

شیعہ سنی تفریق کو ایک طرف رکھتے ہوئے، مسلمانوں میں کئی ایسے رجحان تھے جو خود کو ریفارمر یا پھر حقیقی مذہب کا صحیح اور سچا علمبردار و پیروکار گردانتے تھے۔ اور یہ سب رجحان ایک دوسرے کی حقانیت کو چیلنج کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ سقہ بند علماء باقاعدہ طور پر انگریزوں کے تنخواہ دار بھی تھے اور برطانیہ کے حکم پر فتوے اور احکامات بھی صادر کیا کرتے تھے۔ کئی علماء نے کانگریس کا ساتھ دیتے ہوئے ایک متحدہ و مخلوط نیشنلزم کے تصور کی حمایت کی۔ کچھ علماء البتہ مسلم امہ کی عالمگیر حکومت کے لئے نعرہ زن تھے' یہاں تک کہ وہ ایک ملک میں اسلام کے تصور کے ہی سخت مخالف تھے۔ یہ تصور ابوالاعلی مودودی کا تھا جس نے 1941ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تھی تا کہ سیکولر نیشنلزم کے علمبردار اپنے حریفوں، دیوبند گروپ اور مسلم لیگ کے مقاصد کا کھلے عام مقابلہ کر سکے۔ مودودی نے جناح پر الزام عائد کیا کہ وہ ''اسلام کی بجائے مسلمانوں کے 'دنیاوی' سماجی و معاشی مفادات کے'' زیر اثر سب کچھ کر رہا تھا۔ اس نے برملا اعلان کیا کہ ''جناح سے لے کر معمولی عہدے کا حامل مسلم لیگ کا کوئی بھی ایک لیڈر اسلامی ذہنیت یا اسلامی شعار سے قطعی طور پر بے بہرہ ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی سماجی و معاشی مسائل کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنے کا اہل اور حامل ہے۔ ان کا گھناؤنا کردار بس اتنا ہے کہ کسی نہ کسی حیلے بہانے یا ساز باز سے

ہندوستانی مسلمانوں کے مادی مفادات کا تحفظ کر سکیں''۔(8)

ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کا فیصلہ کن مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب 1917ء میں روس میں بالشویک انقلاب کا تاریخ ساز واقعہ رونما ہوا۔ ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کے کئی سرگرم کارکن اور راہنما روس میں ہونے والے اس انقلاب سے انتہائی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اقبال جیسے شاعر نے کارل مارکس کے بارے میں قرار دیا کہ ''اس کے پاس کتاب (داس کیپٹل) تو ہے لیکن وہ پیغمبر نہیں ہے''۔ روس کے انقلاب نے سب سے زیادہ نوجوانوں کو متاثر کیا۔ ہندو سوشلسٹ ریولیوشنری آرمی Hindu Socialist Revolutionary Army کا قیام اس تبدیلی کا ہی عملی اظہار تھا۔ بھگت سنگھ، راج گرو، سکھ دیو اور بی کے دت کے کارہائے نمایاں اپنے الٹرا لیفٹ ہونے کے باوجود انتہائی جاندار تھے اور برطانوی راج کے جبر و استحصال کے خلاف نوجوانوں کے اعلان بغاوت کی شاندار مثال ہیں۔ آزادی اور انقلاب کیلئے درست مارکسی رہنمائی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ مسلح جدوجہد کا رستہ اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ HSRA کے کچھ سرپھروں نے 8 اپریل 1929ء کے دن ایک اسسٹنٹ پولیس سارجنٹ جے پی سانڈرس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دونو جوانوں کو دہلی میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے اندر بم پھینکنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ان میں سے ایک بھگت سنگھ تھا۔ نوجوانوں کی اکثریت نے جیل میں بھوک ہڑتال شروع کر دی ان میں سے ایک نوجوان جتین داس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اس وقت زبردستی کھانا کھلانے کی کوشش کے دوران ہلاک کر دیا گیا جب وہ اپنی بھوک ہڑتال کے 63 دن پورے کر چکا تھا۔

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی نوجوانوں کے مقدمے نے سارے ہندوستان میں شہرت حاصل کرتے ہوئے گہرے اور شدید اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے اور سماج میں بائیں بازو کا ایک عمومی رجحان مرتب اور متحرک ہونے لگا۔ یہ مقدمہ سماج کی ہر پرت میں بحث و تمحیص کا محور بنتا چلا گیا۔ ملزمان کے ساتھ یہ سماجی ہمدردی اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ گواہان استغاثہ کے خلاف سر چڑھ کر بولنے پر اتر آئے۔ یہاں تک کہ ایک برطانوی سپاہی نے بھی بھگت سنگھ کو شناخت کرنے سے انکار کر دیا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بھگت کو قتل کے وقت دیکھا تھا۔ بھگت سنگھ کا مقدمہ پانچ ماہ تک چلا۔ اس کا فیصلہ 7 اکتوبر 1930ء کو سنایا گیا۔ ان سچے اور سرپھرے نوجوانوں کی مقبولیت اور ان کی سرخ انقلاب کی طرف رغبت نے اس قدر جوش ولولہ پیدا کیا کہ ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کو ایک نیا جذبہ ملا اور

تحریک کی بورژوا قیادت کو اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہونا شروع ہوگئی۔ ہندوستان میں سفر کرنے والے ایک برطانوی سیاح سی ایف اینڈریوز نے 1932ء میں لکھا کہ ''اس وقت انڈیا میں وہی کیفیت نظر آتی ہے جو آج سے انیس سو سال پہلے سلطنت روم میں پائی جاتی تھی۔ بظاہر ہر طرف حکمرانوں کی عملداری نظر آتی تھی اور سب اچھا معلوم ہوتا تھا لیکن اس بظاہر خاموشی کی تہہ میں ایک ایسا اضطراب موجود تھا جو کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح پھٹنے کو بیتاب ہو رہا تھا۔ یہاں کے لوگ اس اضطراب کو قومی آزادی کی تڑپ قرار دے رہے ہیں''۔

برطانوی حکمرانوں نے گاندھی سمیت سبھی کانگریسی رہنماؤں کی تواتر کے ساتھ گرفتاریوں اور پھر رہائیوں کا سلسلہ جاری رکھا تاکہ ان بورژوا لیڈروں کی عظمت، جرات، قربانیوں اور جدوجہد کی داستانیں تراشی اور مقبول کی جاسکیں۔ برطانوی حکمرانوں نے گاندھی کو خاص طور پر قومی آزادی کی تحریک کو بائیں بازو کے اثرات سے بچانے اور اس کے طبقاتی رنگ اختیار کر جانے کے خدشے سے محفوظ رکھنے کیلئے بھرپور استعمال کیا۔ تاہم خود کانگریس کے اپنے اندر اس کا ردعمل خاصا شدید تھا۔ ڈاکٹر سبھاش چندر بوس جو کہ کانگریس کے ایک معروف و موثر بائیں بازو کا رہنما تھا، نے کانگریس کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمارے اور برطانویوں کے درمیان خون کے سمندر اور لاشوں کے پہاڑ حائل ہیں۔ گاندھی نے برطانیہ کے ساتھ جو معاہدے کئے ہیں، دنیا کی کوئی طاقت ہمیں مجبور نہیں کر سکتی ہے کہ ہم اسے تسلیم کر لیں'' گاندھی جہاں کہیں بھی جاتا تھا غصے سے بھرے نوجوان سرخ جھنڈوں کے ساتھ اس کا سواگت کرتے اور اس پر سوالوں اور طنز و تشنیع کی بوچھاڑ کر دیتے۔ وہ بعض اوقات اس کے ساتھ بدتمیزی سے بھی پیش آتے۔ کراچی میں ہونے والی آل انڈیا کانگریس کی کانفرنس کے دوران یہ نعرے لگائے گئے کہ گاندھی کا معاہدہ ہی بھگت سنگھ کو پھانسی چڑھائے جانے کا موجب بنا ہے۔ 19 مارچ 1931ء کو جب گاندھی لارڈ ارون سے ملنے جا رہا تھا، بھگت سنگھ اور اس کے کامریڈز نے اپنے ساتھیوں کے صلاح مشورے سے وائسرائے کے نام ایک خط روانہ کیا۔ اس خط میں رحم کی اپیل نہیں کی گئی تھی بلکہ وائسرائے سے کہا گیا تھا کہ حکومت انہیں جنگی قیدی سمجھتے ہوئے اس کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کرے اور ان کو پھانسی دینے کی بجائے گولی مار کر ہلاک کیا جائے۔

چار دن بعد ان کو لاہور سنٹرل جیل کے اندر پھانسی دے دی گئی۔ بھگت سنگھ کی جیل کی ڈائری دلچسپ اور قابل مطالعہ مواد سے بھرپور ہے جس میں بھگت نے جیل میں اپنی موت کی کوٹھڑی میں اپنے

خیالات ونظریات کے ارتقاء کے بارے میں لکھا ہے۔اس نے نوجوانی کے جوشیلے پن کو نامناسب قرار دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس نے گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفے ''اہنسا'' کی شدید مذمت بھی کی ہے۔ بھگت یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایک سوشلسٹ انقلاب ہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی آزادی کی ضمانت بن سکتا ہے۔ یہ ذمہ داری اور فریضہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا تھا کہ وہ قومی آزادی کی جدوجہد میں شامل لیفٹ کے سبھی حصوں' پرتوں اور رجحانات کو ہر حال میں یکجا' متحد' منظم اور متحرک کرتی۔ اگر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسی طور طریقوں اور تناظر پر عمل پیرا ہوتی تو آج تاریخ کا دھارا ہی مختلف ہوتا اور ہندوستان کی تقسیم کے المیے کا سامنا بھی نہ کرنا پڑتا۔

کمیونسٹ پارٹی

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بنیاد 26/28 دسمبر 1925ء کو کانپور میں ہونے والی کمیونسٹ کانفرنس میں رکھی گئی تھی۔اس کا کنوینر ستیہ بھکا تا تھا جبکہ اس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین حسرت موہانی تھے۔کامریڈ سنگاراویلو نے صدارتی خطبہ دیا تھا۔اس پارٹی کا اولین مرکز 1919ء میں برلن جرمنی میں قائم ہوا جسے بعد ازاں تاشقند روس میں 1920ء میں انڈین کمیونسٹس کے نام سے تشکیل دیا گیا۔مانابندرا ناتھ رائے' جو کہ پارٹی کا مرکزی نظریہ ساز تھا اور جو جلاوطن تھا، نے پارٹی کو تیسری انٹرنیشنل کے ساتھ وابستہ کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔کانپور کی یہ کمیونسٹ کانفرنس ہندوستان بھر سے مختلف بائیں بازو کے گروپوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب رہی۔اس میں شریک مرکزی رہنماؤں میں بنگال سے مظفر احمد، یوپی سے شوکت عثمانی، بمبئی سے ایس اے ڈانگے، لاہور سے عبدالمجید سمیت سارے برصغیر سے نمائندے شامل تھے۔اس کانفرنس سے تقریباً تین سال پہلے 27 اپریل 1923ء کو ''انقلاب'' آفس ریلوے روڈ لاہور کی جانب سے ایک خط کے ذریعے بائیں بازو کے 25 مہان رہنماؤں کو ایک نئی سیاسی پارٹی قائم کرنے کی تجویز اور دعوت دی گئی تھی۔ یہ خط کامریڈ غلام حسین اور شمس الدین حسن کی جانب سے لکھا اور بھیجا گیا تھا۔مزدوروں کی طرف سے جدوجہد کی بڑھتی ہوئی رغبت اور سماج کی وسیع پرتوں کی کمیونسٹ نظریات کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی وابستگی نے برطانوی راج کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔کمیونسٹوں کو ابتدا سے ہی انتہائی سخت اور جانکسل حالات کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں بورژوا سیاستدانوں اور پارٹیوں کو برطانوی راج کے دوران موزوں اور کم مشکل حالات دستیاب

رہے۔راج نے کمیونسٹوں کے خلاف کئی مقدمات قائم کئے جن میں سے دوکوعوامی مقبولیت میسر آ گئی۔ان میں سے ایک کانپور بالشویک سازش کیس تھا جو کہ 1924ء میں ہوا۔اس کا مرکزی ملزم ایم این رائے تھا جسے اس کی غیر حاضری میں سزا سنادی گئی جبکہ کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے آٹھ دیگر ارکان شوکت عثمانی،سنگاراویلو چیتائر،ایس اے ڈانگے،آر سی ایل شرما،نیلینی داس گپتا،مظفر احمد،مولا بخش اور پروفیسر غلام حسین کو گرفتار کرلیا گیا۔استغاثہ کی طرف سے درج کیا جانے والا مقدمہ تاج برطانیہ کی طرف سے دائر کیا گیا جس میں ملزمان پر برطانوی جمہوری اقدار کو سبوتاژ کرنے کی تہمت عائد کی گئی؛ فیصلے میں کہا گیا کہ ''ملزمان سیکشن 121A کے تحت سازش کے مرتکب پائے گئے ہیں' سازش یہ ہے کہ انہوں نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایک برانچ کو سارے برطانوی ہندوستان میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔اس سازش کا مقصد ہے کہ تاج برطانیہ کے تحت قائم برطانوی ہندوستان کی خودمختاری کو ختم کردیا جائے''۔(9) اس مقدمے میں صرف چار ملزمان کو ہی سزا سنائی گئی۔ان میں نیلینی گپتا،ڈانگے،مظفر احمد اور شوکت عثمانی شامل تھے(ایم این رائے برلن میں تھا)ان چاروں کو چار سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

تاشقند روس میں ایک مرکز قائم کیا گیا جس میں ہندوستان میں کمیونسٹ نظریات کے فروغ کیلئے کیڈروں کی تعلیم وتربیت کی جاتی تھی۔ان میں سے اکثر کو،جن کو''مہاجروں'' کے نام سے پہچانا جاتا تھا، 1922ء کے آخر میں شمال مغربی سرحد سے ہندوستان داخل ہوتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا۔جبر وتشدد کی اس کیفیت میں سوائے چند ایک کے باقی کمیونزم سے تائب ہوتے چلے گئے۔ان تمام ترکٹھن حالات کے باوجود کمیونسٹ گروپ ہندوستان کے بڑے شہروں میں پھلتے پھولتے اور پھیلتے رہے۔ان میں مدراس،بمبئی،لاہور،کراچی،کلکتہ اور یوپی کے شہر شامل تھے۔بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں برطانوی راج کے خلاف دو بڑی عوامی بغاوتیں سامنے آئیں۔بغاوت کی پہلی لہر 1919/1922ء تک چلی جبکہ دوسری اس سے بھی شدید لہر 1926/1927ء کے دوران ابھری تھی۔ہندوستانی پرولتاریہ کی طرف سے یہ پہلی بڑی کوشش تھی اور یہ اس کا جدوجہد کی تاریخ میں پہلا قدم تھا۔جب فروری 1928ء میں سائمن کمیشن نے بمبئی میں قدم رکھا تو اس کا سارے ہندوستان میں احتجاجی مظاہروں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔صنعتی پرولتاریہ کے اندر بے چینی اور اضطراب مسلسل بڑھتا چلا جارہا تھا۔1927ء کے دوران اس شعبے میں 129 ہڑتالیں کی گئیں جبکہ اس سے اگلے سال ہڑتالوں کی یہ تعداد بڑھ کر 209 ہوگئی۔بمبئی میں ٹیکسٹائل ورکروں کی طرف سے ایک بڑی عام ہڑتال کی گئی۔اس ہڑتال میں پچاس

کارخانے بند کر دیے گئے اور جو 26اپریل سے لے کر 6اکتوبر 1928ء تک بند رکھے گئے۔بمبئی ریاست کے ضلع بڑدولی میں کسانوں نے ٹیکس کی ادائیگی روکنے کا اعلان کر دیا۔ٹاٹا لمیٹڈ کے سٹیل کے کارخانے میں سٹاف کی برطرفیوں اور اجرتوں میں کمی کے خلاف پانچ مہینوں تک کام بند رکھا گیا۔لیلولہ کے مقام پر ایسٹرن ریلوے کمپنی میں چار ماہ تک کام روک دیا گیا۔نارتھ ویسٹرن ریلوے سے لے کر ساؤتھ انڈین ریلوے میں ریل کے مزدوروں کے شعبے میں ہڑتال کر دی گئی جس نے سارے سسٹم کو جام کر کے رکھ دیا۔اس دوران مسلح جدوجہد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔دسمبر میں اس ریل کو ایک دھماکے سے اڑا دیا گیا جس میں وائسرائے ارون سفر کر رہا تھا۔اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ کانگریس،گاندھی اور نہرو نے اس حملے کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ہولناک بے روزگاری اور بد سے بدتر ہوتے حالات زندگی مزدوروں' کسانوں اور نوجوانوں کے اندر بے چینی گھٹن اور غم وغصے کو بھڑکاتے چلے جا رہے تھے۔شمال مغربی علاقے میں تو یہ تشدد انتہاؤں کو پہنچ چکا تھا۔سائمن کمیشن رپورٹ کے مطابق 1858ء سے 1922ء تک برطانوی فوج کو باغی قبائل کے خلاف 72 مہمات سرانجام دینی پڑیں۔جون کے آخر میں گجرات میں کرائے اور ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع ہوگئی جبکہ بنگال کے اندر ایک طلبہ تحریک پھوٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی مسلح سرکشی میں اضافہ ہوگیا۔کمیونسٹ پارٹی ان تمام واقعات میں قائدانہ کردار ادا کر رہی تھی۔برطانوی سامراجی اس سرخ خطرے سے ڈر گئے تھے۔انہوں نے ایک طرف تو بورژوا سیاستدانوں کو تحریک کو متاثر کرنے کی ذمہ داری سونپی دوسری طرف انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف سختیوں میں اضافہ کر دیا۔1929ء میں ''میرٹھ سازش کیس'' میں یہ جبر کھل کر سامنے آ گیا۔کانپور بالشویک سازش کیس کی طرح سے اس کا بھی مقصد یہی تھا کہ کمیونسٹ قیادت کا قلع قمع کیا جا سکے۔20 مارچ 1929ء کو کمیونسٹ پارٹی کے 31 لیڈر سرکاری ایجنسیوں کی جانب سے سرگرم کمیونسٹ افراد کے بارے میں پیش کی جانے والی رپورٹوں کی روشنی میں گرفتار کر لئے گئے۔اس مقدمے کی سماعت جون 1929ء میں شروع کی گئی جبکہ 16 جنوری 1933ء کو عدالت نے اس مقدمے کو باقاعدہ سننا شروع کیا۔اور سب ملزمان کو سزا سنائی جس میں تین سال سے عمر قید تک کی سزا شامل تھی۔فلپ سپراٹ اور بنجمن فرانسس بیڈلے جو کہ انگلینڈ سے کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے کیلئے آئے تھے ،کو دس سال کی سزا دی گئی۔الہٰ آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس نے سبھی اپیلیں مسترد کر دیں البتہ سزا میں تخفیف کر دی گئی اور 1935ء کی خزاں تک سبھی رہا کر دیے گئے۔مقدمے کی سماعت کے دوران نامزد

ملزمان قومی آزادی کی تحریک میں برطانیہ مخالف جذبات ابھارتے ہوئے عوام کی ہمدردیاں اپنی طرف جیتنے میں کامیاب رہے۔جس پر ہندوستانی بورژوازی مشتعل ہوگئی اور اس نے ایک ڈیفنس کمیٹی قائم کردی جس کا چیئرمین موتی لال نہرو جبکہ جواہر لال نہرو اس کا ممبر تھا۔ملزمان اپنے مقدمے کو کمیونسٹ نظریات کے فروغ کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔چیف جسٹس نے اپنے فیصلے میں لکھا ''یہ لوگ جان بوجھ کر پہلے سے تیار کردہ بیانات لکھ کر لاتے اور انہیں پڑھتے ہوئے خاصا وقت لگا دیتے ہیں۔عدالت کو اس کا ایک ایک لفظ سننا پڑتا ہے۔زیادہ تر بیانات اور کچھ بھی نہیں ہوتے تھے سوائے اس کے کہ ان میں کمیونزم کا پرچار کیا جاتا تھا۔اس کے ہی لوازمات اور پروگرام ان بیانات میں پیش کئے جاتے ہیں۔میرٹھ کیس کی سماعت شروع ہوتے ہی بمبئی ٹیکسٹائل کی گیرین کام گریونین کے خلاف ایکشن شروع کردیا گیا۔حکومت نے نہ صرف کمیونسٹوں بلکہ یونین رہنماؤں کو گرفتار کرنا شروع کردیا،اس دوران فسادات اور ہڑتال کی انکوائریوں کیلئے کمیٹیاں بھی قائم کردی گئیں۔ان کمیٹیوں کا مقصد اور ہدف ہندوستان بھر کی ٹریڈ یونین قیادت میں سے کمیونسٹوں کو برطرف اور الگ کرنا تھا۔اکتوبر 1929ء میں وائیٹلے رائل کمیشن قائم کرکے ہندوستان روانہ کیا گیا۔اخبار ''مانچسٹر گارڈین'' کی رپورٹ کے مطابق اس کمیشن کو قائم کرنے اور بھیجنے کا حقیقی مقصد کمیونسٹوں پر جبر اور دباؤ میں اضافہ کرنا تھا۔25 اکتوبر 1929ء کو اس اخبار نے لکھا:

''پچھلے دو سالوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کے سبھی بڑے کارخانوں کے صنعتی مزدوروں کی یونینوں کے سرگرم راہنما کمیونسٹ منتظمین کے زیر اثر آئے ہوئے ہیں۔ان حالات کی روشنی میں ہی ہندوستانی مزدوروں کے حوالے سے اس قسم کے کمیشن کو تشکیل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی''۔اگرچہ گیرین کام گریونین کو ہڑتال ختم کرنے پر مجبور کردیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ملک بھر میں مزید ہڑتالیں پھوٹ پڑیں۔جمشید پور میں ٹن پلیٹ ورکرز،کلکتہ میں آئل اینڈ پٹرول ورکرز اور کراچی میں ڈاک ورکرز نے ہڑتال کرکے برطانویوں کے جبر وتسلط کے خلاف اعلان بغاوت کردیا۔

سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر کیونکر کمیونسٹ پارٹی اس قدر اثر ورسوخ،تائید وحمایت اور مزدوروں کی بے مثال جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود صحیح معنوں میں قیادت نہ سنبھال سکی؟زیادہ تر سٹالنسٹ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جبر کی کیفیت ہی اتنی سخت تھی کہ پارٹی قیادت نہیں سنبھال سکی۔اس حوالے سے میرٹھ سازش کیس کو حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جبر وتشدد تنظیموں کو توڑ کے رکھ دیتا ہے اور ان کو شدید پسپائی کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ایک مارکسی تنظیم کو اس جبر وتشدد سے نمٹتے

ہوئے سماج میں اپنے لئے حمایت اور یکجہتی حاصل کرنی پڑتی ہے نہ صرف اپنے ملک کے اندر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی۔اس وقت کچھ کمیونسٹ رہنماؤں نے اس پوزیشن کو قبول بھی کیا تھا۔سوامی ایندرا ناتھ ٹیگور نے اپنے پمفلٹ ''تاریخی ارتقا'' میں لکھا ہے ''میرٹھ سازش کیس سے بڑھ کر کسی اور شے نے کمیونزم کیلئے اتنا بھرپور پروپیگنڈہ نہیں کیا۔سارے ملک کی سیاست اس کیس پر توجہ مرکوز کئے ہوئے تھی۔اس کیس کی وجہ سے ہزاروں نوجوان کمیونسٹ پارٹی کی طرف راغب ہوئے۔اس حوالے سے عالمی ذرائع ابلاغ میں بھی کافی تشہیر ہوئی۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سازش کیس نے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کو اپنے قدم جمانے میں اہم کردار ادا کیا''۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کے پروگرام میں جسے ستمبر 1920ء میں دوسری کانگریس کے موقع پر پیش اور شائع کیا گیا،حسب ذیل لکھا گیا''مذہبیت ،عاجزی وانکساری سے بھرپور گاندھی جیسے رجحانات کو سماجی زندگی کے انتہائی پسماندہ اور انتہائی رجعتی عناصر اپنا ہیرو بناتے چلے گئے۔ایسے عناصر اپنے مسائل کا حل پرولتاری سوشلزم میں نہیں سوچتے اور دیکھتے، بلکہ اس کی بجائے یہ صبر وشکر،راضی بہ رضا جیسے قدیم رویوں کے ذریعے اپنی سماجی محرومیوں کو طفل تسلی دیتے رہتے ہیں۔گاندھی،عوامی انقلاب کی مخالفت کیلئے ایک نظریے کے طور پر ترویج اور فروغ پا رہا ہے۔اس کا مقابلہ،لامحالہ طور پر،کمیونزم کے ذریعے کرنا ہوگا''۔

موقف اور نقطہء نظر میں بار بار تبدیلی اور کبھی دائیں تو کبھی بائیں کی طرف راغب ہونے کی وجہ سے سٹالنسٹ کمنٹرن نے کئی انقلابات کو زندہ درگور ہونے پر مجبور کر دیا۔نہ صرف انقلابوں کو بلکہ کئی سچے انقلابیوں کو بھی اور یہ دنیا بھر میں ہوا۔1927ء میں اپنے چائنہ مشن سے واپسی پر ایم این رائے سٹالن کی نظروں سے گر گیا اور اسے 1929ء میں کمنٹرن سے نکال دیا گیا۔پے در پے غلطیوں کے باوجود اب بھی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی سماجی بنیادیں موجود ہیں۔خاص طور پر اس کی ''4 اکتوبر'' کے تاریخی ورثے کے ساتھ نسبت کی وجہ سے۔1936ء میں ریلوے کی عام ہڑتال نے برطانوی راج کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔اس ہڑتال نے ہندوستان کی نوخیز صنعت کے ہر شعبے کے پرولتاریہ کو شدید متاثر کیا تھا۔1938ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ورکرز سوشلسٹ ریپبلک کے نعرے کے تحت کلکتہ میں 50000 مزدوروں کو متحرک و منظم کرتے ہوئے ایک بڑی ہڑتال کرائی۔یہ اس قابل تھی کہ مزدوروں اور غریب کسانوں کی حکومت کے نعرے کے تحت اس سے بھی بڑی عام ہڑتال کرا سکتی تھی۔اس طرح طبقاتی جدوجہد کی ایک اور لہر نے کمیونسٹ پارٹی کو مزید لیفٹسٹ ہونے پر مجبور کر دیا۔1938ء میں کمیونسٹ

پارٹی کی کسان سبھا(کسان کانفرنس) میں 50000 غریب کسانوں نے خود کو شرکت کیلئے رجسٹر کرایا۔ 1939ء میں اس کانفرنس کی ایک قرارداد میں حکومت میں کانگریس کی وزارتوں پر شدید نکتہ چینی کی گئی۔ قرارداد میں مکمل سیاسی نجات اور آزادی کا مطالبہ کیا گیا جو کہ قرارداد کے مطابق عوامی راج کے تحت ہی ممکن تھا۔ 1937ء تک کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد تھی ۔ مہاراشٹرا اور یوپی میں پارٹی کے ہزاروں کارکنوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ بنگال اور پنجاب میں کمیونسٹوں پر تشدد بھی کیا گیا۔ شعلہ پور میں پارٹی کے چار لیڈروں کو پھانسی دے دی گئی ان میں ایک اہم مرکزی ٹریڈ یونین لیڈر بھی شامل تھا۔ مالابار میں کمیونسٹ ورکروں کو مسلسل قید و بند اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ جبکہ مدراس میں کئی کمیونسٹوں کو سولی چڑھا دیا گیا۔

ماسکو کی افسر شاہی کی طرف سے وقتاً فوقتاً پالیسیوں میں تبدیلیاں اور اتار چڑھاؤ، انڈین کمیونسٹ پارٹی پر اثر انداز ہوتے رہے۔ ''فادر لینڈ کے تحفظ'' کی پالیسی نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے کئی سرگرم کارکنوں کے انقلابی جدوجہد کیلئے درکار طبقاتی شعور کو کند اور مجروح کر کے رکھ دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز پر پارٹی نے ایک بھرپور جنگ مخالف مہم شروع کی، اسے سامراجی جنگ قرار دیا گیا، جس کی مخالفت میں پارٹی نے بڑھ چڑھ کر جنگ اور برطانیہ کی مخالفت کی۔ یہ ایک ایسا سنہرا موقع تھا کہ کمیونسٹ پارٹی خود کو عوام کے سامنے ایک متبادل کے طور پر پیش کر سکتی تھی۔ جنگ کے آغاز پر پارٹی نے جنگ کی مخالفت میں جرات کے ساتھ انتہائی موثر ہڑتالیں منظم کرائیں۔ 22 اکتوبر 1939ء کے دن، دنیا میں جنگ کی مخالفت میں محنت کشوں کی طرف سے سب سے پہلا مظاہرہ ہندوستان میں ہوا جس میں ایک دن کی عام ہڑتال کی گئی، اس احتجاج میں لگ بھگ 90000 لوگوں نے حصہ لیا۔ ''نسل انسانی کے خلاف اس قتل عام کی سازش کو شکست دی جائے'' ''سامراجی جنگ مردہ باد'' ''ہندوستان کی آزادی زندہ باد'' جیسے نعرے اس احتجاج کا عنوان تھے۔ برطانوی سامراجیوں نے اس احتجاج میں حصہ لینے والے ہزاروں کارکنوں پر جبر و تشدد کی انتہا کر دی اور ان کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ اس کیفیت نے کانگریس پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے اور اس میں دو رس پولرائزیشن ہوئی۔ اس میں بائیں بازو کے گروپ تشکیل پا چکے تھے جن میں سے کچھ ڈاکٹر سبھاش چندر بوس کے ساتھ منسلک تھے اور جن کو کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وابستہ سمجھا جانے لگا تھا۔ 1939ء میں کانگریس کی صدارت کیلئے ہونے والے الیکشن میں ڈاکٹر سبھاش نے گاندھی کو شکست دے دی تھی۔ یوں امکانات روشن ہو گئے تھے کہ کانگریس کے لیفٹ ونگ کے ساتھ

یونائٹڈ فرنٹ تشکیل دے دیا جاتا۔ یوں کمیونسٹ پارٹی، لیفٹ کی ایک ایسی ناقابل تسخیر طاقت قائم کر لیتی جو کہ ایک مارکسی پروگرام اور طریقوں کے ساتھ قومی آزادی کی تحریک کو سوشلسٹ نتیجے تک پہنچا سکتی تھی۔

بائیں بازو کی زوال پذیری

اس وقت جب کمیونسٹ پارٹی کی جنگ اور برطانیہ مخالف پالیسی تیزی کے ساتھ موثر پیش قدمی کر رہی تھی، عین اسی وقت ماسکو کی پالیسی میں اچانک تبدیلی نے تباہ کن اثرات مرتب کرنے شروع کر دیئے۔ سٹالنسٹ روس کی امریکی و برطانوی سامراج کے ساتھ ہونے والی مصالحت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو بھی برطانوی راج کے خلاف اپنی پالیسی کو یکسر بدلنے پر مجبور کر دیا۔ 1942ء میں کمیونسٹ پارٹی کا ایک رہنما کامریڈ خوشی محمد اعظم گڑھ (یوپی) میں ایک بڑے عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے سامراج کے خلاف جوش و جذبے سے بھرپور تقریر کر رہا تھا۔ اس تقریر کے دوران ہی اسے ایک چٹ دی گئی جو پارٹی کی ہائی کمان کی طرف سے ایک قاصد اس کیلئے لایا تھا۔ یہ پیغام سٹالن کے نئے حکمنامے پر مبنی تھا۔ یہ برطانیہ کے خلاف جدوجہد ترک کرتے ہوئے، اس کے ساتھ مصالحت کا حکم تھا۔ خوشی محمد نے پیغام پڑھا اور فوری طور پر اپنے جوش و جذبے کو سنبھالتے ہوئے یوٹرن لیا۔ اس نے سامراج مخالف جذبات کو ایک طرف رکھ دیا اور کہا کہ برطانیہ نے فادر لینڈ روس کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے۔ چنانچہ اب ہماری جدوجہد اور مزاحمت کا محور فاشسٹ (جاپان اور جرمنی) ہوں گے۔ ہماری اب برطانیہ سمیت اپنے جمہوری اتحادیوں سے کوئی مخاصمت نہیں ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کو اپنے اس یوٹرن کی انتہائی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ انہوں نے صرف برطانیہ کے ساتھ ہی خوش اخلاقی سے پیش آنا شروع نہیں کیا بلکہ قومی بورژوا قیادت کے ساتھ بھی مصالحت و اتفاق کا وطیرہ اپنا لیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پارٹی کا سبھاش چندر بوس سمیت کانگریس اور دیگر بائیں بازو کے رہنماؤں کے ساتھ تنازعہ شروع ہو گیا۔ پارٹی کے کانگریس میں کام کرنے والے کیڈروں نے نہرو جیسے لبرل سوشلسٹ اور جے پرکاش نارائن جیسے سوشل ڈیموکریٹس کے ساتھ بلاک قائم کر لیا۔ نہرو بھی گاندھی کی طرح سے برطانیہ کا تیار کردہ وہ پرزہ تھا جس کے ذمے تھا کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی سرکشیوں اور نوجوانوں کی ریڈیکلائزیشن کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرے۔ بعض مواقع پر تو پارٹی نے تحریک کے عین عروج کے وقت بورژوا لیڈرشپ کے ساتھ انتہائی تعاون کا مظاہرہ کیا حالانکہ ان موقعوں پر یہ ممکن تھا کہ تحریک کو طبقاتی بنیادوں پر

استوار کیا جاتا اور اسے بورژوا قیادت سے پاک صاف کیا جاتا۔ 28 جولائی 1920ء کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس کے ایک خصوصی سیشن میں قومی اور نوآبادیاتی سوال پر لینن کا تیار کردہ ڈرافٹ پیش کیا گیا تھا جس میں حسب ذیل کہا گیا تھا۔

''کمیونسٹ انٹرنیشنل کو نوآبادیاتی اور پسماندہ ملکوں کے اندر بورژوا جمہوریت کے ساتھ لازماً عارضی اتحادوں میں جانا چاہئے لیکن کمیونسٹوں کو ان میں کسی طور بھی ضم نہیں ہو جانا چاہئے۔ خواہ مزدور تحریک اپنی انتہائی ابتدائی حالت میں ہی کیوں نہ ہو!''۔ کمیونسٹ پارٹی کے کیڈروں کو ہر حال میں گاندھی اور نہرو کے طبقاتی کردار اور مفادات کو محروم عوام کے سامنے عیاں کرنا چاہئے تھا۔ ان کو چاہئے تھا کہ وہ کانگریس میں موجود سوشلسٹ یوتھ اور دیگر پرجوش کارکنوں کو کمیونسٹ پارٹی میں ریکروٹ کرتے اور اس طرح مزدوروں اور کسانوں کی ایک ایسی تحریک کو منظم و متحرک کرتے جو سامراجی تسلط کے خاتمے کا باعث بنتی۔ اور یہی جدوجہد کا سچا اور حقیقی کردار ہو سکتا تھا یعنی ایک طبقاتی جدوجہد۔

پارٹی کی جنگ کے بارے میں پالیسی میں اس اچانک تبدیلی نے نہ صرف عوام بلکہ خود پارٹی کے اندر عہدیداروں اور کارکنوں کو تذبذب، بے دلی اور مایوسی میں مبتلا کر دیا۔

8 اگست 1942ء کو گاندھی نے 'ہندوستان چھوڑ دو' مہم شروع کر دی۔ اس کی پرانی چالوں اور مکاریوں کی طرح سے یہ بھی اس کی ایک اور عاجزانہ پیشکش تھی جس سے برطانوی راج اور نوآبادیاتی کردار میں کوئی فرق نہ پڑنا تھا اور نہ ہی پڑا۔ اس کا مقصد بیک وقت طبقاتی تحریک کے جوش و جذبے کو ماند کرنا اور قومی بورژوازی کو متحد اور منظم کر کے تحریک کو قومی جمہوری تقاضوں تک محدود رکھنا تھا۔ اگرچہ سٹالن نے روزویلٹ اور چرچل کو خوش کرنے اور راضی رکھنے کیلئے تیسری انٹرنیشنل کی تنظیم کے ڈھانچوں کو ختم کر دیا تھا مگر وہ انڈین کمیونسٹ پارٹی کو ہدایات دینے سے باز نہیں آ رہا تھا اور اس کی پالیسیوں اور حکمت عملیوں کو متعین کر رہا تھا۔ جیلوں میں بند پارٹی لیڈروں نے برطانوی حکمرانوں سے خفیہ رابطے شروع کر دیئے۔ وہ اپنے نوآبادیاتی حکمرانوں کو ماں دھرتی میں رضاکارانہ خدمات پیش کرنے پر رضامند ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ کانگریس میں سرگرم راج مخالفین اور ''غدار'' کہلائے جانے والے سچے کارکنوں کے خلاف مزاحمت کیلئے بھی کام کرنے کو تیار ہو گئے۔ اس وقت پارٹی کے جنرل سیکرٹری ڈانگے نے وائسرائے ہندوستان لارڈ ویول کو خط لکھا اور جنگ کیلئے کمیونسٹ پارٹی کی خدمات پیش کیں۔ یوں پارٹی نے نہ صرف خود کو مسلسل سرگرم ہوتی ہوئی قومی آزادی کی تحریک سے الگ تھلگ کر لیا بلکہ اس نے اپنے

کیڈروں اور کارکنوں کو مایوسی، بیزاری اور بددلی کی پاتال میں دھکیل دیا۔ایک ایسے وقت میں جب پارٹی کے ہزاروں کارکن پھانسی لگائے جارہے تھے، جیلوں میں ڈالے اور بدترین تشدد کی بھینٹ چڑھائے جارہے تھے،اس وقت پارٹی پر عائد پابندی ہٹالی گئی یہی نہیں بلکہ نوآبادیاتی برطانوی حکومت کی طرف سے پارٹی مطبوعات کیلئے فنڈز کی فراہمی بھی شروع کردی گئی۔

بدقسمتی سے پارٹی کی پہلی کانگریس 1943ء میں ایک ایسے ماحول میں ہوئی جب پارٹی کا برطانیہ کے ساتھ مصالحت کا عمل زوروں پر تھا۔اس عرصے میں پارٹی ہڑتالیں روکنے،نوجوانوں کو مظاہروں سے دور رکھنے اور فوجیوں کو فوج سے بھاگنے سے منع کررہی تھی۔اس غداری ومصالحت کے ردعمل میں عوام کی طرف سے شدید غم وغصہ سامنے آیا۔کئی علاقوں میں کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر پر حملے کئے گئے اور ان کو نذرآتش کردیا گیا۔1940/1950ء کے دور کے کمیونسٹ پارٹی کے نظریہ دان رانا دیو نے لکھا ہے کہ ''ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہورہی تھی۔پارٹی عوام سے کٹ کے رہ گئی تھی''۔ پارٹی کیلئے زیادہ کڑا وقت دوسری عالمی جنگ کے دوران آیا۔جنگ کے آغاز پر ہندوستانی کمیونسٹوں نے برطانیہ اور فرانس کی حمایت کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ ہندوستان کی آزادی کو کسی بھی قابض قوت کے ساتھ سمجھوتے کی بھینٹ نہیں چڑھایا جائے گا۔جنگ کی مخالفت کا یہ موقف مقامی، صوبائی اور ملکی سطح پر کمیونسٹوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا باعث بن گیا۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ موقف کانگریس کے لیفٹ ونگ عناصر کے ساتھ ان کی قربت ورفاقت کا بھی باعث بن گیا۔

پارٹی کے اندر کچھ لیڈروں نے روس کے اس موقف کی مخالفت کی کہ جنگ کا کردار بدل چکا ہے اور یہ کہ یہ اب ایک ''عوامی جنگ'' میں بدل چکی ہے اس لئے دنیا بھر کے کمیونسٹوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس میں اتحادیوں کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیں۔ان مخالفت کرنے والوں میں کیرالہ سے کامریڈ کے دامودرن بھی شامل تھے۔مگر پارٹی نے ماسکو کی فرمانبرداری کرتے ہوئے برطانیہ کیلئے عسکری بھرتی کرنا شروع کردی۔جبکہ ماسکو موقف کی مخالفت کرنے والے کمیونسٹ کافی عرصے تک پابند سلاسل رکھے گئے اور بہت بعد میں رہا کئے گئے۔1942ء میں جب کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' مہم کا اعلان کیا تو وائسرائے نے سختیوں اور جبر میں اضافہ کردیا۔جو قید خانے پہلے کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں سے آباد تھے اور حال ہی میں خالی ہوئے تھے، وہاں اب کانگریس کے کارکنان قید کردیئے گئے۔کئی برسوں بعد دامودرن نے لکھا کہ پارٹی کی طرف سے سٹالن کے موقف کی اندھی تقلید اور فرمانبرداری نے کیا کیا تباہ

کن اثرات مرتب کیے:

''یہ موقف ان معذرت خواہوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ''عوامی جنگ''(people,s war) کا ساتھ دے کر اگرچہ ہم عوام کے دھارے کے برعکس چلے مگر ہمیں اس سے حاصلات بھی بڑی ملی ہیں۔ میں اس وضاحت سے کسی طور اتفاق نہیں کرتا۔ بلاشبہ پارٹی کو اس سے فائدے ہوئے اور اس پر برطانوی راج کی طرف سے عائد پابندی ختم ہونے سے یہ قانونی قرار پا گئی۔ جس سے پارٹی کی رکنیت سازی اور ٹریڈ یونین کی طاقت میں بڑھوتری ہوئی۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ پارٹی عوام کی تحریک کے خلاف چلنا شروع ہو گئی تھی اور اس کے سبھی اغراض و مقاصد برطانوی راج اور سامراج کے ساتھ وابستگی سے وابستہ ہو چلے تھے۔ کمیونسٹ ہونا ایک عزت دارانہ وصف قرار پا گیا۔ کئی نوجوان کمیونسٹ برطانوی فوج میں شامل ہو گئے اور ''سوویت روس کے تحفظ'' کا آدرش لے کر اٹلی اور شمالی افریقہ کے محاذوں پر بھیج دیئے گئے۔ ان میں سے کئی سوشلزم پر قائم رہنے اور پارٹی کیلئے انقلابی کام کرنے کی بجائے جنگ کے بعد بھی فوج کا ہی حصہ بنے رہے۔ یہ بھی درست ہے کہ جولائی 1942ء میں پارٹی کی ممبر شپ جو 4500 تھی، پارٹی کی پہلی کانگریس کے موقع پر مئی 1943ء میں 15500 کو پہنچ گئی تھی مگر ان نئے ارکان میں سے اکثریت کو نہ تو تحریک کا اور نہ ہی ریاستی جبر و تشدد کا تجربہ تھا۔ پارٹی کا سارا زور اور مصرف صرف ایک ہی قرار پایا کہ پارٹی کیلئے محض نئی فصل تیار کی جائے اور بس؛ جس سے پیداوار میں اضافہ ممکن ہوتا رہے؛ مطالبہ بھی بس یہاں تک محدود رہ گیا کہ قومی قیادت کو رہا کیا جائے؛ ایک قومی حکومت تشکیل دی جائے؛ اور یہ کہ مادر وطن روس کو جاپان کے قبضے میں نہیں آنے دینا جو کبھی ہوا بھی نہیں۔ ہڑتالوں اور مظاہروں کو سازش اور سبوتاژ قرار دے دیا گیا۔ دوسری جانب 1942ء میں کانگریس کی طرف سے کی جانے والی ''ہندوستان چھوڑ دو'' جدوجہد نے وہ زور پکڑا کہ جس کی نظیر نہیں تھی۔ لاکھوں مرد و زن خاص طور پر نوجوان نسل جوق در جوق اس کے گرد جمع ہو کر ریڈیکلائز ہوتے چلے گئے۔ اس کانگریسی تحریک کو سامراج کے خلاف ایک انقلاب سمجھ لیا گیا۔ ''کانگریسی سوشلسٹوں'' سبھاش چندر بوس اور اس کے ساتھیوں کو جنہوں نے جوانمردی سے ریاستی جبر و تشدد کا مقابلہ کیے رکھا ''غدار'' ''سازشی'' اور ''ففتھ کالمسٹ'' قرار دے دیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی قومی آزادی کی تحریک کے دوران، ایک دہائی میں دوسری بار عوام کے دھارے سے بالکل کٹ رہی تھی۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اپنی پالیسیوں کی وجہ سے عملی طور پر سامراج مخالف تحریک کو پلیٹ میں سجا کر کانگریس اور اس کی بورژوا

قیادت کو پیش کر دیا۔ اگر پارٹی درست حکمت عملی پر توجہ دیتی تو کانگریس کی ممبر شپ کے بڑے حصے کو متاثر کرتے ہوئے ان کو کمیونزم کی طرف مائل اور قائل کر سکتی تھی۔ جب میں رہا ہوا تو میں نے کئی ایسے مایوس و بددل لیفٹ ونگ کارکنوں کو دیکھا جو ہمارے جلسوں اور مظاہروں میں ''سامراج کے حمایتی مردہ باد'' کے نعرے جوش جذبے کے ساتھ لگانے آتے تھے۔

ایک ایسے وقت میں جب عوام کا دھارا زوروں سے بہہ رہا ہو اور وہ بھی درست سمت میں بہہ رہا ہو' دھارے سے یکسر منہ موڑ لینا یہ سیدھا سادہ نہ صرف یقینی آزادی بلکہ سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کے موجود امکان کو زندہ ڈبو دینے کے سوا کچھ نہیں ہوا کرتا''۔(10)

کمیونسٹ پارٹی کی جنگ کے دوران کے موقف کی کسی توضیح کو کسی حوالے سے بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ سے پارٹی کے سرگرم کارکن اور قومی آزادی کی تحریک میں واضح تقسیم اور علیحدگی پیدا ہوگئی۔ جنگ پر پارٹی کا موقف اسے مسلم لیگ کے نزدیک لے آیا۔ مسلم لیگ کے فروغ نے کمیونسٹ پارٹی کیلئے ایک اور بڑی سٹریٹجک غلطی کرنے کے حالات پیدا کر دیئے۔ بجائے اس کے کہ اپنے حمایتیوں کے سامنے مذہبی سیاست کا درست تنقیدی تجزیہ کر کے ان کو درست متبادل فراہم کیا جاتا، معروف نظریہ دان ادھیکاری کے الفاظ میں ''کمیونسٹ پارٹی نے ان خود ساختہ کمیونل مسائل خصوصاً ہندو مسلم مسئلے کو ایک حقیقی قومی مسئلہ سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ سب ''عوامی جنگ'' کے عرصے کے دوران (1942/45ء) ہو رہا تھا، مسلم لیگ کی طرح سے کمیونسٹ پارٹی بھی قومی مسئلے کے سیاسی کیمپ میں داخل ہو رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کی ستمبر 1942ء میں ہونے والی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ میں ''پاکستان اور قومی یکجہتی'' کے نام سے ایک قرارداد منظور کی گئی جو نظریاتی ابہام اور موقع پرستانہ سیاست کا مرقع تھی۔ اس کی ابتدا اسٹالن کے غلط نظریہء قوم کی تعریف سے کی گئی اور یہ قرار دیا گیا کہ مسلمان ایک قومی اقلیت ہیں لہذا انہیں حق خود ارادیت دے دیا جانا چاہئے''۔(11)

کمیونسٹ پارٹی مکمل طور پر ''قوم'' کی مارکسی روایت کی روشنی میں تعریف پیش کرنے اور اس پر اکتفا کرنے سے قاصر رہی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ان کے اور عوام کے درمیان سیاسی دوری اس حد تک نہ بڑھتی۔ مارکس اور لینن کے نزدیک کبھی بھی ایک مشترکہ زبان اور ثقافت بورژوا قوم اور ریاست کی بنیاد نہیں رہے۔ مذہب تو صرف ایک فرد کی انفرادیت کی وضاحت کرتا ہے اور کسی معاشرے کی بنیاد نہیں ہوتا۔

یہ وہ وقت تھا جب کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کو مذہبی سیاست کے خلاف واضح موقف رکھنا چاہیے تھا۔لیکن اس نازک وقت میں وہ ''طاقتور اور ظالم دشمنوں'' (جاپانیوں) کے خلاف مادر وطن کے تحفظ کے نظریے کی تبلیغ کرتے رہے جس کے بعد مارکسی سیاست کو لاگو کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔اس غلط نظریے کو اپنانے کے بعد غلط نظریاتی سیاست ہی کی جاسکتی تھی۔صرف جنگ کے خاتمے کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اپنے موقف کو تبدیل کیا اور وہ بھی برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے راہنما آر پالمے دت کے کہنے پر۔ دت نے 1946ء میں موقف اختیار کیا کہ پاکستان کی بنیاد قومیت پر نہیں بلکہ مذہب پر ہے۔CPI نے اس موقف کو مانتے ہوئے پاکستان کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ برطانوی سامراج اور مسلمان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایک مشترکہ سازش ہے جس کا مقصد ان کے مفادات کا تحفظ ہے۔ بہت سے ''مسلمان کمیونسٹ'' اس موقف کی تبدیلی کو جلدی نہ سمجھ پائے اور 1947ء تک وہ مسلم لیگ میں ہی رہے۔ جہاں وہ سٹالنسٹ قیادت کے حکم پر ہی گئے تھے تاکہ وہاں جاگیرداروں کے خلاف ''ترقی پسند'' عناصر کی مدد کرسکیں۔

سندھ کے ایک پرانے ''کمیونسٹ'' اور CPI کے سابقہ ممبر سوبھوگیان چندانی نے ایک حالیہ انٹرویو میں اس موقف کی تبدیلی کے بعد پیدا ہونے والی دلچسپ صورتحال کے متعلق بتایا۔

''1943ء میں کمیونسٹ پارٹی نے یوٹرن لیا اور برطانیہ کی حمایت شروع کردی۔ پوری دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں نے جنگ پر اپنا موقف تبدیل کرلیا تھا۔ان کے خیال میں ایک سامراجی جنگ سے اب یہ عوامی جنگ بن چکی تھی۔اس نئے خیال کو طلباء میں پھیلانے کے لئے ایک میٹنگ بلائی گئی۔کمیونسٹ پارٹی نے اس کام کے لئے مقیب الدین فاروقی' سجاد ظہیر اور میاں افتخار کو ہمارے پاس بھیجا' فاروقی جو کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری اور دہلی یونیورسٹی سے اس میٹنگ میں شرکت کے لئے آیا تھا' اس نے طلباء سے خطاب کیا۔اس نے کہا کہ طلباء اس فیصلے کو غداری نہ کہیں کیونکہ دنیا تبدیل ہورہی ہے اور ہم (کمیونسٹ پارٹی) بھی اس کے ساتھ تبدیل ہورہی ہے۔سندھی کامریڈ جو انقلابی عہد میں بالغ ہوئے تھے حیران رہ گئے کہ انہیں برطانیہ کی حمایت کرنے کے لئے کہا جارہا ہے۔

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس موقف پر ڈٹی رہی لیکن وہ کچھ طلباء کو اپنی پسند کی ذہانت پر قائل نہ کرسکے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب ہزاروں طلباء جیل جانے کیلئے تیار ہیں تو میں کیسے پیچھے رہ سکتا ہوں۔لہذا میں نے برطانوی راج کے خلاف جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا''۔(12)

مزاحمت اور انقلاب

1940ء کی دہائی ایشیا سمیت دنیا بھر میں انقلابات کی دہائی تھی۔1946ء ہندوستان میں انقلاب کا سال تھا۔اس سال تحریک اتنے زوروں پر تھی کہ برطانوی حکمرانوں کو انڈین نیشنل آرمی INA کے ان سبھی لیڈروں کو رہا کر دینا پڑ گیا جن کو غداری کے الزام میں گرفتار کیا ہوا تھا۔اس وقت INA کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لوگ کانگریس کے عدم تشدد اور عاجزی کے نظریے سے سراسر بے نیاز ہو چکے تھے۔دوسری عالمی جنگ کے بعد سے برطانوی فوج کے اندر بے چینی اور اضطراب حد درجہ بڑھ گیا تھا، برطانوی افسر اور جوان جنگ سے اکتا چکے تھے۔ہانگ کانگ سے لے کر مصر تک بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔عوام کی یہ سرکشی کسی سے روکے نہیں رک رہی تھی اور اس کی شدت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔قصبوں اور دیہاتوں میں نسلوں سے خاموش مخلوق نہ صرف جاگ اٹھی بلکہ اتنی متحرک ہوئی کہ سامراجی تسلط کے قدم اکھڑتے چلے گئے۔

یکم مارچ 1946ء کو جبل پور کی بیرکوں میں سپاہیوں کی بغاوت پھوٹ پڑی جبکہ 18 مارچ کو ڈیرہ دھون کے اندر گورکھا رجمنٹ نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔جبکہ کئی واقعات میں آرمی اور ایر فورس کے ہندوستانی افسروں کا غم وغصہ پھٹ کر سامنے آ گیا۔برطانوی راج کے خلاف سب سے بڑا احتجاج برٹش انڈین نیوی کے جہازیوں کی طرف سے ہوا، 18 فروری 1946ء کو جنگی جہاز ''HMS تلوار'' پر جو کہ بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز تھا، جہازیوں نے ناقص خوراک اور بدتر حالات کے خلاف احتجاجاً ہڑتال کر دی۔اگرچہ یہ ایک پرامن بھوک ہڑتال تھی تاہم برطانوی راج کے خلاف بڑی اور موثر بغاوتیں ابھی آگے منتظر تھیں۔19 فروری کو جہازیوں نے ہڑتال کو قلعے اور بیرکوں میں لے جانے کا اعلان کر دیا۔انہوں نے نیوی ٹرکوں پر قبضہ کرتے ہوئے ان کو بند کر کے کھڑا کر دیا اور ان پر سرخ پرچم لہرا دیئے اور پھر ان پر بمبئی شہر کی سڑکوں پر مارچ شروع کر دیا۔انہوں نے ٹرکوں پر سوار ہو کر بمبئی کے عوام سے اس ہڑتال میں ان کا ساتھ دینے کی اپیل کر دی جس کے نتیجے میں برطانیہ اور سامراج مخالف جذبات جنگل کی آگ کی طرح سارے علاقے میں پھیل گئے۔19 فروری 1946ء کی شام تک نیوی کے افسروں اور جوانوں کی بڑی تعداد اس ہڑتال میں شامل ہو چکی تھی۔بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز رائل انڈین بحریہ کے جہازوں پر لگے یونین جیک کے پرچم اتار کر پھاڑ دیئے گئے۔اور ان کی بجائے

جہازیوں نے سرخ رنگ کے جھنڈوں سمیت ان پارٹیوں کے پرچم جہازوں پر لگا دیئے جو آزادی کی جدوجہد میں سرگرم تھیں۔ 48 گھنٹوں کے اندر اندر برطانوی راج کو اپنے بحریہ کے یونٹس کی جانب سے سب سے بڑی بغاوت کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ پہلے بغاوت سرگوشیوں کے ذریعے اور پھر ریڈیو کے ذریعے یونٹس کے اندر پھیلی جس پر ان باغیوں نے اس دوران قبضہ کرلیا تھا۔ یوں یہ بغاوت سارے ملک کی گیریژنوں اور بیرکوں تک پھیل گئی۔ باغی جہازیوں کے کچھ لیڈروں نے باغیانہ پیغامات کے ساتھ انقلابی نظمیں اور گیت پڑھنے اور سنانے شروع کر دیئے اور یوں یہ سلسلہ دن رات چلنے لگا۔ یہ بغاوت سبھی ساحلوں پر موجود 74 بحری جہازوں، 20 بیڑوں اور 22 بیرکوں تک سرایت کر گئی۔ ان نیول سٹیشنوں میں بمبئی، کلکتہ، کراچی، مدراس، کوچن اور وشاکا پٹنم شامل تھے۔ 20 فروری کو ہونے والی مکمل ہڑتال میں صرف 10 جہاز اور 2 نیول سٹیشن شریک نہیں ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ سب خودرو اور اچانک ہی ہوا تھا مگر یہ مکمل سچ نہیں ہے۔ 19 فروری کی شام کو ایک ہڑتالی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا؛ سگنل مین ایم ایس خان اور پیٹی افسر ٹیلی گراف آپریٹر مدن سنگھ کو اس کا اتفاق رائے سے صدر اور نائب صدر چنا گیا۔ ایک سکھ دوسرا مسلمان اور دونوں کی عمریں 25 سال سے کم تھیں۔ یہ ایک شعوری فیصلہ تھا جس کا مقصد قومی آزادی کی تحریک میں مذہبی تعصب کو پھیلانے کی کوششوں کو مسترد کرنا تھا۔ جو تحریک کے بورژوا لیڈر اپنے برطانوی آقاؤں کے اشارے پر کرتے جا رہے تھے۔

اس ہڑتالی کمیٹی کے ایجنڈے میں یہ بھی شامل تھا کہ قومی آزادی کی تحریک میں شامل پارٹیوں کے ساتھ رابطے اور بات چیت کر کے ان کی تائید و حمایت حاصل کی جائے۔ کمیونسٹ پارٹی اپنی برطانوی سامراج کی حمایت کرنے کی تباہ کن پالیسی کے باعث آزادی کی تحریک سے باہر ہو چکی تھی۔ انہی دنوں ہندوستان کی بورژوازی اور ان کے نمائندہ لیڈر برطانیہ کے ساتھ مصالحت اور سمجھوتے کیلئے مذاکرات میں مصروف تھے۔ تاریخ کے ایسے فیصلہ کن مرحلے پر یہ لوگ بھی برطانیہ کی طرح ہر قسم کی سرکشی اور بغاوت کے دشمن تھے۔ گاندھی نے تو کھل کر جہازیوں کی سرکشی کی مخالفت کر دی جبکہ کمیونسٹ پارٹی بحریہ کے سپاہیوں کی اس بغاوت کو ٹیکسٹائل ریلوے اور صنعتوں کے دوسرے شعبوں میں ان دنوں ہونے والی ہڑتالوں کے ساتھ جوڑنے میں ناکام رہی جو سارے ملک میں ہو رہی تھیں۔ اسی طرح سے سبھاش چندر بوس جیسے لیڈر بھی اس ضمن میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکے۔ سبھاش چندر تو برطانیہ مخالفت میں حد سے زیادہ

آگے نکل گیا تھا اور وہ انڈین نیشنل آرمی پر زور دیتا رہا کہ وہ برطانیہ کی فوج کے ساتھ لڑیں اور یوں وہ جاپان کی رجعتی حکومت کا ساتھ دیتا رہا۔

کانگریس اور مسلم لیگ خوفزدہ ہو گئیں کہ انقلاب اور طبقاتی جدوجہد کے نظریات اس تحریک میں گہرائی میں سرایت نہ کر جائیں جسے وہ مذہبی تعصب کے ذریعے تقسیم اور کمزور کر چکے تھے۔ بورژوا قیادت کی پیہم غداریوں اور سازشوں کے باوجود انقلابی سرکشی کا سلسلہ کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سارا ملک انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ ان نعروں کے حوالے سے پیدا ہونے والے جوش وجذبے اور سرگرمی نے سارے بمبئی کی کیفیت کو ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ اس دور کے ایک معروف شاعر جوش ملیح آبادی نے یہ مقبول عام ترانہ لکھا:

میرا نام شہید' میرا کام آگے بڑھنا'
میرا نعرہ انقلاب' انقلاب' انقلاب

21 فروری کو برطانوی فوج نے اس وقت جہازیوں پر فائر کھول دیا جب وہ بمبئی قلعے میں سے اپنی بیرکوں سے باہر نکل رہے تھے۔ اس اشتعال انگیزی نے پرامن سرکشی کو پرجوش بغاوت میں بدل کر رکھ دیا۔ سارا دن جہازیوں اور برطانوی ایلیٹ فورس کے مابین مسلح جھڑپیں ہوتی رہیں۔ پہلے دن بمبئی میں ایک جہازی اور دوسرے دن کراچی میں 14 جہازیوں کی شہادت واقع ہوئی۔ برطانوی ایلیٹ فورس نے جہازیوں کے ساتھ یکجہتی کرنے والے صنعتی مزدوروں کے خلاف بھی ایسا ہی جبر وتشدد شروع کر دیا۔ 22 اور 23 فروری کو برطانوی فوج کی وحشت سے 250 جہازی اور مزدور شہید کر دیئے گئے۔ کچھ چشم دید گواہوں کے بقول 21 فروری کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سارا برصغیر ہی سامراجی تسلط کے خلاف انقلابی جوش اور ولولے سے لیس ہو کر سرگرم ہو چکا تھا۔ اس تحریک کے دوران انقلابی ہڑتالی کمیٹی نے اپنی کمان ''نابرا بحری بیڑے'' پر منتقل کر دی تھی۔ جہازیوں نے اپنے جہازوں پر موجود بندوقوں کا رخ برطانوی نیول تنصیبات اور ساحلوں پر موجود مراکز کی طرف کر دیا۔ سبھی جہازوں سے سائرن بجائے گئے، جہازیوں نے لاؤڈ سپیکروں سے اعلان کئے کہ اگر برطانوی حکومت نے شہروں میں یا ساحلوں پر جدوجہد کرنے والے ان کے ساتھیوں پر حملہ کیا تو وہ اپنے اوپر ہونے والی ہر زیادتی اور حملے کا بھرپور جواب دیں گے۔ اور وہ برطانوی فوجی تنصیبات اور مراکز کو تہس نہس کر دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

لندن میں برطانوی حکومت اس اعلان سے دہل کر رہ گئی۔ لیبر پارٹی کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی

نے سر اٹھانے والوں کے سر کچل دینے کے احکامات جاری کر دیئے۔ برٹش انڈین نیوی کے سربراہ ایڈمرل گوڈفرے نے باغی جہازیوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ ہتھیار ڈال دیں یا پھر مرنے کیلئے تیار ہو جائیں۔ انڈین کانگریس کے ایک معروف لیڈر ولابھ بائی پٹیل نے کھل کر برطانیہ کے اس اعلان کی تائید کرتے ہوئے اور جہازیوں کی مذمت کرتے ہوئے برطانیہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس سرکشی کے دوران ہندوستان کی دونوں معروف ہندو اور مسلم قیادتیں کھل کر برطانوی سامراج کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ اس سے ان کا طبقاتی کردار عیاں ہوتا ہے اور برصغیر کی تقسیم کے ضمن میں ان کا برطانوی سامراج کے ساتھ میل ملاپ اور گٹھ جوڑ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

اس وقت جب برطانوی لڑاکا طیارے باغی جہازیوں کے سروں پر سے پرواز کر رہے تھے، ایسے حالات میں سردار پٹیل نے بدنام زمانہ بیان جاری کیا؛ ''چند بدقماش جوشیلے اور غنڈہ قسم کے نوجوان خواہ مخواہ اپنی سرگرمیوں سے سیاست چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں، حالانکہ ان کو سیاست کی قطعاً کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہے''۔(13)

اپنی قومی و ملکی قیادت کے اس مایوس کن، حوصلہ شکن اور روح فرسا ردعمل سے دلبرداشتہ ہو کر ایم ایس خان نے ہڑتالی کمیٹی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی تجویز رکھ دی۔ 36 رکنی کمیٹی نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ کئی گھنٹے اس جان لیوا کیفیت میں گزرے۔ ملکی و قومی قیادت نے سر دھڑ کی بازی لگائی کہ جہازیوں کی اس تحریک کو برصغیر میں پھیلی قومی آزادی کی تحریک کے ساتھ کسی طور بھی نہ جڑنے دیا جائے۔ اور یوں اسے تنہا کر دیا جائے۔ ہڑتالی کمیٹی کے ارکان اس کیفیت سے بددل ہونا شروع ہو گئے۔ 24 فروری کی علی الصبح ''HMS تلوار'' پر ہڑتالی کمیٹی کی میٹنگ شروع ہوئی۔ جو صورتحال بن چکی تھی، اس سے یہی لگتا تھا کہ ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی رستہ نہیں بچا۔ چنانچہ صبح 6 بجے جہاز پر سیاہ جھنڈے لہرا کر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اپنی اس آخری میٹنگ میں ان باغی ہڑتالی جہازیوں نے جنوبی ایشیا کے محروم و مقہور عوام کے نام ایک قرارداد پیش اور منظور کی:

''ہماری یہ سرکشی اور بغاوت ہم محروم لوگوں کی زندگی کا سب سے بڑا، سب سے اہم تاریخی واقعہ تھی۔ پہلی بار یہ ہوا کہ وردی اور بغیر وردی کے مزدوروں کا خون ایک ہی مقصد کیلئے ایک ساتھ ہی سڑکوں پر موجزن ہوا۔ ہم وردی کے مزدور کبھی بھی اسے فراموش نہیں کر پائیں گے۔ ہم یہ بھی سمجھتے اور جانتے ہیں کہ آپ بغیر وردی والے محنت کش بھی اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ہمیں یقین ہے ہماری آنے

والی نسلیں اس واقعے سے سبق سیکھیں گی اور ہم جو حاصل کرنے میں ناکام رہے وہ اسے ہر حال میں حاصل کر کے چھوڑیں گی۔ محنت کش طبقہ زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد''۔(14)

بغاوت کے بعد

ہتھیار ڈالنے کے باوجود سرکشی کرنے والوں کی اکثریت کو گرفتار کر کے ان میں سے کئی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ 15 مارچ کو رائل انڈین نیوی کے سرکش سپاہیوں نے' جو ابھی تک جیلوں میں قید تھے، بھوک ہڑتال کر دی۔ تحریک آزادی کی قومی قیادت نے اس کے حق میں کسی قسم کے ساتھ اور احتجاج سے یکسر انکار کر دیا۔ یہی حالت قومی آزادی کی علمبردار پارٹیوں کی بھی رہی اور انہوں نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا۔

1980ء کی دہائی کے اوائل میں بھارت میں سبالترن سٹڈیز Subaltern Studies کے نام سے تاریخ کا ایک سکول قائم کیا گیا۔ اٹلی کے مارکسسٹ انتونیو گرامچی کی تحریروں سے متاثر ہو کر کام کرنے والے ان مورخین نے کہا کہ ہم کیمبرج اور قوم پرستوں کے اس نقطہء نظر کو یکسر مسترد کرتے ہیں کہ نیشنلزم صرف اشرافیہ کی ہی کاروائی و کارکردگی تھی اور ہندوستان کے سبالترن طبقے (دیہی کسانوں اور شہری مزدوروں) کے کسی آزاد سیاسی عمل کا اس کی تعمیر و تشکیل میں کوئی عمل دخل ہی نہیں تھا۔ اس ادارے کی طرف سے سامنے آنے والی دستاویزات کا مقصد ہندوستان کے سبالترن طبقے کی سرگرمیوں اور نومبر 1945ء سے لے کر فروری 1946ء تک کی ان کی برطانوی راج و سامراج کے خلاف کی جانے والی زندہ جاوید جدوجہد کو اجاگر کرنا تھا۔ انڈین نیشنل آرمی INA کے پابند سلاسل ورکروں کے ٹرائل کے خلاف اور رائل انڈین نیوی کے جہازیوں کی مثالی جدوجہد کے حق میں ہندو اور مسلمان اتحاد کا اظہار کرتے طلبہ اور محنت کشوں کے کلکتہ بمبئی اور کراچی میں ہونے والے احتجاج، وسیع پیمانے پر یکجہتی کی ہی علامت تھے۔ بمبئی کے اندر تو عمومی نظم و نسق اس وقت قائم کیا جا سکا جب وہاں بغاوت کے بعد مظاہروں میں 248 احتجاجیوں کو ہلاک اور 1046 کو زخمی کر دیا گیا۔ رائل انڈین نیوی میں ہونے والی بغاوت نے برطانوی راج کی بنیادیں ہلا کے رکھ دیں۔ برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے 19 فروری 1946ء کو انڈیا میں ایک کیبنٹ مشن روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بغاوت کا یہ واقعہ ہی سب سے اہم ترین عنصر تھا جس نے برصغیر کی آزادی کے فیصلے کو ممکن العمل کر دیا۔

یہی بغاوت تھی جو سامراجی اتھارٹی کو تہس نہس کرنے کی بنیاد بنی مگر المیہ یہ ہے کہ اس واقعے کو تاریخ کے صفحات سے ہی غائب کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد ان باغیوں میں سے کئی ہجرت کر کے پاکستان آئے کہ شاید یہاں انہیں ایک نئی شناخت' نیا تشخص میسر آ جائے لیکن ان کے خواب چکنا چور ہو گئے اور انہیں رائل پاکستان نیوی میں کام کرنے کا اہل ہی نہیں سمجھا گیا۔ کچھ ایسی ہی بدقسمتی بھارت میں رہ جانے والے ان کے ساتھیوں کا مقدر بھی بنی۔ تاہم بہت بعد میں 1973ء میں بھارتی حکومت نے انہیں سرکاری طور پر RIN کا سابق ملازم تسلیم کر لیا اور بغاوت میں حصہ لینے پر ''آزادی کے مجاہد'' قرار دے کر پنشن دینے کا اعلان کیا۔

یہ بات حیران کن ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کی سرکاری تاریخ سے اس عظیم واقعے کو کھرچ دیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی قیادت کا اس کی طرف رجحان اگر دشمنانہ نہیں بھی تھا تو کراہت آمیز ضرور تھا۔ ایس کے پٹیل اور آئی آئی چندریگر جو اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے سربراہ تھے، نے کمال اتفاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرکار کو پیشکش کی کہ ''ہم اپنے رضا کار، پولیس کی مدد کیلئے فراہم کرنے کو تیار ہیں''۔ پٹیل کی دلیل تھی کہ فوج میں کسی قسم کی دراڑ یا خراش کسی طور بھی قابل برداشت نہیں ہونی چاہئے۔ اور ایک مضبوط و متحد فوج ہم سب کی ضرورت ہے جو ہمیں ایک آزاد ہندوستان میں بھی چاہئے ہوگی۔ گاندھی نے کہا کہ اس قسم کے واقعات سے دنیا بھر میں بھارت کی بدنامی ہوئی ہے اور ہماری ساکھ متاثر ہوئی ہے۔ ہندو' مسلمان اور دیگر کی طرف سے اس قسم کی پرتشدد کاروائیاں سراسر ''غیر مقدس'' ہیں۔ محمد علی جناح نے RIN کے نمائندوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ہم اسی صورت میں آپ کی مدد کر سکتے ہیں اگر آپ آئینی' قانونی اور پرامن طور طریقوں سے اپنے مسائل و مطالبات پیش کریں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ ان پر غور کیا جا سکتا ہے''۔(15)

ارونا آصف علی، گاندھی کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو آئینی فرنٹ کی نسبت ایک مزاحمتی مظاہرے میں متحد کرنا کہیں زیادہ آسان کام ہوتا ہے۔ سومیت سرکار، ارونا کے اس موقف کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نہ تو برطانویوں کو آئینی طریقوں سے ہندوستان سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کیا جا سکا اور نہ ہی کوئی بہت بڑی عوامی انقلابی تحریک کے ذریعے ایسا ممکن بنایا جا سکا۔

دستاویزات کا وہ حصہ جو 14 رجمنٹ سے تعلق رکھنے والے کیپٹن عبدالرشید ڈے کے موقع پر

ہونے والی گڑبڑ اور رائل انڈین نیوی کی سرکشی سے متعلق ہے،مکمل واضح کرتا ہے کہ ہندوستانی نیشنل لیڈرشپ کا رویہ کس قدر محتاط تھا۔سیاسی پارٹیوں کے پاس گڑبڑ اور سرکشی کو روکنے کی ایک انتہائی دلکش اور جامع دلیل یہ تھی کہ چونکہ اب اقتدار ان کو منتقل ہونے والا ہے اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ ان کو ورثے میں ایسی فوج ملے جو باغیانہ رجحانات کا ریکارڈ رکھتی ہو اور ڈسپلن سے باہر ہو جاتی ہو۔اگرچہ دستاویز کے جس حصے کا ہم حوالہ دے رہے ہیں،اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کی ہندو اور مسلمان قیادت کے بیانات مختصراً درج کیے گئے ہیں۔تاہم ان کے تفصیلی نقطہ ہائے نظر ہمیں دیگر دستاویزات میں باآسانی مل جاتے ہیں۔یہ دستاویزات،غالباً پہلی بار،مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں کے حوالے سے ایک منفرد بصیرت اور نایاب مواد ہمارے سامنے لاتے ہیں۔سال 1946ء مزدور تحریک کی بے چینی کے حوالے سے بے مثال اور یادگار سال ثابت ہوا۔یہی نہیں بلکہ اس کی کوکھ سے کئی نئی طاقتور تحریکوں نے جنم لیا۔جس کتاب سے یہ مواد اخذ کیا گیا ہے اس میں 250 دستاویزات کسانوں اور مزدوروں کے معاملات سے متعلق ہیں جو کہ بے شمار مختلف ذرائع اور پرائیویٹ اخبارات سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔جن کو پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے،یہ دیکھ کر کہ کس طرح خاکروبوں سے لے کر کان کنوں تک،ریل کے مزدوروں سے لے کر سفید پوش پوسٹل ورکروں اور بینک ایمپلائز تک یہاں تک کہ فوجی اداروں کی انتظامیہ کے ملازمین تک ان مظاہروں اور ہڑتالوں میں شریک ہوئے۔ریلوے اور پوسٹل ورکرز تو سارے ہندوستان میں ہڑتال پر چلے گئے تھے جبکہ اس دوران الٰہ آباد میں 80000 مظاہرین نے دفاتر کا گھیراؤ کر لیا تھا۔یہ سبھی ہڑتالیں اور مظاہرے سختی کے ساتھ کچل دیئے گئے۔یہ دستاویزات اس سال کی مزدور تحریکوں میں کمیونسٹوں کے کردار کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔تاہم دستاویزات میں کسانوں کی تحریکوں سے متعلق جو مواد ہے،وہ اپنے وقت اور کردار کے حوالے سے انتہائی اچھوتا ہے۔پنجاب سے متعلق کچھ منتشر واقعات سے قطع نظر،دستاویزات کا ایک بہت بڑا حصہ تنجور،رامناد اور مالابار کے علاقوں سے متعلق ہے جبکہ بمبئی کے وارلی قبائل کے احتجاج اور پھر بنگال میں تیبھاگا تحریک کی شروعات جو کہ مزارعین نے شروع کی تھی اور جس میں ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے امیر مالکان ان کو فصل کا دو تہائی حصہ دیا کریں جو پہلے انتہائی کم (یعنی آدھا) ہوتا تھا۔

اس مقام پر مصنف لکھتا ہے کہ ”مزدوروں کے مقابلے میں ان تحریکوں کے اندر کمیونسٹوں کی مداخلت زیادہ نمایاں تھی اور یوں بائیں بازو کی قیادت کا حامل ایک اور طاقتور احتجاج ہمارے سامنے

آتا ہے جسے کبھی پوری طرح نہ تو محسوس اور نہ تسلیم کیا گیا۔اور جو ابھی تک یاد کیے جانے کے قابل اور ایک کمیونسٹ تحریک کے متحرک متبادل کے طور پر موجود ہے۔تاہم مرکزی قیادت کا مصالحت کرنے کا انتخاب کر لینا اور پھر اس انتخاب کے نتیجے میں برصغیر کی تقسیم کو ایک لازمی معاوضے کے طور پر قبول کر لینا، یہ سب لاکھوں بے سروسامان اور خانماں خراب انسانوں کی بے شمار قربانیوں کی قیمت پر کیا گیا۔

یہ سب کچھ گزر گیا لیکن یہ سب کچھ برطانوی راج سے آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کے عظیم ترین باب ہیں۔بلاشبہ اس بغاوت اس سرکشی کو کچل دیا گیا مگر اس سے قابض برطانیہ کو یہ سمجھ آ گیا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا! اسی کے براہ راست نتیجے میں ہی برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ کو اعلان کرنا پڑ گیا کہ برطانیہ جون 1948ء سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ دے گا۔یہ کیفیت تھی کہ ایک تحریک کو شکست دیتے اور اسے کچلتے ہوئے برطانوی حکمرانوں کا اعتماد کس قدر کھوکھلا اور شکستہ ہو چکا تھا! برطانوی سامراجی، مقامی بورژوا قیادت کے ساتھ ساز باز کر کے نسلی اور مذہبی بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ان واقعات کے بعد برطانویوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دیں گے مگر ایسے نہیں چھوڑیں گے، انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی اس راجدھانی کو متحد حالت میں نہیں بلکہ منقسم کر کے ہی روانہ ہوں گے، خواہ اس کی کوئی شکل ہو اور کچھ بھی کرنا پڑ جائے۔اس کو کسی کنفیڈریشن کی شکل دے دی جائے یا کوئی اور سیاسی روپ بہروپ، جس کا ارادہ شاید وہ ان تاریخی واقعات سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ یہ طے ہو گیا کہ برطانیہ ''تقسیم کرو اور راج کرو'' کی پالیسی پر عمل کا فیصلہ کر چکا تھا۔ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کی مروجہ سیاسی تاریخ میں ایسے عظیم الشان واقعات کا سرے سے ریکارڈ نہ ہونا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ایسے کئی بڑے زندہ و پائندہ واقعات اور بھی ہیں جنہیں ابھی عوام کے سامنے آنا اور منظر عام پر لایا جانا ہے۔نوجوانوں اور مزدوروں کی نئی نسلوں کو فروری 1946ء کے جہازیوں کی ہڑتالی کمیٹی کے پیغام اور ان کے ولولے کو پڑھنا' سمجھنا اور محسوس کرنا ابھی باقی ہے۔اس بغاوت کی شدت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو دہلا کے رکھ دیا تھا اور اس کے انتہائی گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے تھے۔کمیونسٹ قیادت شدید دباؤ میں تھی اور نیچے سے اس کے کارکنوں، عہدیداروں، فل ٹائمروں اور نوجوانوں میں تذبذب بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔کمیونسٹ پارٹی نے بمبئی میں ایک عام ہڑتال کی کال دی جس نے سارے شہر کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔جب ریاست کے مسلح جتھے احتجاج کرنے والوں کو کچلنے کیلئے نکلے تو مزدوروں نے سارے رستے اس طرح سے بند کر دیئے کہ وہ کوئی نقل و حرکت ہی نہ کر پائیں۔شہر کی

سبھی گلیاں اور رستے کارزار بن گئے۔تین دنوں تک جاری رہنے والی،ریاستی اداروں کے ساتھ ان جھڑپوں کے نتیجے میں 400 سے زائد افراد ہلاک جبکہ سینکڑوں زخمی ہوگئے۔19 مارچ 1946ء کو ملک کے سبھی اہم شہروں میں موجود پولیس کے مراکز میں ایک ہڑتال پھٹ پڑی۔الٰہ آباد میں تو پولیس نے بھوک ہڑتال کر دی۔دہلی پولیس 22 مارچ کو ان کے ساتھ شریک ہوگئی۔3 اپریل کو بہار میں 10000 پولیس اہلکاران کے ساتھ شامل ہوگئے۔اور پھر ورکرز بھی جلد ہی ہڑتالوں کے اس سلسلے میں شامل ہوگئے۔2 مئی 1946ء کو نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ہڑتال ہوگئی۔پھر 11 جولائی کو پوسٹل ورکرز نے سارے ملک میں ہڑتال کا اعلان کردیا۔اس کے ساتھ ہی صنعتی ورکروں نے بھی ہڑتال کے اس عمل میں بھرپور شریک ہونے کا اعلان کردیا۔یوں سارا ہندوستان ان سرکشیوں' بغاوتوں اور ہڑتالوں کا حصہ بن گیا۔برطانیہ اپنے ریاستی مسلح اداروں پر کنٹرول سے ہی محروم ہوتا جارہا تھا۔اس کڑے اور کٹھن وقت میں سامراجی راج کو ہزیمت سے بچانے کیلئے سب سے پہلے، ہندوستان کی ہر مذہب کی سیاسی قیادت کو میدان میں اترنا پڑا۔

کانگریس کی قیادت اس انقلابی کیفیت سے لرز کر رہ گئی۔خطرے کی گھنٹیاں تیزی سے بج رہی تھیں۔1939ء سے 1946ء تک کانگریس کے سربراہ مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا تھا کہ یہ ابھی براہ راست عمل کا وقت نہیں ہے۔اس کے بقول ''ابھی ہمیں واقعات کے تسلسل کو دیکھنا چاہئے اور تب تک برطانوی حکومت کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے''۔جبکہ نہرو کا موقف تھا کہ ''جو کچھ ہو رہا ہے اور ہو چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح سے سماج دشمن عناصر بمبئی جیسے بڑے شہروں میں صورتحال کو خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ہماری آزادی کا دن زیادہ دور نہیں اور ایسے اشارے موجود ہیں جن سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اپنی آزادی جیتنے کے نزدیک پہنچ چکے ہیں مگر میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ہم میں اس نظم وضبط کا شدید فقدان ہے جو کہ ایک آزاد ملک کیلئے ضروری ہوتا ہے''۔(16)

فروری 1946ء میں کلکتہ اور مدراس بھی پھٹ پڑے جبکہ کراچی میں کیفیت کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئی کہ اسے انتہائی بے رحمی سے کچلنا ضروری ہوگیا جس کے نتیجے میں بہت سے انقلابی جہازیوں اور سپاہیوں کو ہلاک کردیا گیا جبکہ سینکڑوں زخمی ہوگئے۔ لندن وائیٹ ہال کو مسٹر آچنلیک Auchinleck کی طرف سے ایک ٹیلیگرام بھیجا گیا، جس میں کہا گیا کہ 'اگر تم نے ان کو تین دنوں میں آزاد نہیں کیا تو یہ لوگ زبردستی تم سے اپنی آزادی چھین لیں گے'۔1940ء سے 1945ء تک سر ونسٹن

چرچل کے چیف آف سٹاف رہنے والے جرنیل اور جو اس وقت ہندوستان کا چیف آف سٹاف اور برٹش انڈین آرمی کا ایک جہاندیدہ جرنیل تھا، نے برملا بیان دیا کہ ''ہندوستان، بیچ سمندر موجود ایک ایسا بحری جہاز بن چکا ہے، جسے آگ لگ چکی ہے اور جو گولہ بارود سے لدا ہوا ہے''۔ اس کا لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے سوال تھا کہ کیا ہم اس آگ پر قابو پا سکتے ہیں اس سے پہلے کہ یہ بارود کے ذخیرے تک پہنچ جائے؟

چونکہ سارا برصغیر ہی انقلابی ابھار سے لبریز ہو چکا تھا، لہٰذا یہ ناگزیر ہو چکا تھا کہ برطانوی جاتے جاتے اپنے پیچھے متحدہ ہندوستان نہیں بلکہ منقسم و منتشر ہندوستان ہی چھوڑ کر جائیں۔ اسے تقسیم ہونا تھا۔ ایک بار پھر ہندو اور مسلمان سپاہی 1946ء کی تحریک میں ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر لڑے۔ مسلح افواج میں نصف سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ مذہبی تفریق کو مسترد کرتے ہوئے بری، بحری اور فضائی فوج کے مسلمان سپاہیوں نے اپنے ہندو اور دیگر مذاہب کے سپاہی بھائیوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کی۔ بمبئی کی ہڑتال کے دوران ہندو مسلم ورکروں نے باہم مل کر محاصرے ترتیب و تشکیل دیئے تھے۔ کلکتہ اور دوسرے کئی شہروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے انڈین نیشنل آرمی کے گرفتار شدہ سیاسی کارکنان اور عہدیداروں کی رہائی کیلئے بے شمار مظاہرے اور احتجاج منظم کیے۔ ان گرفتار شدگان کا تعلق ہر مسلک و مذہب سے تھا۔ سارے برصغیر میں پھیلی ہوئی اس عوامی تحریک کا نشان سرخ پرچم ہوا کرتا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے متذبذب اور ڈانواڈول ہونے کے باوجود پارٹی کے ہزاروں ورکر اور نوجوان فل ٹائمرز سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کی آرزو میں تڑپ رہے تھے۔ اس دور کی ادبی تحریروں میں ہمیں اس ناآسودہ تڑپ کی بے شمار واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لبرل ناول نگار اور معروف تنقید نگار خوشونت سنگھ نے برصغیر کی تقسیم کے حوالے سے اپنے مشہور ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' میں کمیونسٹ پارٹی کے نوجوان فل ٹائمر اقبال سنگھ کی ذہنی و قلبی کیفیت کو بیان کیا ہے، جسے ایک جدید شہری علاقے سے پاک و ہند کی نئی سرحد کے نزدیک ایک دیہی علاقے منومر جا بھیجا جاتا ہے:

''گاؤں کے گردوارے کے صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے، آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھتے ہوئے اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سوچا کہ ہر کوئی ہندو، مسلمان، سکھ، کانگریسی، لیگی، اکالی یا کمیونسٹ سب اس میں ڈوبے ہوئے ہیں، ضروری تھا کہ قوموں، مذہبوں کے ان سبھی جذبوں کو پاش پاش کر دیا جاتا اور ان کو مراعات یافتہ طبقات کے خلاف کام میں لایا جاتا۔ یہی پرولتاری انقلاب ہوتا اور یہی آسان رستہ تھا۔ اس وقت اقبال کی قیادت میں سے کوئی اس کے پاس موجود نہیں تھا جو اس چاندنی میں اس کے

چہرے پر موجود سرخی کو محسوس کر سکتا''۔(17)

طبقاتی بنیادوں سے پیوستہ پرولتاریہ انقلاب کی طرف مائل ایک مزدور تحریک ہی واحد رستہ تھی جس سے تقسیم کیلئے درکار متعصّبانہ جذبوں اور منافرانہ رویوں سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ پرولتاری انقلاب کیلئے درکار سبھی عوامل وعناصر موجود تھے مگر یہ قیادت ورہنمائی سے محروم تھے۔ جب پرولتاریہ کے نام لیوا اور علمبردار ایسے موقعوں پر غلطی کریں تو اس کی سزا صدیوں تک کئی نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔

کوئی بھی انقلابی یا قبل از انقلابی کیفیت زیادہ لمبا عرصہ قائم نہیں رہا کرتی۔عوامی تحریکوں میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔لیکن جونہی کوئی تحریک ناکام ہو کر پلٹتی ہے تو ناگزیر طور پر ردانقلاب سماج پر غلبہ حاصل کر لیا کرتا ہے۔ برصغیر میں جونہی تحریک کمزور پڑی اور ایک ممکنہ انقلاب کو مصالحت وغداری کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تو پھر انہی محروم ومقہور انسانوں کو ہی اس کے تباہ کن نتائج بھگتنا پڑ گئے۔قومی آزادی کی تحریک کی قیادت سے کمیونسٹ پارٹی کے الگ تھلگ ہو جانے سے انڈین بورژوا قیادت معاملات اور حالات پر حاوی ہوتی چلی گئی۔اگر پورا سچ بیان کیا جائے تو انڈین بورژوازی نے کبھی آزادی کی لڑائی لڑی ہی نہیں ہاں البتہ یہ عوامی جدوجہد کو بروئے کار لا کر برطانوی حکمرانوں سے لین دین اور ساز باز ضرور کرتے رہے۔وہ براہ راست اپنے ہاتھوں میں اقتدار لینے کے آرزومند تھے۔ برطانیہ طاقت سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔تحریک جتنی مشتعل ہوتی گئی بغاوتوں کی شدت اور برطانوی فوج سے بھاگنے والے سپاہیوں کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ونسٹن چرچل اور اس کی کنزرویٹو پارٹی کو دوسری عالمی جنگ کے بعد ہونے والے انتخابات میں بدترین شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ جنگ مخالف جذبات اس الیکشن میں انتہائی مضبوط عنصر ثابت ہوئے۔ 26 جولائی 1945ء کو برطانوی پارلیمان کے نتائج کا اعلان کیا گیا۔کلیمنٹ کی سربراہی میں لیبر پارٹی نے 388 نشستیں جیتتے ہوئے واضح اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل کر لی۔ برطانوی حکومت کے پاس اب اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیتی۔اپنے اصلاح پسندانہ چہرے کے باوجود لیبر پارٹی بھی اپنی نوآبادیوں میں ٹوری پارٹی کی طرح سرمایہ دارانہ حکمرانی کی ہی خواہشمند تھی۔کلیمنٹ ایٹلی کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن (جو ملکہ وکٹوریہ کا پوتا تھا) کو انڈیا کا آخری وائسرائے نامزد کرنا اس بات کا اقرار تھا کہ نئی لیبر حکومت پرانی پالیسیوں کو ہی جاری وساری رکھے گی۔ برطانوی راج اور اس کے سیاسی نمائندوں کے پاس کسی طور کوئی طے شدہ منصوبہ نہیں تھا کہ وہ ہندوستان کیسے' کب اور کس طرح چھوڑیں گے۔ دنیا

بھر کے ہر حکمران کی طرح یہ حکمران بھی انقلاب سے خوفزدہ تھے اور دوسری طرف وہ کسی بھی قسم کے انتشار سے بھی بچنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ہر دو کیفیتیں جب سامنے آتی ہیں تو منافعوں کا نظام اتھل پتھل ہو جاتا ہے جبکہ جائیدادیں اور حکمران طبقات کے اثاثے خطروں کی زد میں آتے ہیں۔ چنانچہ ان حکمرانوں نے ایک موثر اور پرامن تبدیلی کی کوشش کرنی چاہی۔ وائیٹ ہال سے کئی مشن ہندوستان روانہ کیے گئے تاکہ سرمایہ دارانہ اقتدار کو برقرار اور سامراجی لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کی کوئی حتمی شکل نکالی جا سکے۔ انہی میں سے ایک کابینہ مشن بھی تھا جو 1946ء میں ہندوستان روانہ کیا گیا۔

کابینہ مشن پلان

کابینہ مشن مئی کے اوائل میں انڈیا پہنچا۔ 16 مئی کو ''کیبنٹ مشن پلان'' شائع کیا گیا۔ اس کے مطابق مرکزی حکومت ہی دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کی مکمل ذمہ دار ہوگی۔ اس کے تحت برصغیر کو تین علاقوں A,B,C میں تقسیم کیا گیا۔ B زون میں پنجاب، سندھ، این ڈبلیو ایف پی (پختونخواہ) اور برٹش بلوچستان شامل تھے۔ A میں مسلمانوں کی اکثریت اس علاقے میں ہوگی۔ C سیکشن جس میں بنگال اور آسام بھی آتے تھے مسلمان اقلیت میں ہوں گے۔ یہ تصور کیا گیا کہ ایک تو اس سے مسلم اقلیت مطمئن ہو جائے گی دوسرا اس سے مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیے جانے والے قانونی تقاضوں کی بھی تسلی و تشفی ہو جائے گی۔ پہلے پہل جناح نے اس منصوبے کو یکسر مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ تو بہت آگے چلی گئی اور ایک الگ آزاد ملک کا مطالبہ کر دیا اور وہ اس سے پھر کبھی پیچھے ہی نہ ہٹی۔ کانگریس کے صدر مولانا آزاد نے اس منصوبے کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ مسلم لیگ کونسل نے حتمی فیصلے کیلئے تین دن کی مہلت مانگ لی۔ آخری دن جناح اس منصوبے کو تسلیم کر لینے کے موڈ میں تھا۔ اس نے کونسل کو بتایا کہ یہ سب سے اچھا ممکنہ منصوبہ ہے جسے سوچا جا سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس نے کونسل پر زور دیا کہ وہ اس منصوبے کی حمایت کرے۔ کونسل نے متفقہ طور پر اس کی منظوری دے دی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے کابینہ مشن پلان کی منظوری ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم واقعہ تھا۔

26 اپریل 1946ء کو مولانا آزاد نے ایک بیان جاری کیا جس میں نہرو کا نام کانگریس کی صدارت کیلئے تجویز کیا گیا اور کانگریس کے سبھی ارکان سے اپیل کی گئی کہ وہ سب متفقہ طور پر نہرو کو صدارت کے منصب کیلئے منتخب کر لیں۔ چنانچہ نہرو متفقہ طور پر کانگریس کا نیا صدر بن گیا۔ کانگریس

ورکنگ کمیٹی کی طرح سے مسلم لیگ کونسل بھی متفقہ طور پر کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر چکی تھی۔ تاہم ابھی تک اسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی AICC کی طرف سے حتمی منظوری ملنا ضروری تھا۔ یہ سوچا جا رہا تھا کہ یہ محض ایک رسمی کاروائی ہی ثابت ہوگی کیونکہ AICC شروع سے ہی ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی تائید کرتی چلی آ رہی تھی۔ 7 جولائی کو بمبئی میں اس کا اجلاس طلب کر لیا گیا جس میں کافی تلخ بحث مباحثے کے بعد رائے شماری کرائی گئی اور کثرت رائے کے ساتھ منصوبے کو قبول کرنے کی ایک قرارداد منظور کر لی گئی۔ مگر 10 جولائی کو نہرو نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں اس نے حیران کر دینے والا بیان دے دیا۔ کچھ اخباری نمائندوں نے اس سے سوال پوچھا کہ AICC کی طرف سے قرارداد کی منظوری کے بعد کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ AICC کانگریس نے کابینہ مشن پلان کو عبوری حکومت کی تشکیل سمیت مکمل قبول کر لیا ہے۔ اس کے جواب میں نہرو نے کہا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی کا حصہ بنے گی۔ اس نے کہا کہ ہم کسی بھی معاہدے کے پابند نہیں ہیں اور ہم صورتحال کے مطابق حکمت عملی اور نقطہء نظر اپنانے کیلئے آزاد ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں نہرو نے واضح کیا کہ کانگریس نے صرف آئین ساز اسمبلی ہی میں شریک ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ اور ہم نے طے کیا ہے کہ ہم کیبنٹ مشن پلان کے بہترین ہونے کے باوجود اپنے موقف میں ترمیم یا تبدیلی کیلئے آزاد ہیں۔

نہرو کی طرف سے نقطہء نظر کی اس اچانک تبدیلی نے بورژوا بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم سے بچنے کے امکانات کو ہمیشہ کیلئے ناممکن بنا دیا۔ نہرو کے اس اچانک بدلاؤ نے ہندو بورژوازی کی تنگ نظری کو عریاں کر دیا یہی نہیں بلکہ وہ نادیدہ قوتیں بھی عیاں ہو کر سامنے آ گئیں جو اس سارے کھیل میں اب تک پس پردہ کارفرما چلی آ رہی تھیں۔ اور جو برصغیر کی تقسیم کیلئے سرگرم عمل اور سرگرداں تھیں۔ اور یہ کوئی حادثہ بھی نہیں تھا کیونکہ یہ قوتیں جانتی تھیں اور ڈری ہوئی تھیں کہ ایک متحدہ برصغیر میں سرمایہ دارانہ نظام اور سامراجی تسلط کے خلاف طبقاتی جدوجہد اور انقلابی سرکشی کے خطرات زیادہ ممکن، زیادہ موثر اور زیادہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ لیڈی ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن نے اس سلسلے میں نہرو پر کس قدر محنت کی اور اپنے سحر میں قابو کیا، یہ بات تاریخ میں اب تک ایک سربستہ راز ہے۔ اب جا کر ایلکس وان تنزلمین Alex von Tunzelman کی 2007ء میں شائع ہونے والی کتاب ''انڈین سمر'' Indian Summer میں اس معاشقے کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر ایک فلم بنائی جا رہی ہے جس میں کیٹ بلانچٹ ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کا کردار ادا کر رہی ہے، یہ فلم 2009ء میں ریلیز ہوگی۔

مسلم لیگ نے کابینہ مشن پلان کو دباؤ میں آ کر قبول کیا تھا۔ذاتی طور پر جناح اس سے خوش نہیں تھا۔اس نے لیگ کونسل میں واضح طور پر کہا تھا کہ وہ محض اس لئے اس کی تائید کا کہہ رہا ہے کیونکہ اس سے بہتر کچھ حاصل ہی نہیں ہوسکتا تھا۔اس کے سیاسی مخالفوں نے الزام تراشی شروع کردی کہ وہ اپنے کیے گئے وعدوں پر قائم نہیں رہا۔انہوں نے الزام عائد کیا کہ اس نے اپنے ایک آزاد اسلامی ریاست کے نظریے کو ترک کردیا ہے۔نہرو کے بیان نے سبھی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔جناح نے فوری طور پر ساری صورتحال پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ کردیا اور لیاقت علی خان سے کہا کہ وہ اس مطالبے پر غور کیلئے لیگ کی کونسل کا اجلاس طلب کرے۔کانگریس کے صدر نے واضح طور پر اشارہ کردیا تھا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ساری سکیم کو بدل کر رکھ دے گی،اس سے سبھی اقلیتیں اکثریت کے رحم وکرم پر آجاتیں۔جناح نے یہ سوچا کہ چونکہ کانگریس نے کابینہ مشن پلان کو مسترد کردیا ہے اس لئے وائسرائے اب مسلم لیگ کو بلائے گا اور کیونکہ مسلم لیگ منصوبے کو تسلیم کرچکی ہے لہٰذا وہ اسے حکومت سازی کی دعوت دے گا۔جناح ایک حد درجہ خود پسند انسان تھا اور اس نے کانگریس کے عمل کو ذاتی تضحیک تصور کیا۔یوں ہندو مسلم اتحاد کا اب تک ایک مہان علمبردار چلا آنے والا جناح ایک الگ مسلمان ملک پاکستان کا غیر متزلزل وکیل بن کر سامنے آگیا۔

کولنز اور لاپائرے اپنی کتاب ''Freedom at Midnight'' میں جناح کے بارے میں لکھتے ہیں کہ '' ہندوستان کے مسلمان عوام کا ایک ایسا مشکوک رہنما جس کا تصور بھی مشکل سے کیا جاسکتا ہے۔محمد علی جناح کا اسلام بس یہاں تک تھا کہ یہ اس کے والدین کا مذہب تھا اور بس۔وہ شراب پیتا،سور کھاتا جو روزانہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے اپنی داڑھی منڈواتا اور مکمل کلین شیو کرتا ہے۔وہ کبھی جمعہ نماز کیلئے مسجد نہیں جاتا،خدا اور قرآن کا جناح کے دنیاوی حساب کتاب اور نقطہء نظر میں کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا۔جناح کا سیاسی دشمن گاندھی اس سے کہیں زیادہ قرآنی آیتیں جانتا ہے۔اور تو اور جناح مسلمانوں کی عوامی زبان اردو میں مسلسل دو چار فقرے بھی ادا کرنے سے قاصر ہے مگر اس کے باوجود بھی یہ امر حیران کن ہے کہ یہ جناح ہی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت کا نمائندہ بننے کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے''۔(18)

جناح ہمیشہ اپنے مخالفوں کے ساتھ نخوت سے پیش آتا۔وہ نہرو کو Peter Pan کہتا تھا۔ایک ایسا ادیب جسے سیاستدان کی بجائے انگریزی کا پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔یا پھر یہ کہ نہرو ایک ایسا معزز

برہمن ہے جس نے اپنی ہندوانہ مکاری کو اپنی مغربی تعلیم کے غلاف میں چھپا رکھا ہے۔ گاندھی، جناح کے نزدیک ایک چالاک وعیار لومڑی ہے۔ وہ ہندوازم کے احیاء کا پرچارک ہے۔ جناح مہاتما گاندھی کو کبھی نہیں بھولا جو ایک بار اس کے گھر ملنے آیا تو اپنے مٹی سے بھرے جسم سے اس کے انتہائی بیش قیمت ایرانی قالینوں کا ستیاناس کر گیا تھا۔ 27 جولائی 1946ء کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ جناح نے اپنے ابتدائی کلمات میں پاکستان کے مطالبے کو دہرایا اور اسے مسلم لیگ کیلئے واحد راستہ قرار دیا۔ تین دن تک کے بحث مباحثے کے بعد کونسل نے کابینہ مشن پلان کو مسترد کر دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کے حصول کیلئے براہ راست ایکشن کا رستہ اختیار کیا جائے گا۔

مولانا آزاد سمیت کانگریس کے کئی ایک رہنما اس نئی صورتحال سے پریشان ہو کر رہ گئے۔ 8 اگست 1946ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ بلائی گئی جس میں آزاد نے موقف اختیار کیا کہ صورتحال کو بچانے کیلئے ہمیں چاہیے کہ ہم یہ قرار دے دیں کہ بمبئی پریس کانفرنس میں کہی جانے والی باتیں نہرو کا ذاتی موقف تھا اور اس سے کانگریس کے فیصلے کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ لیکن اس پر نہرو نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اگر کانگریس ورکنگ کمیٹی ایسی قرارداد منظور کرتی ہے کہ کانگریس کے صدر نے جو کہا اس کا کانگریس کی پالیسی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے تو اس سے نہ صرف کانگریس کا کچھ باقی نہیں بچے گا بلکہ خود اس کا بھی۔ اپنی کتاب India Wins Freedom میں جو اس نے اپنے دیرینہ کامریڈ اور دوست جواہر لال نہرو کے نام انتساب کی ہے، ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا ''یہ ہندوستان کی تاریخ کے بدقسمت ترین المیوں میں سے ایک المیہ ہے۔ اور میں انتہائی کرب اور دکھ کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری نہرو پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس کے المناک بیان نے کہ کانگریس کابینہ مشن پلان کے بارے میں کوئی بھی کاروائی کرنے میں آزاد ہے، سبھی گم گشتہ کیمونل اور سیاسی مسائل کو از سر نو سامنے لا کھڑا کر دیا۔ مسٹر جناح نے اس (نہرو) کی غلطی سے بروقت فائدہ اٹھایا اور وہ کابینہ مشن پلان کی منظوری سے دستبردار ہو گیا جسے پہلے مسلم لیگ کی طرف سے تسلیم کیا جا چکا تھا''۔(19)

آزاد ایک بار پھر نہرو کے بارے میں لکھتا ہے ''ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے کے ایک ماہ کے اندر اندر برصغیر کی تقسیم کا یہ سخت گیر مخالف نہ جانے کیوں اور کیسے اسی تقسیم کا، اگر علمبردار نہ بھی کہیں، تو اس کا حمایتی بن کر سامنے آ گیا۔ میں انتہائی حیران و پریشان تھا کہ کیونکر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہرو کا اس قدر مداح

بن گیا۔نہرو بلاشبہ ایک بااصول لیڈر ہے لیکن وہ ایک ایسا بے صبرا شخص ہے جو کسی ذاتی ترغیب پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں نہرو کے بدلنے کی ایک اہم وجہ لیڈی ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت ہے جو نہ صرف انتہائی ذہین بلکہ انتہائی پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دوستانہ مزاج کی بھی حامل ہے''۔(20)

اپنی اسی کتاب میں ہی آزاد گاندھی کے بارے میں لکھتا ہے کہ''میں جب دوبارہ گاندھی سے ملنے گیا تو مجھے اپنی زندگی کے سب سے شدید صدمے اور حیرانی کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگرچہ وہ ابھی کھل کر تقسیم کے حق میں نہیں بول رہا تھا مگر وہ اس کے خلاف بولنے سے بھی کترا رہا تھا۔جس بات نے مجھے سب سے زیادہ حیرت اور صدمے سے دوچار کیا، وہ یہ تھی کہ گاندھی وہی دلائل دہرا رہا تھا جو سردار پٹیل پہلے پیش کرتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے دو گھنٹوں تک گاندھی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری ایک بھی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھا''۔(21)

پٹیل کے کردار کے بارے میں آزاد لکھتا ہے''یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ والا بھائی پٹیل ہی برصغیر کی تقسیم کا بانی مبانی ہے''میں حیران ہوا جب پٹیل نے کہا کہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر میں دو قومیں آباد ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمان اور ہندو اب یہاں ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اس واضح لڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے بخوشی الگ ہو جائیں بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے رہیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پٹیل جناح سے کہیں بڑھ چڑھ کر تقسیم کے نظریے کی وکالت پر اترا ہوا تھا۔ جناح نے بلاشک وشبہ تقسیم کا پرچم لہرایا مگر اس پرچم کی سربلندی کیلئے پٹیل زیادہ جوش جذبے کے ساتھ سرگرم ہو چکا ہے''۔(22)

14 جون 1947ء کو کانگریس کی AICC کی میٹنگ ہوئی ،کانگریس جو اپنی ابتدا سے ہی ہندوستان کی وحدت اور آزادی کی لڑائی لڑتی آ رہی تھی، یہی کانگریس اس میٹنگ میں ہندوستان کے بٹوارے کی قرارداد منظور کرنے جا رہی تھی۔ گاندھی نے بحث میں مداخلت کرتے ہوئے ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے اپیل کی کہ وہ پنڈت پانت کی طرف سے پیش کی جانے والی قرارداد کی منظوری دے دیں۔ جب قرارداد پیش کی گئی تو تقسیم کے حق میں 29 جبکہ اس کی مخالفت میں 15 ووٹ آئے۔ یعنی گاندھی بھی کمیٹی کے تمام ممبران کو ملک کی تقسیم کیلئے راضی نہیں کر سکا۔ اس میٹنگ میں سندھ سے تعلق رکھنے والے

ارکان نے شدت کے ساتھ تقسیم کی قرارداد کی مخالفت کی۔انہیں ہر قسم کی یقین دہانیاں کرائی گئیں، انہیں نجی بحثوں میں کہا گیا کہ اگر تقسیم کے بعد ان کے ساتھ کوئی مسئلہ' کوئی زیادتی کی گئی' ان کی عزت نفس کا احترام نہ کیا گیا تو اس کا بدلہ ہندوستان کے مسلمانوں سے لیا جائے گا۔اس سے واضح ہو گیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اگر اقلیتوں کے خلاف کچھ ہوا تو اس کا انتقام دوسرے ملک میں رہنے والی اقلیت سے لیا جائے گا۔یہ ایک وحشیانہ سوچ تھی جو کہ پروان چڑھائی جا رہی تھی اور جس کا مقصد محض منافرت کو فروغ دینا تھا۔

معصوموں کا قتل عام (بٹوارے کے بعد)

اچاریہ کریپالانی جو اس وقت کانگریس کا صدر تھا، نے اس قسم کے خیالات کی تباہ کاریوں کو محسوس کر لیا تھا کہ اس کے کیا بھیانک نتائج نکل سکتے ہیں۔اگر ان خیالات کو پھیلایا گیا اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا تو اس سے ہندوستان میں مسلمانوں اور پاکستان میں ہندوؤں پر جبر و تشدد اور ان کے قتل عام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔برصغیر کے بٹوارے کے بعد نئی سرحدوں کے آر پار خون کے جو دریا بہائے گئے ،یہ سارا خونی کھیل انتقام کی اسی منافرانہ سوچ اور نظریے کا ہی شاخسانہ اور نتیجہ تھا۔

یہ طے پایا کہ بھارت 15 اگست کو جبکہ پاکستان اس سے ایک دن قبل وجود میں لایا جائے گا۔14 اگست کو ماؤنٹ بیٹن کراچی آیا جہاں اس نے پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا۔وہ اگلے دن واپس آیا اور نصف شب کو بھارت وجود میں آ گیا۔مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ ''اگر ایک متحدہ برصغیر آزاد ہوتا تو اس بات کے امکانات انتہائی کم ہوتے کہ برطانیہ یہاں کی معاشی اور صنعتی زندگی پر اپنا پہلا سا کنٹرول قائم رکھ سکتا''۔(23)

ان دونوں نئی ریاستوں نے آگ اور خون' قتل و غارتگری سے بھری کوکھ سے جنم لیا۔ہزاروں سالوں سے چلی آ رہی مذہبی، نسلی اور علاقائی ہم آہنگی کو کچھ دنوں کے اندر اندر منافرتوں اور خونریزیوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔خاندانوں کے خاندان اپنے اپنے آبائی شہروں' قصبوں' دیہاتوں اور گھروں سے نکل جانے یا نکال دیئے جانے پر مجبور کر دیئے گئے۔انسانوں سے لدی ہوئی ریلوں کی ریلیں تہہ تیغ کر دی گئیں۔14 اگست کی صبح انسانی خون سے سرخ اور فضا انسانی چیخوں سے لبریز ہو چکی تھی۔یہ انقلاب کی ناکامی کا انتقام تھا، لاکھوں معصوم انسانوں کے خون میں لت پت آزادی کی صبح۔مذہبی تعصب کے رجعتی

پاگل پن کی وحشت و بربریت کی طرف سے خونریزی کی انتہا کردی گئی اوراس کی شدت اتنی تھی کہ خود تقسیم کی وکالت کرنے والے ششدر وشرمسار ہوکر رہ گئے۔

سب سے زیادہ وحشت اور بربریت کا مظاہرہ بنگال اور پنجاب میں کیا گیا۔المیہ یہ ہے کہ یہی وہ علاقے تھے جہاں سے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے سب سے پہلے اپنے دونوں اخبار شروع کیے تھے۔امرتسر سے پنجابی زبان میں ''کرتی'' (worker) جبکہ کلکتہ سے بنگالی میں لنگال (plough) نکالا گیا تھا۔اس کے باوجود پھر یہی پنجاب اور بنگال کے مزدور کسان ہی تھے جنہوں نے اس تقسیم کے آدم خورالیے میں سب سے زیادہ جانیں دیں۔تقسیم کے اس خنجر کو منافرت وتعصب کے زہر میں ڈبویا گیا اور اسے دوقوموں کے مشترکہ سینے میں گھونپا گیا اوراسے بیچ سے چیر کر رکھ دیا گیا۔

اگست 1947ء سے لے کر ستمبر تک کا سارا عرصہ پنجاب جہنم کا منظر پیش کرتا رہا، یہ اتنا ہولناک تھا کہ جس کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا، یہ اتنا المناک تھا کہ جس کی شدت کا شمار ہی ناممکن تھا، یہ ایسی وحشت تھی کہ وحشت بھی پشیمان ہوگئی، یہ ایک ایسی خونریزی تھی کہ جس کا نہ جواز تھا نہ کوئی وضاحت۔

کولنز اور لاپائرے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں ''لاہور کے گٹروں سے انسانی خون ابل رہا تھا۔مشرق کا خوبصورت پیرس تباہی و بربادی کا منظر پیش کررہا تھا۔لاہور سے کچھ ہی فاصلے پر واقع امرتسر کے بیشتر علاقے، خاص طور پر اس کے مسلمان علاقے، میں مکان اور گھروں کی جگہ اینٹیں اور ملبے ہی باقی بچے تھے۔جل چکے اور جلتے ہوئے گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں ہر طرف سے آسمان کی طرف جاتا نظر آرہا تھا۔اور یہ صرف امرتسر ہی نہیں تھا بلکہ سارے کا سارا پنجاب ہی خاک وخون سے لتھڑ چکا تھا''۔(24) اس وقت کے ایک جید صحافی رابرٹ ٹرمبل نے ''نیویارک ٹائمز'' میں 12 ستمبر 1947ء کو لکھا کہ ''یہاں گولی کے ذریعے مارے جانے کو رحمدلی سمجھا جارہا ہے کیونکہ تشدد لاٹھیوں، پتھروں اور اینٹوں سے مارے جانا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے، زخمی ہونے والے بے یارومددگار پڑے رہتے ہیں اور پھر گرمی اور مکھیاں ہی ان کا خاتمہ کرتی ہیں۔سفاکی کا کوئی رنگ ونسل کوئی حسب نسب نہیں ہوا کرتا۔اگست کے یہ سارے دن پنجاب میں اس قدیم مذہبی قانون کی نمائندگی کررہے ہیں جس کے مطابق آنکھ کے بدلے آنکھ کا حکم ہے۔یہی ہورہا ہے، قتل عام کے بدلے قتل عام، زنا کے بدلے زنا، بے رحمی کے مقابلے میں بے رحمی۔ٹرینیں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی قبریں بن گئی ہیں۔ریلوے لائنیں لاشوں سے اٹی ہوئی ہیں اور ٹرینیں ایسے ان بے گوروکفن لاشوں پر سے گزر رہی ہیں جیسے کوئی بحری جہاز گہرے سمندر کے بیچ میں

سے جا رہا ہو۔ یہ ٹرینیں ان لاشوں کو کچلتی کاٹتی ہوئی اپنی اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہیں۔ ڈبوں میں سوار ہوتے ہی چیخوں اور سسکیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی ٹرین لاہور یا امرتسر پہنچنے کیلئے تین سے چار دن لگا دیتی ہے اور وہ بھی اس کیفیت میں کہ جو زندہ سوار ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر کو زندہ یا سلامت اترنا نصیب نہیں ہوتا۔

سڑکوں پر جو قافلے رواں دواں ہیں، وہ سست روی کے ساتھ لنگڑاتے، گھسٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اور عالم یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اور گلے مٹی سے بھرے، پاؤں زخموں سے چور، بدن بھوک اور پیاس کے ہاتھوں نحیف و نزار ہو چکے ہیں۔ پیشاب' پسینے اور پاخانے کی بدبو قافلے کی ہم سفر و ہمرکاب ہوتی ہے''۔

یہ ہندو مسلمان اور سکھ عام معصوم کسان تھے، جن کی زندگیاں کھیتوں کھلیانوں میں کام کرنے کے علاوہ کہیں بھی نہیں گزریں۔ ان کی اکثریت کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وائسرائے کیا ہوتا ہے، کانگریس کیا ہے اور مسلم لیگ کیا، نہ ہی ان کو یہ سدھ بدھ تھی کہ تقسیم کیوں ہو رہی ہے اور سرحدیں کیوں بنائی جا رہی ہیں۔ انہیں تو اس کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ جس آزادی کے نام پر یہ کھلواڑ ہو رہا ہے اس سے انہیں زندگی رزق اور عزت سمیت ہر حق سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ تو وہ معصوم تھے کہ جب ساون کے بادل برسے بنا گزرتے تھے تو یہ کسان اپنے تھکے ہارے چہرے آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر اپنے کسی خدا' کسی بھگوان کسی گرونانک کو مخاطب کرتے، اور اس سے برسات کی بھیک مانگتے تھے۔ اس انسانی المیے نے اپنے پیچھے بربادیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو جنم دیا۔ لاہور سے امرتسر کے مابین 45 میل کا راستہ ایک طویل انسانی قبرستان میں تبدیل ہو کے رہ گیا۔

معلوم تاریخ کے آغاز سے چلے آتے ہر تنازعے کی طرح سے تقسیم کے اس المیے اور بربادی میں بھی جنسی وحشت اور زنا کے واقعات وبا کی طرح پھوٹ پڑے۔ سکھوں کے دسویں گرنتھ میں گرو نے اپنے ماننے والوں کو سختی کے ساتھ منع کیا ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے ساتھ جنسی مباشرت نہ کریں تاکہ پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے بچا جا سکے۔ سکھوں نے اپنے گرو کے حکم کو صریحاً نظرانداز کر دیا انہیں جہاں بھی کوئی مسلمان عورت نظر آتی تھی، وہ اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی آبروریزی کے طفیل یہ کہاوت بنا دی گئی کہ مسلمان عورتوں میں جنسی شہوت زیادہ ہوتی ہے۔

تقسیم کے اس خونی عمل کے دوران عام ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں کی حالت زار کی بجائے

، پاکستان اور ہندوستان کے حکمرانوں کی فکر اور توجہ کا مرکز ومحور اثاثوں کی تقسیم تھی۔ افواج، اثاثوں اور دولت کی تقسیم کے موقع پر ان حکمرانوں نے بدترین لالچ اور اوچھے پن کا مظاہرہ کیا۔ دونوں ریاستوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ویسا ہی سامراجی طرز حکمرانی اختیار کیا جائے جو نسلوں تک ان پر مسلط رہا۔ بٹوارہ اس کرہ ارض کی ایک سب سے قدیم اور زندہ تہذیب کے جسم پر لگنے والا ایک کاری زخم تھا، ایک ایسی تہذیب جو فن میں، تعمیرات میں، موسیقی میں، لٹریچر میں اور انسانی ثقافت کے دوسرے کئی شعبوں میں اپنی بلندیوں اور مہارت کو پہنچی ہوئی تھی اور جس کی ثقافت کی رنگارنگی اس کا سب سے خوبصورت پہلو تھی۔

تقسیم کا یہ درد ابھی تک کروڑوں انسانوں کی روحوں کو مضطرب کیے ہوئے ہے، یہ ان کیلئے ایک ناسور بن چکا ہے۔ یہ تقسیم حالیہ انسانی تاریخ کے بڑے ردانقلابی واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔ تقسیم کے ساٹھ سالوں بعد بھی سارے برصغیر میں یہی سوال پوچھا جاتا ہے کہ کیا اس تقسیم کو ختم کیا جاسکتا ہے؟

پنجابی زبان کے معروف شاعر استاد دامن نے اس بٹوارے کے کرب کو کچھ ان الفاظ میں ڈھالا ہے۔۔۔۔۔۔

برباد انہاں آزادیاں توں ہوئے تسی وی او ہوئے اسی وی آں
لالی اکھیاں دی صاف پئی دسدی اے روئے تسی وی او روئے اسی وی آں

نوٹس

1۔مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستان کی آزادی،(انگریزی ایڈیشن،اورینٹ لانگ مین)، صفحہ 202

2۔8اگست 1853ء کے ''نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' نمبر 3840 میں شائع ہوا

3۔ کولن اینڈ لیپیئر،فریڈم ایٹ مڈنائٹ، صفحہ 58

4۔ٹراٹسکی،تصنیفات 1939ء، صفحہ 169

5۔ٹائمز آف انڈیا،16 جنوری 1948ء

6۔لال خاں، بٹوارہ: کیا یہ ختم ہوسکتا ہے؟(انگریزی)،صفحہ 26

7۔سرجان کمنگ، پولیٹیکل انڈیا،(آکسفورڈ)،1932ء

8۔پی۔ہارڈی، برطانوی ہندوستان کے مسلمان (انگریزی)،(کیمبرج)،1972ء

9۔لال خاں، بٹوارہ: کیا یہ ختم ہوسکتا ہے؟(انگریزی)،صفحہ 34

10۔کے۔دامودارن، ہندوستانی کمیونزم کی یادداشتیں (انگریزی)، نیولیفٹ ریویو نمبر 93،لندن، 1975ء

11۔پاکستان اور نیشنل یونٹی، بمبئی،1944ء

12۔نیوز لائن (کراچی)،اکتوبر 2008ء،صفحہ 82

13۔مزدور مورچہ،فریدآباد، جولائی 1978ء

14۔ایضاً،صفحہ 12

15۔ لال خاں، بٹوارہ: کیا یہ ختم ہوسکتا ہے؟(انگریزی)،صفحہ 57

16۔مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستان کی آزادی،(انگریزی ایڈیشن،اورینٹ لانگ مین)، صفحہ 61

17۔خشونت سنگھ،ٹرین ٹو پاکستان،صفحہ 50

18۔کولن اینڈ لیپیئر،فریڈم ایٹ مڈنائٹ، صفحہ 127

19۔مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستان کی آزادی، (انگریزی ایڈیشن، اورینٹ لانگ مین)، صفحہ 170

20۔ایضاً، صفحہ 198

21۔ایضاً، صفحہ 203

22۔ایضاً، صفحہ 201

23۔صفحہ 224, 209

24۔کولن اینڈ لیپیئر، فریڈم ایٹ مڈنائٹ، صفحہ 359,360

بورژوا جمہوریت کی نااہلی۔۔۔ایک ناکام آغاز

فوجی اقتدار اور ابھرتا طوفان

''میں کسی اور خطے کے کاروباری لوگوں کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں کہ ہمارے کاروباری اور سرمایہ دار انتہائی کمینے ہیں، انہیں تھوڑا سا بھی موقع مل جائے تو یہ عوام کا خون تک چوس لینے سے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ میں پریشان ہوں کہ کب تک ہم اس لٹیرے نجی شعبے کو عوام سے بچاتے رہیں گے! ایک دن آئے گا جب عوام اس سے اپنا انتقام لیں گے''

(فیلڈ مارشل ایوب خان)(1)

سرکاری ذرائع ابلاغ کے مطابق پاکستانی ریاست کی نظریاتی اساس فلسفی و شاعر علامہ سر محمد اقبال کی طرف سے دیکھا گیا خواب ہے۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ خود اس پراسرار نظریے کا خالق اس بات پر تحفظات رکھتا تھا کہ کیسے اس کے نظریے پر عملدرآمد کیا جا سکتا ہے؟ نظریہ پاکستان کا یہ خالق پاکستان کے قیام سے تقریباً دس سال پہلے 1938ء میں فوت ہو گیا تھا۔ اپنی موت سے ایک سال قبل اس نے جناح کو ایک خط لکھا اور اس میں اس نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ کس طرح اس کا خواب برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک بھیانک حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ 28 مئی 1937ء کو لکھے گئے اپنے اس بصیرت

افروز مکتوب میں اقبال نے مسلم لیگ کو درپیش سیاسی مسائل کی طرف توجہ دلائی ''جہاں تک مسلم ہندوستان کا تعلق ہے مجھے اس پر کوئی شک نہیں ہے کہ تم اس بارے میں صورتحال کی نزاکت کو بخوبی سمجھتے ہو۔ مسلم لیگ کو اس بات کا حتمی طور پر فیصلہ کن تعین کرنا ہوگا کہ یا تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اشرافیہ طبقے کی نمائندہ ہے یا عام مسلمانوں کی! شاید اسی وجہ سے یہ عام مسلمان اس میں اتنی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں اور یہ بات معقول بھی نظر آتی ہے۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی اکثریت سے ان کے حالات بہتر کرنے کا وعدہ نہیں کرتی وہ ہمارے عوام کو کسی طور متاثر اور اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ نئے آئین کے مطابق اعلیٰ ترین عہدے بالا دست طبقے کی اولادوں کیلئے مختص کر دیئے گئے ہیں جبکہ ان سے چھوٹے عہدے وزیروں کے رشتہ داروں یا دوستوں کیلئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عام مسلمانوں کی عمومی بہتری کیلئے سوچا تک بھی نہیں۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز حساس ہوتا چلا جا رہا ہے''۔(2)

پاکستان کا پہلا پلاننگ کمیشن 1948ء میں قائم کیا گیا تھا جس کے 15 ارکان میں سے 11 امریکہ اور سامراجی اداروں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کمیشن کی ساخت ہی سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ نوخیز ریاست، سیاسی اور معاشی ترقی کیلئے کیا قدم اٹھانا اور کس طرف جانا چاہ رہی تھی۔ بہت سے ''مسلمان'' کاروباری اداروں کو ہندوستان میں انتہائی سخت مقابلے کا سامنا تھا بلکہ وہ ٹاٹا اور برلا سمیت دیگر بڑے ''ہندو'' اداروں کی برتری اور سبقت تلے دبے ہوئے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ غلط خیال راسخ ہو گیا کہ ایک الگ ''آزاد'' ریاست اور منڈی حاصل کر لی جائے تو اس سے ان کیلئے بے پناہ منافعوں کا رستہ ہموار ہو جائے گا۔ چنانچہ حبیب، ولیکا، آدم جی، سہگل اور اصفہانی سمیت دوسرے مسلمان کاروباری گھرانوں نے جناح اور مسلم لیگ پر نچھاور ہونا شروع کر دیا، بھاری رقوم اس سلسلے میں پیش کی گئیں تاکہ نئی منڈی اور نئی اسلامی جمہوریہ میں ان کو خاطر خواہ اور مناسب مقام میسر آ سکے۔

پاکستان میں نئی ابھرنے والی بورژوازی کو ایک سنہرا موقع میسر آ گیا کہ وہ اپنی صلاحیت اور اہلیت کو ثابت کرتی۔ کیونکہ ایک ریاست، ایک وسیع منڈی، بے پناہ قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ اور افرادی قوت کا بے شمار ذخیرہ ان کی دسترس میں آ گیا تھا۔

تشخص کا بحران

جناح پاکستان کو ایک جدید صنعتی سیکولر سرمایہ دارانہ ریاست کے طور پر بنانا اور تشکیل دینا چاہتا تھا۔ وہ مضبوط نظم ونسق اور مستحکم طریق کار کا خواہشمند تھا۔ اس کے ایک قریبی دوست کے مطابق ''جناح گلیڈسٹون کے انداز فکر کا حامل پارلیمنٹیرین تھا''۔ پاکستان کی افتتاحی تقریب کے وقت وہ خاصا نحیف ونزار اور بیمار تھا جو پہلے ہی پچھلے تین سالوں سے اپنے فزیشن کے الفاظ میں اپنی قوت ارادی کو وسکی اور سگریٹوں کے سہارے سے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بننے کے بعد جناح نے اپنے نئے اے ڈی سی سید احسن سے کہا'' کیا تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی میں ہی پاکستان کو بنتا دیکھ سکوں گا''۔(3) وہ ستمبر 1948ء میں پراسرار حالات میں وفات پا گیا۔ اپنی ابتدا سے ہی پاکستان ایک اندرونی خلفشار کی زد میں آ چکا تھا جو جناح کی موت کے بعد اور بھی شدید ہو گیا۔ جاگیردار اشرافیہ اور نیم سرمایہ دار امراء کے مابین اختلافات نے سیاسی انتشار پیدا کر دیا۔ 1951ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو کمپنی باغ راولپنڈی میں اکبر خان نے گولی مار کر قتل کر دیا۔

1950ء کی دہائی میں ہونے والے داخلہ اور خارجہ پالیسی سے متعلق فیصلے انہی تنازعات اور تضادات کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست کے طور پر قائم کیا گیا تھا، اس مصنوعی نظریے کو پاکستان کے نئے ابھرنے والے حکمران طبقے نے ایک ایسے سماج پر مسلط کرنے کی کوشش کی جو کثیر نسلی، کثیر زبانی اور کثیر قومیتی تھا۔ جناح نے جس سیکولرازم کا وعدہ اور اعلان کیا تھا وہ تیزی کے ساتھ کمزور اور ختم کیا جا رہا تھا۔ تعلیمی نصاب کو مکمل طور پر ریاست کے سرکاری مذہبی نظریے کے مطابق تشکیل دے دیا گیا۔ سرکاری نقطہء نظر کو رائج کرنے کیلئے تاریخ کے چہرے کو مسخ کر دیا گیا۔ اردو کو قومی زبان قرار دے کر مسلط کر دیا گیا، یہ اور بات ہے کہ ریاستی افسر شاہی، کامرس، تجارت اور اشرافیہ نے انگریزی زبان کو ہی اختیار کیے رکھا۔ پاکستان کے پہلے دونوں کمانڈر انچیف انگریز تھے۔ اگرچہ مسلم لیگ نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان اور بھارت کے مشترکہ گورنر جنرل کے طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر فوج ایک برطانوی کمانڈر کو مسلح افواج کے سربراہ کے طور پر قبول کرنے کیلئے دیدہ ودل فرش راہ کرنے جا رہی تھی تاکہ نوآبادیاتی ڈھانچوں کو جاری رکھنے کو یقینی بنایا جا سکے۔ پاکستان کا پہلا کمانڈر انچیف جنرل

میسروی تھا جس کے بعد میجر جنرل ڈگلس گریسی کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ لینڈ ریونیو سسٹم، ملٹری چین آف کمانڈ، سول انتظامیہ، قانونی ضابطے اور عدالتی نظام یہ سب برطانوی طرز اور مرضی سے تشکیل دیئے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ برطانوی برصغیر کی اپنی سبھی نوآبادیوں کے ساتھ ان کے آزاد ہونے کے بعد اور باوجود بھی جڑے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر اور ریلوے میں ''لیفٹ ہینڈ ڈرائیونگ'' پر ابھی تک عمل ہو رہا ہے۔

پاکستان کے حکمران طبقے نے اپنی پالیسیاں امریکہ کے ساتھ وابستہ کر لیں اور یوں یہ شروع سے ہی اس کی کٹھ پتلی بن گئے۔ امریکہ اور اس کی سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی CIA ابتدا سے ہی پاک فوج کے معاملات میں شریک ہو گئے۔ اس بدنظمی، انتشار اور پاکستان کے نوزائیدہ بورژوا طبقے کی بدحواسی کی بنیادی وجہ خود اس طبقے کا تاریخی اعتبار سے تاخیر زدہ (Belated) ہونا تھا۔ تاریخ میں اس کا ظہور اس وقت ہوا جب سامراج، عالمی منڈی پر فیصلہ کن غلبہ و تسلط حاصل کر چکا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران جب ساری دنیا اس جنگ کی تباہیوں اور بربادیوں سے اتھل پتھل اور تہس نہس ہو چکی تھی، تو یہ صرف امریکہ ہی تھا جس کی سرزمین جنگ کی چیرہ دستیوں سے مکمل طور پر محفوظ رہی۔ تاہم اس جنگ کے دوران امریکہ کے اندر ایمرجنسی، جنگی حکومت اور قوانین پوری طرح سے نافذ اور سرگرم عمل رہے۔ جس کے باعث امریکی حکمران طبقات کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے محنت کش طبقے کا زیادہ سے زیادہ استحصال کر کے اپنی دولت و طاقت میں اضافہ کر سکیں۔ اس کے نتیجے میں امریکی صنعت کو مثالی عروج ملا اور وہاں بھاری بھاری مقدار میں قدر زائد کا ارتکاز ہو گیا۔ اس بھاری اور بے تحاشا قدر زائد کی وجہ سے امریکہ کو تحقیق اور تکنیک کے شعبے میں ترقی اور تنوع کیلئے مرضی کی سرمایہ کاری کرنے کی عیاشی میسر آ گئی جس سے پیداواری صلاحیت اور منافعوں میں اور بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یوں امریکی بورژوازی کو تب تک کا سب سے بڑا مالیاتی ارتکاز میسر آ گیا۔ اس کے اثرات یہ ہوئے کہ بعد از جنگ امریکہ نے ساری دنیا پر ٹیکنالوجی میں برتری، مالیاتی تسلط اور عسکری غلبہ حاصل کر لیا۔ یوں اسے عالمی سرمایہ دارانہ معیشت اور عالمی منڈی پر انتہائی موثر کنٹرول میسر آ گیا۔ عالمی بینک، بریٹن وڈ ٹریٹی جو بعد میں آئی ایم ایف، گیٹ GATT جو پھر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن ہو گیا، جیسے ادارے امریکی مالیاتی تسلط کو قائم کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ ادھر سیاسی اور سفارتی سطح پر اقوام متحدہ، ناٹو NATO، سینٹو CENTO اور سیٹو SEATO سمیت دیگر معاہدے' ادارے اور اتحاد امریکہ کی سیاسی' سفارتی اور عسکری اجارہ داری قائم کرنے کیلئے استعمال میں لائے گئے۔ اسی

دوران یورپی سامراج جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے مالیاتی طور پر کمزور پڑ چکا تھا جس کی وجہ سے وہ براہ راست نوآبادیاتی کنٹرول کو برقرار رکھنے کی اہلیت سے محروم ہو گیا۔ یورپی پرولتاریہ کی انقلابی تحریکوں کی ناکامی اور دوسری عالمی جنگ سے بیزار اور تھک ہار کے محاذوں سے واپس آنے والے فوجیوں کے ردعمل نے یورپی سامراج کی کمزوری کو اور بھی نحیف و نزار کر دیا۔ یورپی سامراج کو براہ راست نوآبادیاتی حکمرانی سے دستبردار ہونا پڑ گیا۔ پھر ان ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکوں کے ظہور اور ابھار نے یورپی سامراج کی شکست کو اور بھی تیز کر دیا۔

لیکن تیسری دنیا کے نوآبادیاتی انقلابات بھی سرمایہ دارانہ سامراجیت کے اس نئے ڈھانچے کی گرفت سے بچنے کیلئے وقتی نجات ثابت ہوئے۔ ان انقلابات کے نتیجے میں پرولتاری بونا پارٹسٹ حکومتیں سامنے آئیں جو اپنی ہی طرز اور اپنے ہی طور طریقوں سے چلنے والی انقلابی تحریکوں کے نتیجے میں قائم ہوئیں۔ یہ حکومتیں پیٹی بورژوا دانشوروں کی قیادت میں گوریلا افواج کے ذریعے یا پھر ان انقلابی فوجی افسران کے زیر اثر فوجی بغاوتوں کے ذریعے قائم ہوئی تھیں جو اپنے اپنے سماجوں میں بدترین سامراجی استحصال اور جبر و تشدد سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کے پاس سامراجی استحصال اور لوٹ مار سے محفوظ رہنے کے لئے اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کے عفریت سے جان چھڑانے کے لئے کوئی اور مناسب اور موزوں طریقہ کار موجود نہیں تھا۔

ان چند مستثنیات کے علاوہ باقی سبھی نام نہاد آزادی حاصل کرنے والے ملکوں کی اکثریت سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ حکومتوں کے شکنجے میں پھنس گئی۔ یہ حکومتیں بدعنوان اور خصی حکمران طبقات کے زیر تسلط تھیں جو کہ اپنے سماجوں کو ترقی دینے اور ان میں صنعت یافتہ سرمایہ دارانہ ریاست کی تعمیر کیلئے درکار سماجی، معاشی اور سیاسی بنیادیں قائم کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم تھے۔ نوآبادیاتی غلامی سے حاصل ہونے والی یہ نام نہاد آزادی اپنے کردار میں معذور اور مفلوج تھی۔ اس آزادی سے ابھرنے والے حکمران طبقات کا کردار دلالی، جی حضوری اور سامراجی طاقتوں کی مخلصانہ اطاعت پر مبنی تھا۔ دوسری طرف ان نوآبادیاتی حکمرانوں کی وراثتی اور نامیاتی نااہلی کے سبب ان کی ریاستوں کی پہلے سے کمزور معاشی بنیادیں اور بھی نحیف ہوتی چلی گئیں اور یوں یہ مغربی سامراج کے مالیاتی سرمائے اور ٹیکنالوجی کے رحم و کرم پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوتے چلے گئے۔ ان کی اس تاریخی پسماندگی اور جدید ترقی یافتہ ملکوں پر معاشی، تکنیکی اور مالیاتی انحصار نے ان نااہل حکمرانوں کو بعد از جنگ کے نئے عالمی نظام کی اطاعت پر مجبور کر دیا جسے

سامراج کی بلا روک ٹوک لوٹ مار کی سہولت اور آسانی کیلئے تشکیل و ترتیب دیا گیا تھا۔

برصغیر کی 1947ء کی تقسیم نے اس بات کو یقینی بنا دیا کہ سامراجی استحصال اور سرمائے کی حکمرانی ایک نئے نوآبادیاتی نظام کی شکل میں جاری و ساری رہے گی۔ جہاں عالمی منڈی کا غلبہ ان سماجوں کو سامراجی استحصال کی غلامی پر مجبور کر دے گا۔ پاکستان کا نااہل حکمران طبقہ اس مجبوری کو جلد ہی جان گیا تھا مگر پھر ان کی اپنی بے بسی ان کے آڑے آ گئی اور وہ اس طوق کو اپنے گلے سے نہیں اتار سکا۔ اس تاریخی کمزوری سے ایک طرف اسے سامراجی غلامی کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالنی پڑ گئیں تو دوسری طرف اسے جاگیردار اور زمیندار اشرافیہ کے پاؤں میں اپنا سر رکھنا پڑ گیا' ان میں پیر اور سجادہ نشین بھی شامل تھے۔ یہ دیہی علاقوں میں بڑی بڑی زمینوں کے مالک تھے جو کہ انہیں برطانوی راج نے اپنے اقتدار کو طول اور تقویت دینے کیلئے اور بے لوث غلامی کرنے کے اعزاز میں دان کی تھیں۔ نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں، پیروں اور گدی نشینوں کا یہ ٹولہ بھی نااہل سرمایہ داروں کی طرح سے ایک الگ مسلمان شناخت کے نام پر مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ ہو چکا تھا۔ ملکی سطح پر ہونے والی سیاست کا ہر مسئلہ جاگیردارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا جانے لگا۔ اپنی زمینوں اور اپنے مزارعین کی وجہ سے حاصل ''کامل خودمختاری'' کے بل بوتے پر جاگیرداروں کا یہ طبقہ جب چاہتا ایک نئی پارٹی بنا لیتا یا کسی پارٹی کے حصے بخرے کر دیتا۔ جناح ایک بورژوا جمہوری ریاست کی تشکیل کے حق میں تھا مگر دو قومی نظریے کے علمبرداروں کی طرف سے مذہب کے واویلے نے اس نئی ریاست کا چہرہ اور رنگ روپ ہی بدل کے رکھ دیا۔

کشمیر

آزادی کے پہلے سال ہی کشمیر میں جنگ پھوٹ پڑی جو کہ برطانوی سامراج کی طرف سے دانستہ چھوڑا گیا ایک تنازعہ تھا۔ برطانویوں کا ''تقسیم کرو اور راج کرو'' کی پالیسی کا مقصد و منتہا بھی یہی تھا۔ اور یہ پالیسی وہ اپنی نوآبادیوں سے نکل جانے کے بعد بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ بھارت اور پاکستان کے مابین دشمنی اور عدم استحکام کا زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کرنا ان کے سامراجی تسلط کی بڑھوتری کیلئے انتہائی سودمند پالیسی تھی۔ مسلم اکثریت کے حامل کشمیر کے ہندو مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کا معاہدہ کر لیا۔ جس پر پاکستانی حکمرانوں نے کشمیر کو بزور طاقت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک خفیہ منصوبہ بنایا گیا جس کے مطابق پختون قبائلیوں کو حملہ کرنا تھا۔ یہ پختون قبائلی 23/24 اکتوبر 1947ء کی شب

دریائے جہلم عبور کر کے کشمیر داخل ہوئے۔منصوبے کے مطابق 26 اکتوبر کو اس وقت سرینگر پر قبضہ کر لینا تھا جب ہر طرف عید کا تہوار منایا جا رہا ہوتا۔ مگر بجائے سرینگر کا رخ کرنے کے انہوں نے خود کو مظفر آباد اور ملحقہ علاقوں میں لڑائی جھگڑوں اور لوٹ مار میں مصروف اور ملوث کر لیا۔ یہ محض بارہ مولا تک ہی پیش قدمی کر سکے (اگر چہ یہ کشمیری دارالحکومت کی بجلی کاٹنے میں کامیاب ہو چکے تھے) اس کی وجہ سے بھارت کو وہاں بڑی تعداد میں اپنے فوجی اتارنے کا موقع مل گیا تا کہ وہ حملہ آوروں سے نمٹ سکیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر کی تاریخ ایک انتہائی عجیب و غریب موڑ مڑتی ہے۔ کشمیر کا تین چوتھائی حصہ بھارت کے اور باقی کا ایک تہائی سب سے دشوار ترین علاقہ پاکستان کے کنٹرول میں آ گیا۔ بھارتی فوج نے قبائلی پیش قدمی کو روکتے ہوئے اور سرینگر کو قبضے سے بچاتے ہوئے نیشنل کانفرنس کے ورکروں کو کشمیر کے دفاع کی ذمہ داری سونپ دی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جوابی حملہ کرتے ہوئے بارہ مولا کو دوبارہ اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ بھارتی فوج کے جموں و کشمیر میں داخل ہو جانے کے بعد گورنر جنرل پاکستان جناح نے کوشش کی کہ پاکستان بھی جوابی کاروائی کرتے ہوئے اپنی فوج کشمیر بھیج دے مگر اس وقت کے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی کی طرف سے اس کوشش کو روک دیا گیا۔ اسے خوف تھا کہ اس سے دونوں نئی ریاستوں کے مابین جنگ چھڑ جائے گی۔ اس وقت دونوں ملکوں کی افواج ایک ہی سپریم کمانڈ کے زیر کمان تھیں۔ جناح نے اس کے باوجود بھی کوشش کی کہ پاکستان کے حمایتی ''آزاد کشمیر'' کی قوتوں کی مدد کیلئے فوج کو بھیجا جائے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے باقاعدہ چھٹی پر گئے ہوئے فوجیوں سے درخواست کی گئی کہ وہ ریاست کشمیر جا کر لڑائی میں حصہ لیں۔

مئی 1948ء میں جنرل گریسی اپنے پچھلے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے پاکستانی فوج کو ''سرکاری'' طور پر جموں و کشمیر بھیجنے پر رضامند ہو گیا۔ یوں حملوں اور جوابی حملوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں پاکستان نے گلگت (اس علاقے کو سرکاری طور پر 3 نومبر 1947ء کے دن پاکستان کا حصہ بنایا گیا) بلتستان وادی کا کچھ حصہ، پونچھ کا زیادہ تر حصہ اور جموں کے میر پور پر قبضہ کر لیا۔ جبکہ بھارتی فوج نے لداخ، کشمیر اور جموں کے کئی صوبوں اور پونچھ کے کچھ حصے پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ 1948ء کے آخر تک جو جنگ کشمیر تک محدود تھی اس کے بھارت اور پاکستان کے اندر پھیلنے کے امکانات پیدا ہو گئے۔ لیکن اس شدت کو جنگ بندی کے ایک معاہدے کی صورت میں روک لیا گیا۔ یہ جنگ بندی اقوام متحدہ کی طرف سے عمل میں لائی گئی اور جس پر یکم جنوری 1949ء سے

عملدرآمد ہونا تھا۔ بعدازاں 27 جولائی 1949ء کو ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت دونوں افواج کے نمائندوں کی موجودگی میں سیز فائر لائن کی نشاندہی کر دی گئی۔ یہ لائن 1965ء کی پاک بھارت جنگ تک قائم رہی۔

جناح

جناح جس واحد ''سیاسی پارٹی'' پر اعتماد اور تکیہ کر سکتا تھا وہ پاکستان کی سول انتظامیہ تھی، جس نے انڈین سول سروس سے جنم لیا اور جس کا تخم برطانوی سامراجی انتظامیہ نے بویا تھا۔ جناح پاکستان کو ایک مکمل آئینی سوشل ڈیموکریسی سمجھتا تھا۔ 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے کراچی میں ہونے والے اجلاس میں اس نے کھلے عام ان تمام تر تعریفوں اور وضاحتوں سے لاتعلقی کا اعلان کیا جو اس نئی ریاست کے کردار کے بارے میں بیان کی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنے خطاب میں کہا ''تم آزاد ہو، کسی مندر میں جانا ہو یا کسی مسجد میں، پاکستان کی اس ریاست میں رہتے ہوئے تم آزادی سے کہیں بھی اپنی اپنی عبادت کرنے کیلئے جا سکتے ہو۔ تمہارا خواہ کسی مذہب، کسی نسل کسی رنگ سے تعلق ہو ریاستی امور کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہوگا۔ ہم اس بنیادی اصول پر اپنی بنیاد اور اپنی ریاست کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک ہی ریاست کے برابر کے حقوق کے حامل شہری۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں آئندہ اس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے۔ اور آپ لوگ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے اور ہندو بھی ہندو نہیں رہیں گے اور یہ بات میں مذہب کے حوالے سے نہیں کر رہا بلکہ سیاسی حوالے سے کر رہا ہوں کہ یہ سب ریاست کے شہری ہی ہوں گے''۔(4)

جناح کی اس تقریر کو مذہبی جماعتوں، متشدد فرقہ پرستوں اور دائیں بازو کی جماعتوں کی جانب سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے کیونکہ اس میں ایک اسلامی ریاست کی تخلیق کی مخالفت کی گئی ہے۔ یہ تنقید غیر معقول اور بلا جواز بھی نہیں ہے۔ اگر پاکستان ''مسلم قوم'' کیلئے کی جانے والی جدوجہد کا ہی نتیجہ تھا تو پھر واضح طور پر سیکولرازم اس کیلئے ایک غیر مناسب اور غیر موزوں نظریہ ہی قرار پاتا ہے۔ اگر سیکولرازم کے حامل آدرش کو ہی پاکستان میں فروغ دینا اور اس پر عملدرآمد کرنا مقصود تھا تو یہ کام ایک متحدہ برصغیر میں بھی بخیر و خوبی سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ جناح پر آئین پرستی کا بھوت سوار تھا جس نے اس نئی ریاست کی

تشکیل کیلئے چلائی جانے والی مہم کے کردار کو مبہم کر کے رکھ دیا۔ بٹوارے کے فوری بعد ہی جناح نے مسلم لیگ کو ایک سیکولر جماعت بنانے کیلئے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا اور وہ یہ طے کر چکا تھا کہ اس کا نام مسلم لیگ سے تبدیل کر کے پاکستان نیشنل لیگ رکھ دیا جائے۔ مگر پاکستان ٹائمز نے اس کے ارادے کو قبل از وقت افشا کر دیا۔ جناح کی فوری موت اور پھر لیاقت علی خان کے اچانک قتل کے بعد معاملات کی ساری کمان سول سروسز نے سنبھال لی۔

پاکستان کی معاشی صورتحال بہتر نہیں تھی۔ اس نئی ریاست کی معیشت پر زرعی شعبے کی برتری کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ زراعت کا مجموعی پیداوار میں حصہ 60% جبکہ روزگار کے شعبے میں اس کا حصہ 70% تھا۔ اس کے مقابلے میں کل پیداوار میں صنعت کا حصہ 6% جبکہ روزگار میں 10% تھا۔ باقی حصہ خدمات کے شعبے کا تھا۔ بڑے پیمانے پر پیداوار کا وجود ہی نہیں تھا۔ دستیاب صنعتی اداروں کا 41% زرعی خام مال کی تیاری سے وابستہ تھا اور اس لیے یہ موسم کے مطابق ہی کام کرتا تھا۔ پاکستان کو زرعی خام مال پیدا اور تیار کرنے والا ملک سمجھا جاتا تھا جو سیاسی اور معاشی رابطوں کے ایک نیٹ ورک کے ذریعے برطانیہ سے جڑا ہوا تھا۔

1954ء کے انتخابات

پاکستان کے دیہات اور مضافات کی کیفیت تو اور بھی بدترین تھی۔ پاکستان میں مجموعی طور پر 6000 جاگیردار 35 لاکھ کسانوں کی مجموعی ملکیت سے زیادہ زمین کے مالک تھے۔ جاگیردار ہی مسلم لیگ کی ورکنگ کونسل کے اندر سب سے بڑا گروپ رکھتے تھے۔ کوششیں کی گئیں کہ ایک متفقہ و متحدہ حکمران طبقہ تشکیل پا جائے، ایک مستحکم حکومتی پارٹی بنالی جائے، اور ایک مستقل آئین ترتیب دیا جائے۔ لیکن یہ سبھی کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ آنے والی دہائیوں میں ''شناخت اور تشخص کا وہ بحران'' پوری شدت کے ساتھ کھل کر سامنے آ گیا جس نے اس نئی ریاست کے نظریہ سازوں کو روز اول سے ہی حواس باختہ کیا ہوا تھا۔

کوریا کی جنگ کے دوران پاکستان نے اپنے روپے کی قیمت کم کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے اس کی معیشت کو ایک عارضی عروج میسر آیا۔ مگر جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی زرعی خام مال کی قیمتیں بھی تیزی کے ساتھ گر گئیں۔ گراوٹ کی اس کیفیت میں 1952/53ء میں پیدا ہونے والی غذائی قلت

اور قحط نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا اور مسلم لیگ غذائی اجناس کے ذخیرہ اندوزوں سے نمٹنے اور معاشی بحران پر قابو پانے میں مکمل طور پر ناکام رہی جس سے اس کی نااہلی کھل کر سامنے آ گئی۔ پاکستان میں سیاسی امور و رموز تشکیل دینے میں نمایاں کردار برطانوی راج کی تیار کردہ اور پروردہ پنجابی سول افسر شاہی اور بیوروکریسی کے ان لوگوں کا تھا جو بٹوارے کے بعد وسطی اور شمالی بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے اور جنہیں اردو بولنے والے یا مہاجر کہا جاتا ہے۔ مسلم لیگ ریاستی افسر شاہی کی پیدا کردہ تھی جس کی تنہائی اور بے بسی 1954ء میں ہونے والے صوبائی انتخابات کے موقع پر کھل کر سامنے آ گئی۔ یہ الیکشن ایک ایسے ماحول میں ہونے جا رہے تھے جس سے پہلے زبان کے پیچیدہ مسئلے پر بڑی تعداد میں عوامی مظاہرے پھٹ پڑے تھے۔ 21 فروری 1952ء کو پولیس نے طالب علموں کے ایک بڑے مظاہرے کو منتشر کرنے کیلئے گولی چلا دی جس سے 26 ہلاک اور 400 زخمی ہو گئے۔ انتخابات کیلئے اعلان کردہ تاریخ جوں جوں نزدیک آتی جا رہی تھی، افسر شاہی کا خوف اور تذبذب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بائیں بازو کو چپ کرانے کیلئے الیکشن پندرہ دنوں تک کیلئے ملتوی کر دیے گئے۔ 48 گھنٹوں کے اندر اندر 1200 کمیونسٹوں اور ٹریڈ یونینسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ آخر کار جب 8 مارچ سے 12 مارچ تک کے دوران ووٹنگ کی اجازت دے دی گئی تو بنگالیوں نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ مرکزی سیاسی دھارے کے شعور سے کتنی دور اور تنہا تھی۔ صوبے کی کل 309 نشستوں میں سے مسلم لیگ کو صرف 10 میں کامیابی مل سکی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی نے دس نشستوں پر الیکشن لڑا جس میں سے وہ چار پر کامیاب ہوئی۔ یہاں یہ امر توجہ اور دلچسپی کا حامل ہے کہ کامیاب ہونے والے کمیونسٹ ہندو تھے جبکہ مسلمان کامریڈز اپنی نشستیں ہار گئے تھے۔ یہ واقعہ 1947ء کے بٹوارے کے شرمناک کردار کو صاف عیاں کر رہا تھا۔

الیکشن کے صرف دو ماہ بعد ہی مرکزی حکومت نے نو منتخب اسمبلی کو تحلیل کر دیا اور آئین کی شق 92A کے تحت وہاں گورنر راج نافذ کر دیا۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی اور مالکان کیلئے حکم جاری کر دیا گیا کہ کسی کمیونسٹ مزدور کو کام پر نہ رکھا جائے ورنہ انتظامیہ ان کے ساتھ سختی سے نمٹے گی۔ ایک طرف بائیں بازو کو کچلنے اور اس کی سرگرمیاں روکنے کیلئے جبر و تشدد کیا جا رہا تھا تو دوسری طرف دائیں بازو کے ''یونائیٹڈ فرنٹ'' کو مراعات سے نوازا جا رہا تھا۔ مغربی پاکستان میں ضمنی الیکشنوں میں مسلم لیگ پے در پے شکستوں سے دوچار ہو رہی تھی جس سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ اگر آزاد انتخابات کرائے گئے تو مسلم لیگ تینوں صوبوں میں ہار جائے گی۔

انکل سام سے رسم وراہ

افسر شاہی دہشت زدہ ہوکر حواس باختہ ہوتی جارہی تھی۔معاملات کوسیدھا کرنے اوران پر قابو پانے کیلئے ''ون یونٹ'' کا منصوبہ تیار کرلیا گیا۔اس کی ابتدامیں ہی ،مسلم لیگ میں دھڑے بندی ہو گئی۔گورنر جنرل غلام محمد ایک بدتمیز و بدزبان بیوروکریٹ تھا جس کا امریکہ میں ڈولس برادرز کے ساتھ انتہائی قریبی تعلق تھا۔جبکہ وزیراعظم محمد علی بوگرہ خود بھی امریکی وزیرخارجہ جان فوسٹر ڈولس کا چہیتا اورمنظورنظر تھا۔غلام محمد نے وزیراعظم بوگرہ کے ساتھ کمانڈرانچیف جنرل ایوب خان کو امریکہ روانہ کیا تاکہ اس کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے طویل المدتی عسکری اور معاشی معاہدے کیے جائیں اور ملک کو چلانے کے لئے حکومت کوسنبھالا دیا جائے۔کراچی واپسی پر یہ دونوں سیدھا گورنر جنرل ہاؤس گئے۔جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئین ساز اسمبلی تحلیل کرکے پاکستان میں ہنگامی حالت کا نفاذ کردیا جائے۔ یہ ایمرجنسی ان بے شمار ایمرجنسیوں کا نقطہء آغاز تھی جو بعد میں پے در پے ملک میں نافذ ہوتی رہیں۔ مرکزی حکومت نے زبردستی ون یونٹ منصوبہ مسلط کردیااورصوبائی اسمبلیوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اسے منظور کرلیں۔ 14اکتوبر1955ء کو ایک نیا صوبہ ''مغربی پاکستان'' قائم کردیا گیا۔جبکہ 23مارچ 1956ءکو پاکستان کو''اسلامی جمہوریہ'' قرار دے دیا گیا۔

پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے روس کے دورے کی دعوت مسترد کردی تھی جبکہ اس کی بجائے اس نے امریکہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔بعدازاں اس کے پیشروحکمرانوں نے اس گٹھ جوڑ کو مزید مضبوط کیا۔غلام محمد اور سکندر مرزا جو بیوروکریٹ تھے،دونوں نے 1950ء کی دہائی میں ملک کو چلایا اوران کی خواہش تھی کہ ان کا امریکہ کے ساتھ اتحاد قائم و مستحکم ہوجائے تاکہ وہ ملک میں اپنی پوزیشن کو بہتر وموثر کرسکیں۔جبکہ پہلی امریکی امداد 1951ء میں ہی پاکستان پہنچادی گئی تھی۔جان فوسٹر ڈولس نے پاکستان کوایشیا میں آزادی کا نگہبان قرار دیا۔یہ تصور کہ امداد کسی شرط یا پابندی کے بغیر ملا کرتی ہے انتہائی بیہودہ اور فاسق ہے۔خود امریکی سرکاری دستاویز اس پر اپنی پالیسی کو واضح کرتی ہے؛

''تکنیکی معاونت کوئی ایسی شے نہیں ہوا کرتی جو ایک حکومتی ادارے کے طور پر ہم ایک دوسرے کو لیتے یا دیتے ہوں۔امریکی حکومت کسی طور کوئی خیراتی ادارہ نہیں ہے۔نہ ہی یہ امریکی عوام کے سخی مزاج ہونے کا کوئی اظہار یا وسیلہ ہے۔اس کارخیر کیلئے فلاحی،خیراتی اور مذہبی ادارے مناسب آلہ ہوتے ہیں اور

ایسے کئی دنیا بھر میں کام کر بھی رہے ہیں۔ تکنیکی معاونت امریکہ کے ان متعدد اوزاروں میں سے ایک ہے جس کے ذریعے ہم نہ صرف اپنی خارجہ پالیسی بلکہ دنیا بھر میں امریکی مفادات کی تعمیر و تشکیل کیا کرتے ہیں۔ ہماری یہ معاونت دفاعی معاہدوں، سمندر پار انفارمیشن پروگراموں، اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں میں شرکت، افراد کے تبادلوں کے منصوبوں، ٹیرف اور تجارتی پالیسیاں، زائد زرعی اجناس کو ٹھکانے لگانے کی پالیسیوں اور روایتی سفارتی نمائندگی کے طریق کار سے متعلق ہوتی ہے''۔(5) بھارت اور افغانستان کی جانب سے مغربی بلاک کا حصہ بننے سے انکار نے پاکستان کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ پاکستان کی فوج اور افسر شاہی پاکستان کو امریکی اڈہ بنانے پر راضی ہوگئی۔ جنم دن سے ہی پاکستان کی تعمیر میں خرابی کی اک صورت مضمر تھی۔ جس نے اسے تحفظ و عدم تحفظ کے دوہرے احساس میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ اسی احساس کے کرب نے شروع ہی سے اس کی سبھی پالیسیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معیشت سمیت اس کی سب پالیسیاں ریاست کے تحفظ کے اسی احساس کے گرد ہی تشکیل اور ترتیب دی جاتی رہی ہیں۔

آزادی کے بعد ہونے والے خونریز واقعات کے بعد پاکستان کا حکمران طبقہ بھارت کو ایک ایسا درندہ سمجھ کر خوفزدہ ہو چکا تھا کہ جو اپنے چھوٹے ہمسایوں کو کھا جانے پر تلا ہوا تھا۔ اس کچھ سچے اور کچھ تصوراتی خوف نے پاکستان کے حکمرانوں کو آزادی کے فوری بعد ہی اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اپنے سے بڑے، زیادہ طاقتور اور زیادہ مضبوط بھارت سے محفوظ رہنے کیلئے، اور پھر اپنی اندرونی کمزوری اور کھوکھلے پن سے سہمے اور سب سے بڑھ کر اپنے محروم عوام سے خوفزدگی نے ان حکمرانوں کو ایک ایسی نفسیات میں مبتلا کر دیا کہ ریاست کو زیادہ سے زیادہ مسلح کیا جانا ہی ہمارے بچنے کا مناسب و معقول رستہ ہے۔

''بھارت سے محفوظ رہنے کیلئے، پاکستان کی خواہش ہوگی کہ وہ ضرورت پڑنے پر امریکہ کا دامن پکڑ لے گا۔ لیکن ہم کبھی بھی قبول نہیں کر سکتے کہ ہم بھارت کا دامن تھام لیں اور خود کو ننگ وطن کر لیں''۔(6) اگرچہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے مذکورہ بالا شرمناک اور بیہودہ بات 3 جنوری 1966ء کو امریکی سفیر کے سامنے کہی تھی، تاہم بھارت کی برتری کے اس خوف و ہراس نے پاکستان کو شروع دن سے ہی امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ پاکستان اپنے وفاقی بجٹ کا کم از کم 25% شروع سے ہی دفاعی اخراجات پر خرچ کرتا چلا آ رہا ہے، مگر اس سے کہیں بڑی رقم خفیہ طور پر بھی دفاع پر خرچ کی جاتی رہی ہے۔ یہ اعداد و شمار سامنے آئیں تو انسان کی عقل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ اس کے باوجود بھی پاکستان اب تک

لڑی جانے والی ایک بھی جنگ میں کامیابی حاصل نہیں کرسکا،اس کارگاہ شکست میں یہ 1948ء میں نصف کشمیر سے ہاتھ دھو بیٹھا، 1971ء میں یہ اپنا ہی نصف مشرقی پاکستان ہار گیا، 1980ء کی دہائی کے اوائل میں سیاچن گنوادیا گیا جبکہ کارگل کی حقیقی کہانی پر سے ابھی پردہ اٹھنا باقی ہے۔

آزادی کے وقت 95000 نفوس پر مشتمل فوج پاکستان کے حصے میں آئی تھی۔ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ اس کی تعداد میں فوری اضافہ کرتے ہوئے اسے 150,000 کردیا جائے۔اس مقصد کیلئے محمد علی جناح' لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین نے اپنے اپنے دورحکومت میں امریکہ سے دوارب ڈالر کے فنڈز حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر امریکہ انکار کرتا رہا۔ پاکستان کا سب سے پہلا بجٹ 28فروری1948ء کو پیش کیا گیا جس کا 85% حصہ حیران کن حد تک دفاعی اخراجات کیلئے مختص کیا گیا۔صرف 1953/54ء کو چھوڑ کر اگلے دس سالوں تک یہی حصہ مختص رکھا گیا۔ایوب حکومت کے پہلے بجٹ میں ترقی کیلئے رقم دوگنی کردی گئی اور اسے دفاعی بجٹ کے برابر لایا گیا (دفاعی بجٹ کو ابتدائی سالوں سے ہی امریکہ کی عسکری معاونت کے مطابق ترتیب وتشکیل دیا جاتا رہا تھا) ترقی کا یہ تخمینہ بھی امریکی معاشی معاونت کے تحت ہی مرتب ہوا تھا۔

1952ء میں پاکستان کو غذائی قلت کے شدید بحران نے آلیا۔ پاکستان نے امداد اور معاونت کیلئے امریکہ سے درخواست کی ۔مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں پاکستان کو ایکسپورٹ امپورٹ بینک آف امریکہ (USEXIM) کی جانب سے 15 ملین ڈالروں پرمبنی ایک کمرشل قرضے کے ذریعے دس لاکھ ٹن گندم فراہم کی گئی۔

19 مئی 1954ء کو پاکستان اور امریکہ کے مابین ''باہمی دفاعی معاہدے'' پر دستخط ہوگئے۔جبکہ 8 ستمبر 1954ء کو پاکستان سیٹو (South East Asia Treaty Organistaion) SEATO کا ممبر بن گیا۔ایوب خان نے اس موقع پر کہا کہ '' آسمان ہماری حد ہے''۔لیکن سیٹو نے کبھی بھی پاکستان کو نہ تو امریکی امداد سے مستفید ہونے دیا اور نہ ہی پاکستان پر حملوں کے وقت اس کا کوئی ساتھ دیا۔ پاکستان نے 1959ء میں بدابیر کے مقام پر امریکہ کو اڈہ بنانے کی جو سہولت فراہم کی تھی اس نے بھی پاکستان کے دفاع کو مستحکم کرنے میں کوئی مدد نہیں کی بلکہ اس کیلئے خطرات میں اضافہ کردیا۔اس اڈے سے 1962ء میں، امریکی U-2s طیارے پرواز کرکے روسی فضائی حدود میں داخل ہوگئے تھے جن میں سے ایک کو روسیوں نے مار گرایا تھا اور پھر پاکستان کو دھمکی دی تھی کہ دوبارہ اس اڈے سے کوئی

پرواز اس کی حدود میں آئی تو وہ پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔

11 جولائی 1952ء کو پاکستان ورلڈ بینک میں شامل ہو گیا۔ اس سے اگلے سال بینک کے ایک وفد نے پاکستان کا دورہ کیا اور آبپاشی، ریلوے کی بحالی، مواصلات میں بڑھوتری اور ہائیڈرو پروجیکٹس منصوبوں کیلئے 6 کروڑ ڈالر کی پیشکش کی۔ پاکستان نے اپنی تاریخ کا پہلا قرضہ 22 جولائی 1952ء کو پاکستان ریلوے کیلئے ورلڈ بینک سے حاصل کیا جو دو کروڑ ستر لاکھ ڈالر تھا۔

1967ء میں جب امریکہ نے پاکستان کی امداد بند کر دی تو ایوب خان نے عالمی بینک سے رابطہ کیا اور پہلی بار پاکستان نے اپنے قرضوں کیلئے ریلیف مانگا۔ مگر دو سال تک کنسورشیم نے اس پر غور کیلئے اپنی میٹنگ ہی نہیں بلائی۔ جس پر جنرل یحییٰ خان کو مجبور ہو کر 25 مارچ 1969ء کو قرضوں کی دوبارہ ادائیگی پر پابندی لگا دینی پڑی۔

امریکی معاشی اور عسکری امداد نے پاکستان کی سیاسی اور سماجی قوتوں کے اندرونی تعلقات کو بھی بدل کے رکھ دیا اور ان کا جھکاؤ رجعتی اور قدامت پرست پارٹیوں اور اداروں کی طرف کر دیا۔ اور امریکہ کو اس کیفیت کا بخوبی ادراک بھی ہے، اس نے اس کا اظہار بھی کیا ہے ''سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو امریکی عسکری امداد نے پاکستان کی مسلح افواج کو مضبوط کیا ہے۔ اس وقت ملک میں یہی ایک واحد منظم اور مستحکم ادارہ ہے اور اس وجہ سے پاکستان کو اجتماعی دفاعی معاہدوں میں شرکت کا حوصلہ اور موقع بھی ملا ہے۔(7)

صورتحال اس وقت انتہا پر پہنچ گئی جب پاکستان نے اکتوبر 1956ء میں مصر پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ وہاں برطانیہ کے حمایتی بادشاہ فاروق کے تخت کے اکھاڑے جانے کے بعد وہاں جمال عبدالناصر کی حکومت کے قیام نے مشرق وسطیٰ کی سیاست کا رخ بدل کے رکھ دیا تھا۔ عرب قوم پرستی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ ناصر نے 26 جولائی 1956ء کو مغرب کی طرف سے اسوان ڈیم کی تعمیر کیلئے درکار فنڈز نہ دینے کے ردعمل میں نہر سویز کو قومی تحویل میں لیا۔ اس موقع پر ناصر نے کہا کہ سامراج کو اپنے غصے کی آگ میں جھلسنا پڑ سکتا ہے۔ ناصر کی برطانیہ کے خلاف مزاحمت نے سبھی سابق نوآبادیوں کے عوام کی اکثریت کے دل و دماغ کو اس کیلئے ہمدردی اور ہم آہنگی کے جذبات سے بھر دیا۔

مغربی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی

1957ء کے اوائل میں بھاشانی نے مغربی پاکستان کا دورہ کیا جہاں اس نے بائیں بازو کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ سبھی ترقی پسند تنظیموں کی ایک آل پاکستان کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ یہ کانفرنس 25/26 جولائی 1957ء کو ڈھاکہ میں ہوئی۔ اس کے نتیجے میں نیشنل عوامی پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سماجی ساخت کے حوالے سے اس میں ہر صوبے کی نمائندگی موجود تھی مگر یہ ملک بھر کے سبھی کمیونسٹ اور نان کمیونسٹ بائیں بازو کے گروپوں کا ایک ''یونائٹڈ فرنٹ'' تھا۔ اس کے طے کردہ مقاصد اور عزائم میں انقلابی قوم پرستی اور سوشل ڈیموکریسی کا اتصال تھا۔ بنیادی طور پر اپنی ہیئت اور پروگرام کے حوالے سے یہ سٹالنزم کے مختلف عوامل کا مجموعہ تھا۔ برصغیر کے بٹوارے نے بائیں بازو کی طاقتوں کو شدید بے سروسامانی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ خاص طور پر مغربی پاکستان میں تو اس کے شدید اثرات مرتب ہوئے۔ جہاں کمیونسٹ تحریک کبھی عوامی بنیادیں حاصل نہیں کر پائی۔ یہاں کے کمیونسٹ محض ایک محدود نوعیت کا کسان احتجاج ہی منظم کر پائے تھے۔ لائل پور جو کہ اب فیصل آباد ہے، منٹگمری جسے بعد میں ساہیوال بنا دیا گیا، ملتان، خانیوال اور کچھ دیگر ضلعوں میں کسانوں کی تحریکیں اور کسانوں، زمینداروں کے مابین جھڑپیں سامنے آئی تھیں۔ پنجاب کے حکمران اور یونینسٹ لیڈر سر سکندر حیات نے تشدد اور مراعات دونوں طریقے استعمال کر کے اس احتجاج پر قابو پا لیا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان CPP کے قیام کا فیصلہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے 1948ء میں کیا اور اس کیلئے وہاں سے کچھ مسلمان کمیونسٹوں کو پاکستان بھیجا تا کہ وہ نئی تنظیم کی مدد و معانت کر سکیں۔ سجاد ظہیر سی پی پی کا پہلا جنرل سیکرٹری تھا جس کا تعلق بھارت کے صوبے یوپی سے تھا۔ اس کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا اور وہ اردو ادب میں ایک معروف تنقید نگار بھی تھا۔ تاہم اس کی تنظیمی صلاحیتیں اس کی ادبی قابلیت سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ طارق علی کے الفاظ میں ''مغربی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی ممبر شپ دو سو سے کم تھی۔ صرف مستعد کیڈروں کی موجودگی سے ہی کوئی پارٹی موثر ٹریڈ یونین نیٹ ورک کو تشکیل دے سکتی تھی''۔(8) مگر کیڈروں کی استعداد اور صلاحیتوں سے مناسب طور پر استفادہ نہیں کیا گیا۔ پارٹی نے شارٹ کٹ استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ اور پھر سٹالنسٹ مرحلہ واریت کا غلط نظریہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی جو اس کی ترقی و پھیلاؤ کے آڑے آئی۔

1951ء میں پنڈی سازش کیس نے سارے ملک کو چونکا کے رکھ دیا۔ چیف آف آرمی سٹاف میجر جنرل اکبر خان اس کا ماسٹر مائنڈ تھا جو ایک ترقی پسند اور بہادر افسر کے طور پر مشہور تھا۔ اس کے ساتھیوں میں انقلابی قوم پرست، انتہائی متعصب اور مذہبی جنونی قسم کے افسر بھی شامل تھے۔ نوزائیدہ کمیونسٹ پارٹی اس معاملے میں یوں ملوث ہوگئی کہ سجاد ظہیر کی جنرل اکبر سے ایک کاک ٹیل پارٹی میں ملاقات ہوئی۔ جس میں جنرل اکبر نے مجوزہ بغاوت کے بارے میں گفتگو کی اور اس کیلئے اغراض ومقاصد اور ہٹ لسٹ کی تیاری میں مدد مانگی۔ کمیونسٹ پارٹی نے اس منصوبے کی منظوری دی اور اس سلسلے میں ہونے والی کئی میٹنگوں میں شرکت بھی کی گئی۔ لیکن فوج سے شریک ایک افسر اس دوران خوف کا شکار ہو چکا تھا اور اس نے مخبری کر دی جس سے سارا راز افشا ہو گیا۔ سبھی سازشیوں کو دھر لیا گیا۔ کمانڈر انچیف ایوب خان حیران رہ گیا کہ اسے گولی سے اڑا دینے کا منصوبہ تیار ہو چکا تھا۔ اس منصوبے کی کمزوری اور ناپختگی اسی سے ظاہر ہوگئی کہ سازشیوں کو انتہائی کم سزا سنائی گئی۔ سجاد ظہیر تو رہا ہوتے ہی واپس بھارت چلا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی نے پابندی لگنے کے بعد خود کو عملی طور پر تحلیل کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے کئی کیڈروں نے آزاد پاکستان پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس دھچکے نے پارٹی کے رہے سہے عناصر کو اتھاہ مایوسی میں دھکیل دیا اور اس کے بعد سے پارٹی کبھی بھی ایک ملکی سطح کی آزاد قوت کے طور پر نہیں ابھر سکی۔ اس کے بعد اس کی سیاست وقتاً فوقتاً مختلف النوع اور مختلف طبقات کے عناصر کے ساتھ وابستہ ومنسلک ہوتی رہی۔

1958ء

1958ء کے بجٹ میں دفاعی بجٹ میں اضافہ جبکہ قیمتوں میں توازن کے اقدامات کو ختم کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے شہریوں کیلئے زندہ رہنے کیلئے درکار لوازمات کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا جو کہ اوسطاً 8.2 فیصد تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں اور دیہاتوں میں احتجاج شروع ہو گیا۔ ہڑتالیں ایک عمومی بات ہو کے رہ گئیں جنہیں ریاست اور مالکان کے پالتو غنڈے بے رحمی سے کچل رہے تھے۔ مغربی پاکستان کے دارالحکومت لاہور میں لاکھوں کسانوں نے مارچ کیا جس میں انہوں نے یہ مطالبات پیش کیے۔

1- مزارعوں کی بے دخلی کا خاتمہ۔

2- جاگیرداری نظام کو ختم کیا جائے۔

3- غیر کاشتہ زمین بے زمین کسانوں میں تقسیم کی جائے۔

کئی دیگر واقعات میں سے ایک واقعہ صوبہ سندھ کے اندرون میں واقع ایک قصبے 'لنڈو میں پیش آیا جہاں ہاریوں (غریب کسانوں) کی فصلوں پر قبضہ کر کے ان کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا، خواتین کے ساتھ زیادتی کی گئی اور کئی ہاریوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سب مقامی جاگیرداروں کی بھرپور معاونت اور منشا سے کیا گیا''۔(9) 20 جون 1958ء کو لائل پور میں مزدوروں نے ایک یونین لیڈر کی گرفتاری کے خلاف ایک ہڑتالی کارخانے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جس پر پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کر دی جس سے چھ مزدور ہلاک اور اکیس شدید زخمی ہو گئے۔

ملک کے سب سے پہلے عام انتخابات مارچ 1959ء میں ہونے تھے۔ افسر شاہی انتہائی خوفزدہ تھی اور اس کی کئی درست وجوہات بھی تھیں۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ بائیں بازو کی جماعتیں قومی و صوبائی اسمبلی کی کئی نشستوں پر کامیابی حاصل کر لیں گی۔ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر ان الیکشن کو ملتوی یا موخر کیا جاتا ہے تو ایک عوامی غم و غصہ پھٹ پڑے گا اور پھر انتخابات کے امکانات بھی معدوم ہو جائیں گے۔

فوجی راج

دس سالوں کے دوران افسر شاہی ایک مستحکم و موثر بورژوا سیاسی پارٹی تعمیر کرنے میں ناکام رہی۔ 7 اکتوبر 1958ء کو پاکستان کے قیام کو جب گیارہ سال گزر چکے تھے، اور اس کے سیاسی ڈھانچے شکست و ریخت کی زد میں تھے، پاکستان کی فوج نے اقتدار پر قبضہ کر کے سیاست کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ یہ نئی حکومت سول و فوجی افسر شاہی کا ملغوبہ آمریت تھی۔ ایوب خان کے الفاظ میں ایک ایسی ریاست جو نوآبادی رہ چکی ہو اس میں ''جمہوریت کسی طور سنجیدگی و تحمل سے نہیں پنپ سکتی اس کیلئے تو ویسا ہی ٹھنڈا مزاج اور ماحول درکار ہوتا ہے جیسا برطانیہ کے اندر ہے''۔(10) ان الفاظ کو امریکی پالیسی سازوں اور ان کے نمائندوں نے نہ صرف سنجیدگی سے لیا بلکہ اسے دنیا بھر میں آزمایا بھی گیا۔ دونوں ادارے، فوج اور سول افسر شاہی، نوآبادیاتی ریاست کی براہ راست پیداوار اور باقیات تھے۔ اور ان اداروں کی طرف سے نوآبادیاتی حکمرانی کو برقرار رکھنے کی اہمیت سے کسی طور صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب اور پختونخواہ کے

پسماندہ ودرماندہ علاقوں سے نئی فوج کیلئے بڑے پیمانے پر بھرتی کی جارہی تھی۔

یہ ایک سادہ حقیقت ہے کہ آزادی کی پہلی دہائی کے دوران ہی یہ بات عیاں ہوچکی تھی کہ ریاست و مملکت پاکستان بہر طور ایک جدید صنعتی اور ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک بننے کی اہلیت سے محروم ہے۔ برصغیر کے بٹوارے کے المیے کو نظرانداز کرنے والے بائیں بازو کے سیاستدانوں کی خوش فہمی کہ نئی ریاست کا بانجھ حکمران طبقہ ایک جمہوری سیٹ اپ قائم کرے گا، قومیتوں کو برابری کے حقوق دے گا، شفاف الیکشن کرائے گا اور خودمختاری سمیت سبھی جمہوری تقاضے پورے کرے گا، یہ ایک طرف ان کا سب سے بہترین یوٹوپیائی خواب تھا تو دوسری طرف انقلابی مارکسزم کے ساتھ بدترین غداری بھی تھی۔ روایتی مسلمان بورژوازی درحقیقت امید اور مایوسی کے درمیان لٹک رہی تھی۔

سیاسی اتھل پتھل، ریاست کا بحران، اور سامرجی غلبے کی اطاعت بنیادی طور پر آزادی سے ہمکنار ہونے والے ایک نوآبادیاتی ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی ناکامی کی عکاس تھی جو کہ اب ایک وحشی سامراج کے جنون کے جال میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ نئی ریاست پہلے سے ہی بیچ سے کٹی ہوئی تھی اور اس کی دو قومیتیں بٹوارے کی قینچی سے ہی کٹ چکی تھیں، یہ کٹاؤ صرف جغرافیائی ہی نہیں تھا بلکہ تاریخی، معاشی اور ثقافتی تھا۔ کٹاؤ اور چیر پھاڑ کے اس زخم کو مندمل کرنے کیلئے ایک اعلیٰ پیمانے کی سماجی، معاشی ترقی اور نشوونما کی ضرورت تھی جس کو پاکستان کا حکمران طبقہ شروع کرنے سے ہی قاصر رہا۔ آپس میں دست وگریبان رہنے والی سیاسی حکمران اشرافیہ نے ایسی انتشارزدہ کیفیت پیدا کردی کہ جس سے پاکستانی سرمایہ داروں اور سامراج کے مفادات کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ بحران زدہ پاکستانی سرمایہ دارانہ نظام کی حفاظت کیلئے براہ راست فوجی حکمرانی کو اختیار کیا جائے۔ اس بات نے پاکستان کے حکمران طبقے کے رجعتی کردار کو بھی عیاں کردیا حالانکہ ابھی اس کی حکمرانی شروع ہوئے کچھ ہی سال ہوئے تھے۔

ریاست کی تشکیل کیلئے مذہب کا استعمال اپنے اندر ایک بہیمانہ حکمت عملی تو تھی ہی لیکن مارشل لاء مسلط کرنے سے اس ریاست اور اس کے حکمران طبقات کا تاریخی، معاشی اور نظریاتی دیوالیہ پن کھل کر سامنے آگیا۔ لیکن پھر جیسا کہ واقعات کا تسلسل ثابت کرتا ہے کہ فوجی آمریتوں کا یہ تجربہ بھی اپنے جبروتشدد کے باوجود، پاکستانی سرمایہ داری کو استحکام اور کارکردگی فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے برعکس اس دس سالہ آمریت نے ایسے سماجی تضادات کو ابھارا کہ جن کی وجہ سے ایک سماجی انقلاب پھٹ

پڑا جس سے ریاست ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی اور ایک سوشلسٹ انقلاب سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے کیلئے سامنے آ گیا۔

جمال عبدالناصر

27 اکتوبر 1958ء کی فوجی بغاوت کے نتیجے میں بننے والی حکومت فوجی اور سول بیوروکریسی کی کھلی آمریت تھی۔ دس سالوں تک قائم رہنے والی یہ آمریت دو وقفوں پر مشتمل رہی۔ پہلا 1958/62ء کا عرصہ فوجی تسلط کا تھا جبکہ 1962/69ء کے دوران بیوروکریسی نے ملکی سیاست میں اپنا حاوی کردار بحال کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ دن تھے جب ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں صورتحال انتہائی نازک ہوتی جا رہی تھی۔ خاص طور پر برطانوی سامراج کا انحطاط حالات کی نزاکت کو اور بھی مشتعل کرتا جا رہا تھا۔ نہر سویز کا 1956ء کا بحران اس کی بڑی وجہ بنی جب برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کو بپھرے ہوئے مصر کے عوام اور وہاں عروج کو پہنچے ''ناصرازم'' نے شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ عرب سمیت کئی نام نہاد مسلمان ممالک کے فوجی افسروں کیلئے جمال عبدالناصر امید کا ایک ایسا محور بن کر ابھرا جسے وہ قابل تقلید سمجھتے تھے اور تقلید کرنا بھی چاہتے تھے۔ اس کیفیت میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی فوجی بغاوت نے، ہر چند کہ وہ مغرب کا حامی تھا، سب کو حیران و پریشان کر دیا۔ وائیٹ ہال لندن کی راہداریوں میں تو اس نے کھلبلی مچا دی۔ بغاوت کے فوری بعد سفارتی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی اور سب کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ حالیہ دنوں میں آکسفورڈ نے کچھ برطانوی اخبارات کی فائلوں میں سے اس دور کا ایک ٹیلی گرام شائع کیا ہے جس سے اس سفارتی خوف کی واضح جھلک سامنے آ جاتی ہے۔ یہ ٹیلی گرام کامن ویلتھ آفس کی طرف سے 28 اکتوبر 1958ء رات 8 بج کر 20 منٹ پر بھیجا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ 'نئی حکومت کو کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا' مستقبل میں استحکام غیر یقینی ہے اور بے شمار اضطراب موجود ہیں۔ اگرچہ ایوب خان ایک مضبوط شخصیت کا حامل ہے اور عملیت پسند آدمی ہے تاہم اس کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہے جس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا پاکستانی فوج میں کوئی اور آدمی یا لوگ ایسے تو نہیں جو پس پردہ رہ کر صورتحال کو سنبھالا دے سکیں۔ ہمارے لیے یہ بات باعث تشویش ہے کہ اگر کسی وقت ایوب خان کو ہٹایا جاتا ہے تو اس کے بعد جو آئے گا وہ مغرب اور دولت مشترکہ دونوں کیلئے پہلے سے کم سودمند ہو گا۔ اس بات کے خدشات بھی موجود ہیں کہ یا تو وہ غیر جانبداری برتے گا یا پھر وہ

ناصر کے نقش قدم پر چل پڑے گا۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ دولت مشترکہ کے ایک رکن ملک میں جمہوریت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اگر چہ یہ عارضی ہے۔ ایوب حکومت کا مستقبل غیر یقینی ہے، تاہم یہ بات ہمارے مفادات کیلئے بہتر ہوگی کہ ہمیں ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرنی چاہیے''۔(11)

برطانوی سامراج کے خدشات اتنے بے بنیاد بھی نہیں تھے خاص طور پر اس کے عراق، شام اور پھر مصر کے تلخ تجربے کے بعد تو یہ اور بھی درست ہو گئے تھے۔ مصر میں قیادت کرنے والے بیس افسروں کا گروپ جس نے ''آزاد افسروں'' کی موثر حکومت قائم کی تھی یونیورسٹی گریجوایٹس پر مبنی تھا جن میں سے زیادہ تر قاہرہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ یہ سب اپنے شہروں میں مقبول سیاسی رجحانات سے متاثر تھے۔ ان میں اخوان المسلمین کی احیائے اسلام سے متاثر ہونے والے اور مصر کے بائیں بازو کی طرف سے مشتہر سوشلزم کے پیروکار شامل تھے۔ انور السادات اخوان کا سرگرم کارکن تھا تو جمال عبدالناصر، خالد محی الدین اور جمال سالم بائیں بازو سے وابستہ تھے۔ کیڈٹ اور افسر کے طور پر اپنی طالبعلمی کے دوران ناصر نے والٹیر، جاریبالدی، اتاترک، نپولین، کلازوٹ اور بعض کے مطابق مارکس تک کا بھی مطالعہ کیا ہوا تھا۔ اس گروپ نے کامیابی کے ساتھ بادشاہت کو اکھاڑ پھینکا تھا اور کوشش کی کہ انقلابی اقدامات کیے جائیں۔ خاص طور پر زراعت کے شعبے میں ایک قوم پرستانہ سامراج مخالف پروگرام کے تحت دیہاتوں میں استحصالی طبقے کی کمر توڑ دی گئی۔

میکارتھر

متضاد طور پر دیہاتی اور آمرانہ پس منظر رکھنے کی وجہ سے پاکستانی جرنیل کچھ مختلف قسم کے تھے جن کا دنیا کے بارے میں تصور محدود اور تھکا ماندہ سا تھا۔ لیکن امریکیوں کے منصوبے اور اہداف کچھ اور ہی تھے۔ وہ مشرق بعید کے تجربے کو پاکستان کے اندر دہرانا چاہ رہے تھے۔ جنوبی کوریا، ہانگ کانگ، فورموسا جو کہ اب تائیوان ہے، جاپان، سنگاپور سمیت جنوب مشرقی ایشیا کے کئی علاقوں میں امریکہ، فوجی آمریتوں کی مدد سے نسبتاً مضبوط سرمایہ دارانہ معاشی بنیادیں قائم کر چکا تھا۔

فوجی اور دھونس کی طاقت کی مدد سے امریکی ملٹری ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر جنرل ڈگلس میکارتھر نے شدت کے ساتھ زرعی اصلاحات سمیت کئی اقدامات کیے تاکہ ان ریاستوں میں جدید صنعتی سرمایہ دارانہ بنیادیں استوار کی جاسکیں۔ یہ تجربات کامیاب رہے کیونکہ یہ ریاستیں اپنے ساتھی ملکوں چین، کورین جزیرہ

نمااور ملایا سے کٹی ہوئی تھیں۔ جاپان پہلے ہی ان ممالک میں صنعتی بنیادیں استوار کر چکا تھا وہ بھی جنگ سے پہلے۔ تاہم امریکہ نے جنرل میکارتھر کے جابرانہ دور میں بے پناہ سرمایہ کاری کی اور ایک ایسی مطیع بورژوازی پیدا کی جو ہزاروں قسم کی جکڑ بندیوں میں کچھ اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ امریکی تسلط اور غلبے پر ذرا سی بھی آنچ نہ آسکے اور جو جنرل میکارتھر اور امریکی فوج کی واپسی کے بعد بھی قائم رہ سکے۔ یہ سارا اہتمام چین اور علاقے کے دوسرے ملکوں میں سرخ انقلاب کی طوفانی موجوں کو روکنے کیلئے کیا جارہا تھا۔ اسی لئے یہاں ٹھوس قسم کی سرمایہ دارانہ ترقی کو یقینی بنایا گیا۔ امریکہ نے جنگ کے دوران اپنے محنت کشوں سے کشید کی ہوئی قدر زائد کی بڑی مقدار کو یہاں سرمایہ کاری کیلئے استعمال کیا۔ یہ سب، بعد از جنگ کی سرد جنگ کے دوران امریکی سامراج کی سیاسی، عسکری، سفارتی اور سٹریٹجک برتری کو برقرار رکھنے کیلئے لازمی تھا۔ 1949ء کے انقلاب کے بعد چین میں قائم ہونے والی سٹالنسٹ حکومت نے بھی، اپنی تنگ نظر قوم پرستی کے باعث اس عمل کو مضبوط کرنے میں بہت مدد کی۔ جنرل میکارتھر کی جابرانہ حکومت نے اس عمل میں کئی جاگیردارانہ باقیات کی طاقت کو تہہ و بالا کیا ان میں جاپان کی بادشاہت کا خاتمہ بھی شامل تھا تاکہ ان علاقوں میں جدید قومی ریاستیں قائم کی جاسکیں۔

ایوب خان

پاکستان کی قسمت میں ایسا نہیں تھا، اگرچہ ہمارے یہاں اب بھی کچھ بورژوا سیاستدان ایشیائی ٹائیگرز کے ''معجزے'' کے سرزد ہونے کا راگ الاپتے رہتے تھے تاہم 1990ء کی دہائی میں ان ایشیائی ٹائیگرز کے انجام کے بعد سے یہ غلط فہمی ختم ہو کے رہ گئی ہے۔ پاکستان میں یہ عمل رابرٹ میکنا مارا کے ذریعے شروع کیا گیا جو 1960ء کی دہائی میں امریکی وزیر دفاع اور ان دنوں عالمی بینک کا سربراہ تھا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کی پالیسیوں کو تشکیل دینے اور ان پر عملدرآمد کرانے کی ذمہ داری میکنا مارا ہی سرانجام دے رہا تھا' وہ بھی پاکستانی جرنیلوں کی معاونت اور دباؤ کے ذریعے۔ پاکستان میں سبز انقلاب اور زرعی اصلاحات کا منصوبہ واشنگٹن میں تیار کیا گیا۔ امریکہ کی اس پالیسی کے پیچھے وہی مقاصد کارفرما تھے جو مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا میں کارفرما تھے۔ یعنی خطے میں کسی بھی انقلابی تحریک سے نمٹنے کی قبل از وقت تیاری کی جائے۔ لیکن پاکستان میں اس پالیسی کے الٹ نتائج برآمد ہوئے۔ جس طرز کی ترقی کا اہتمام کیا گیا اس نے انقلاب کو روکنے کی بجائے اس کے ابھرنے کے حالات پیدا کر دیئے۔

بٹوارے کے نتیجے میں جو قابل ذکر اثرات مرتب ہوئے ان میں سے ایک، اس وقت کی سیاسی اور جغرافیائی صورتحال تھی۔ برصغیر میں ہر طرف انقلابی طوفان ابھر رہے تھے۔ جو ہندو مسلمان بورژوا سیاسی قیادت کی کوششوں کے باوجود آزادی کی تحریکوں کے کردار پر حاوی ہو رہے تھے۔ اپنی سوانح عمری ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' میں ایوب خان نے ایک پورا باب اپنی فوجی حکمرانی کے بارے میں لکھا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اسے فوجی بغاوت کی بجائے ایک انقلاب ثابت کر سکے۔ لیکن اس کی اپنی حیرانگی اور خدشات بھی اس میں خاصے نمایاں ہیں۔ وہ لکھتا ہے ''ایک اور پریشانی جو مجھے لاحق ہو چکی تھی وہ یہ تھی کہ کس طرح فوج اقتدار میں آنے کے بعد اس سے الگ ہوگی، یہ ہوگی بھی یا نہیں؟ باہر کی دنیا اسے ''فوجی بغاوت'' قرار دے رہی تھی جو کہ دیگر ملکوں کے اندر بھی تسلسل سے ہو رہی تھی۔ اس سے پاکستان کے تشخص اور ساکھ کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ ایک انتہائی منظم، تربیت یافتہ اور ڈسپلن کی حامل فوج کیلئے یہ امر تکلیف دہ ہوتا ہے کہ وہ سیاسی حکمرانی کا آلہ بن جائے۔ لیکن جس قسم کی صورتحال ملک کے اندر موجود تھی' یہ صرف فوج ہی تھی جو ایک متحد ادارے کے طور پر اسے سنبھال اور معاملات کو معمول پر لا سکتی تھی۔ انقلابات اپنی تیاری میں طویل اور دردناک مراحل سے گزرتے ہیں۔ ان کیلئے تفصیلی منصوبہ بندی، خفیہ میٹنگیں کرنی پڑتی ہیں، ملک بھر میں فوج کو اتارنا اور متحرک کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے معاملے میں تیاری بہت ہی کم تھی اور اسے ایک ملٹری ایکشن کے طور پر نافذ کیا گیا۔ بس اتنا ہوا کہ ایک بریگیڈ ہی کو بلکہ دو بریگیڈز کو حرکت کرنا پڑی''۔ (12) پاکستانی بورژوا طبقے کی کمزوری نے فوج کو ایک متبادل اور وسط مدتی حکمرانی کے جواز فراہم کیے۔ غیر فوجی اشرافیہ کو حکمرانی کیلئے فوج پر بے پناہ انحصار کرنا پڑا۔ تاہم یہ بھی ایک شرمناک حقیقت ہے کہ دن رات اٹھتے بیٹھتے فوجی آمریت کا رونا رونے والے سبھی بورژوا سیاستدان اپنی اپنی حکومتوں کے دوران فوج کیلئے خزانے کے منہ بھی کھول دیا کرتے ہیں اور اسے پہلے سے بھی زیادہ بڑی رقم سے نوازتے ہیں۔ ایسا اس وجہ سے ہے کیونکہ یہ بخوبی ادارک رکھتے ہیں کہ آخری تجزیے میں ان کے استحصالی طبقے کے مفادات کی نگرانی اور نگہبانی کیلئے اور کسی بھی انقلاب کے خطرے سے بچاؤ کیلئے اگر کوئی ادارہ سب سے موثر اور کارگر ہے تو وہ یہی پاک فوج ہی ہے۔

بٹوارے کے بعد عالمی پیمانے پر سیاسی منظرنامے میں تبدیلی کے باعث برطانیہ کی عملداری کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ امریکہ نے سنبھالنا شروع کر دی۔ فروری 1954ء میں جی ایچ کیو راولپنڈی میں (USMAAG) یونائٹڈ سٹیٹس ملٹری اسسٹنس ایڈوائزری گروپ تشکیل دیا گیا

کیونکہ پاکستان کی داخلی و خارجی پالیسیاں اس وقت تک بڑی حد تک امریکی مفادات کے تابع ہو چکی تھیں۔ کچھ سیاستدان اس حقیقت سے بھی گھبرا گئے تھے کہ فوجی سربراہوں کے پینٹا گان کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ یہ بات مشکوک ہے کہ امریکی حکام 1950ء کی دہائی کے آخر میں ہونے والی فوجی بغاوت سے باخبر تھے۔ کچھ سالوں بعد ایوب خان کے بھائی سردار بہادر نے الزام عائد کیا کہ امریکی سی آئی اے فوج کے اقتدار پر قبضے کے معاملے میں پوری طرح ملوث تھی۔

اکتوبر 1958ء کے بعد ملٹری چیفس اور افسر شاہی کے نمائندگان نے دلیل دینی شروع کر دی کہ ملک کو سیاستدانوں سے محفوظ رکھنے کیلئے مارشل لاء کا نفاذ ضروری ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی سیاست بدنامی کی حد تک غیر مستحکم ثابت ہو چکی تھی اور ملک کے پارلیمانی ادارے تباہ و برباد ہو چکے تھے لیکن فوجی اقتدار کیلئے محض یہی ایک حقیقی وجہ نہیں تھی۔ پاکستانی ریاست ایک تشخص اور شناخت سے محروم تھی اور اس کا حکمران طبقہ کمزور تھا۔ اس نئی ریاست کے ہر ڈھانچے میں عوام کے غیض وغضب کے پھٹنے اور ان کی انقلابی پیش قدمی کے قوی امکانات موجود تھے۔ چنانچہ فوج نے غیر ملکی رہنمائی کے ساتھ، عوامی طاقت کے اظہار کے عمل کو روکنے کا فیصلہ کر لیا اور خود کو متبادل و معیاری حکمران طبقے کے طور پر متعارف کرانے اور خود کو ایک مضبوط سیاسی پارٹی کے طور پر سامنے لانے کا فیصلہ کر لیا۔ افسر شاہی کی طرف سے اس عمل کو مکمل تائید و حمایت حاصل تھی۔ ایوب آمریت کا پہلا مرحلہ آپریشن کلین اپ پر مبنی تھا جس میں سیاستدانوں کو گرفتار کر کے ان کے سیاست کرنے پر کئی سالوں تک پابندی لگا دی گئی۔ کئی ٹریڈ یونیوں اور کسان تنظیموں پر بھی پابندی لگا دی گئی اور طلبہ کو سختی سے روک دیا گیا کہ وہ کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لیں گے۔ بائیں بازو کے معروف دانشور میاں افتخار الدین کے ترقی پسند اخبارات کے سلسلے کو ریاستی تحویل میں لے لیا گیا، یہ الزام لگاتے ہوئے کہ میاں افتخار غیر ملکی ایجنٹ ہے۔ یہ بائیں بازو کے خلاف ایک سنجیدہ حملہ تھا جس کے ذریعے اس کی آواز دبا دی گئی اور سب کچھ حکومت نے براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔

اسی دوران فوج نے ملک کو جدید ''قومی ریاست'' بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ زرعی اصلاحات، تعلیم، شادی، فیملی لاء، اجرت و ملازمت سمیت کئی معاملات کیلئے کمیشن قائم کرنے شروع کر دیئے۔ تاہم فیملی لاء آرڈیننس (جس میں یک زوجیت کو تحفظ اور عورت کو طلاق کا حق دیا گیا) کے علاوہ کوئی اور کمیشن فیصلہ کن سنجیدہ اصلاحات نہیں کر سکا۔

داخلہ اور معاشی پالیسی

لیکن اس سلسلے میں جو واحد اصلاح کی بھی گئی اس سے استفادہ صرف درمیانے اور حکمران طبقے کی عورتیں ہی حاصل کر سکیں۔ محنت کش طبقے کی خواتین اور سماج کے دیگر محروم طبقات کے مالی وسائل ہی اتنے نہیں تھے کہ وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔ پاکستان کی خواتین کی اکثریت انہی محروم طبقات سے تعلق رکھتی تھی۔ پے اینڈ سروسز کمیشن نے جو رپورٹ مرتب اور پیش کی اس میں سول سروسز کے ملکی ڈھانچے کی اوور ہالنگ کے نام پر تباہ کن اقدامات تجویز کیے گئے جن کو لاگو کرنے سے برطانوی راج سے ورثے میں ملنے والی روایتی شاہانہ اکڑفوں کو چیلنج کیا گیا تھا۔ لیکن اس رپورٹ کو خاموشی سے سرد خانے میں ڈالنا مناسب سمجھا گیا۔ زرعی اصلاحات کے کمیشن نے سب سے زیادہ مایوس کیا۔ اس میں جو تجویز دی گئی اور جس طرح عملدرآمد کیا گیا اس کا ایک ہی مقصد و منشا تھا کہ صورتحال کو جوں کا توں قرار رکھا جائے۔ ہاں البتہ کچھ مصنوعی قسم کی اونچ نیچ ضرور کی گئی۔ میکسیکو میں کارڈینا اس اور مصر میں ناصر کی زرعی اصلاحات کے مقابلے میں دیکھا جائے تو پاکستان میں ہونے والی زرعی اصلاحات کو سب سے زیادہ زمیندار طبقے کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا۔ اگرچہ زمین کی حد ملکیت میدانی علاقوں میں 500 ایکڑ اور بارانی علاقوں میں 1000 ایکڑ مقرر کر دی گئی اور چراہ گاہوں اور مویشی فارموں کو اس سے مبرا قرار دے دیا گیا۔ زمینداروں نے اپنے پیاروں کے نام زمین کا انتقال درج کروا کے اصلاحات کو بے معنی کر دیا۔ سندھ کے ایک بہت بڑے وڈیرے میر غلام علی تالپور نے زرعی اصلاحات کو انتہائی سخاوت قرار دیتے ہوئے اسے صدر پاکستان کی کشادہ دلی کا نتیجہ قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان زرعی اصلاحات نے دیہات کے اصل اور مرکزی مسئلے کو چھیڑا تک بھی نہیں یعنی کاشت اور ملکیت کو الگ الگ کرنا۔ ان اصلاحات میں اگر کوئی مساوات سامنے آئی بھی تو وہ زمینداروں کے مابین مساوات تھی۔ بہت ہی کم اور نہ ہونے کے برابر زمین مزارعین کے حصے میں آئی مگر ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی جسے ادا کر کے اس پیشکش سے وہ مستفید ہو سکتے۔ چونکہ ہندو ساہوکار اب رہے نہیں تھے اس لیے نقد رقوم کی کوئی صورت موجود نہیں رہی تھی۔ انہی زمینداروں اور مالکوں نے ہی ساہوکاری کا کام سنبھال لیا تھا۔ حکومت نے دیہی قرضوں کے ادارے قائم ہی نہیں کیے تھے جو بے زمین کسانوں کی مدد کر سکتے۔ ان زرعی اصلاحات کے وقت 6000 زمینداروں کے پاس 500 ایکڑ فی کس کے حساب سے 75 لاکھ ایکڑ زمین تھی، جبکہ 22 لاکھ کسان خاندانوں کے

پاس فی خاندان 5 ایکڑ یا اس سے بھی کم زمین تھی۔ 25 لاکھ کسان بے زمین تھے اور وہ مزارع یا کھیت مزدور کا کام سرانجام دیتے تھے۔ اصلاحات نے اس صورتحال میں کوئی معیاری تبدیلی پیدا نہیں کی۔ جیسا کہ پاکستان ٹائمز نے نشاندہی کی ''پابندی لگنے سے کچھ ہی ماہ قبل، پاکستان مسلم لیگ جیسی قدامت پرست جماعت کی لینڈ ریفارم کمیٹی نے بھی نہری زمین کی ملکیت کی حد 150 ایکڑ کرنے کی تجویز پیش کی تھی''۔(13)

زمینداروں نے کاشتہ اراضی کا صرف 6% ہی ان زرعی اصلاحات کی نذر کیا تھا۔ اس کے باوجود کہ اس طبقے نے حکومتی سبسڈیوں سے استفادہ کرنا شروع کر دیا تھا جس سے ان کی پیداوار میں بڑھوتری بھی ہو رہی تھی۔ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر کاشتکاری کو فروغ دیا گیا جس سے قابل کاشت زمین کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن چھوٹے کاشتکار عملی طور پر نظرانداز کر دیئے گئے۔ سبز انقلاب کے اصل فوائد زمیندار طبقے کو ہی میسر آئے۔ سبسڈی اور قرضوں سے بھی سب سے زیادہ موقع اور مفاد انہی کو ملا۔ جبکہ ان کو انکم ٹیکس کی ادائیگی سے بھی مبرا رکھا گیا۔ دیہی علاقوں میں سکولوں، ہسپتالوں، ڈسپنسریوں کیلئے بمشکل کوئی رقم رکھی گئی۔ یہی حالت دیگر سہولیات کے ضمن میں بھی تھی جن سے وہاں فلاح و بہبود ممکن ہوتی۔ دیہی غریب آبادی جو ملک کی اکثریتی آبادی تھی بمشکل اس زرعی انقلاب سے مستفید ہو سکی۔

شہروں میں البتہ ڈرامائی طور پر معاشی ترقی کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ فوج نے پاکستان کو سرمایہ کاری کیلئے جنت بنا دیا اور اس کیلئے کئی پابندیاں اور تحفظات فراہم کیے گئے جن میں اہم ترین ٹریڈ یونینوں کو سختی سے دبا کے رکھا گیا۔ پاکستان کے پاس 1947ء میں کوئی سرمایہ دار طبقہ موجود نہیں تھا۔ برصغیر کا شمال مغربی حصہ خاص طور پر صنعتی اداروں کیلئے کبھی بھی موزوں نہیں رہا تھا۔ یہ بمبئی سے آنے والے بوہرے اور اسماعیلی خوجے تھے جنہوں نے پاکستان کی محدود صنعتکاری کا آغاز کیا۔ یہ لوگ، پنجاب کے اپنے چنیوٹی بھائی بندوں کے ساتھ مل کر پاکستان کی طاقتور افسر شاہی کے خدمتگار بن گئے۔ موخرالذکر نے نئی ریاست کی آشیرباد اور تعاون سے سرمائے کی تشکیل کیلئے کئی مسلسل اقدامات سرانجام دیئے۔ حکومتی امداد سے سستی مشینری اور خام مال کی فراہمی، سود سے پاک قرضے؛ ان سب سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا رہا لیکن دوسری طرف ٹیکسوں کی وصولی سے دیدہ دانستہ آنکھیں بند کر لی گئیں۔

تقسیم کے فوراً بعد ہی ستمبر 1947ء میں کراچی میں انڈسٹریز کانفرنس بلائی گئی تاکہ مستقبل کی ملکی صنعتی ترقی کے بارے میں منصوبہ بندی کی جا سکے۔ 2 اپریل 1948ء کو حکومت نے اپنی پہلی صنعتی پالیسی

جاری کی جس میں مسلسل صنعتی ترقی کی غرض سے ترجیحات کا تعین کیا گیا تھا۔(14)

حقیقی اداروں کے مالک طبقے کی کمزوری اور صنعت کی کمی کی وجہ سے حکومت کو صنعتی اداروں کا حامل طبقہ پیدا کرنے اور اس کو تیزی سے نشوونما دینے کیلئے سرگرم کردار ادا کرنا پڑ گیا۔اس سلسلے میں محمد علی جناح نے گورنر جنرل کے طور پر پہلی صنعتی پالیسی کے اجرا کے فوری بعد کراچی میں صنعت وتجارت کے چیمبر سے خطاب کرتے ہوئے واضح اہداف کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''حکومت چاہے گی کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن کی مدد سے صنعت اور تجارت کو پھلنے پھولنے کا ہر ممکن موقع مل سکے۔میں آپ کی توجہ چاہتے ہوئے آپ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ صنعتکاری کے ہر مرحلے کیلئے درکار انفرادی اور پرائیویٹ انٹر پرائز کو منظم کرنے کے عمل میں حکومت پاکستان کی معاونت کریں۔میں سول سرونٹس اور کاشتکاروں کے بغیر پاکستان کا تو تصور کرسکتا ہوں لیکن تاجروں کے بغیر پاکستان کا نہیں۔مجھے اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ پاکستان میں تاجروں اور سرمایہ کاروں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔اور مجھے اس کا قوی یقین ہے کہ وہ اپنا مستقبل، اپنی قسمت خود ہی تعمیر کریں گے''۔(15)

حکومت نے صنعتی ترقی میں بڑھوتری اور صنعتکار طبقے کی نشوونما کیلئے کئی مختلف اور تیز تر اقدامات کیے۔مارچ 1949ء میں کراچی سٹاک ایکسچینج قائم کی گئی تاکہ سرمائے کی ایک وسیع منڈی فراہم کی جائے۔ستمبر 1949ء میں پاکستان انڈسٹریل فنانس کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ نجی شعبے کی صنعتوں کو مالی معاونت فراہم کی جاسکے۔

نئے صنعتکار

ایک اور ٹھوس اقدام کے طور پر 1950ء میں پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن ایکٹ کا اجرا کیا گیا جس پر جنوری 1952ء میں عملدرآمد شروع کیا گیا۔جس کا مقصد ایک ایسی کارپوریشن کا قیام تھا جو صنعت کے شعبے میں عملی اقدامات کی ذمہ دار ہوتی۔بعض مخصوص کیفیات میں یہ نجی سرمائے کی معاونت بھی کرسکتی تھی جو اس کے منصوبوں کیلئے ضروری ہوسکتا تھا۔اس کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جب منصوبے مکمل ہوتے اور کام شروع کردیتے تو کارپوریشن سرمائے کے حصص نجی سرمایہ کاروں کو منتقل کردے گی۔نومبر 1952ء میں حکومت نے درآمدات کیلئے عمومی کھلے لائسنس معطل کردیے اور اشیائے صرف کی درآمد کو پابند کرتے ہوئے صرف ''ضروری'' اشیاء اور مشینری کی درآمد کی اجازت دے دی۔ان

تمام عوامل نے مل جل کر پاکستان میں ایک منافع بخش صنعتی سرمایہ کاری کے حالات پیدا کر دیئے۔ یوں ہم خوشحالی وترقی کا ایک ایسا دور دیکھتے ہیں جس کے دوران بڑے پیمانے پر صنعتی سرمایہ کاری ہوئی۔ غیر ملکی زر مبادلہ کی لاگت اور درآمد شدہ اشیاء کی مقامی سطح پر انتہائی زیادہ قیمتوں میں فرق کی وجہ سے درآمدات کا لائسنس رکھنے والوں نے ناقابل تصور منافع کمایا جسے بعد میں انہوں نے صنعت میں سرمایہ کاری کیلئے استعمال کیا۔ ان کو اس بات کی بھرپور ضمانت اور یقین دہانیاں فراہم کی گئیں کہ ان کو ایک ایسی ملکی منڈی دستیاب ہوگی جس میں کوئی بے یقینی نہیں ہوگی اور اگلی حکومت بھی اسے جاری وساری رکھے گی۔

''1950ء کی ساری دہائی کے دوران نئے صنعتکاروں نے انتہائی اعلیٰ منافع کمایا، ان کی سرمایہ کاری زیادہ تر اشیائے صرف کی صنعتوں میں تھی جہاں یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کا لگایا ہوا سارا سرمایہ پہلے ہی سال وصول ہو جایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی کے اوائل تک بھی اداشدہ سرمائے اور نیٹ ویلیو پر شرح منافع 25 سے 35 فیصد ہوتا تھا۔ اس عرصے میں اور ساٹھ کی دہائی تک حکومت نے نجی ملکیت کو مراعات دیتے ہوئے نجی صنعتوں کو بہت بڑے پیمانے پر سبسڈیز اور ٹیکسوں میں رعایتیں دیں۔

منافعوں کو بہت حوالوں سے ٹیکسوں سے مبرا رکھا گیا' ایسا مختلف شکلوں میں کیا گیا جیسا کہ ملک کے کئی مخصوص جغرافیائی علاقوں میں قائم ہونے والے صنعتی زونز کو ''ٹیکس ہالیڈے'' قرار دے دیا گیا' الاؤنسز کی گراوٹ میں تیزی لائی گئی' دوبارہ سرمایہ کاری میں لگنے والی کارپوریٹ اور ذاتی آمدنی پر انکم ٹیکسوں میں چھوٹ دی گئی وغیرہ وغیرہ۔ 1950ء کی دہائی میں حکومت نے جن چند ایک صنعتوں پر سرمایہ کاری کی ان میں نجی اداروں نے تکنیکی پیچیدگیوں، زیادہ ابتدائی اخراجات، زیادہ لاگت اور مشکوک منافعوں کا جواز بناتے ہوئے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ مگر حکومت نے بہرحال وہ پروگرام شروع کیا جس کا اعلان کردہ ہدف یہ تھا کہ وہ ان صنعتوں کو تیار ہو جانے کے بعد نجی اداروں کو فروخت کر دے گی''۔(16)

1958ء تک ترقی کا یہ سلسلہ رک چکا تھا۔ زرعی پیداوار میں جمود نے غذائی اشیاء کی شدید قلت پیدا کر دی جس کا مطلب تھا قیمتوں اور افراط زر کے اندیشے میں اضافہ۔ اشیائے صرف کی ملکی پیداوار کے ذریعے درآمدات کے متبادل کی یہ حکمت عملی جتنی کارگزاری دکھا سکتی تھی دکھا چکی تھی اور اب اس میں مزید پھلنے پھولنے کا کوئی امکان باقی نہیں بچا تھا۔ ایوب خان کے مارشل لاء نے گرتی ہوئی معاشی اور سیاسی صورتحال کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کیلئے کئی ایسے مدافعتی اقدامات کر رکھے تھے کہ جن کی مدد سے اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ ان اقدامات نے شروع شروع میں سرمایہ کاروں کو وقتی طور پر بے یقینی سے

دوچار کیا مگر پھر جلد ہی حکومت نے اس بات کو واضح کیا کہ اس سب کچھ کا مقصد نجی شعبے کی ترقی اور نشوونما ہی تھا۔ ابتدائی طور پر اس حوصلہ افزائی کا مقصد نئی صنعتوں کی نشوونما تھا جس کا ہدف برآمدات کے شعبے کو ترقی دینا تھا اور جس کیلئے مالی امداد بہت بڑی مقدار میں ملنے والی غیر ملکی امداد سے کی جاتا تھی۔ ان اہداف کو پانے کیلئے جلد ہی پالیسیوں کا نفاذ کر دیا گیا۔ ایوب خان نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ''معاشی ترقی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے نئے ممالک مغربی جمہوری نظام کی جکڑ بندیوں کی طرز پر ترقی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر ان کی ترقی کے عمل کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان ملکوں نے بھی مطلق العنان حکومتوں کے ہوتے ہوئے ہی یہ حاصلات کی تھیں''۔(17)

1960ء کی دہائی میں حکومت کی نجی شعبے کو کھلی چھوٹ دینے کی پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے نجی صنعت کو مالیاتی اداروں کی طرف سے قرضوں کی صورت میں مزید معاونت کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ پاکستان انڈسٹریل فنانس کارپوریشن PIFCO اس مقصد کیلئے پہلے ہی 1948ء میں قائم کی جا چکی تھی۔ 1957ء میں پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انویسٹمنٹ کارپوریشن PICIC، عالمی بینک کی معاونت سے قائم کی گئی۔ تاکہ PIFCO کے دائرہ کار سے باہر موجود نجی صنعتوں کی بڑی تعداد کو بھی غیر ملکی زرمبادلہ کی سہولت فراہم کی جا سکے۔ 1960ء کی دہائی میں PIFCO کو انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ بینک آف پاکستان IDBP میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس نے درمیانے درجے کی اور PICIC نے بڑی صنعتوں کا شعبہ اپنے اپنے ذمے لے لیا۔ ان شعبوں میں جہاں نجی شعبہ ابھی تک سرمایہ لگانے سے احتراز کر رہا تھا اس کے باوجود کہ ان کو ہر قسم کی من مانی معاونت کی پیشکش بھی کی گئی تھی، حکومت نے ان منصوبوں پر خود ہی براہ راست سرمایہ کاری کر لی۔ یہ زیادہ تر صنعتی استعمال کی اشیاء کے منصوبے تھے جن کا مقصد پاکستان کے صنعتی طور پر پسماندہ علاقوں میں روزگار کے مواقع پیدا کرنا تھا۔

سرمایہ دارانہ مفادات کی عوامی مفادات پر برتری

PIDC نے اپنے منصوبے انتہائی موزوں شرائط پر نجی اداروں کو سونپ دیئے۔ کارپوریشن کے وسائل سے مستفید ہونے کیلئے عمومی طریق کار کی غیر موجودگی میں، کہ ان منصوبوں کو کیسے کس کے سپرد کیا جائے، یہ تبادلے سیاسی بندر بانٹ کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ چنانچہ یہ سبھی منصوبے ان بڑے صنعتکاروں کے پاس چلے گئے جنہوں نے اعلیٰ افسر شاہی کی دیانتدارانہ خدمت کی تھی۔ یوں کاروبار اور

بیوروکریسی کے اس مالیاتی مفاداتی تال میل نے ملک کے بڑے صنعتی گھرانوں کے پاس دولت کے ارتکاز میں بے پناہ اضافہ کردیا۔اور یہ سب حکومت کی صنعت سازی کو تیز تر ترقی دینے کی عمومی پالیسی کے تحت ہورہا تھا لیکن یہ سب فوائد کی سماجی تقسیم میں عدم توازن کی صورت میں ہی ہورہا تھا۔اس پالیسی کے درپردہ دلیل یہ تھی کہ سرمائے کے ارتکاز کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ صنعتی اداروں کے قیام کی ایک لازمی ضرورت پوری ہورہی تھی۔ یہ جواز پیش کیا گیا کہ صرف بہت زیادہ آمدنی والے سرمایہ کارگروپوں کی ہی اس مقصد کیلئے حوصلہ افزائی کی جانی ضروری تھی کیونکہ صرف انہی میں ہی ''بڑے پیمانے کی بچت کرنے کے امکانات ہوا کرتے ہیں''۔

1950ء کی دہائی میں بڑے پیمانے کی پیداواری صنعت کی اوسط شرح پیداوار 16% تھی جو 1960ء کی دہائی کے اوائل تک 15% رہی۔ 1954/55ء سے 1959-60ء کے دوران صنعتی شعبے کا مجموعی قومی آمدنی GNP میں حصہ 8.4% تھا جو 1959/60ء سے 1968-69ء تک بڑھ کر 10.6% ہوچکا تھا۔ 1959ء تک پاکستان کے 24 بڑے صنعتی گھرانے پاکستان کے کل اثاثوں کے 45.9% حصے کے مالک بن چکے تھے۔ 1968ء میں 22 خاندان، جن میں ایوب خان کا خاندان بھی شامل تھا، ملک کے کل صنعتی سرمائے کے 66%، انشورنس کے 70% اور بینکنگ کے 80% کے مالک ومختار بن چکے تھے۔(18)

دراصل پبلک فنانس کے اداروں کے ذریعے حکومتی وسائل تیزی کے ساتھ بڑے صنعتی گھرانوں کی طرف منتقل ہوتے جارہے تھے کیونکہ ان گھرانوں نے اپنی اجارہ دارانہ برتری قائم اور مستحکم کرلی تھی۔ نہ صرف کارپوریشنوں بلکہ منڈیوں کی صورت میں بھی۔حکومت کے طے شدہ ہدف کے باوجود جو اس نے اپنے تیسرے پانچ سالہ منصوبے 1965/70ء کیلئے جاری کیا تھا، کہ صنعتی استعمال کی اشیاء کی صنعت کو ترقی کیلئے ترجیح دی جائے گی، اور حکومت کی طرف سے اس خواہش کے اظہار کے باوجود کہ اس کیلئے نجی اداروں کو درکار مالی معاونت بھی فراہم کی جائے گی، ان بڑے نجی اداروں نے صرف انہی صنعتوں میں ہی سرمایہ کاری کی جو ان کیلئے بلند شرح منافع کی ضامن تھیں۔

1965/68ء کے عرصے میں PICIC نے اپنے 83% قرضے ٹیکسٹائل انڈسٹری (جیوٹ اور دیگر فائبر) کو فراہم کیے جبکہ صرف 6.6% قرضے انجینئرنگ، دھات اور برقی صنعت کو جاری کیے گئے اور یہی وہ شعبے تھے جنہیں حکومت سرمایہ کاری کیلئے اپنی اولین ترجیح قرار دے چکی تھی۔(19)

اسی وجہ سے ایوب خان حکومت کو یہ تشویش لاحق ہو گئی تھی کہ کراچی بہت زیادہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ شہر صنعتی محنت کشوں کے بڑے پیمانے پر ارتکاز کو بھی جنم دے رہا تھا۔ 1954ء میں ملک کی بڑی صنعت کی افرادی قوت کا 25% سے زیادہ حصہ کراچی میں تھا۔ یہ 1959/60ء میں 40%، 1964/65ء میں 45% اور 1969/70ء میں 30% ہو چکا تھا۔

''حکومت کی طرف سے صنعت کو منتشر کرنے اور صرف چند مراکز کی ہی اہمیت کو کم کرنے کی پالیسی، کہ جہاں صنعت مرتکز ہو چکی تھی خاص طور پر کراچی کے معاملے میں، صنعتی مزدوروں کی کسی بھی تنظیم کیلئے انتہائی اہم مطالعے کی حامل ہے۔ کیونکہ یہ علاقائی تقسیم نئے نئے لوگوں کو صنعتی افرادی قوت کا حصہ بناتی جا رہی تھی۔ تاہم یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ آگے چل کر، صنعت کے بکھرے ہوئے پھیلاؤ نے صنعتی افرادی قوت کے قومی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا، خصوصاً 1968/69ء کے عظیم انقلاب میں جس نے ایوب حکومت کا دھڑن تختہ کر دیا تھا''۔(20)

بدعنوانی اور جبر

ریاست نجی سرمایہ داری کو تخلیق اور اسے مضبوط کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس بات کو بھی یقینی بنایا جا رہا تھا کہ نئی بورژوازی افسر شاہی کے ساتھ وابستہ و پیوستہ رہے گی۔ جس کے نتیجے میں کاروباریوں اور افسر شاہی میں انتہائی قریبی مفاداتی رشتے قائم ہو گئے۔ 1958ء کی فوجی بغاوت کے بعد فوج کی بالا پرت بھی اس رشتے داری میں شریک ہو گئی۔ یوں بدعنوانی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ افسر شاہی اور جنرل شاہی نے سیاسی تو بورژوازی نے معاشی طاقت کو اپنے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ منافعوں میں اضافہ ہوتا رہا مگر پیداواری صنعت کے مزدوروں کی حقیقی اجرتوں میں شدید کمی واقع ہوتی چلی گئی۔ جبکہ کراچی، لاہور، لائل پور، راولپنڈی اور دیگر شہروں کے صنعتی مراکز میں محنت کشوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ہر چند کہ ایوب خان کے دور حکومت کو پاکستان کی معلوم تاریخ کے نسبتاً پرسکون دور میں شمار کیا جاتا ہے، مگر یہی پرسکون دور ملک میں کسی قسم کا حقیقی استحکام پیدا کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ یہ ایک وحشی استحصالی حکومت تھی جس نے کئی جرائم اور زیادتیوں کا ارتکاب کیا۔ خاص طور پر بائیں بازو کے ساتھ۔ لاہور کا بدنام زمانہ شاہی قلعہ ایوب دور میں ہی جدید دور کا معروف عقوبت خانہ بنا دیا گیا تھا۔ یہاں سب سے زیادہ شہرت حسن ناصر شہید پر ہونے والے جبر اور بعد میں اس کی

شہادت کو حاصل ہوئی جو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا ایک قائد تھا جسے فوجی حکمرانوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔کئی دیگر سیاسی اور ٹریڈ یونین رہنما بھی اس تاریخی عقوبت خانہ کی کال کوٹھریوں میں انسانیت سوز جبر وتشدد کا شکار ہوتے رہے۔

مگر یہ جبر وتشدد شاہی قلعے کی بلند فصیلوں سے نکل کر سارے ملک میں پھیلتا چلا گیا، ہر کونے کھدرے میں پولیس بلا روک ٹوک اندھا دھند وحشتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔خاص طور پر ایوب خان کے سیاسی مخالفین کو نشان عبرت بنایا جاتا رہا۔رشوت اور بدعنوانی افسر شاہی کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور پولیس کے معاملے میں تو یہ ایک عام معمول قرار پا گیا تھا۔جمہوریت کو نیچے عوام تک لے جانے کے نام پر بنیادی جمہوریت کا کھیل رچایا گیا تا کہ سیاست کو ''غیر سیاسی'' کر دیا جائے۔تب سے لے کر اب تک ہر فوجی آمر نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور طول دینے کیلئے بنیادی جمہوریت کا یہی شعار اپنا رکھا ہے۔2 جنوری 1965ء کے پہلے قومی صدارتی الیکشن کیلئے یہی بنیادی جمہوری ادارے ہی حلقہ انتخاب قرار پائے تھے۔مگر اس تمام تر حفاظتی و مدافعتی اقدامات کے باوجود ایوب خان کو یہ الیکشن لڑنا پڑ گیا۔ایوب خان کی طرف سے نظر انداز کیے جانے والے لومڑی مزاج جاگیرداروں نے اس کے ساتھ کئی چالیں چلنی شروع کر دیں۔انہوں نے محمد علی جناح کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کو اس کے مقابلے میں حزب مخالف کے مشترکہ ومتفقہ امیدوار کے طور پر لا کھڑا کر دیا۔مس فاطمہ اپنے بھائی کے ساتھ شانہ بشانہ عوامی جلسوں میں شریک رہی تھی اور جناح کی بیوی کے چھوڑ جانے کے بعد سے وہ اپنے بھائی کی سیاسی ہمسفر رہی تھی۔

جنگ

کھلے بندوں کی جانے والی دھاندلی کے باوجود سرکاری مشینری اور ذرائع ابلاغ کے زور دار پروپیگنڈے کے مطابق ایوب خان ''آرام'' سے اپنا صدارتی الیکشن جیت گیا۔سماج کی تہوں میں پنپتی بے چینی نے رفتہ رفتہ سطح پر ابھرنا شروع کر دیا۔اقتدار کے خاموش ایوانوں میں سے آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔حکومت کے حکمت سازوں کے چہروں پر تشویش کے آثار بڑھتے ہی چلے گئے۔وہ سماج میں اس اچانک شروع ہو جانے والی حرکت سے گھبرا گئے اور بدحواس ہو کر ایک دوسرے کے خلاف بدترین اقدامات پر اتر آئے تا کہ عوام کی توجہ کو تقسیم اور گمراہ کیا جا سکے۔جو اس حکومت کے وجود اور اسکے جواز پر

انگلیاں اٹھانے لگ گئے تھے۔اسی بدحواسی میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ کشمیر پر چڑھائی کر دی جائے تا کہ بھارت کے ساتھ جھگڑے کی کوئی شکل نکل آئے۔ان میں سے چند بہادر و باہمت نے تو یہ بھی سوچنا سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم کشمیر کو فتح کر کے اپنی حکمرانی کو ایک مستحکم بنیاد فراہم کر دیں گے۔جنرل کلازوٹز نے کہا تھا کہ ''جنگ سیاست کا پرتشدد ذریعے سے تسلسل ہے''۔

انہوں نے داخلی تضاد کو خارجی محاذ آرائی کے ذریعے ختم کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔کچھ سرکاری دانشمندوں کا یہ بھی خیال تھا کہ جنگ محض کشمیر کے اندر واقع متنازعہ سرحد تک ہی محدود رہے گی۔مگر یہ جنگ ایک علاقے تک محدود لڑائی سے پھیل کر دو ملکوں پاکستان اور بھارت کی بین الاقوامی سرحدوں تک پھیلتی چلی گئی۔ستمبر 1965ء میں شروع ہونے والی یہ جنگ 17 دن تک جاری رہی اور جیسا کہ ہر جنگ کا بنیادی قانون ہوتا ہے، ہر جنگ کی طرح اس میں بھی سب سے پہلا خون سچائی کا ہی ہوا۔یہ سوال ابھی تک تشنہ ہے کہ یہ جنگ کس نے جیتی اور کس نے ہاری؟ سوویت سفارتکاری کی مداخلت کے نتیجے میں ہونے والے سیز فائر کے بعد دونوں پاکستان اور بھارت نے اپنی اپنی فتح کے شادیانے بجائے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک نسبتاً کمزور ملک ہونے کی وجہ سے پاکستان کو اس جنگ سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا، نہ صرف معاشی طور پر بلکہ خود ریاست کی اپنی اندرونی ساکھ اس سے شدید متاثر ہوئی۔بحران پہلے سے ہی حکمران طبقے کے اندر دراڑیں ڈال چکا تھا جنگ نے تو اس تقسیم کو مزید گہرا، مزید شدید کر دیا۔سب سے اہم ترین تنازعہ ایوب خان اور اس کے انتہائی لاڈلے، چہیتے اور معتمد ذوالفقار علی بھٹو کے مابین کھل کر سامنے آ گیا۔

یہ تنازعہ اس وقت بھی عیاں ہو کر سامنے آیا جب ایوب خان کی کابینہ کی ٹیم اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کا وفد تاشقند (روس) میں روسی وزیراعظم کوسیگن اور وزیر خارجہ گرومیکو کی سربراہی میں ہونے والے مصالحاتی مذاکرات کیلئے اکٹھے ہوئے۔بھٹو نے بعد میں تاشقند معاہدے کو ایوب خان کی طرف سے پاکستان کی خودمختاری کو بیچ دینے کا معاہدہ قرار دے دیا۔بھٹو کے ساتھ ایوب خان کی علیحدگی ایوب کیلئے ہلاکت خیز ثابت ہوئی اور یہ ان بڑی وجوہات میں سے ایک تھی جو ایوب کی رخصتی کا باعث بنیں۔

انقلاب

کہا جاتا ہے کہ جنگوں کی کوکھ سے انقلاب جنم لیا کرتے ہیں۔ جنگی جنون کے نتیجے میں ابھرنے والا قومی اور سماجی تعصب اور عوام الناس کے ذہنوں میں انڈیلا جانے والا جذبہ حب الوطنی فوراً ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ہر سرمایہ دارانہ سماج کی طرح اس جنگ سے ہونے والی تباہ کاریوں کا بوجھ بھی آخر کار محنت کشوں اور مفلوک الحال عوام پر ہی ڈال دیا گیا۔ جس کی وجہ سے سیاسی وسماجی اپوزیشن اور مزاحمت نے سر اٹھانا شروع کر دیا جس کی ابتدا بیروزگار گریجوایٹس اور طالبعلموں سے ہوئی۔ مسلسل بیروزگاری سے پیدا ہونے والے اور سماج میں تیزی سے پھیلتے ذہنی دباؤ کا شکار نوجوانوں نے اپنی پیشہ ورانہ ڈگریاں جلانا شروع کر دیں۔

کئی حوالوں سے 1965ء کی جنگ 1968/69ء کے انقلاب کے معاملے میں عمل انگیز ثابت ہوئی۔ جنگ نے ناگزیر طور پر معیشت پر اپنے اثرات مرتب کیے اور اس نے معاشی ترقی اور سماجی ارتقاء کے مابین فرق اور فاصلے کو مزید بڑھا دیا۔ ایوب حکومت کے دوران مضبوط معیشت، انفراسٹرکچر اور صنعت کی ترقی ہوئی مگر اس ترقی کی سماج کو ترقی دینے کی نااہلی نے ایک بار پھر اس تاریخی حقیقت کو عیاں کر دیا کہ ایک نوآبادیاتی بورژوازی قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے پورے کرنے کیلئے قطعی طور پر نااہل ہوا کرتی ہے۔ پاکستانی بورژوازی نے کبھی سوچا تک بھی نہیں ہوگا کہ اسے اس سے بہتر حالات میسر آئیں گے۔ ریاست کی طرف سے مالیاتی اور بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے ضمن میں امداد، وہ بھی تجارت کیلئے سازگار حالات اور محصولات کی سودمند پابندیوں سمیت۔ ریاست کی طرف سے فراہم کی گئی سہولتوں اور مراعات کی فہرست کافی طویل ہے مگر اس سب کے باجود یہ نہ تو زرعی انقلاب کے ذریعے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر سکی اور نہ ہی ایک حقیقی قومی ریاست تشکیل دے سکی۔ اور نہ ہی یہ برابری کی جڑت کا احساس پیدا کر کے قومی مسئلے کو حل کر پائی۔ نہ تو یہ ریاست کو ایک سیکولر شکل وصورت فراہم کر سکی اور نہ ہی بالغ رائے دہی کی حامل ایک سچی پارلیمانی جمہوریت کو ممکن بنا سکی۔ اصلاحات کی اس ایوبی دہائی کے دوران ہونے والی سماجی اور صنعتی ترقی کی طرز ناہموار اور مشترکہ فطرت کی حامل تھی۔ بورژوازی قومی خودمختاری تخلیق کرنے میں ناکام رہی اور سامراجی جکڑ بندیوں سے خود کو کسی طور آزاد نہیں کرا سکی۔ حکومت نے جو کچھ بھی کیا اس سے اور تو کچھ سامنے نہیں آ سکا البتہ اس کی بدعنوانی اور کھوکھلا پن ضرور عیاں ہو کر سب کے سامنے

آ گیا۔ایک ترقی پسند طبقے کے طور پر ان کی ناکامی اور نااہلی اس وقت سامنے آ گئی جب انہوں نے اپنی بقا کیلئے جاگیردارانہ باقیات اور مذہبی شدت پسندی کے ساتھ اتحاد کرلیا اور جب انہوں نے سامراج کی محتاجی اختیار کر لی۔اس قسم کے حکمران طبقے کو تاریخ کے ہاتھوں انجام سے دوچار ہونا ہی تھا اور 1968/69ء کے انقلاب نے یہ تاریخی فریضہ تقریباً سرانجام دے ہی دیا تھا۔

ایوب خان کی صنعتی ترقی کا سب سے مثبت پہلو ایک نئے تازہ دم پرولتاریہ کا تاریخ کے میدان میں قدم رکھنا تھا۔پھر بڑی ٹریڈ یونینوں اور منظم ٹریڈ یونین ازم کی غیر موجودگی بھی ایک اہم عنصر تھا۔اس قسم کی مضبوط ٹریڈ یونینیں عمومی طور پر بدعنوانی اور مصالحانہ موقع پرستی کا شعار اپنائے ہوئے ہوتی ہیں اور پرولتاریہ کے انقلابی ارتقا کے عمل میں رکاوٹ کے سوا کوئی کردار ادا نہیں کرتیں۔لیکن جن ٹریڈ یونینوں کو انقلاب ابھارتا ہے ان کی سوچ اور ان کا عمل ہی کچھ اور ہوا کرتا ہے۔تاہم انقلاب کی پسپائی ان کو پھر سے وہی روایتی ٹریڈ یونین بننے پر مائل کر دیتی ہے۔یہی اس انقلاب میں بھی ہوا یعنی جب دھارا پلٹا تو سب پلٹ کے رہ گیا اور حالات پھر سے معمول پر آ گئے۔

دیہی زرعی بحران اور زرعی شعبے کی سست رو اور بیزار کر دینے والی اکتاہٹ کے مارے، دیہات و مضافات سے آئے یہ محنت کش، تیز ترین صنعتکاری کے عمل میں کھپتے چلے گئے۔تاہم صنعت اور جدید ٹیکنالوجی نے ان کو ایک نئی بصیرت سے روشناس کراتے ہوئے ان کے سادہ دماغوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھار دیا۔اور پھر یہ مزدور ابھی تک ٹریڈ یونین یا سیاسی قیادت کی دھوکہ دہی پر مبنی مصالحت کے نقصانات سے محفوظ تھے۔مصالحت کر لینے کی پیچیدگیاں اور بیہودگیاں ابھی تک ان کے دل و دماغ کو چھو کر بھی نہیں گزری تھیں۔ان کا شعور روشنی کی رفتار سے بلند ہوتا جا رہا تھا اور جونہی ان کو ادراک ہو گیا کہ مشترکہ حاصلات کیلئے مشترکہ جدوجہد کے سوا نہ کوئی رستہ ہے اور نہ ہی کوئی حل تو ان کا یہ شعوری نتیجہ 1968/69ء کے انقلاب کی صورت میں آتش فشاں کی طرح پھٹ کر سامنے آ گیا۔

یہ تازہ دم پرولتاریہ نسبتاً ایک تیز ترقی کی پیداوار تھا۔کارل مارکس نے 1857ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے اپنی معرکتہ الآرا کتاب میں لکھا تھا ''ریلوے لائن کے بچھائے گئے ہر ایک میل اور ٹیلی گراف کے ذریعے برطانوی سامراج اپنی قبر خود ہی کھود رہا ہے''۔مارکس کا یہی مشاہدہ ایوب دور کی صنعتی ترقی کے معاملے پر بھی مکمل لاگو ہوتا ہے۔معاشی ترقی کے ہونے مگر سماجی ارتقا کے نہ ہو سکنے سے پیدا ہونے والے تضادات پھٹ کر 1968/69ء کے انقلاب کا روپ دھار گئے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی اور سب سے تیز ترقی ایوب کے دور میں ہی ہوئی تھی۔ کسی اور دور حکومت میں اس قدر صنعت کاری نہیں ہو سکی جتنی اس دور میں ہوئی۔ جس سال انقلاب ہو رہا تھا اس سال پاکستان کی شرح ترقی 9.1% تھی جو اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی اسے نصیب نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ شاندار شرح ترقی اور صنعتکاری کا یہ عمل ہرگز ہرگز فوجی حکومت سے سرزد ہونے والا کوئی معجزہ نہیں تھا۔ اس میں مختلف النوع قسم کے کئی عوامل و عناصر کارفرما تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مغرب میں ہونے والا عروج اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو ملنے والے ابھار کے اثرات تھے جو ہر طرف مرتب ہو رہے تھے۔ جس سے پاکستانی حکمرانوں نے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اس وقت یہ کینیشین ازم کو اپنانے کی پوزیشن میں بھی تھے اور پھر ریاست کو معیشت میں بھرپور مداخلت کے مواقع بھی میسر آئے ہوئے تھے۔

پاکستان کی ترقی امریکی ماہرین معیشت کیلئے مشعل راہ بنی ہوئی تھی اور وہ دیگر کئی نوآبادیاتی ممالک کو مشورے دے رہے تھے کہ وہ بھی تیسری دنیا کے اس شاندار ماڈل کی پیروی کریں جو آزاد ادارہ سازی کی ایک روشن مثال بن چکا ہے۔ لیکن یہ محض دنیا کو بتانے کی باتیں تھیں۔ یہاں کوئی ادارہ آزاد نہیں تھا۔ یہ صرف ریاستی سبسڈیوں اور تحفظات کی ہی کرم فرمائی تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام خود کو اتنا مضبوط و مستحکم کر سکا تھا۔ پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن جیسے اداروں کی طرف سے قائم کی جانے والی فیکٹریاں بعد میں نجی سرمایہ داروں کے ہاتھوں ''معقول'' قیمتوں پر بیچ دی گئیں۔ اس عمل کو ''ہارورڈ ڈیویلپمنٹ ایڈوائزری سروس'' کا نام دیا گیا۔ پاپانیک Papanek نے پاکستان کی بورژوازی کو ڈاکوؤں کا ٹولہ قرار دیا اور اس ترقی کے نیچے پھلتے پھولتے استحصال کو جائز قرار دیا۔ لیوس کیرل Lewis Caroll کے طنزیہ انداز میں پاپانیک نے اپنی کتاب Wonderland میں ان نابرابریوں کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے ''آمدنیوں میں نابرابری ہی معیشت کی ترقی کا باعث بنا کرتی ہے۔ اسی سے ہی کم آمدنی والے لوگوں کی حالت میں حقیقی بہتری ممکن ہوتی ہے''۔(21) ایوب خان کی حکومت کو بھک سے اڑا دینے والے سماجی دھماکوں نے پروفیسر پاپانیک کی اس وضاحت کو غلط ثابت کر دیا۔ ہارورڈ کے یہ عالم فاضل مشیر صنعت میں سرمائے کو ڈالتے وقت اس تباہی کو نظر انداز کر گئے جو اس عرصے کے دوران زراعت کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ مغربی پاکستان میں سرمایہ کاری کیلئے دو تہائی رقم باہر سے آ رہی تھی کیونکہ ایک مضبوط و مستحکم فوجی حکومت ہی تھی جو غیر ملکی سرمائے کو ملک کے اندر لا رہی تھی

اور مقامی سرمائے کی نشوونما کر رہی تھی۔

فوجی حکومت کی پالیسیوں نے ملک کے اندر دولت کا بے پناہ ارتکاز کر دیا تھا۔ 1964ء میں جب ملک بھر کے معیشت دان اکٹھے ہوئے تا کہ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کو تجویز و تشکیل دیا جا سکے تو انہیں اس حقیقت کی سمجھ آ گئی کہ پاپا نیک کے ماہرین عوام کی اکثریت کیلئے حقیقی آمدنی میں درپیش تعطل اور رکاوٹ کا کوئی مداوا نہیں کر سکے تھے۔ پلاننگ کمیشن کے سربراہ ماہر معیشت ڈاکٹر محبوب الحق نے جن اعداد و شمار کا انکشاف کیا ان سے سارا ملک ششدر رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ ملک کا 66% صنعتی سرمایہ محض 22 خاندانوں کی دسترس میں تھا۔ داؤد، آدم جی، سہگل، ولیکا، بھیم جی، ڈنشا، فینسی، مارکر، اصفہانی اور حبیب ان میں سب سے نمایاں تھے۔ اسی تیسرے پانچ سالہ منصوبے کی دستاویز میں یہ اعتراف بھی شامل تھا کہ معیشت کی حقیقی صورتحال ایسی نہیں کہ جس سے خوش گمان ہوا جا سکے۔ ایک طرف قومی آمدنی GNP ترقی کر رہی تھی اور معیشت پھیلتی جا رہی تھی تو اسی کے ساتھ ساتھ عوام الناس کی بدحالی اور کسمپرسی بھی ترقی اور وسعت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ معاشی ترقی کے انہی پانچ سالوں کے دوران ہی عوام کی خوراک کی شرح انتہائی نیچے جا چکی تھی۔

افسر شاہی اور فوج نے ایک طرف بڑے شہروں میں بے انت اور شدید استحصال کے نتیجے میں کروڑ پتیوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا تھا تو دوسری طرف جاگیرداروں اور سرمایہ دار کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کیے رکھی جنہوں نے کسانوں اور مزارعوں کا خون چوس چوس کر اپنی طاقت اور دولت میں بے پناہ اضافہ کر لیا تھا۔ کوئی بھی جب اس ظالمانہ کیفیت پر بات یا احتجاج کرتا تو اس پر ظلم کی انتہا کر دی جاتی تھی۔ شہروں میں ہر قسم کی ٹریڈ یونین سرگرمی کو بالا دست طبقہ اپنے مضبوط کنٹرول میں لیے ہوا تھا۔ ٹریڈ یونین ازم کے سست رو ارتقا کی متعدد وجوہات تھیں۔ ایک جابر جاگیردار کی فیکٹری میں تازہ وارد ہونے والے محنت کشوں کی اکثریت کا شاپ فلور پر خاموش رہنا ایک وجہ تھی۔ سرکاری سطح پر ہونے والا جبر و تشدد اور مکر و فریب بھی ایک بڑی وجہ تھی۔ کمپنی یونینوں کے عہدیداروں کو ریاست کی طرف سے خاصی پذیرائی اور حوصلہ افزائی فراہم کی جا رہی تھی۔ جبکہ مقامی عہدیدار فیکٹری مالکان کی مدد سے نمائندہ یونین بنانے کی کوشش کرنے والوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتے تھے۔ ایوب اقتدار کے سارے عرصے میں ہڑتالوں پر پابندی عائد رہی جبکہ ٹریڈ یونین رہنماؤں کو حکومت نے تنخواہیں لگا رکھی تھیں۔ لیکن پاکستان میں ٹریڈ یونین ازم کی کمزوری کی ایک بڑی معروضی وجہ بھی تھی۔ روزگار سے محروم محنت کشوں کی ایک بہت بھاری تعداد کی

موجودگی کبھی بھی مضبوط یونینوں کیلئے سازگار نہیں ہوا کرتی۔ دیہات میں افسر شاہی اور زمینداروں نے مزارعین کو مکمل طور پر اپنا تابع بنا لیا ہوا تھا۔ یہاں ہونے والی ترقی ''ٹیوب ویل انقلاب'' کا فائدہ بھی صرف دیہات کا امیر ہی اٹھا سکا تھا۔ دیہی ترقی کیلئے دیہی انفراسٹرکچر، سماجی بہبود اور پیداواری ٹیکنالوجی کیلئے سرمایہ کاری کی منصوبہ بندی کرنے کی بجائے، پاکستانی معیشت صرف شہری اشرافیہ کی صارفیت کی عادات کی تسکین کیلئے سرگرم رہی۔ اور یہی ملک کی غیر منظم درآمدی پالیسی کے پیچھے کارفرما مقصد تھا۔ پاکستان میں سرمایہ دارانہ نظام کسی طور آزاد اور ترقی بخش نہیں تھا۔ بلکہ یہ بڑی سرمایہ دار طاقتوں کا ایک ایسا مطیع و محتاج موکل تھا جو خود مفلوک الحال تھا اور صرف بڑے پیمانے کی غیر ملکی امداد کے ذریعے ہی اپنے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔ صنعتی ترقی نے پاکستان پر دو بڑے گہرے اثرات مرتب کیے' ایک اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے بیچ فاصلوں اور تنازعات کو بڑھاوا دیا اور دوسرا اس نے شہروں کے اندر محنت کش طبقے کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ کیا۔

پاکستان کی بورژوازی خود کو مبارکبادیں دینے میں اتنی محو اور مخمور ہو چکی تھی کہ اسے ان سیاسی کیفیات کا سرے سے اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا جو عنقریب ان کی ریاست کے تانے بانے ادھیڑنے کا سبب بننے والی تھیں۔ 1968/69ء میں پاکستان میں ہونے والی انقلابی سرکشی کم از کم ایشیا کی تاریخ کی پچھلی دو دہائیوں کا سب سے حیران کن واقعہ تھا۔ عالمی تناظر میں یہ ایک ایسا سماجی انقلاب تھا جس کی کامیابی تاریخ کے ارتقائی عمل پر گہرے دوررس اثرات مرتب کر سکتی تھی۔

نوٹس

1۔ایوب خان،ایوب خان کی ڈائری72-1966ء،بدھ16اکتوبر1968ء،(آکسفورڈ)
صفحہ 273

2۔اقبال کے جناح کے نام خطوط،لاہور1942ء

3۔ کولن اینڈ لیپیئر،فریڈم ایٹ مڈنائٹ،صفحہ 285

4۔ڈان،کراچی،12اگست 1947ء

5۔ٹیکنیکل معاونت: خارجہ امور کی کمیٹی کی حتمی رپورٹ (انگریزی)،واشنگٹن،12مارچ1957ء

6۔ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک (انگریزی)،(آکسفورڈ)،2007ء،صفحہ 25

7۔ٹیکنیکل معاونت: خارجہ امور کی کمیٹی کی حتمی رپورٹ (انگریزی)،واشنگٹن،12مارچ1957ء

8۔طارق علی،کیا پاکستان بچ جائے گا؟(انگریزی)،صفحہ 56

9۔پاکستان ٹائمز،16مئی1958ء

10۔طارق علی،کیا پاکستان بچ جائے گا؟(انگریزی)،صفحہ 63

11۔برٹش پیپرز69-1958،(آکسفورڈ)،صفحہ 49

12۔ایوب خان،آپ بیتی: آقا نہیں دوست،صفحہ 71

13۔پاکستان ٹائمز،لاہور26جنوری1959ء

14۔1948ء کی صنعتی پالیسی جو آرغلڈ 1955ء میں دوبارہ شائع ہوئی،ضمیمہ 3،صفحہ 8-283

15۔ ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک (انگریزی)،(آکسفورڈ)،2007ء،صفحہ 18

16۔ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک (انگریزی)،(آکسفورڈ)،2007ء،صفحہ 20

17۔ایضاً،صفحہ 25

18۔بزنس ریکارڈر،25اپریل1968ء

19۔IBRD1970: Vol, III صفحہ 63

20۔ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک (انگریزی)،(آکسفورڈ)،2007ء،صفحہ 24

21۔گستاف ایف پاپانیک، پاکستان کی ترقی (انگریزی)،(ہارورڈ)،1967ء

انقلاب کا آغاز!

جب سوشلسٹ فتح اتنی قریب آ گئی تھی!

عوام کی تاریخی واقعات میں براہ راست مداخلت ہی کسی بھی انقلاب کی سب سے نمایاں خوبی ہوتی ہے۔ عام دنوں میں ریاست خواہ اس پر بادشاہت براجمان ہو یا جمہوریت، خود کو عوام سے بے نیاز رکھتی ہے اور مورخین سربراہان مملکت، وزرا، دانشوروں اور صحافیوں کے حوالوں سے ہی تاریخ کو مرتب کرتے ہیں۔۔۔۔لیکن جب وہ وقت آ جاتا ہے کہ یہ فرسودہ نظام عوام کیلئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو وہ سبھی حدود و قیود پامال کرتے ہوئے ان لوگوں کو سیاسی دھارے سے نکال باہر کرتے ہیں، اپنے روایتی نمائندوں کو اٹھا کر ایک طرف کر دیتے ہیں، اور پھر اپنی مداخلت و شمولیت سے ایک نئی طرز حکومت کی بنیادیں رکھتے ہیں۔ یہ عمل اچھا ہے کہ برا، اس کا فیصلہ اخلاقی مبلغین کرتے پھریں۔ ہمیں تو ان حقائق سے ویسے ہی سروکار ہے جیسے وہ اپنے معروضی حالات کی کوکھ سے جنم لیتے اور تشکیل پاتے ہیں۔ ایک انقلاب کی تاریخ ہمارے لیے، سب سے پہلے، حکمرانی کے عمل میں عوام کا دخل ہوتا ہے جو وہ اپنے مقدر بدلنے کیلئے کرتے ہیں"۔(1)

(لیون ٹراٹسکی، 1879/1940ء)

انقلاب کی پہلی چاپ

جمعرات 7 نومبر 1968ء کو 1917ء کے عظیم اکتوبر انقلاب کی 51 ویں سالگرہ تھی۔ اس دن پاکستان کے کسی بھی قصبے یا شہر میں اس حوالے سے نہ تو کوئی تقریب منعقد ہو رہی تھی' نہ ہی یہ دن منایا جا رہا تھا۔ معمول بن گیا تھا کہ اس دن سبھی کمیونسٹ، سوشلسٹ یا پھر ترقی پسند پارٹیوں کے سٹالنسٹ رہنما حکومتی وزراء اور افسران بالا کے ہمراہ ''معززین شہر'' کی حیثیت سے روس کے سفارتخانے یا قونصلیٹ میں مدعو کیے جاتے اور وہاں سالگرہ کا جشن منایا جاتا تھا۔ سٹالنسٹ افسر شاہی نے 'بالشویک انقلاب' کو سفارتخانوں کی دیواروں میں محصور کر دیا تھا۔ اس دن کو پرولتاریہ کی عالمگیریت پر مبنی یکجہتی کی علامت کی بجائے روس کے قومی دن کی حیثیت میں بدل کے رکھ دیا گیا تھا۔ یہ اپنے اندر بالشوازم کی اس بین الاقوامیت کی اساس کے قتل کی غمازی کرتا تھا جسے 1917ء کے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں ہونے والے انقلاب نے متعارف کرایا اور نافذ بھی کیا۔ U.S.S.R کی ایک یونین کے طور پر تشکیل کا مقصد بھی یہی تھا کہ دنیا بھر کے ملکوں کے مزدوروں کو ایک مضبوط اکائی میں پرویا جائے۔

تاہم اسلام آباد میں روسی سفارتخانے سے ذرا ہی دور انقلاب کے قدموں کی پہلی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ 6/7 نومبر کے اس واقعے کے بعد جو عوامی ابھار پاکستان میں سامنے آیا وہ یہاں وہی تاریخ رقم کر سکتا تھا جو روس میں 1917ء کے انقلاب نے کی تھی۔ اگلے 138 دنوں کے اندر جو کچھ پاکستان کے گلی کوچوں میں ہوا، اس کی ابتدا اسلام آباد سے کچھ کلومیٹر دور گورنمنٹ پولی ٹیکنیک کالج کے سامنے ہوئی تھی۔ جہاں پولی ٹیکنیک اور گورڈن کالج کے طلبہ ریاستی طاقت کے ساتھ ٹکرا گئے اور یہیں سے انقلاب کی شروعات ہوئی۔ اس آغاز نے عوام کے قدموں کو وہ انقلابی سرکشی اور سرشاری فراہم کر دی کہ جس سے اقتدار کے ایوان لرزتے چلے گئے، نہ صرف اسلام آباد اور ڈھاکہ میں بلکہ لندن اور واشنگٹن میں بھی۔

یہ پہلا واقعہ جس نے واقعات کے تسلسل کو جنم دیا، ایک دستاویزی شکل میں اسلام آباد میں برطانوی ہائی کمیشن کی طرف سے وائٹ ہال لندن کو بھیجی جانے والی ٹیلی گراموں کی صورت میں موجود ہے۔ ان ٹیلیگراموں میں جو عبارت موجود ہے وہ اگرچہ سفارتی منافقت سے بھرپور ہے تاہم اس سے بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ 1968ء کی خزاں سے شروع ہو کر 1969ء کی بہار تک جاری رہنے والی انقلابی سرکشی سے سامراجی کس قدر ہراساں ہو چکے تھے۔ برصغیر پر اپنے راج کے تجربات اور پھر

پاکستانی سرمایہ داری کے ساتھ وابستہ ان کے گہرے مفادات وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے سامراجیوں پر خوف طاری ہو چکا تھا۔اس کیفیت کا اظہار ان کے اپنے بھیجے گئے پیغامات سے ہوتا ہے جو ابھی حال ہی میں مرتب اور شائع کیے گئے ہیں۔ برطانویوں کو بہرحال باقی ہر بڑی طاقت (امریکہ سمیت) کے مقابلے میں اس خطے کی کیفیات ونفسیات سے زیادہ واضح آگاہی اور سدھ بدھ تھی۔ 16 نومبر 1968ء کو برطانوی ہائی کمیشن کی جانب سے پکارڈ نامی ایک سفارتکار کی طرف سے 'مغربی پاکستان میں گڑ بڑ' (Disturbance in West Pakistan) کے نام سے ایک مراسلہ بھیجا گیا۔ہم اس کو یہاں نقل کر رہے ہیں تاکہ قارئین کو درست طور پر اندازہ ہو سکے کہ برطانویوں کو ان واقعات سے کتنی دلچسپی اور کیسے کیسے تحفظات تھے۔ یہ دلچسپی بغیر وجہ کے نہیں تھی،سب سے بڑی امکانی وجہ یہ تھی کہ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات سے نمٹنے کی تیاری کرنی تھی۔ یہ مراسلہ مسٹر مائیکل سٹیوارٹ ممبر پارلیمنٹ SW1 وائٹ ہال کے نام اور پتے پر بھیجا گیا تھا۔

''سر! میں جناب کی توجہ کیلئے مظاہروں کی رپورٹ بھیجنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں جو یہاں راولپنڈی میں 7 سے 10 نومبر کے دوران طالبعلموں نے کیے اور بعد میں جن میں دیگر لوگ بھی شریک ہو گئے ۔ یہ مظاہرے پولیس کی فائرنگ سے ایک طالبعلم کی ہلاکت کے بعد اس کے ساتھ ہمدردی کے اظہار میں شروع ہوئے ہیں۔ یہ مغربی پاکستان کے کئی حصوں میں ہو رہے ہیں اور کئی جگہوں پر یہ متشدد بھی ہو رہے ہیں۔ 10 نومبر کو پشاور میں جب صدر ایوب خان جلسہ عام سے خطاب کر رہا تھا،اس پر ایک طالبعلم کی طرف سے گولی چلائے جانے کی رپورٹ ملی ہے۔ 13 نومبر کو ذوالفقار علی بھٹو،ولی خان اور دیگر کئی اہم اپوزیشن رہنماؤں کو دفاع پاکستان قوانین کی دفعہ 32 کے تحت گرفتار کر لیا گیا ہے۔

مغربی پاکستان میں پیش آنے والے واقعات دھماکہ خیز نوعیت کے ہیں۔اکتوبر میں کراچی میں طلبہ کے مظاہرے ہوئے۔اور پھر نومبر کے پہلے ہفتے میں تعلیمی اداروں میں مسائل کے خلاف پھر مظاہرے ہوئے۔ پھر یہ بگڑتے چلے گئے اور بڑے تعلیمی اداروں تک پھیل گئے جس سے وہ بند کر دیے گئے۔ حیدرآباد کی یونیورسٹی میں صورتحال بہت خراب ہو چکی ہے۔سرحد کے کئی شہروں میں پولیس نے مظاہرین پر آنسو گیس پھینکی اور لاٹھی چارج کیا۔ یہ مظاہرے اکتوبر کے آخر اور نومبر کے شروع میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورے کے بعد ہوئے ہیں۔ یوں طالبعلموں کو سڑکوں پر آنے کا جواز فراہم کر دیا گیا ہے۔

یہ واقعہ 7 نومبر کو راولپنڈی میں پیش آیا۔ جب شہر کے سب سے قدیم ادارے گورڈن کالج جو کہ اعلیٰ تعلیم کیلئے پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہے، کے طلبہ پچھلے دنوں افغان سرحد کے ساتھ ملحقہ علاقے لنڈی کوتل گھومنے گئے۔ اور یہاں کی روایت کے مطابق وہاں سے کچھ سمگل شدہ اشیا خریدیں جو پاکستان میں کہیں اور نہیں ملتیں۔ واپسی پر کسٹمز حکام نے انہیں پکڑ لیا۔ اس 'ناروا سلوک' پر گورڈن کالج کے طلبہ نے احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال کر دی اور ایک جلوس کی شکل میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر پہنچ گئے تا کہ کسی ازالے کی بات کر سکیں۔ تاہم ڈپٹی کمشنر نے ان کی شنوائی نہیں کی جس پر جلوس انٹر کانٹینینٹل پہنچ گیا جہاں مسٹر بھٹو اپنے پشاور کے دورے سے واپسی پر دوراتوں کیلئے قیام پذیر تھے۔ مسٹر بھٹو کو پاکستان کے مغربی حصے میں طالبعلموں کی بھرپور حمایت میسر ہے۔ انہوں نے بھٹو کو گورڈن کالج میں آنے کی دعوت دی تا کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے لئے اسے اپنا دکھ سنا سکیں۔ اس وقت یہ طلبہ غصے میں تو تھے مگر پر امن تھے۔ اسی دوران جی ٹی روڈ پر واقع پولی ٹیکنیک کالج کے طلبہ کا ایک گروپ بھی بھٹو سے ملنے اور دعوت دینے کیلئے پہنچا۔ یہ میٹنگ ابھی جاری تھی کہ پولیس پہنچ گئی اور لاٹھی چارج کے ساتھ ساتھ فائرنگ شروع کر دی جس سے پولی ٹیکنیک کا ایک طالبعلم ہلاک ہو گیا۔ اس واقعے نے غم و غصے کو بھڑکا دیا۔ جب اس فائرنگ کی خبریں راولپنڈی کے طلبہ تک پہنچیں تو انہوں نے کنٹونمنٹ اور صدر ایریا میں توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ پبلک سروس ٹرانسپورٹ پر پتھراؤ شروع کر دیا گیا اور اسے آگ لگا دی گئی۔ 7/8 نومبر کی درمیانی رات کے وقفے کے بعد اگلی صبح (اسلام آباد کے کچھ چھوٹے مظاہروں کے علاوہ جنہیں پولیس نے آسانی سے کنٹرول کر لیا تھا) راولپنڈی شہر میں ساڑھے بارہ بجے مظاہرے شروع ہو گئے مظاہروں کا زور گورڈن کالج کے علاقوں اور قریبی سیٹلائٹ ٹاؤن میں تھا۔ عمارتوں کو نقصان پہنچایا گیا، زیادہ تر نشانہ سرکاری عمارتیں اور انتظامی دفاتر تھے۔ انٹر کانٹینینٹل ہوٹل اور سرکاری ملکیتی پاکستان بک شاپ کے شیشے توڑ دیئے گئے۔ فوج کو بلا کر متاثرہ علاقوں میں صبح سے رات تک کیلئے کرفیو لگا دیا گیا۔ گذشتہ روز مارے جانے والے طالبعلم کو اسلام آباد سے 70 میل دور اس کے آبائی شہر پنڈی گھیب میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اگر اسے پنڈی میں دفنایا جاتا تو پنڈی شہر ناگزیر طور پر بڑے ہنگاموں کی زد میں آ سکتا تھا جسے بچا لیا گیا۔

9 نومبر کی اگلی صبح لوگوں کا ہجوم مری روڈ پر جمع ہوا جب بھٹو ریل کے ذریعے لاہور روانہ ہو رہا تھا۔ سکیورٹی فورسز نے ہجوم پر فائر کھول دیا جس سے دو افراد ہلاک ہو گئے۔ اسکے بعد بظاہر راولپنڈی میں معاملات ٹھنڈے پڑ گئے۔ اگلے دن کرفیو میں نرمی کر دی گئی اور فوج واپس بیرکوں میں چلی گئی۔

سرکاری اعدادوشمار کے مطابق تین ہلاکتوں کے علاوہ فائرنگ سے پانچ افراد زخمی ہوئے جنہیں ہسپتال داخل کرایا گیا۔جبکہ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ یہ سب کم بتایا گیا ہے۔ان لڑائیوں میں ایک اسسٹنٹ سپریٹنڈنٹ پولیس شدید زخمی اور نو کانسٹیبل بھی زخمی ہوئے۔کئی سفارتی گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچا،ان میں ترکی کے سفیر اور ایران کے وزارتی قونصل کی کاریں بھی شامل ہیں۔جبکہ ایک قونصل خانے کی بس اور لینڈ روور بھی ان علاقوں میں پتھروں کی زد میں آچکی ہیں جبکہ ان کے مقامی ڈرائیور کو پکڑ لیا گیا۔البتہ برطانوی پراپرٹی کو کہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔

لیکن پنڈی میں مارے جانے والے طالبعلم کی ہلاکت کے ساتھ یکجہتی کیلئے مغربی پاکستان میں کئی جگہوں پر مظاہرے شروع ہو گئے ۔8 نومبر تک تو یہ پرامن تھے مگر اگلے روز رپورٹیں آئیں کہ پنجاب سندھ اور سرحد میں پرتشدد ہنگامے ہوئے ہیں۔کراچی میں مقامی مسائل کی وجہ سے پہلے ہی بے چینی تھی مگر پنڈی کے واقعے نے اسے بھڑکا دیا۔وہاں پبلک پراپرٹی کو کافی نقصان پہنچا ہے جبکہ سکول' کالج یونیورسٹیاں بند کردی گئی ہیں۔لاہور میں 8 نومبر سے ہنگامے شروع ہوئے جو اگلے دن بھی جاری رہے، یہ زیادہ تر ریلوے سٹیشن کے آس پاس کے علاقوں میں ہوئے ہیں۔جہاں لوگ بھٹو سے ملنے اور اس کے استقبال کیلئے جمع ہوئے جو پنڈی سے لاہور پہنچ رہا تھا۔یہاں بھی تعلیمی ادارے بند پڑے ہیں۔ایسے ہی مظاہرے پشاور، مردان ، چارسدہ ،نوشہرہ ،ایبٹ آباد ،ڈیرہ اسماعیل خان ،لائل پور،سیالکوٹ،کوہاٹ، سکھر،سرگودھا،گوجرانوالہ،بہاولپور سمیت مغربی پاکستان کے کئی دوسرے شہروں میں بھی ہونے کی رپورٹیں ملی ہیں۔10 نومبر کو شمالی پنجاب اور سرحد کے کئی علاقوں میں مزید ہنگاموں کی اطلاعات ملیں۔مردان' چارسدہ' کیمل پور اور نوشہرہ میں تو مظاہرین نے ایوب حکومت کے خلاف سخت نعرے بازی کرتے ہوئے گاڑیوں اور ریلوں پر شدید پتھراؤ بھی کیا۔نوشہرہ میں پولیس فائرنگ سے ایک شخص ہلاک بھی ہوا ہے۔چارسدہ میں مشتعل عوام نے ایک شوگر مل پر قبضہ کر کے چینی برآمد کر لی (حکومت عرصے سے چینی کی قلت کا شور مچائے ہوئے تھی)۔

اب میں جناب عالی کی توجہ بھٹو اور ولی خان جو کہ نیشنل عوامی پارٹی کا صدر اور ماسکو نواز ہے،اور دیگر اپوزیشن لیڈروں کی طرف دلانا چاہتا ہوں جنہیں 13 نومبر کو آئین کی دفعہ 32 کے تحت گرفتار کرلیا گیا ہے۔مجھے یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ مسٹر بھٹو کی سیاسی شہرت اور مقبولیت 28 اکتوبر کے اس کے سرحد کے دورے کے بعد سے انتہائی مستحکم ہو چکی ہے۔اور یہ سب حکومت کی اپنی غلطیوں کا ہی نتیجہ

ہے۔ 21 ستمبر کو حیدر آباد میں بھٹو نے خطاب کرتے ہوئے صدر پاکستان پر ذاتی حملے کیے جس کی وجہ سے حکومت کے غبارے سے ہوا نکلنی شروع ہوگئی۔ پہلے بھٹو پر گورنر موسیٰ نے حملہ کرانے کی بھونڈی اور ناکام کوشش کی اس کے بعد اخبارات میں اس کے خلاف اپنے حمایتی افراد سے خبروں کا سلسلہ شروع کرا دیا گیا ہے۔ غیر جانبدرانہ رائے یہی ہے کہ اکتوبر کے بعد سے بھٹو عوام میں قابل قدر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کے بعد سرحد میں اس کے دورے نے تو اس مقبولیت کو اور بھی بڑھا دیا جہاں اس کا فقید المثال استقبال دیکھنے کو آیا۔ وہ جہاں بھی گیا لوگوں کا جم غفیر جمع ہوتا گیا اس کے باوجود کہ حکومت نے دفعہ 144 نافذ کر رکھی ہے جس کے مطابق پانچ سے زیادہ افراد کے اجتماع اور اسلحے کی نمائش پر پابندی عائد ہے مگر لوگوں نے اس پابندی کی پرواہ تک نہیں کی۔ اور وہ لاٹھی چارج، آنسو گیس اور فائرنگ سے ڈرے بغیر استقبال کیلئے پہنچتے رہے۔

اس کامیابی کی کیا وجوہات ہیں؟ اپنے 10 جولائی کے مراسلے میں پاکستان کی اندرونی سیاست کے حوالے سے میں لکھ چکا ہوں کہ کون سی وجوہات ہیں کہ بھٹو کی ساکھ اور مقبولیت میں بڑھوتری ہو رہی ہے۔ یہ ساکھ اور مقبولیت اس کے حکومت کے بارے میں خیالات کا نتیجہ ہے جن کا اظہار وہ اپنے عوامی جلسوں میں کرتا چلا آ رہا ہے۔ جب وہ پشاور گیا تو اسے عوام کا مزاج آشنا قرار دیا گیا جبکہ میری خود ملتان سے تیس میل دور واقع شہر خانیوال کے کچھ اساتذہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے کہا کہ 'بھٹو ہمارا ہیرو ہے'۔ سرحد کا تو یہ عالم ہے کہ وہاں کوئی بھی قابل ذکر سیاستدان اگر حکومت کی کھلے عام مذمت کرے تو عوام اسے سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ اپنی سیاسی بصیرت اور عوام کی مزاج آشنائی کی بدولت بھٹو اپنی خوبیوں سے بروقت فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس نے پشاور، کوہاٹ، ڈیرہ اسماعیل خان اور چارسدہ میں محض حکومت مخالفت جوشیلی تقریروں سے عوام کے دل جیت لیے، اگر وہ کسی سنجیدہ موضوع پر بات کرنا شروع بھی کرتا تو جذبات سے بھرے لوگ اسے روک دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ ایسی کیفیت پیدا ہو چکی ہے کہ جس سے بھٹو کو بنی بنائی مقبولیت میسر آتی چلی جا رہی ہے۔ نظر انداز کیے گئے علاقے سرحد کا چیمپئن بننے کے بعد بھٹو پنڈی اور پھر پنجاب کی طرف روانہ ہوا تو طالبعلموں اور ''بے یار و مددگار غریبوں'' پر مشتمل اس کے حمایتی سڑکوں پر اس کے استقبال کیلئے نکل پڑے اس دوران وہ ریاستی اداروں کے وحشیانہ تشدد کا شکار ہوتے رہے۔ اس کے بعد بھٹو کی گرفتاری نے تو جیسے جلتی پر تیل چھڑک دیا ہو۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حکومت مسٹر بھٹو کی مقبولیت سے ڈر چکی ہے۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ

مسٹر بھٹو بھی سیاسی قید یا شہادت سے گھبرانے والا آدمی نہیں۔ وہ دیکھ رہا ہے اور اچھی طرح سے جان چکا ہے کہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کو اس کی گرفتاری سے، خاص طور پر اگرتلہ کیس کی شہرت کے بعد ایک ہیرو کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ حکومت میں موجود ٹھنڈے دماغ اس حقیقت سے شاید اتنے بے خبر بھی نہیں لگتے۔ مگر وہ بھٹو کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کو زیادہ توجہ دینا مناسب سمجھ رہے ہیں۔ وہ اسے غدار، سازشی سمیت کیا کیا نہیں قرار دے رہے ہیں اور لگتا ہے کہ کوئی الزام ایسا باقی نہیں بچا جو اس پر لگایا جا سکتا ہو۔ حکومت نے کھلے عام ساری ذمہ داری بھٹو پر ڈال دی۔ بھٹو نے بھی مشتعل مظاہرین کو چپ کروانے کی بجائے کہہ دیا کہ ''ان کی لڑائی برحق ہے اور میں ان کے ساتھ ہوں''۔ ان حالات میں حکومت کے پاس اس کے سوا اور کوئی رستہ نہیں بچا کہ وہ مسٹر بھٹو کو گرفتار کر لے۔ اگرچہ اس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں کہ آگے اس کے ملک کی سیاسی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں پہلے ہی اگرتلہ سازش کیس کے حوالے سے مرکز کے خلاف منافرت شدید ہو چکی ہے۔ مگر مرکزی حکومت مغربی حصے میں اپنی طاقت کو مضبوط سمجھتے ہوئے مشرقی حصے کے ساتھ اپنے خراب ہو چکے تعلقات کو کسی خاطر میں نہیں لا رہی۔ لیکن اب حکومت کو مکمل انتشار کا سامنا ہے جو اب صرف تاشقند معاہدے جیسے مسئلے تک ہی محدود نہیں رہا ہے بلکہ یہ اس کی سبھی پالیسیوں کے خلاف اپنا اظہار کرتا جا رہا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا کہ یہ خود حکومت کے وجود کے خلاف ہو چکا ہے۔

1958ء کے بعد جب سے یہ حکومت تشکیل پائی ہے تب سے اب تک نفرت اور غم وغصہ کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہیں پہنچا۔ بلاشبہ حکومت کے پاس حمایت اور طاقت کے مناسب ادارے موجود ہیں جن میں سول سروسز، بنیادی جمہوریت کے حامل بلدیاتی ادارے، پولیس اور سب سے اہم فوج جو ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ لیکن اب ایک دوسرا ابھار جو بھٹو کی گرفتاری کے بعد اور بھی سخت ہو سکتا ہے حکومت کی پوزیشن کو مزید کمزور کر سکتا ہے۔ اور حکومت کو ہر حال میں اس قسم کی کیفیت سے بچنے کیلئے فیصلہ کن اقدامات کرنے چاہییں۔ حکمرانوں کے لیے حکمران اور محکوم طبقات میں مصالحت کرانا اور تفاوت کو کم کرنا بہت مشکل ہو چکا ہے۔ مسٹر بھٹو کی گرفتاری اس عمل کو اب اور بھی مشکل بنا دے گی۔ اگر یہ معاملہ نہ بھی ہو تو حکومت کے پاس ایسا نہ کوئی منصوبہ ہے نہ دانش کہ جو اس بحران پر قابو پا سکے۔ مسلم لیگ بھی اب اپنی سماجی بنیادیں کھوتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے مسلم لیگ کی قیادت حکومت کو عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی سے آگاہ کر چکی ہے اور جو بعد میں فسادات اور گڑبڑ کی صورت میں ظاہر بھی ہوئی۔ صوبے اور مرکز

کے مابین مصالحت کی اگر کوئی کوشش ہوتی ہے تو اس کیلئے بھی سماجی رابطے انتہائی ضروری ہیں' مجھے بتایا گیا ہے کہ صدر مملکت مسلم لیگ کی قیادت کے ساتھ اس حوالے سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر چکا ہے کہ پنڈی میں فسادات کیوں شروع ہوئے!

میں اپنے اس مراسلے کی ایک ایک کاپی نیو دہلی میں برطانوی ہائی کمشنر اور کابل میں ہر میجسٹی محترمہ سفیر صاحبہ کی خدمت میں بھی ارسال کر رہا ہوں۔ جناب عالی! یہ سب میرے لیے باعث اعزاز ہے۔ آپ کا فرمانبردار خادم۔۔۔۔پکارڈ'' (2)

اس کے بعد پاکستان میں برطانوی ہائی کمیشن کے مشیر برائے فوجی امور نے 18 نومبر کو ایک اور حساس مراسلہ روانہ کیا۔ یہ مراسلہ تاریخی حوالے سے حساس' شمال مغربی صوبہ سرحد (پختونخواہ) میں پیدا ہونے والی صورتحال اور عوام کے پاکستان کی مسلح فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے بارے میں تھا۔ سرحد تاریخی طور پر پہلے بھی برطانوی راج کے خلاف جدوجہد میں پیش پیش رہا جہاں کے لوگوں نے سامراجیوں کے خلاف شدید مزاحمت کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس علاقے پر کبھی نہ کنٹرول حاصل کر سکے اور نہ ہی حکمرانی قائم کر سکے۔ یہ مراسلہ پہلے کی نسبت بہت مختصر ہے، اس لیے ہم اسے بھی یہاں نقل کر رہے ہیں۔

''18 نومبر 1968ء

منسٹری آف ڈیفنس (DI2)

مین بلڈنگ وائٹ ہال لندن SW1

پاکستان میں گڑبڑ

(Reference:My MA/81 14 November 1968)

یہ میرے سابقہ مراسلے کا تسلسل ہے۔ ہمیں فوج کے ساتھ پیش آنے والے کچھ سنجیدہ واقعات کے حوالے سے اہم رپورٹس موصول ہوئی ہیں۔

1۔ ایبٹ آباد میں ہونے والے فسادات کے دوران ایک گھر پر حملہ کر دیا گیا جو پاکستان ملٹری اکیڈمی نے کرائے پر لیا ہوا تھا، جس میں ایک میجر جسے 1965ء میں بہادری پر انعام دیا گیا رہائش پذیر تھا۔ اس واقعے میں گھر کو تہس نہس کر کے سامان یا تو لوٹ لیا گیا یا اسے تباہ کر دیا گیا۔ یہ گھر صدر ایوب

کی ملکیت ہے۔

2۔پشاور میں آرمی میڈیکل کور کے ایک کرنل کو اس کے ڈرائیور اور اردلی سمیت لوگوں نے قابو کرلیا اور ان پر تشدد کیا۔اس کی وردی پھاڑ دی۔ایک حکم نامے کے ذریعے فوج کو کہہ دیا گیا ہے کہ پشاور شہر کے اندر وردی میں نہ جایا جائے۔ پشاور وہ شہر ہے جو عرصہ دراز سے اہم اور تاریخی فوجی مرکز چلا آرہا ہے۔

3۔راولپنڈی میں پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف ایر مارشل نور خان کی سرکاری گاڑی پر پتھراؤ کیا گیا ہے جسے پولیس کی بھاری نفری کی مدد سے محفوظ مقام تک پہنچایا گیا۔

4۔پنڈی میں ہی ماسٹر جنرل آف آرڈیننس میجر جنرل وصی الدین کی بیوی کو اس وقت سخت تذلیل کا سامنا کرنا پڑ گیا جب وہ اپنے بچوں کو سکول سے لینے گئی۔وہ جنرل سٹاف کی سرکاری گاڑی میں سوار تھی جس کے ستارے ڈھکے ہوئے تھے۔

پشاور اور پنڈی دونوں جگہوں پر فوج کو انتظامیہ کی مدد کیلئے طلب کرلیا گیا ہے۔یہ اطلاعات سفارتکاروں کو فراہم کردی گئی ہیں۔

(جے ڈی ڈبلیو ملر) بریگیڈیر ملٹری ایڈوائزر

کاپی برائے اطلاع: میجر جنرل جے ایم میکنیل''(3)

عوام کا ابھار

مشرقی و مغربی پاکستان کے دونوں حصوں میں موجود برطانوی ہائی کمیشن اور قونصل خانے کی طرف سے وائٹ ہال لندن روانہ کیے گئے۔اسی طرح وہاں سے ان کے لیے مناسب جواب اور ہدایات بھی دی جاتی رہیں۔تاہم ان میں سے تین مراسلے ایسے ہیں جو برطانوی سامراجیوں کے اضطراب کو نمایاں طور پر واضح کرتے ہیں۔ان میں سے پہلا ڈھاکہ میں متعین ڈپٹی ہائی کمشنر روئے فوکس کی طرف سے 20 نومبر 1968ء کو بھیجا گیا۔''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ان واقعات میں ایک واضح پیغام موجود ہے کہ اگر ہم نے مشرقی پاکستان کو کمیونزم سے بچانا ہے تو ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا مگر ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ہمیں اس خطرے کو خود بھی سمجھنا اور اپنی دوست دنیا کو بھی بتانا ہوگا''۔(4)

تمام سفارتی لفاظی کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ روئے فوکس صاف اور شفاف

انداز میں اپنے آقاؤں کو ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے سے خبردار کر رہا تھا۔ دوسرا پیغام جو ایک برطانوی سفارتکار جو پنڈی میں تعینات تھا کے انقلابی تحریک کے خوف کی عکاسی کرتا ہے جس نے 29 جنوری 1969ء کو لندن کو ایک واضح طور پر کھلے الفاظ میں پیغام روانہ کیا ''حالت یہ ہو چکی ہے کہ کئی نوجوان آرمی افسر بھٹو کے فلسفے اور اس کی شخصیت کے طلسم میں مبتلا ہو چکے ہیں، فوج کے اندر ایک ''نوجوان ترک مہم'' شروع ہونے والی ہے جو اپنے شہریوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آرمی کا کنٹرول سنبھالنے اور اقتدار بھٹو کے حوالے کرنے کے موڈ میں ہے اور اس بات کو کسی طور خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا''۔(5)

سفارتی داؤ پیچ کے باوجود یہ پیغام واضح کرتا ہے کہ کیا کہا اور لکھا جا رہا تھا۔ بھٹو کا فلسفہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ پیپلز پارٹی کے بنیادی منشور میں اسے بیان اور عام کیا جا چکا تھا جس کے مطابق انقلابی سوشلزم کے ذریعے سرمایہ داری و جاگیرداری کو اکھاڑ کر پھینکا جانا تھا۔ نوجوان فوجی افسروں کی طرف سے اس فلسفے کی حمایت کے آغاز نے پاکستان کے حکمران طبقات اور ان کے سامراجی آقاؤں کے پاؤں تلے سے زمین نکال لی تھی۔ وہ اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتا چلا جا رہا تھا' وہ انقلابی سوشلزم کی وکالت کر رہا تھا اور وہ جہاں جہاں جا رہا تھا لوگ دیوانہ وار اس کی طرف لپک رہے تھے۔

اس سے بھی واضح تیسرا پیغام مسٹر پکارڈ کی طرف سے پنڈی سے 19 فروری 1969ء کو بھیجا گیا تھا ''برطانیہ کے معاشی و تجارتی مفادات خطرے کی زد میں آ چکے ہیں۔ مزید یہ کہ ایک انقلابی صورتحال پیدا ہونے جا رہی ہے۔ اسے مغربی بنگال کی صورتحال سے جوڑنا کسی طرح غلط نہیں ہوگا۔ اور اس سے عالمی امن کو سنجیدہ خطرات لاحق ہو جائیں گے''۔(6) یہاں مسٹر پکارڈ صاف طور پر مغربی بنگال کے انقلاب کو پاکستان میں آتا دیکھ رہا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سارے جنوبی ایشیا میں سوشلسٹ انقلاب کے اندیشے سے آگاہ کر رہا تھا۔ اور جب وہ عالمی امن کو درپیش خطرے کی بات کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام اور وجود کے خاتمے کا خطرہ ہے۔ اور یہ اندیشہ اتنا غلط بھی نہیں تھا اگر انقلاب کامیاب ہو جاتا تو۔

1965ء کی جنگ کے نتیجے میں پہلے سے ہی غربت کا شکار سماج کی اکثریت کو مہنگائی اور افراط زر میں اضافے نے مزید غربت میں دھکیل دیا۔ چونکہ لوگوں کو مروجہ سیاسی ذرائع سے کسی قسم کا کوئی ریلیف میسر نہیں آ رہا تھا اور نہ کسی نوعیت کے حقوق مل رہے تھے اور چونکہ ریاستی مشینری بدعنوان تھی اس لئے

لوگوں نے ماورائے پارلیمان راستے کا انتخاب کرلیا جس میں انہیں ڈرامائی طور پر حیران کن کامیابیاں ملیں۔مغربی اور مشرقی پاکستان کے بڑے شہروں میں مزدوروں نے طالبعلموں اور بیروزگار نوجوانوں کے احتجاجی مظاہروں میں بھرپور شرکت کی جس نے تحریک کو انقلابی رنگ میں رنگ دیا۔روایتی ٹریڈ یونین رہنما جو قاعدے قانون اور ادارہ جاتی پابندیوں میں محدود رہ کر ہی کچھ کرنے کے عادی تھے اور جو پہلے ہی 1963ء میں کراچی کے اندر چلنے والی صنعتی تحریک میں مزدوروں کی طرف سے رد کر دیئے گئے تھے، وہ اس بار بھی پیچھے ہی رہ گئے تھے۔جبکہ دوسری طرف اپنے ہڑتالی ایکشن کمیٹیوں جیسے سیاسی عمل میں شرکت کے ذریعے جو کہ اس احتجاجی انقلابی تحریک کے دوران قائم ہوئی تھیں، انقلابی نوجوان جو کہ ابھی تک صرف طلبہ سیاست تک ہی محدود چلے آرہے تھے، لیبر اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے عرصے میں ایک اہم عنصر کے طور پر ابھر کر سامنے آئے تھے، وہ مزدوروں کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ مقصد کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔پرجوش طلبہ اور مزدور تنظیموں کا یہ تال میل پہلے بھی 1963ء کی تحریک میں ایک ساتھ کام کر چکا تھا۔مگر 1968/69ء کے سیاسی عمل اور اس عمل میں ان دونوں کے باہمی تعامل نے تنظیمی شعور اور تحریکی جذبے کے معیار کو ہی بدل کے رکھ دیا۔اس جڑت نے کئی جگہوں پر نئی لیبر تنظیمیں بھی قائم کیں جن کے سیاسی اہداف و مقاصد زیادہ واضح، زیادہ بلند اور زیادہ سماجی وانقلابی تھے۔اور جو محض اجرتوں کیلئے مصالحت کرنے والی تنظیموں اور قیادتوں سے کہیں بہتر کہیں آگے تھیں۔طلبہ مزدوروں کے درمیان باہمی تنظیمی جڑت کا موازنہ دوسرے ملکوں کی تحریکوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے مثال کے طور پر 1945/47ء کے دوران مصر میں طلبہ اور مزدوروں نے ایک ساتھ مل کر سامراجی جبر اور مقامی استحصال کے خاتمے کیلئے تحریک چلائی تھی۔

طلبہ بغاوت کے شعلے

دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان میں چلنے والی اس تحریک کی پہلی چنگاری بھی طلبہ کے گرم جوش وجذبے سے ہی نکلی تھی۔نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن NSF پاکستان کی مرکزی بائیں بازو کی طلبہ تنظیم تھی جو دراصل 1953ء کی تحریک کے دوران تشکیل دی گئی تھی مگر بعدازاں اس پر پابندی عائد کردی گئی۔ 1950ء کی دہائی میں اور طلبہ تنظیمیں بھی تھیں جن میں ہائی سکول سٹوڈنٹس فیڈریشن اور گرلز سٹوڈنٹس کانگریس شامل تھیں جو بعد میں گرلز سٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں ڈھل گئی تھی۔اس کے سرگرم ارکان میں

زاہدہ تقی، حمزہ باجی، راحت شکور، زرینہ صالحہ، ملکہ حسین اور دیگر شامل تھیں۔ 1958ء میں ایوب آمریت کے تسلط کے بعد NSF (نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن) پر اس کی طلبہ میں بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کے انقلابی سوشلزم پر عمل پیرا ہونے کی بنا پر پابندی لگا دی گئی۔ 1959ء میں امریکی صدر آئزن ہاور نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اس کے دورے کا آخری پروگرام کراچی میں تھا اور پھر اسے واپس امریکہ چلے جانا تھا۔ NSF نے امریکی صدر کی آمد پر مظاہرے کا پروگرام تشکیل دیا اگرچہ اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی مگر یہ منصوبہ حکومت کے علم میں آ گیا۔ مظاہرے سے ایک رات قبل معراج محمد خان اور دیگر طلبہ قائدین گرفتار کر لیے گئے، یوں یہ مظاہرہ نہ کیا جا سکا۔ طلبہ نے ایک اور اہم مظاہرہ 1961ء میں کانگو کے بائیں بازو کے وزیر اعظم پیٹرس لومبا کے قتل کے حوالے سے کیا تھا۔ اس کا اہتمام بھی NSF نے کیا تھا۔ اس مظاہرے پر حکومتی پریس اور خاص طور پر جماعت اسلامی نے خاصی لے دے کی اور کہا کہ یہ مظاہرین جبل پور بھارت میں مسلمانوں کے قتل کو بھول گئے ہیں۔ دو دنوں کے بعد NSF نے جبل پور میں غریب مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف پھر مظاہرہ کیا۔ یہ سبھی مظاہرے پر جوش تھے اور کراچی کے سبھی کالجوں میں پھیل گئے۔ اس دوران کراچی یونیورسٹی میں ہڑتال بھی ہوئی۔ ریاست نے اس پر ردعمل کرتے ہوئے سبھی طلبا رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ پندرہ طلبہ رہنماؤں پر ملٹری قوانین کے تحت مقدمہ چلایا گیا جن میں سے پانچ کو رہا کر دیا گیا جبکہ معراج محمد خان سمیت باقیوں کے کراچی شہر میں داخلے پر نو ماہ کی پابندی عائد کر دی گئی۔ ان دنوں نوجوانوں پر ریاستی جبر کے خلاف حبیب جالب کی نظم بہت مشہور ہوئی۔

جن جوانوں نے اپنا لہو اچھال دیا
ستمگروں نے انہیں شہر سے نکال دیا

ایک شہر سے بے دخل کرنے کے بعد ان طلبہ رہنماؤں کو دوسرے شہروں میں جانے اور اپنا پیغام پھیلانے کا موقع میسر آ گیا۔ اس دوران انہیں ہر بڑے شہر میں جانے اور وہاں کے طلبہ کے دلوں میں انقلابی جوش و جذبہ بیدار کرنے کا موقع ملا۔ 1963ء میں کراچی کی عام ہڑتال کے دوران NSF نے سرگرم کردار ادا کیا اور اس دوران ریلوے، کے ای ایس سی، شپ یارڈ سمیت سائیٹ اور لانڈھی کے صنعتی مزدوروں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ 12 ستمبر 1962ء کو ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ جب ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ نے پولو گراؤنڈ کراچی میں بڑے جلسہ عام کا اعلان کیا۔ ایک بہت بڑا سٹیج تیار کیا گیا جس میں وزرا سمیت لیگ کے اہم رہنماؤں کی شرکت متوقع تھی۔ NSF کے سرگرم کارکن سٹیج پر

چڑھ گئے جس سے کاروائی میں خلل پڑ گیا۔ان طلبہ نے ایوب خان کے رجعتی وزیر چوہدری خلیق الزمان کو سٹیج سے نیچے پٹخ دیا۔جس کے نتیجے میں لڑائی شروع ہوگئی۔ذوالفقار علی بھٹو بھی اس وقت سٹیج پر موجود تھا جو اس وقت کنونشن مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری تھا۔اوراس کی بھی NSF والوں کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی۔اس واقعے کے بعد کئی طلبہ کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔تاہم اس سرکشی کے بعدان کے کئی مطالبات تسلیم کر لیے گئے جن میں بیچلر کی ڈگری کو تین کی بجائے دوسال میں کرنے، سبھی تعلیمی اداروں میں فیسوں میں کمی سمیت کئی دوسرے مطالبات شامل تھے۔1964ء کے صدارتی الیکشن میں NSF نے ایوب کے خلاف فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔1965ء میں کراچی میں گل رعنا کلب میں ہونے والا کنونشن تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔اس میں NSF دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ان میں سے ایک ماسکو نواز دھڑا معراج محمد خان کی قیادت میں جبکہ دوسرا پیکنگ نواز دھڑا کاظمی کی قیادت میں قائم ہوگیا۔

NSF نے 1968/69ء کے طلبہ احتجاج میں مرکزی کردار ادا کیا تھا اور پیپلز پارٹی کی حمایت کی تھی۔جبکہ 1970ء کے الیکشن میں یہ پیپلز پارٹی کی حمایت سے دستبردار ہوگئی اور الیکشن کے بعد بھٹو کی طرف سے پارٹی سیاست میں اصلاح پسندانہ پوزیشن اختیار کر لینے پر اور ریاستی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن جانے پر اس کے خلاف ہوگئی۔1968/69ء کے انقلاب کے دوران پنجاب یونیورسٹی طلبہ سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی جہاں دوسری تنظیموں کے ساتھ ساتھ نیشنل سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (NSO) اسلامی بنیاد پرستوں کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ان دنوں بنیاد پرست انتہائی کمزور تھے جبکہ بایاں بازو انتہائی موثر اور متحرک تھا۔تاہم طلباء یونین کے انتخابات میں بائیں بازو کے اتحاد کے مشترکہ امیدوار کو مخالف بنیاد پرستوں کے امیدوار کے مقابلے میں 162 ووٹوں سے شکست ہوگئی۔یہ شکست بنیاد پرستوں کی طاقت کا نہیں بلکہ بائیں بازو کی باہمی تقسیم کا نتیجہ تھی۔سچ یہ ہے کہ کامیابی کے باوجود بنیاد پرست کیمپس پر کنٹرول نہیں کر سکے تھے۔

اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں طلبہ تحریک کے سرگرم رہنما امتیاز عالم نے کتاب کے مصنف سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ ''یہ ایک شاندار عہد تھا، جب ہر طالب علم دیگر کلاسیکل لٹریچر کے ساتھ ساتھ مارکس، لینن، ماؤزے تنگ، ٹالسٹائی اور دوسرے ترقی پسند مصنفین کو ذوق وشوق سے پڑھ رہا تھا۔ہر طرف طلبہ کے مابین بحث مباحثے ہو رہے ہوتے تھے۔ہر دوسرے دن طلبہ حقوق کیلئے اور ایوب حکومت کے خلاف مظاہرے معمول بنے ہوئے تھے۔احتجاج ایک باقاعدہ معمول بن چکا تھا۔ہر آدمی انقلاب

کے رومانس کا اسیر ہو چکا تھا۔

''مجھے اب بھی یونیورسٹی میں اپنا آخری دن یاد ہے۔ہم کوئی ساٹھ ستر کے قریب طلبہ الوداعی تقریب کے سلسلے میں ایک کھلے گراؤنڈ میں اکٹھے تھے۔ہم نے جوشیلے انداز میں انقلابی تقریریں کیں۔آخر میں ہم نے مزدوروں کا عالمی گیت انٹرنیشنال گایا۔ہم نے اپنی ڈگریاں پھاڑ دیں اور یہ فیصلہ کیا کہ یہاں سے ہم اپنے اپنے گھروں کو جانے کی بجائے کارخانوں اور کھیتوں کھلیانوں میں جا کر انقلاب کیلئے کام کریں گے''۔(7) ایوب خان کے خلاف تحریک کارخانوں' کھلیانوں میں پھیل گئی۔''یونیورسٹی میں احتجاجی مظاہروں کے بعد اسے غیر معینہ مدت کیلئے بند کر دیا گیا۔ہاسٹلوں کو زبردستی خالی کرالیا گیا۔یہاں سے جانے کے بعد طلبہ اپنے اپنے علاقوں میں پھیل گئے اور جدوجہد شروع کرتے ہوئے مزدوروں' کسانوں سے مل کر انقلاب کا پیغام پہنچانے لگے''(8)

یہ سب پرجوش طلبہ مزدور اور کسان ایک متبادل تنظیم کی جستجو میں تھے جس کے ساتھ چل کر انقلاب ممکن بنایا جا سکتا۔ 1968/69ء کی تحریک کے دوران ان کا دیگر سرگرم مزدوروں بالخصوص کسی انقلابی رجحان سے وابستہ مزدور رہنماؤں کے ساتھ تعلق استوار ہو چکا تھا۔پرجوش دکانوں پر کام کرنے والے مزدور اور طالبعلم رہنما مزدوروں کے شعبے میں انتہائی متحرک ہو چکے تھے۔

1967ء کی ریلوے ہڑتال، انقلاب کا نقطہء آغاز

1960ء کی دہائی میں محنت کشوں کے لیے ایوب خان آمریت کی طرف سے مسلط کردہ صنعتی تعلقات کے نظام کے تحت' جو ریاستی قاعدے قانون کی پیچیدگیوں کا شکار تھا' انصاف اور فوری نتائج کا حصول بہت مشکل ہو گیا تھا۔وہ مزدور رہنما جو عدالتوں کے طویل' صبر آزما اور تھکا دینے والے عمل سے اکتا چکے تھے، ایسے رستے اور وسیلے کی جستجو میں تھے جن سے مسائل کا براہ راست اور جلد حل ممکن ہو سکتا۔خاص طور پر جب انہیں نیچے سے مزدوروں کی طرف سے کافی دباؤ ہوتا تھا کہ مسائل کو جلدی سے حل کیا جائے۔ایسے مزدور رہنما جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو نہیں بدل رہے تھے، وہ مزدوروں کے اندر بڑھتے ہوئے جوش و جذبے اور انقلابی شعور کے ہاتھوں استرداد کا شکار ہو رہے تھے اور اپنی ساکھ اور حمایت سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔پیچیدہ' طویل لیبر قوانین اور ان پر حکومتی گرفت کی وجہ سے مروجہ سماجی ڈھانچے کے معیارات اور اقدار محنت کشوں کے کسی کام نہیں آ رہے تھے اور ان کو سہولت

فراہم کرنے کی بجائے ان کے عذاب میں اضافہ کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس تحریک نے ان قوانین کو چیلنج کر دیا تھا اور معاملات ان قانونی جکڑ بندیوں سے باہر نکل گئے تھے۔ ان حالات میں جو ہو رہا تھا ان میں ایک بڑا واقعہ جس نے 1968/69ء کے انقلاب کی بنیاد کو استحکام بخشا وہ جنوری 1967ء کی ریلوے کی شاندار ہڑتال تھی جو 13 دنوں تک جاری رہی تھی۔ ان دنوں ریلوے میں دائیں بازو کی دو رجعتی یونینیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک ریلوے مزدور یونین کی قیادت ایم اے رحیم کر رہا تھا، جبکہ اوپن لائن پر ریلوے یونائٹڈ یونین (سی بی اے) کی قیادت عمر دین کے پاس تھی۔ جبکہ بائیں بازو کی واحد یونین ریلوے ورکرز یونین تھی جس کا قائد مرزا ابراہیم تھا۔ یہ ریلوے ہڑتال مزدوروں کی طرف سے اوقات کار کے دوران سپیشل راشن ڈپو قائم کرنے کے مطالبے پر کی گئی تھی۔ اس مطالبے کو حکومت نے مسترد کر دیا تھا۔ جس کے بعد ریلوے میں آزادانہ طور پر کمیٹیاں تشکیل پانا شروع ہو گئیں۔ ہڑتال کی اپیل ایک سے دوسرے مزدور تک زبانی طور پر پہنچائی گئی۔ تھوڑی سی تعداد میں لیفلیٹس شائع کیے جا سکے تھے۔ جب ہڑتال شروع ہوئی تو ریل کا ایک ڈبہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ پرانے ٹریڈ یونینسٹوں نے کہا کہ ہم نے برصغیر کی تاریخ میں ریلوے کی ایسی ہڑتال نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ رجعتی یونینیں تو اس ہڑتال کی حمایت نہیں کر رہی تھیں مگر مرزا ابراہیم کی یونین اپنے پیکنگ نواز ہونے اور حکمران ایوب خان کے ماؤ کے ساتھ قریبی تعلقات اور چینی افسر شاہی کی پاکستانی حکومت کی حمایت کی وجہ سے اس ہڑتال کی قیادت نہیں کر رہی تھی۔ وزیر محنت احمد سعید کرمانی نے مرزا ابراہیم سے رابطہ کر کے اسے مزدوروں اور حکومت کے مابین مصالحت کرانے کا کہا۔ مرزا نے ہر ممکن کوشش کی مگر وہ ہڑتال کو ختم نہیں کرا سکا۔ حکومت نے اس ناکامی پر مرزا کو گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھ ہی ریلوے مزدوروں پر جبر و استبداد شروع کر دیا گیا۔ حیدر آباد میں ریلوے مزدور پٹڑیوں پر لیٹ گئے تاکہ کچھ غداروں کی طرف سے ریل چلانے کی کوشش کو ناکام بنا دیا جائے مگر ریل چلا دی گئی جس سے دو مزدور ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔ حکومت نے بیشتر مطالبات تسلیم کر لیے اور ہڑتال ختم کر دی گئی۔ اس ہڑتال کے نتیجے میں مزدوروں کی نئی تازہ دم قیادت ابھر کے سامنے آئی جو کردار اور معیار میں پہلے والی سرکاری و غیر سرکاری قیادت سے آگے نکل چکی تھی۔ ایک کمزوری جو اس ہڑتال کے ضمن میں سامنے آئی وہ یہ تھی کہ اسے دیگر اداروں اور شعبوں کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکا۔ مگر جو بہتر بات اس سے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ مزدوروں کو اپنی لامتناہی طاقت کا ادارک ہو گیا اور انہیں اپنی اہلیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا جس نے ایوب حکومت کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔

ایوب حکومت کو ایک سنجیدہ مسئلہ درپیش تھا جس سے حکمران نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایوب خان کسی طرح اپنی فوجی حکومت کی شکل وصورت کو بدل کر اپنی حکمرانی کو اب جمہوری لبادہ پہنانا چاہتا تھا تاکہ اسے قانونی اور اخلاقی جواز فراہم کیا جاسکے۔ اس کیلئے ''بنیادی جمہوریت'' کا رستہ نکالا گیا۔ یہ سکیم 1959ء میں متعارف کرائی گئی اور اس کے تحت 80000 ارکان براہ راست منتخب کر لیے گئے۔ جس میں سے آدھے مشرقی اور آدھے مغربی پاکستان سے تھے۔ ایوب کا خیال تھا کہ اس طریقے سے اتنی تعداد میں اپنی مرضی کے نمائندے منتخب کروا کر وہ سیاست کو اپنے قابو میں کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ امریکہ نے اس منصوبے کیلئے ایوب کو خطیر رقم سے نوازا۔ ایوب خان نے ان نئے منتخب ارکان سے اعتماد کا ووٹ لے لیا۔ اعتماد کے اس ووٹ کے حوالے سے منتخب ارکان سے سوال کیا گیا تھا کہ ''کیا آپ کو صدر فیلڈ مارشل ایوب خان (ہلال پاکستان، ہلال جرات) پر اعتماد ہے؟''۔ سبھی ارکان نے ''ہاں'' کر دی۔ یوں صدر ایوب نے 1960ء میں پاکستان کے پہلے نومنتخب صدر کا حلف اٹھایا۔ ایک نیا آئین تیار کیا گیا وہ بھی اس انداز سے کہ سبھی اختیارات صدر کے پاس مرکوز ہو گئے۔ بعد ازاں انہی بنیادی جمہوری ارکان کے ذریعے ایک پارلیمنٹ بھی منتخب کرالی گئی۔ لیکن یہ سبھی حیلہ سازیاں اور دھوکے اس وقت دھرے کے دھرے رہ گئے جب تحریک پھوٹ پڑی۔ بھٹو تحریک سے پہلے ہی حکومت کے خلاف میدان میں آچکا تھا۔ اس نے تاریخ کے دیے گئے موقعے کو اپنی گرفت میں کر لیا تھا۔ ہم پہلے ہی سفارتی مراسلوں کی شکل میں بتا چکے ہیں کہ 7 نومبر 1968ء کو پنڈی میں عبدالحمید کی شہادت کے بعد جنم لینے والی تحریک میں اس کی مقبولیت کس قدر وسیع اور گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

طوفانی واقعات کی ابتدا

سٹینلے والپرٹ نے انقلابی تحریک میں بھٹو کی مداخلت کے بارے میں لکھا ہے ''ذوالفقار علی بھٹو پنڈی کی طرف روانہ ہوا جہاں مصطفیٰ کھر اور ممتاز بھٹو اس کا انٹر کانٹینینٹل ہوٹل میں انتظار کر رہے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبہ کو ہوٹل کے لان سے پولیس نے بھگا دیا تھا جن کی بڑی تعداد قریبی گورڈن کالج سے آئی ہوئی تھی۔ پنڈی وہ شہر تھا جہاں جی ایچ کیو واقع تھا۔ چنانچہ جلسہ اور اجتماع کسی طور بھی پسندیدہ عمل نہیں تھا اور وہ بھی اس دن جس دن روسی انقلاب کی سالگرہ ہو''۔

''میں جب مال روڈ پہنچا تو سارا علاقہ آنسو گیس کی شیلنگ کی وجہ سے دھوئیں سے اٹا ہوا تھا۔

میرے پہنچنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھٹو کو پولی ٹیکنیک کالج سے فون آیا کہ وہاں پولیس نے فائرنگ کر دی ہے جس سے ایک طالبعلم عبدالحمید کی موت واقع ہوگئی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ طالب علم اس کی لاش ایوان صدر تک لے جانا چاہ رہے تھے اور وہ چاہ رہے تھے کہ بھٹو اس جلوس کی قیادت کرے''۔(9)

راولپنڈی میں اپنے فقید المثال استقبال کے بعد بھٹو ریل کے ذریعے لاہور کے تاریخی سفر پہ روانہ ہوا۔ راولپنڈی کے طالبعلم رہنما اس سفر میں اس کے ساتھ تھے۔ اس سفر کے دوران ہر سٹیشن پر ہزاروں لوگ بھٹو کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بیتابی سے اس کے منتظر تھے۔ سٹیلے، حکومت کی طرف سے پنڈی سے نکال دیے جانے کے بعد بھٹو کے تاریخی شہر لاہور پہنچنے کا احوال بیان کرتا ہے'' وہ دو سال سے زائد عرصے بعد لاہور آیا تھا، اس عرصے میں وہ چپ رہا تھا مگر اس کا استقبال ایک لاکھ یا شاید اس سے بھی زیادہ نوجوانوں نے کیا۔ ہر طرف سر ہی سر تھے جو ایک دوسرے کے اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ کسی طرح بھٹو کی ایک جھلک دیکھ سکیں''۔(10) 13/14 نومبر کی شب پاکستان کے سبھی بائیں بازو کے رہنما بھٹو اور ولی خان سمیت گرفتار کر لیے گئے ۔ اس حکومتی اقدام نے صورتحال کو مزید بھڑکا دیا۔ وکلاء نے 15 نومبر کو احتجاج کیا۔ 19 نومبر کو کراچی لاہور سمیت ملک کے سبھی چھوٹے بڑے شہروں میں ہائیکورٹ بار کی جانب سے ہڑتال اور مظاہرے کیے گئے۔ نومبر کے آخر میں ایک عام ہڑتال نے پنڈی شہر کو مفلوج کر کے رکھ دیا، اس روز پولیس سارا دن طلبہ اور مزدوروں کے ساتھ لڑائی کرتی رہی جبکہ فوج ایک طرف بیرکوں میں بیٹھی تماشا دیکھتی رہی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی 7 دسمبر کو ڈھاکہ میں عام ہڑتال نے شہر کو جام کر کے رکھ دیا۔ یہاں پولیس نے نوجوانوں کے خون سے شہر کو سرخ کر دیا۔ اس واقعے کے خلاف بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مولانا بھاشانی نے جس کی نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) ماؤسٹ فلسفے کی حامل تھی، وسط دسمبر میں سارے مشرقی پاکستان میں مکمل عام ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ مجیب کی عوامی لیگ نے بھاشانی کی کال کی حمایت کر دی۔ اور یوں مشرقی پاکستان کی ہر دکان کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ ایوب کو پتہ چل گیا کہ اس کے دن گنے جا چکے ہیں۔ وہ پبلک مقامات پر جہاں کہیں بھی جاتا اسے یا تو گولی یا پھر بپھرے ہوئے لوگوں کی گالی سننے کو ملتی۔ اس کی صحت جواب دیتی چلی گئی۔ اسے اس بات کا تو یقین تھا کہ اس کی فوج بھارت کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہے البتہ وہ یہ ضرور سمجھ رہا تھا کہ یہ ملک کے اندر جاری گلیوں سڑکوں پر شور شرابے اور فسادات کا بھرپور توڑ کر سکتی ہے اور اس کے سیاسی مخالفین کا قلع قمع بھی کر لے گی۔ مگر وہ الٹ اور غلط سوچ رہا تھا اس کی فوج بھارت کے ساتھ تو لڑ سکتی تھی مگر ایک انقلابی سرکشی پر

اترے ہوئے عوام کا مقابلہ کسی بھی فوج کے بس کی بات نہیں ہوا کرتی۔ایوب کی بدقسمتی یہ تھی کہ جس فوج کو وہ اپنے کسی کام لاسکتا تھا، وہ اس کے کسی کام نہیں آسکتی تھی، اگر وہ اس انقلابی کیفیت میں اسے کام لانے کی کوشش کرتا تو یہ ٹوٹ جاتی۔

28 نومبر کو پیپلز پارٹی اور نیپ نے مشترکہ احتجاج کیا اور جلسے اور مظاہرے منظم و متحرک کیے۔8 دسمبر کو ایوب نے ڈھاکہ کا دورہ کیا جہاں طلبہ نے اس کے خلاف مظاہرے کیے۔پولیس فائرنگ سے کئی طلبہ ہلاک اور زخمی بھی ہوئے۔10 دسمبر کو فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی جانب سے ملک گیر ہڑتال کی گئی۔جبکہ 13 دسمبر کو مشرقی پاکستان کو عام ہڑتال نے جام کر کے رکھ دیا۔ایوب خان اپنی ڈائریوں میں اس وقت کے حوالے سے لکھتا ہے ''آج رپورٹس موصول ہوئی ہیں کہ بہت سے شہروں میں طلبہ اور غنڈہ عناصر کی طرف سے ہنگامے کیے گئے ہیں۔یہ لوگ مسلح تھے اور لوٹ مار کر رہے تھے۔مسلم لیگ اور فیملی پلاننگ کے دفاتر کو انہوں نے اپنا ٹارگٹ بنایا ہوا تھا۔جو بات قابل تشویش ہے وہ یہ کہ دس سے بارہ سال کی عمر کے سکول طلبہ بھی اس فساد میں شریک ہونا شروع ہو چکے ہیں''۔(11) ایوب خان کو نیچے سے عوام کی ناقابل واپسی سرکشی اچھی طرح محسوس ہونی شروع ہوگئی تھی اس کے بقول ''کاروں اور دیگر گاڑیوں کو سنگسار کیا جانے لگا ہے دکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک قافلے کو روک کر اسے مارا پیٹا گیا جس پر اپنے دفاع میں انہیں گولیاں چلانی پڑیں جس سے کئی افراد زخمی ہوگئے''۔''بھاشانی اور اس کے پیروکاروں نے مسلسل مکمل ہڑتال کی ہے۔اس دوران ڈھاکہ اور نارائن گنج میں دفعہ 144 لگا دی گئی تاہم بھاشانی نے بعد از نماز ظہر اسے توڑنے کا فیصلہ کیا، جب پولیس افسران اسے روکنے میں ناکام رہے تو اس پر اور اس کے اجتماع پر رنگین پانی پھینک دیا گیا۔جس پر وہ پسپا ہونے اور بھاگنے پر مجبور ہو گئے''۔(12) 20 جنوری 1969ء کو ڈھاکہ میں ایک کمیونسٹ طالبعلم رہنما اسد پولیس فائرنگ سے ہلاک کر دیا گیا۔اس قتل نے سارے ملک میں طلبہ کے جوش جذبے کو اور بھی بھڑکا دیا۔21 جنوری کو لاہور میں ڈاکٹروں نے اپنا پہلا احتجاج کیا۔اسی لاہور شہر میں 24 جنوری کو عام ہڑتال کی گئی شہر میں 24 گھنٹوں کیلئے کرفیو لگا دیا گیا اور فوج کو بلا لیا گیا تاکہ لوگوں کو کنٹرول کیا جا سکے۔تاہم ہر جگہ طلبہ اور ہزاروں لوگ اس کرفیو کے خلاف باہر نکلے اور مظاہرے کیے۔

مشرقی پاکستان میں نابا کمار انسٹیٹیوٹ کا نہم جماعت کا ایک طالبعلم مطیع الرپولیس فائرنگ سے ہلاک ہوا۔جس پر ڈھاکہ میں مشتعل طلبہ اور عوام نے دو سرکاری اخبارات کے دفاتر جلا ڈالے کیونکہ وہ

عوام کے خلاف لکھ رہے تھے۔ یہ دونوں ''مارننگ نیوز'' اور دینک پاکستان'' ڈھاکہ سے شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے روزنامہ پیغام کے دفتر کو بھی تباہ کر دیا جس کا مالک مشرقی پاکستان کا گورنر منعم خان تھا۔ 25 جنوری کو کراچی میں شدید مظاہرے ہوئے جس میں کئی بسیں جلا دی گئیں، یہاں کرفیو لگا دیا گیا۔ 26 جنوری کو ڈھاکہ اور نارائن گنج میں لوگوں نے کرفیو توڑ دیا اور فائرنگ سے تین شہری ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد لوگوں نے بنیادی جمہوریت کے ممبروں پر حملہ کر دیا۔ کراچی میں کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) کے دفتر پر حملہ کر کے اسے نذر آتش کر دیا گیا۔ کراچی کے ساتھ ساتھ لاہور، گوجرانوالہ، ڈھاکہ سمیت کئی شہروں میں کرفیو لگا دیا گیا اور اس کے اوقات میں اضافہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے ان انقلابی واقعات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب ''پاکستان کے بحران اور ان کا حل'' میں لکھا ہے۔

''14 فروری 1969ء کو ریلوے، واپڈا، اور رکشہ ٹیکسی یونین نے لاہور میں ہڑتال کر دی اور مظاہرہ کیا۔ ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز نے اپنے معاشی مطالبات پیش کیے جن میں مزدوروں کی اجرتوں میں اضافے سمیت کئی مطالبات شامل تھے۔ 17 فروری کو ملتان میں پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن کے ملازمین نے ہڑتال کر دی۔ 19 فروری کو لاہور میں 30 ٹریڈ یونینوں نے مل کر مظاہرہ کیا۔ 20 فروری کو اوورسیروں پر مشتمل سرکاری ملازمین نے اپنے مطالبات کے حق میں لاہور میں مظاہرہ کیا۔ 21 فروری کو ویسٹ پاکستان سیکرٹریٹ کے سبھی کلرکوں نے ہڑتال کر دی اور اپنے مطالبات پیش کیے۔ 23 فروری کو روڈ ٹرانسپورٹ ورکروں نے مظاہرہ کیا جس میں ہسپتالوں اور پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے مزدور بھی شریک ہو گئے۔ 24 فروری کو ٹرانسپورٹ مزدوروں نے ایک اور مظاہرہ کیا جبکہ اسی روز بہاولپور میں اساتذہ نے بھی مظاہرہ کیا''۔

''13 مارچ کو گجرات میں قائم باسکو فیکٹری میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی جو تیرہ دن چلتی رہی۔ 4 مارچ کو ڈاکخانے کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی یہ بھی تیرہ دن چلی۔ اسی دن ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے دو ہزار مزدوروں نے ایک دن کی مکمل ہڑتال کر دی۔ 5 مارچ کو کراچی پورٹ ٹرسٹ کے دس ہزار مزدوروں نے ہڑتال کر دی جو پانچ دن جاری رہی۔ 6 مارچ کو لاہور میں ریلوے مزدوروں نے ہڑتال کی اور مظاہرہ بھی کیا جس میں ایوب کی حمایت کرنے والے ایک شخص کو مظاہرین نے مار مار کے ہلاک کر دیا''۔

''7مارچ کو نیشنل بینک کے ملازمین نے ہڑتال کردی جبکہ ریلوے کے مزدوروں نے مظاہرہ کیا۔ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز نے ایک بہت بڑی ریلی نکالی۔8مارچ کو کراچی میں اساتذہ نے ریلی نکالی،دیگراداروں کی بڑی ریلیاں بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئیں۔9مارچ کو واپڈا کی سنٹرل ہائیڈرو یونین نے ایک مظاہرہ کیااوراپنے مطالبات پیش کیے جن میں سب سے بڑا مطالبہ کم ازکم تنخواہ150روپے مقرر کرنے کا تھا۔اس دن پہلی بار بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کا مطالبہ سامنے آیا۔اسی دن ایسٹرن فیڈرل یونین (انشورنس کمپنی) کے ملازمین نے بھی ہڑتال کا اعلان کیا۔ 11مارچ کو واپڈا کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور ایک ریلی نکالی۔اسی روز ٹیلی کمیونیکیشن کے مزدوروں نے ہڑتال کردی جو آٹھ دن جاری رہی۔جبکہ اسی دن کراچی میں 5000اساتذہ نے ریلی نکالی جس میں ڈاکخانے کے کلرک اور ڈاکیے بھی شریک ہوگئے۔12مارچ کو ٹیلیفون آپریٹروں نے ہڑتال کردی۔13مارچ کو ٹیلی کمیونیکیشن کے مزدوروں نے مظاہرہ کیا جس کے بعد انجینئرنگ سٹاف نے بھی اپنے ساتھی مزدوروں کے ساتھ یکجہتی کرتے ہوئے ہڑتال کردی۔14مارچ کو طویل فاصلوں پر کام کرنے والے آپریٹروں نے بھی ہڑتال کردی۔15مارچ کو نیشنل بینک اور گرینڈلیز بینک نے ہڑتال کر دی۔17مارچ کو لاہور میں بیس ہزار سے زائد پرائمری سکول اساتذہ نے ایک میل لمبا جلوس نکالا جس میں پنجاب کے 12اضلاع سے ٹیچرز شریک ہوئے۔18مارچ کو جوائنٹ لیبر کمیٹی کی کال پر ملک بھر میں 25لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کردی۔19مارچ کو کراچی پورٹ ٹرسٹ کے 6000مزدوروں نے کوئی نوٹس دیئے بغیر ہڑتال کر دی۔21مارچ کو انڈیا فلورملز اور کراچی سٹیم رولرز ملز کے مزدوروں نے ملوں کا کنٹرول سنبھال لیا اور انہیں چلانے کیلئے کمیٹیاں تشکیل دے دیں۔اسی روز اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے 20000مزدوروں نے ہڑتال کردی۔21مارچ کو ہسپتالوں کے گریڈ4کے ملازمین نے ہڑتال کردی۔اس سارے عرصے کے دوران مشرقی پاکستان میں گھیراؤ کے 24واقعات پیش آئے جن میں مزدوروں نے کارخانوں پر قبضے کرکے ان کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔اس کے ساتھ ہی کئی سرکاری و نیم سرکاری دفاتر پر بھی قبضے کر لیے گئے اور اپنے مطالبات تسلیم کرائے گئے۔25مارچ کو جوائنٹ لیبر کونسل نے مزدور مطالبات کا ہفتہ منانے کا اعلان کردیا''۔

''اس ساری تحریک کے دوران کل 239افراد ہلاک ہوئے جن میں سے 196مشرقی پاکستان جبکہ 43مغربی پاکستان میں ہلاک ہوئے۔تفصیلات کے مطابق ان میں پولیس فائرنگ سے ہلاک

ہونے والوں کی تعداد مغربی پاکستان میں 41اور مشرقی پاکستان میں 88 تھی اوران میں زیادہ تر طالبعلم تھے''۔(13)

ایوب نے اتوار 9مارچ 1969ء کے دن کی اپنی ڈائری میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے''صوبے میں لا اینڈ آرڈر کی صورتحال انتہائی بگڑ چکی ہے۔لگتا ہے کہ یہ کبھی تھی ہی نہیں،سول انتظامیہ مکمل ناکام ہو چکی ہے۔فسادی عناصر سے ہٹ کر،کمیونسٹ غنڈے اور دہشت گرد بھاشانی کے بھڑکانے پر تھانوں کو،مسلم لیگیوں کے گھروں اور جائیدادوں کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں اور بلدیاتی اداروں کے سربراہوں اور ارکان سے مستعفی ہو جانے کا کہہ رہے ہیں''۔''ان حالات کو دیکھتے ہوئے بہت سے سول افسران اپنی ملازمتیں چھوڑ چکے ہیں۔یہی حال لوکل رینٹ کلیکٹروں کا ہے جبکہ ان کا ریکارڈ جلا دیا گیا ہے''۔''ان مزدوروں نے بھی ناک میں دم کر رکھا ہے اور وہ مسلسل مظاہروں پر مظاہرے کیے جا رہے ہیں،جس کا اثر پیداوار پر پڑ رہا ہے۔سرمایہ کاری ختم ہو کے رہ گئی ہے۔سٹاک مارکیٹ بیٹھ چکی اور سرمایہ ملک سے باہر منتقل کیا جا چکا ہے۔آنے والے دن پاکستان کیلئے بہت برے ثابت ہو سکتے ہیں''۔(14)

20مارچ کی اپنی ڈائری میں ایوب نے تسلیم کر لیا کہ تحریک نے کس طرح ریاست اور حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے''کراچی ڈاک یارڈ میں مزدوروں نے ہڑتال کرتے ہوئے کام سے ہاتھ روک لیے ہیں۔نہ تو کچھ لادا،نہ اتارا جا رہا ہے۔بتایا گیا ہے کہ جہاز خالی واپس چلا گیا کیونکہ اس پر کپاس لادی نہیں کی جا سکی۔بھاشانی کراچی میں ہے اور وہ ہر طرف فساد پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔کہا جا رہا ہے کہ آگے اس سے بھی خراب صورتحال پیدا ہونے والی ہے''۔(15)

مسلح افواج کے تینوں جرنیلوں آرمی کے جنرل یحییٰ،نیوی کے ایڈمرل ایس ایم احسن اور فضائیہ کے ایر مارشل نور خان میں سے ایک کو بھی جرات نہیں ہو رہی تھی کہ وہ متحرک اور مشتعل عوام پر گولی چلانے کا حکم دیں اس کی بجائے وہ بات چیت اور مذاکرات پر زور دے رہے تھے۔21فروری 1969ء کو ایوب خان نے اعلان کر دیا کہ وہ 1970ء میں ہونے والے صدارتی الیکشن میں امیدوار نہیں ہوگا۔اس اعلان نے انقلاب کے شعلوں کو اور بھی بھڑکا دیا۔اس نے تحریک کے رنگ و روپ اور جوش و جذبے کو نئی امنگ اور ترنگ سے بھر دیا۔لاہور میں مغربی پاکستان سیکرٹریٹ کے کلرکوں نے ایک جزوی ہڑتال کا اعلان کیا،جس میں تیسرے اور چوتھے درجے کے ملازمین بھی شریک ہو گئے۔اس ہڑتال میں کچھ دنوں

کے اندر ہی ہسپتالوں، پی ڈبلیو ڈی، پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ساتھ کچھ خودمختار سرکاری ادارے جیسے روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن، نیشنل بینک اور واپڈا کے سٹاف اور چھوٹے ملازمین بھی شامل ہوگئے۔ مغربی پاکستان کی سبھی لیبر یونینوں اور فیڈریشنوں نے جوائنٹ لیبر کونسل تشکیل دے دی۔ اس کونسل نے مارچ کے پہلے ہفتے کو مزدوروں کے مطالبات کے ہفتے کے طور پر منانے جبکہ 17 مارچ 1969ء کو ملک بھر میں عام ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ یہ ایک انتہائی کامیاب اور تاریخی ہڑتال ثابت ہوئی اس دن سارا ملک بند ہو کے رہ گیا۔ اس دن بجلی کے مزدوروں نے اسلام آباد میں ایوان صدر، سول سیکرٹریٹ، سرکاری دفاتر اور جی ایچ کیو کی بجلی کاٹ دی۔ ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کے صدر بشیر بختیار کے الفاظ میں یہ ہمارا صدر ایوب کیلئے واضح پیغام تھا ''کہ تمہیں جانا ہوگا، نہیں گئے تو ہم یہ سلسلہ جاری رکھیں گے''۔(16)

مارچ پاکستان کی تاریخ کا سب سے متحرک ترین مہینہ بن گیا۔ مزدوروں نے کارخانوں کا مکمل گھیراؤ جلاؤ کر لیا تھا اور فیکٹریاں ان کے قبضے میں آ چکی تھیں۔ ان حالات میں سرکاری ملازمین کی ہڑتالوں نے حکومتی افسر شاہی اور شہری معیشت دونوں کو عضو معطل بنا کے رکھ دیا۔ انقلاب کے زندہ عمل میں محنت کشوں کی شرکت اور شمولیت، سیاسی عمل کے ذریعے اپنی کم اجرتوں میں اضافے، اور اس دوران ان کی طرف ہڑتال کے بنیادی حق، صنعتوں کو نیشنلائز کیے جانے اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کے مطالبات تحریک کے سب سے بڑے انقلابی مرحلے کے طور پر ابھر کے سامنے آئے۔ ناگزیر طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان تیزی کے ساتھ نظریاتی طور پر دائیں اور بائیں بازو میں تقسیم ہو کر انقلاب کی تڑپ میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ تحریک جو بھٹو اور بھاشانی کے شانہ بشانہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی، ایوب اقتدار کے فوری خاتمے کا مطالبہ تو کر ہی رہی تھی مگر یہ اب اس مطالبے سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ مولانا بھاشانی، جسے، فیلڈ مین نے ایک نہ سمجھ آ سکنے والی پہیلی قرار دیا تھا،(17) خاص طور پر انقلاب کا ہر جلسے ہر تقریر میں ذکر کر رہا تھا۔ کراچی میں ورکروں سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم باتیں کم کریں اور اپنے ہتھیار تیار رکھیں''۔(18)

کسانوں کی بغاوت

بھاشانی ایک روایتی کسان لیڈر تھا اور گوریلا جدوجہد پر یقین رکھتا تھا۔ وہ ماؤزے تنگ کا پیروکار

تھا۔ایوب دور کی بے پناہ صنعتی ترقی کے باوجود پاکستان ایک زرعی معیشت کا حامل ملک تھا جس کی آبادی کی اکثریت دیہاتوں میں رہائش پذیر تھی۔شہروں اور قصبوں میں سے نکل کر انقلاب کی آواز دیہاتوں میں پہنچ کے اپنا رنگ جما رہی تھی۔یہ کسانوں کے دل ودماغ پر اور ان کی نفسیات پر ان کے اعصاب پر گہرائی اور شدت کے ساتھ چھاتی چلی جارہی تھی۔ چنانچہ جلد ہی کسانوں کی ایک بہت بڑی سرکشی دیہاتوں میں پھیل گئی اور شہروں اور قصبوں میں جاری انقلابی ابھار کی ہم سفر بن گئی۔مشرقی ومغربی پاکستان دونوں طرف کسانوں نے اپنے اپنے جاگیرداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔''جیہڑ اواہوے،اوہو کھاوے''یعنی جو کاشت کرے گا وہی زمین کا مالک ہوگا' کا نعرہ ہرطرف چھا گیا۔سندھ میں چھمبر، پختونخواہ میں ہشت نگر اور مشرقی پاکستان کے کئی ایک اضلاع میں بڑی کسان تحریکیں ابھر کر سامنے آئیں۔چھمبر میں ہاریوں نے انتہائی جرات وبہادری کے ساتھ یکجہتی اور وحدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاگیرداروں کی زمینوں پر قبضہ کرلیا اور کسان عدالتیں تک قائم کرلیں۔یہ حیدرآباد میں اپنے مزدور بھائیوں کی تحریک کے ساتھ جڑ گئے اور وہاں ہونے والے مظاہروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔زیل پاک سیمنٹ فیکٹری کے مزدوروں کی ایک ریلی میں جو مزدور رہنما استاد مرتضیٰ کی قیادت میں نکلی، 800 مزدوروں کے ساتھ 700 ہاریوں نے بھی چھمبر سے شرکت کی۔اس ریلی میں بلدیہ،روڈ ٹرانسپورٹ سمیت کئی اور شعبوں کے مزدور بھی شامل ہوئے۔

اس جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ جاگیردار غریب ہاریوں سے اپنی زیادتیوں کی سرعام معافیاں مانگتے پھر رہے تھے اور یہ بھی ماننے پر مجبور ہوگئے کہ کسان فصلوں کی بٹائی کسان عدالتوں کے فیصلوں کے مطابق کرسکتے ہیں۔کوئی بیگار نہیں لیا جائے گا بائیں بازو کے کسی کسان کو بے دخل نہیں کیا جائے گا۔کسانوں کی اس تحریک سے نعرہ طلوع ہوا''ہاری حقدار، جاگیردار دستبردار''۔

مزدور کسان پارٹی MKP ایک بائیں بازو کی پارٹی تھی جو کہ ماؤاسٹ خطوط پر استوار کی گئی تھی۔ wikipedia کے مطابق اپنی ابتدا میں ہی اس نے کئی مختلف دھڑوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا جن میں پنجاب میں میجر اسحاق محمد اور مشرقی پاکستان کے کئی گروپ شامل تھے۔1970ء میں میجر اسحاق گروپ اس پارٹی میں ضم ہوگیا۔اس پارٹی کا مرکز کسان تھے اور یہ چینی ،ویتنامی اور افریقی عوام کی جدوجہد سے متاثر تھی۔اس کو سرحد میں فوری کامیابیاں ملیں جس کی وجہ وہاں ایوب کے دور میں ہونے والی زرعی اصلاحات اور فارم مشینری کی تنصیب کے نتیجے میں جاگیرداروں اور کسانوں کے مابین چلنے

والے تنازعات تھے۔مزدور کسان پارٹی نے کسانوں کو منظم کرتے ہوئے ان کو ایک دھاگے میں پرویا جس کی اس وقت کسان بغاوت کو اشد ضرورت تھی۔اس کے نتیجے میں 1960/70ء کی دہائی میں تحریک کو شاندار تقویت میسر آئی۔اس تحریک کو نہ صرف جاگیرداروں کی نجی فوج بلکہ ریاستی جبر وتشدد کا بھی مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔اس تحریک نے اپنے وقت میں تین حکومتوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا۔جاگیرداروں نے جو مختلف پارٹیوں میں شامل تھے ''اتحاد پارٹی'' بنالی تاکہ اس کسان بغاوت کو مل کر کچلا جاسکے۔جبکہ سبھی صوبائی حکومتیں کسانوں کی تحریکوں کو کچلنے کیلئے ان جاگیرداروں کی مکمل پشت پناہی اور مدد کر رہی تھیں۔

کسانوں اور ریاست کے مابین ایک شدید تصادم جولائی 1971ء میں منڈانی پختونخواہ میں ہوا جہاں 1500 پولیس کے مسلح دستوں نے سارا دن کسانوں پر حملے کیے جس سے بیس کسان اور پارٹی کیڈرز زخمی ہوئے۔دوسری بڑی جھڑپ نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط حکومت کے آخری دنوں میں ہوئی۔کوئی 8000 فوجی اور رینجرز مالاکنڈ تعینات کر دیئے گئے تاکہ مزدور کسان پارٹی کو روکا جاسکے۔اس لڑائی میں پارٹی کے نائب صدر مولوی محمد صادق کو قتل کر دیا گیا۔

مزدور کسان پارٹی نے پارلیمانی جدوجہد کو نظرانداز کرتے ہوئے 1970ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔اسی طرح قومی مسئلے پر بھی یہ درست موقف نہیں لے سکی۔اسی طرح سے یہ سندھ اور بلوچستان میں بھی خود کو منظم نہیں کرسکی۔اس کے باوجود بھی اس کی مردان، پشاور کے اضلاع سمیت مالاکنڈ اور سوات ودیر کی سابقہ ریاستوں کے علاقے میں مضبوط بنیادیں قائم تھیں۔جبکہ ہزارہ اور پنجاب میں اس نے موثر حمایت حاصل کی۔پارٹی کی پہلی مرکزی کانگریس شیرگڑھ ضلع مردان میں مئی 1973ء میں ہوئی۔علاقے کو ہر طرف مسلح سکیورٹی گارڈوں نے گھیر لیا تھا جبکہ ٹرانسپورٹروں کی طرف سے ہڑتال کرائی گئی تاکہ لوگ اس میں شریک نہ ہوسکیں۔تاہم یہ سب حربے ناکام ہوئے اور 5000 افراد اس کانگریس میں شریک ہوئے۔اپنے بس مالکان کا کہنا ماننے سے انکار کرنے والے ڈرائیوروں اور پارٹی کے پرجوش کارکنوں کی بڑی تعداد اس میں شامل تھی۔اس کانگریس میں میجر اسحاق محمد کو پارٹی کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ 1970ء کی طرح 1977ء کے عام انتخابات میں بھی اس پارٹی نے حصہ نہیں لیا اگرچہ یہ ایک درجن سے زیادہ حلقوں سے انتخابات جیتنے کی پوزیشن میں تھی۔مگر اس نے ''انتخاب نہیں انقلاب'' کا نعرہ اختیار کرتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی نرم ہونے کے بعد بڑی ریلیاں نکالیں۔پشاور میں 50000 جبکہ شیرگڑھ مردان میں 30000 افراد ان ریلیوں میں شریک ہوئے۔

ایک اور بڑی کسان جدوجہد 1972ء میں چشتیاں شوگر ملز پر قبضے کی شکل میں سامنے آئی۔ یہ کارخانہ دو سالوں تک مزدوروں کے کنٹرول میں رہا۔اس میں 1200 مزدور کام کرتے تھے۔اس قبضے کو زیادہ تر اردگرد کے علاقے کے کسانوں کی بھرپور حمایت حاصل رہی جو اپنی فصلیں بھی یہاں لا کر دیتے رہے۔ مزدور کسان پارٹی کے سابق لیڈر امتیاز عالم کے الفاظ میں ''ان دنوں یہ شوگر مل مزدوروں اور کسانوں کیلئے ایک کمیون کا کام سرانجام دے رہی تھی۔ ہر چیز ورکروں کیلئے مفت فراہم کی جارہی تھی اور یہاں سے بہت سا سیاسی کام بھی شروع کیا گیا۔وہاں 25 فل ٹائمرز کام کر رہے تھے جو وہاں سے نکل کر دوسرے علاقوں میں جاتے اور مزدوروں کو منظّم کیا کرتے تھے۔ہم نے شوگر ملز ورکرز کی ایک مرکزی فیڈریشن بھی قائم کر لی تھی جس کا مرکز چشتیاں شوگر ملز کو بنایا گیا۔بھٹو حکومت کو اس قبضے کو ختم کرنے کیلئے رینجرز طلب کرنے پڑے۔مگر کیفیت یہ تھی کہ ہم خود اندر سے ہی کمزور ہو کر ٹوٹ چکے تھے کیونکہ فیکٹری کو چلانے کیلئے درکار سرمایہ ہی نہیں تھا اور ہم کسانوں کی امداد کے ساتھ ٹریڈ یونین فیڈریشن سے ملنے والے فنڈز پر ہی گزارہ کر رہے تھے''۔(19) امتیاز عالم نے یہ بھی بتایا کہ ''ہم نے کسان خواتین کو بھی دیہاتوں میں منظّم کیا تھا۔ یہ خواتین زیادہ تر کپاس کی چنائی اور گندم کی بوائی کے موقعوں پر ہی باہر نکلا کرتی تھیں۔ انہیں فصل کی بٹائی میں سے 1/16 حصہ ملتا تھا، 1974ء میں ہم نے چشتیاں میں کسان خواتین کانفرنس بھی کرائی جس میں دس ہزار کے قریب خواتین شریک ہوئیں۔ ہمارا اس کانفرنس پر بمشکل 48 روپے خرچ آیا وہ بھی سٹیج تیار کرنے اور لاؤڈ سپیکر کیلئے تھا۔سبھی خواتین اپنے سفر کا اہتمام خود کر کے اور کھانا بھی گھروں سے تیار کر کے لائی تھیں''۔

پشتونخواہ کے علاوہ یہ تحریک پنجاب کے کئی قصبوں دیہاتوں میں سرایت کر چکی تھی، خانیوال، راجن پور، ڈیرہ غازیخان، وہاڑی، بوریوالہ سمیت کئی علاقوں میں کسانوں نے زمینوں پر قبضے شروع کر دیئے تھے۔ یہ تحریکیں بے دخلیوں، بیگار اور بٹائی کے مسئلے پر شروع ہوئی تھیں۔اس تحریک کے نتیجے میں انہیں فصلوں میں پہلے سے بہتر حصے ملنے شروع ہو گئے۔

پاکستان میں کسانوں کی جدوجہد کی ایک لمبی تاریخ ہے جس نے ملک میں کسان کانفرنسوں کی روایت ڈالی۔ مارچ 1948ء میں پہلی کسان کانفرنس تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائل پور (جسے بعد میں فیصل آباد بنا دیا گیا) میں منعقد کی گئی تھی جس میں پنجاب کسان کمیٹی کی تنظیم و تشکیل کی گئی جس نے پنجاب بھر میں کسانوں میں موثر کام کیا۔انقلابی تحریک کی وجہ سے پنجاب کے مختلف شہروں میں کسان کانفرنسیں

منعقد کی گئیں۔ 1970ء میں کسان کانفرنس ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جبکہ 1971ء میں خانیوال میں ہوئی۔ 22/23 مارچ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والی کانفرنس پاکستان کی تاریخ کی کامیاب ترین کانفرنس تھی۔ جس میں پاکستان کسان کمیٹی کے مطابق ملک بھر سے ڈھائی لاکھ کسانوں نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں جو اہم شخصیات شریک تھیں ان میں مولانا بھاشانی، فیض احمد فیض، احمد راہی اور معراج محمد خان شامل تھے۔

لوگ کسی سمندری طوفان کی طرح سے متحرک ہو چکے تھے۔ پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں کے خون خشک ہو چکے تھے اور دماغوں سے ہوش اڑ چکے تھے۔ ان کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ ملاؤں کو یہ ساری کیفیت ایک آنکھ بھی نہیں بھا رہی تھی اور وہ تلملائے ہوئے تھے کیونکہ مزدور، کسان اور نوجوان جو کچھ کہہ رہے تھے، جو کچھ کر رہے تھے وہ ان کے حساب سے سراسر کفر تھا کیونکہ وہ خدا کی بنائی ہوئی تقدیر کے برخلاف اپنی ذلتوں، محرومیوں اور غربت کے خاتمے کی جستجو اور جدوجہد میں ملوث تھے۔ افسر شاہی تو روز ازل سے ماضی میں رہنے کی عادی چلی آ رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے ہی اس کے تصورات اور طور طریقے وہی اور ویسے ہی چلے آ رہے تھے۔

این ڈبلیو ایف پی (پشتونخواہ) میں کسان تنظیمیں انتہائی سرگرمی سے صوبہ بھر میں کسانوں کی میٹنگیں اور جلسے جلوس کر رہی تھیں۔ 1960/70ء کی دہائیوں میں وہاں کئی کسان کانفرنسیں منعقد کرائی گئیں۔ جن میں وسیع عوامی احتجاج، جلوسوں اور بعض اوقات مسلح جدوجہد کے ذریعے کسانوں کو درپیش مسائل و مطالبات سامنے لائے گئے۔ اپریل 1967ء میں شاہ آباد قصبے (ضلع پشاور) میں ایک کسان جرگہ منعقد ہوا جس میں خوانین کی طرف سے زمینوں پر قبضے اور کسانوں کی زبردستی بے دخلی کے خلاف قرارداد منظور کی گئی۔

سندھ ہاری کمیٹی نے بھی کسانوں کے مسائل اور مطالبات کیلئے جدوجہد میں کوئی کسر نہیں اٹھا چھوڑی تھی۔ 21/22 جون کو سکرنڈ ضلع نوابشاہ میں ایک تاریخی کسان کانفرنس شیخ عبدالمجید سندھی کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں ضلع نوابشاہ سمیت صوبہ بھر سے کسانوں کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی، ان میں سے کئی کسان دور دراز علاقوں سے ننگے پاؤں سفر کر کے پہنچے تھے۔ اپنے صدارتی خطاب میں مجید سندھی نے کہا ''یہ صوبے بھر کے ہاریوں کی نمائندہ کانفرنس ہے۔ ہماری جدوجہد جاگیرداروں کی ظالمانہ پالیسیوں اور ان کے قبضے کے خلاف ہے۔ زمینوں پر جاگیرداروں سے زیادہ ہاریوں کا حق ہے اور

ہم ہر حال میں یہ حق لے کر رہیں گے"۔(20) انقلاب نے مڈل کلاس کے تذبذب اور اضطراب کو بھی ختم کر دیا تھا۔ وکلا، ڈاکٹر، آرٹسٹ، سائنسدان، دانشور، شاعر، صحافی اور سماج کی سبھی پرتیں جسے حکمران طبقہ عام طور پر اپنے اقتدار کے استحکام کیلئے استعمال کرتا رہتا ہے، اس فیصلہ کن سفر میں پرولتاریہ کے ساتھ شامل اور شریک ہو چکے تھے اور انقلاب کے تیز و تند دھارے کا حصہ بن چکے تھے۔ اس عمل میں سب سے قابل ذکر تحریک صحافیوں کی تھی۔

بائیں بازو کے صحافیوں کی جدوجہد

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) 2 جون 1950ء کو قائم کی گئی، اس کی تشکیل کا فیصلہ دو ماہ قبل کراچی میں ہونے والے کنونشن میں کیا گیا تھا۔ اس کنونشن میں دہلی یونین آف جرنلسٹس کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے۔ اس کنونشن کے سرکردہ لوگوں میں منہاج برنا اور آئی ایچ رشید شامل تھے۔ اس یونین کی تاریخ شاندار جدوجہد سے بھری پڑی ہے۔ اس کا ایک ناقابل فراموش واقعہ 1949ء میں انگریزی اخبار "سندھ آبزرور" کراچی میں ہونے والی 49 دنوں کی طویل ہڑتال ہے۔ اس ہڑتال کو سندھ یونین آف جرنلسٹس نے منظم کیا تھا۔ اس نے اگلے سال پی ایف یو جے کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ بعد ازاں "ٹائمز آف کراچی" کی 1954ء کی ہڑتال، 1966ء میں روزنامہ "انجام" کراچی کی ہڑتال اور 1969ء میں روزنامہ "کوہستان" کی ہڑتال صحافیوں کی اس یونین کی شاندار جدوجہد کا روشن باب ہیں۔ 1959ء میں اس کے مطالبے پر پہلے ویج بورڈ کی تشکیل دی گئی جس نے 1960ء میں پہلے ایوارڈ کی منظوری دی۔ یہ طے کیا گیا کہ ہر پانچ سال کے بعد نیا ویج ایوارڈ لاگو کیا جائے گا۔ مگر دوسرا ایوارڈ 1969ء میں ہی لاگو کیا جا سکا وہ بھی انقلابی تحریک کے بے پناہ دباؤ کی وجہ سے ممکن ہوا۔

ایوب حکومت کے جبر کی وجہ سے پاکستانی صحافت کو شدید دھچکے لگے۔ اس حکومت نے سیاہ ترین قانون "پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس" (ترمیم شدہ) نافذ کر دیا۔ اس کے تحت آزاد اخبارات و جرائد "پاکستان ٹائمز" "امروز" اور ہفت روزہ "لیل و نہار" کو ایک مارشل لا حکم کے تحت سرکاری تحویل میں لے لیا گیا، جو پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے تحت شائع ہو رہے تھے اور جو معروف ترقی پسند میاں افتخار الدین کی ملکیت تھے۔ آمریت نے اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے ایک ادارہ "نیشنل پریس ٹرسٹ" بھی قائم کر دیا جس نے کم و بیش 14 معتبر و معروف روزناموں اور ہفت روزوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ بات

عیاں ہو چکی تھی کہ اس ٹرسٹ کے قیام کا مقصد پریس کو اپنے کنٹرول اور قابو میں رکھنا تھا اور سرکاری وفادار وکاسہ لیس یونینوں کی تشکیل تھا۔ یہ بھی اسی دور میں ہی ہوا کہ نیوز ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (APP) کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اس ایجنسی کو تحویل میں لینے کا مقصد ''ایجنسی کے انتظامی و معاشی امور کو بہتر اور موثر بنانا'' قرار دیا گیا۔ مگر اس کا حقیقی مقصد اپنی مرضی کی خبروں کی تشکیل و تشہیر کرنا ہی تھا۔ پی ایف یو جے نے ان سب آمرانہ اقدامات کی سخت مذمت کی۔ اس نے آرڈیننس کے نفاذ کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی اپیل کرتے ہوئے ،آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی (APNS) اور کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹر (CPNE) جو دونوں مالکان کی ہی تنظیمیں ہیں مگر مختلف اور الگ الگ ہیں، کے ساتھ مل کر ایک جوائنٹ ایکشن کمیٹی تشکیل دی جس نے 9 ستمبر 1963ء کو ملک بھر میں ہڑتال کی۔ بعد میں مالکوں کی ان دونوں تنظیموں نے الگ ہو کر حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور ایک ضابطہ اخلاق طے کرنے پر متفق ہو گئیں۔ تین دہائیوں سے زیادہ عرصے سے یہ دونوں تنظیمیں میڈیا مالکان پر مشتمل چلی آ رہی ہیں۔ یہ ارب اور کروڑ پتی مالکان اپنے محنت کشوں اور صحافیوں کا بے دردی سے استحصال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حکومت نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ اس آرڈیننس کو معطل رکھا جائے گا۔ مگر یہ یقین دہانی جلد ہی جھوٹی ثابت ہو گئی جب روزنامہ ''اتفاق'' پر جو ڈھاکہ سے شائع ہوتا تھا اور اپوزیشن کا ترجمان بنا ہوا تھا، اسی ظالمانہ آرڈیننس کی روشنی میں پابندی لگا دی گئی۔ 60 کی دہائی میں یہ اخبار مشرقی پاکستان کے لوگوں کی آواز بن چکا تھا۔ تفضّل حسین کا ادارتی صفحے پر چھپنے والا کالم ''راج نیتک منچا'' (سیاسی پلیٹ فارم) کو مشرقی بنگال میں بے انتہا عوامی پذیرائی مل رہی تھی۔ جس سے گھبرا کے ایوب حکومت نے 17 جون سے 11 جولائی 1966ء تک اخبار کو سنسر لگاتے ہوئے بند کر دیا۔ اس کے بعد پھر 17 جولائی 1966ء سے لے کر 9 فروری 1969ء تک اسے بند کر دیا گیا۔ تفضّل حسین جو اخبار کا ایڈیٹر تھا، کو کئی بار جیل میں ڈالا گیا۔ ''اتفاق'' کو 10 فروری 1969ء کو دوبارہ شائع کیا جا سکا۔

منہاج برنا نے PFUJ کی تاریخ کے حوالے سے اپنے مضمون میں لکھا ہے ''1968ء آزادی صحافت کیلئے جدوجہد کے حوالے سے یونین کی تاریخ میں اہم ترین سال تھا۔ یہ سارا سال نئے سال کے آغاز تک (جب ملک پر یحییٰ آمریت مسلط ہوئی) ایوب آمریت کے خلاف عوام کی عظیم و درخشاں انقلابی جدوجہد سے مزین تھا۔ گھبرائے اور بوکھلائے ہوئے ایوب نے جبر و تشدد کا وطیرہ اپنایا ہوا تھا۔ پریس پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں لگائی جا رہی تھیں۔ 1966ء میں روزنامہ اتفاق پر پابندی لگانے کے

بعد حکومت نے روزنامہ ''پوربانی'' ڈھاکہ اور ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور کو بھی بند کر دیا۔ صحافیوں کو بغیر مقدمات کے قید کر دیا گیا جبکہ ''نوائے وقت'' لاہور، ''عبرت'' حیدرآباد، ''پاکستان آبزرور'' ''آزاد'' اور ''سنگ باد'' ڈھاکہ کیلئے سرکاری اشتہارات پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے ساتھ حکومت نے جابرانہ ''پریس ایڈوائس'' کا نظام بھی مسلط کر دیا جسے ایک باقاعدہ اور مسلسل حربے کے طور پر بروئے کار لایا جاتا رہا۔ یونین کی فیڈرل ایگزیکٹو کونسل نے کراچی میں اپنی 15 سے 17 دسمبر تک ہونے والی میٹنگ میں اس ساری صورتحال کا جائزہ لیا اور ایک تفصیلی قرارداد مرتب کی گئی جس میں کہا گیا کہ 'حالیہ مہینوں کے اندر ایک جمہوری و تعمیری آلے کے طور پر قومی پریس کا کام کرنا ناممکن بنا کے رکھ دیا گیا ہے۔ صورتحال اتنی بھیانک ہو چکی ہے کہ لوگوں کا پرنٹ میڈیا پر سے اعتماد ہی اٹھ گیا ہے۔ صحافیوں کی سماج کے غیر جانبدار نگران کی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ کونسل اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ قومی پریس نے اس سے زیادہ بھیانک مرحلہ نہیں دیکھا۔ لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی صحافت کی جدوجہد اور اس پر اعتماد کی بحالی اس وقت کا سب سے اہم ترین تقاضا بن چکا ہے۔ یہ ساری صورتحال اس حکومت کی پچھلی ایک دہائی کی جابرانہ پالیسیوں کا نتیجہ ہے''۔

''تاہم کونسل اس پر مطمئن ہے کہ ملک بھر کے صحافیوں کی آزادی صحافت کیلئے جدوجہد کی روایت اب بھی مستعدی سے جاری وساری ہے اور اس کیلئے جو کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے کیا جا رہا ہے۔ پچھلے دو ماہ کے دوران صحافیوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ان کو جھکایا نہیں جا سکتا۔ کئی میٹنگیں، جلسے جلوس، ریلیاں اور مظاہرے اس عرصے میں منظم کیے گئے ہیں۔ 10 دسمبر کو ملک بھر میں کی جانے والی کامیاب ہڑتال نے ان کے حوصلے اور عزم کو ظاہر کیا ہے کہ وہ صحافت کی آزادی کیلئے کسی بھی قسم کی قربانی سے گریز نہیں کریں گے۔ اس حوالے سے کونسل پریس ورکرز، کیلی گرافرز، پروف ریڈرز اور ہاکروں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہے کہ انہوں نے صحافیوں کی اس جدوجہد میں بھرپور ساتھ دیا اور کونسل امید کرتی ہے کہ اتحاد و یگانگت کا یہ عمل مزید فروغ پائے گا''۔

''اس سارے عرصے میں ایک طرف قانون نافذ کرنے والے وحشی اداروں نے صحافیوں تو دوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں کو جسمانی تشدد اور اذیت کا نشانہ بنایا۔ ڈھاکہ، کراچی، لاہور اور پنڈی میں صحافیوں، پریس فوٹو گرافروں یہاں تک کہ ان کے دفاتر کو ٹارگٹ بنایا گیا۔ ڈھاکہ میں مشتعل عوام نے ''مارننگ نیوز'' اور دینک پاکستان'' کے دفاتر کو تہس نہس کر ڈالا۔ یہ دونوں اخبار حکومتی ادارے نیشنل

پریس ٹرسٹ کی ملکیت تھے۔ چٹاگانگ سے روزنامہ ''یونٹی'' اور لاہور پنڈی کے ''کوہستان'' کے دفاتر پر حملے کیے گئے''۔(21)

یحییٰ آمریت کے نافذ ہوتے ہی اس کے وزیر اطلاعات جنرل شیر علی کی نگرانی میں پی ایف یو جے کے خلاف شاید اس کی تاریخ کا بدترین جبر واستبداد شروع کر دیا گیا۔ حکومت کے کاسہ لیس چند سیاستدانوں کی ملی بھگت کے ساتھ، جن کے مالی مفادات حکومت سے وابستہ تھے، یونین کے سرکردہ رہنماؤں کو تذلیل وتضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ اس مہم کیلئے کچھ روزناموں اور لاہور سے چھپنے والے ایک مخصوص ہفت روزے کو استعمال کیا جاتا رہا۔ کردار کشی کی ایک بیہودہ مہم شروع کر دی گئی جس کا مقصد صحافت، ریڈیو، ٹیلیویژن اور دیگر اداروں میں سے ''کمیونسٹوں اور اسلام دشمن عناصر کا قلع قمع کرنا'' قرار دیا گیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ایوب دور میں پاکستان ٹائمز اور امروز کو ریاستی تحویل میں لیے جانے کی وکالت اور حمایت کی تھی۔ ان میں سے ایک سرکردہ لیڈر مجلس احرار سے وابستہ نوابزادہ نصر اللہ نے بیان جاری کر دیا کہ زیادہ تر اخبار نویسوں خاص طور پر نیشنل پریس ٹرسٹ میں کام کرنے والوں کی اکثریت ''سرخوں'' پر مبنی ہے لہٰذا اسلام اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کیلئے لازمی ہے کہ ان سے اداروں کو پاک صاف کر دیا جائے۔(22) ایک ہفت روزہ ''زندگی'' نے تو پی ایف یو جے کے رہنماؤں کے خلاف مسلسل مضامین چھاپنے شروع کر دیئے جن میں مارشل لا حکام سے استدعا کی جاتی رہی کہ ان کو ملازمتوں سے نکال دیا جائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترقی پسند اخبار نویسوں کے خلاف زہر اگلنے والے ان تنخواہ داروں کو کبھی بھی آزادی صحافت اور جمہوری اقدار کی بحالی کیلئے ایک حرف تک لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

پی ایف یو جے کی طرف سے ایک اور طاقتور ہڑتال 15 اپریل 1970ء کو مشرقی ومغربی پاکستان میں کی گئی۔ دس دنوں تک جاری رہنے والی یہ ہڑتال کئی حوالوں سے یادگار ہے۔ مالکوں کی تنظیم اے پی این ایس نے دوسرے ویج بورڈ کا تجویز کردہ ایوارڈ دینے سے صریحاً انکار کر دیا تھا۔ اس کے مطابق پچھلے دس سالوں میں رکی ہوئی اجرتوں میں 35% اضافہ کرنے کا کہا گیا تھا۔ اس وقت ویج بورڈ اور اسکے ایوارڈ کا تعلق صرف صحافیوں سے ہوتا تھا جبکہ اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کے دوسرے محنت کشوں کا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہائی کورٹ میں اپنی پٹیشن ہارنے کے باوجود مالکوں کی تنظیم نے ایوارڈ پر عملدرآمد کرنے سے انکار کر دیا جس پر پی ایف یو جے نے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

چودہ مالکان اور ایڈیٹروں نے بدحواس ہو کر ہڑتال سے کچھ روز پہلے ایک مشترکہ بیان جاری کیا

جس میں ہڑتال کو ''کمیونسٹوں اور بھاشانی'' کی سازش قرار دیتے ہوئے مارشل لا حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ پی ایف یو جے کے خلاف مارشل لا ضابطوں کے تحت فوری کاروائی کی جائے۔ اس ہڑتال کا دوسرا بڑا روشن پہلو یہ تھا کہ اس نے سبھی محنت کش صحافیوں' پریس فوٹوگرافروں اور کیلی گرافروں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا۔ جیسا کہ پہلا اور دوسرا ویج ایوارڈ صرف صحافیوں کیلئے ہی مختص تھا، پی ایف یو جے نے بارہا مطالبہ کیا کہ یا تو باقی محنت کشوں کیلئے الگ بورڈ تشکیل دیا جائے یا پھر ان کو بھی اس کا حصہ بنا دیا جائے۔ اس کی دلیل تھی کہ اخبار و جرائد محض صحافیوں کی محنت سے ہی نہیں شائع ہوتے بلکہ دفاتر کی چھتوں کے نیچے کام کرنے والے سبھی محنت کشوں کی محنت شاقہ اس میں شامل ہوتی ہے۔ اور جنہیں وہی مالک اجرتیں دیتے ہیں۔ اور ان محنت کشوں پر بھی معاشی' سماجی حالات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کا ایک جیسا ہی اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ہڑتال کیلئے جو چار نکاتی ایجنڈا جاری کیا گیا ان میں ایک غیر صحافی محنت کشوں کیلئے عبوری ریلیف کا مطالبہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مالکان کو سبھی محنت کشوں' صحافیوں غیر صحافیوں دونوں کو عبوری امداد دینی پڑ گئی۔

1970ء کی اس ہڑتال کے بعد یونین اور اس سے ملحقہ تنظیموں کے 250 سرکردہ رہنماؤں اور صحافیوں کو وزارت اطلاعات کی ہدایات کے تحت ان کی متعلقہ انتظامیہ نے ملازمتوں سے برخاست کر دیا۔ پاکستان ٹائمز، جنگ، نوائے وقت، امروز، مارننگ نیوز اور مشرق وہ اخبارات تھے جن سے انہیں نکال دیا گیا تھا۔ 25 مارچ 1970ء کو فوج نے روزنامہ ''اتفاق'' کے دفتر کو جلا ڈالا جس کے بعد سے یہ اخبار بند ہو گیا تاہم بعد میں یہ اخبار 21 مئی 1971ء کو حکومتی سرپرستی میں دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ 10 دسمبر کو ڈھاکہ میں معروف صحافی سراج الدین کو ایک مذہبی جنونی نے پہلے اغوا اور پھر قتل کر دیا۔ وہ 1964/65ء میں مشرقی پاکستان یونین آف جرنلسٹس کے صدر رہے جبکہ 1970/71ء میں پی ایف یو جے کے نائب صدر تھے۔ صحافیوں کی شاندار جدوجہد ضیاء آمریت کے دور میں بھی جاری رہی۔ صحافی ان اولین لوگوں میں سے تھے جنہیں آزادی اظہار کا مطالبہ اور جدوجہد کرنے کے جرم میں کھلے عام کوڑوں کی سزا دی گئی۔

دوسری جانب نظریاتی حوالے سے صنعتکاروں اور تاجروں نے رجعتی مذہبی پارٹیوں نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کی خدمات لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ ایوب کی پوزیشن انتہائی کمزور پڑ چکی تھی۔ ان جماعتوں نے واویلا شروع کر دیا کہ جب تک سیاسی نمائندوں کو اقتدار منتقل نہیں ہو جاتا تب تک ایوب

حکومت کو برقرار رکھا جائے۔ یہی وہ پوزیشن تھی جسے ایوب کا وزیر قانون پیش کرتا پھر رہا تھا۔ 2 مارچ 1969ء کو جماعت اسلامی کے قائم مقام امیر میاں طفیل نے بیان جاری کیا کہ ''ایوب حکومت کا اس مرحلے پر جانا غلط ہوگا ایسا ہوا تو یہ گول میز کانفرنس کے فیصلے کی روشنی میں عوام کی خواہشات کی نفی کے مصداق ہوگا''۔(23) یہ گول میز کانفرنس پہلے 26 فروری اور پھر 10 مارچ کو ہوئی جس کے چوتھے مرحلے میں حکومت کا ردعمل سامنے آیا۔ ایوب حکومت اس کانفرنس کے شرکا کے دو مطالبات ماننے پر راضی ہوگئی جس پر اپوزیشن لیڈر بھی متفق ہو گئے؛ ان میں بالغ رائے دہی کی بنیادوں پر الیکشن اور پارلیمانی نظام شامل تھے۔ تاہم ایوب کی طرف سے ان مراعات کی پیشکش نے تحریک کو کسی طور متاثر نہیں کیا اور یہ جاری وساری رہی۔ عوام نے بورژوا جمہوریت کے قیام کے مرحلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انقلاب محنت کش طبقات کو سوشلسٹ تبدیلی کی طرف مائل کر چکا تھا۔ تحریک کو جمہوری خطوط کی طرف لے جانے والی بورژوا قیادت تحریک کی اس نہج کے باعث ختم ہو چکی تھی۔

فوج میں بے چینی

یقینی طور پر اس انقلاب کی وجہ سے مسلح افواج میں پیدا ہونے والے اثرات واضطراب کے بارے میں ناکافی معلومات دستیاب ہیں۔ تاہم 25 مارچ 1969ء کو ایوب کی اقتدار سے رخصتی میں فوج میں پائے جانے والی بے چینی کا بہت بڑا عمل دخل تھا۔ جنرل یحییٰ کی مصالحانہ اور اصلاح پسندانہ پالیسیوں کے پیچھے بھی فوج میں موجود اسی اضطراب کا ہی عمل دخل تھا۔ جنگ شروع کرنے اور پاکستانی قوم کے تعصب کو، خاص طور پر مغربی پاکستان کے اندر جہاں سے بہت بھاری تعداد میں فوج جنگ کیلئے استعمال ہونی تھی، فروغ دینے کے پیچھے ایک بڑی وجہ صرف انقلاب کو پٹڑی سے اتارنا نہیں تھا بلکہ فوج کے اندر پھیلے اضطراب کا قلع قمع کرنا بھی تھا۔ لیکن صورتحال اس قدر پیچیدہ اور کشیدہ ہو چکی تھی کہ حکمران نہ صرف جنگ کرنے بلکہ آدھا ملک گنوانے پر بھی تیار ہو گئے تاکہ ہر حالت میں سرمائے کی حکمرانی کو بچا لیا جائے۔

آگے چل کر ہم مختلف جرنیلوں کی کتابوں سے فوج کے اندر موجود بے چینی کا حوالہ دیں گے جس کا انہوں نے کسی حد تک مبہم انداز میں ذکر کیا ہے۔ فوج کے اندر پائی جانے والی بے چینی کا اندازہ 1970ء کے انتخابات میں کچھ فوجی چھاؤنیوں میں سے بھیجے جانے والے پوسٹل بیلٹس کے ذریعے لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ ہو جانے والی انقلابی سوشلزم کی لہر نے وردی میں موجود محنت

کشوں کے شعور کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ فلپ ای جونز کسی حد تک چھاؤنیوں میں انقلاب کے اثرات کو دریافت کرنے اور اپنی کتاب ''PPP-Rise to Power'' میں پیش کرنے میں کامیاب رہا۔ اس سے ان رپورٹوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ فوج کی افسرانہ پرت نے کسی بھی سیاسی پارٹی کو ووٹ نہیں دیا۔ جی ایچ کیو کو فوج کے الیکشن نتائج سامنے لائے جانے کے بارے میں شدید سکیورٹی اور سیاسی تحفظات تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جی ایچ کیو فوج کو بائیں بازو کے نظریات کی یلغار سے محفوظ رکھنا چاہتا ہو جو الیکشن مہم میں زور و شور سے مرکزی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ لیکن جس قدر بھی نتائج معلوم ہو سکے ہیں ان سے بآسانی پتہ چل جاتا ہے کہ فوج کے اندر پیپلز پارٹی کو وسیع حمایت میسر تھی۔ اسی حقیقت نے ہی بھٹو کو الیکشن کے بعد یحییٰ خان اور مجیب الرحمان کے ساتھ مذاکرات میں اپنی برتری جتانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ الیکشن کے نتائج فوج کے اندر انقلابی اضطراب کی موجودگی اور شدت کو عیاں اور ثابت کرتے ہیں۔

چھاؤنیوں کے انتخابی نتائج (24)

1970ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات

(پوسٹل بیلٹ کے ذریعے ڈالے گئے ووٹوں کی شرح فیصد)

چھاؤنی	مسلم لیگ	پیپلز پارٹی	جماعت اسلامی	دوسری اسلامی جماعتیں	آزاد	دیگر
واہ	3.2	67.2	16.7	5.2	1.9	5.8
جہلم	21.2	61.2	7.1	5.6	1.4	3.6
ائیر فورس بیس ایریا	11.6	37.8	11.9	13.1	25.5	-
سرگودھا کینٹ	8.0	58.3	8.8	8.1	16.9	-

شورکوٹ روڈ	-	67.6	-	22.8	9.6	-
لاہور گیریژن	29.2	58.2	-	-	0.7	11.9
لاہور کینٹ	25.7	64.7	-	-	0.7	8.0
سیالکوٹ لائنز	7.2	72.3	8.4	8.8	3.1	0.2
سیالکوٹ کینٹ	20.8	55.7	8.0	14.6	0.7	0.2
گوجرانوالہ	23.4	67.4	7.5	1.7	-	-
ملتان	-	55.9	-	44.1	-	-

اس انقلابی تحریک کے دوران متعدد ایسے مواقع آئے جب فوج کے افسروں نے مزدوروں، طالبعلموں اور نوجوانوں کے مظاہروں پر فائرنگ کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔ ایسے بھی مواقع تھے کہ جب فوج اور پولیس مظاہرین کے ساتھ کچھ کرنے کی بجائے ایک طرف کھڑی رہی۔ انقلابی مظاہروں اور ہڑتالوں کی حمایت کرنے کے الزام میں کئی درمیانے رینک کے فوجی افسروں کو کورٹ مارشل بھگتنا پڑا۔ یہ انقلابی ابھار اور اس میں جذبوں کی شدت تھی کہ طاقتور فوج کو بھی محنت کشوں کے ان جذبوں کے مقابلے میں پسپائی اختیار کرنی پڑ گئی جو انقلاب کی تڑپ نے ان میں پیدا کردیئے تھے۔ کراچی میں ہونے والے ایسے واقعات میں سے ایک اس کیفیت کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ 1996ء میں مصنف کے ساتھ ایک انٹرویو میں ایک ریٹائرڈ میجر نے جو اس انقلاب کے وقت کراچی میں تعینات تھا، اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط کے ساتھ اس واقعے کے بارے میں بتایا ''میں فروری 1969ء میں کراچی میں تھا مجھے حکم ملا کہ میں کراچی کے ایک مشہور علاقے بندر روڈ (جو کہ اب محمد علی جناح روڈ کہلاتی ہے) میں مزدوروں

کے ایک بڑے مظاہرے کو منتشر کروں۔اس مظاہرے میں کراچی کے مختلف علاقوں کی مختلف صنعتوں سے 50000 سے زائد افراد شریک تھے جس کی قیادت طلبہ اور مزدوروں کے بائیں بازو کے راہنما کر رہے تھے۔ایمپرس مارکیٹ کے قریب 16 کے قریب ٹینک موجود تھے جو اس کا راستہ روکنے کیلئے کھڑے کیے گئے تھے۔یہاں سے مظاہرین کو انتباہی سگنل جاری کیے جا رہے تھے۔میں فوج کے کچھ افسروں کے ساتھ ان ٹینکوں کے آگے یوں کھڑا تھا جیسے کسی جنگی کیفیت میں تھا۔ایک افسر نے مظاہرے کی قیادت سے رابطہ کر کے انہیں سخت فوجی انداز میں منتشر ہو جانے کی ہدایات جاری کیں۔مزدوروں نے صاف انکار کر دیا اور آگے بڑھنے لگے۔مزدور اب زیادہ پر جوش انداز میں سوشلسٹ انقلاب کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے''۔

''فوجی افسر نے ایک بار پھر قیادت سے رابطہ کیا اور اس بار کچھ نرم لہجے میں ان سے منتشر ہو جانے کو کہا۔انہوں نے دوبارہ انکار کر دیا جس پر اس افسر نے سڑک پر چاک سے ایک لکیر کھینچی اور اعلان کیا کہ جو بھی اس لکیر کو عبور کرے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔اس پر تو جیسے مظاہرین کو آگ لگ گئی۔پہلے ہتھوڑی درانتی والے سرخ پرچم اٹھائے ہوئے ،سوشلسٹ فتح تک جدوجہد کی عبارتوں کے حامل بینر ہاتھوں میں لیے ہوئے مظاہرین آگے بڑھتے چلے گئے اور لائن عبور کر لی،اس کے بعد افسر لائنیں لگاتا گیا اور مظاہرین عبور کرتے رہے۔اس نے پانچ لائنیں لگائیں اور مظاہرین ان پانچوں ڈیڈ لائنوں کو عبور کرتے چلے گئے۔اس کے بعد ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کا قافلہ پیچھے کی طرف ہٹنا شروع ہو گیا۔ہم پسپا کر دیئے گئے تھے۔مجھ سمیت سبھی افسروں نے اسے اپنی سبکی محسوس کیا۔مگر ہم کس طرح اپنے ہی عوام' اپنے ہی لوگوں پر گولیاں چلاتے جو اپنی محرومیوں اور ذلتوں سے نکلنے کیلئے جدوجہد کر رہے تھے۔ہمارے پیچھے ہٹنے پر مجمع خوشی سے جھوم اٹھا اور انہوں نے جوشیلے انداز میں تالیاں بجائیں۔محنت کشوں کے چہروں اور جذبوں سے اپنے اتحاد و یگانگت کی ایک تاریخی جھلک واضح اور نمایاں تھی۔فوج کے بڑے اور بھاری بھرکم ٹینک اور ان کی ہیبت،عوام کے اس جوش و جذبے کو شکست دینے اور انہیں منتشر کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی تھی''۔(25)

اس قسم کے واقعات سے صاف عیاں اور ثابت ہوتا ہے کہ انقلاب کا جوش و جذبہ متحد و متحرک عوام کی نفسیات سے موت سمیت ہر قسم کا خوف نکال دیا کرتا ہے۔یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ ریاست کو 1968/69ء کے انقلاب کے دوران ہونے والی طبقاتی جنگ میں پرولتاریہ کے ہاتھوں شکست سے

دوچار ہونا پڑا تھا۔فوجیوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی ان دنوں چھاؤنیوں میں ''بتی بند'' کے بعد ہونے والی سرگوشیوں پر مبنی گفتگو کو یاد کرتی مل جاتی ہے۔وہ اپنے کمانڈنگ افسروں اور جرنیلوں کی طرف سے اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے حقارت آمیز اور ذلت انگیز حاکمانہ رویوں کو یاد کرتے تھے۔اپنی ان سرگوشیوں میں یہ سپاہی سوشلزم کی بھرپور حمایت کیا کرتے تھے۔

طلبہ اور نوجوانوں کی تحریک نے سارے سماج کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔مزدور کارخانوں پر قبضے کیے جا رہے تھے اور ان کی پہیہ جام ہڑتالیں ملک کو جام کیے جا رہی تھیں۔کھیت مزدوروں' کسانوں' مزارعوں اور ہاریوں نے اپنے اپنے جاگیرداروں کی زمینوں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔اور ان کے محلات وعیش گاہوں کو جلایا جا رہا تھا جو انہی کسانوں کے خون پسینے کو نچوڑ کر تعمیر کی گئی تھیں۔کھیتوں کھلیانوں میں جاری اس جدوجہد نے شہروں میں محنت کش طبقے کی جاری جدوجہد کو تقویت بخشے رکھی۔اس زندہ و تابندہ جدوجہد میں فوج کے سپاہیوں اور نچلے درجے کے افسران کی شرکت وشمولیت پاکستان میں استبداد واستحصال کے حامل سرمایہ دارانہ نظام کے تابوت میں آخری تختہ ثابت ہو جاتی۔اگر اس وقت ایسے حالات' ایسی کیفیت میں ایک انقلابی پارٹی ہوتی جو فوج کے جوانوں کی اس حمایت کو منظّم ومتحرک کرتی تو اس تحریک کو انقلابی سوشلزم کی فتح میں تبدیل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔اس سے انسانی تاریخ کا دھارا تبدیل ہو سکتا تھا۔

نوٹس

1۔ٹراٹسکی ،انقلاب روس کی تاریخ،(پاتھ فائنڈر)،صفحہ 17

2۔برٹش پیپرز 69-1958،(آکسفورڈ)،صفحہ 739-734

3۔ برٹش پیپرز 69-1958،(آکسفورڈ)،صفحہ 743

4۔رائے فاکس،20نومبر 1968ء

5۔ برٹش پیپرز 69-1958،(آکسفورڈ)،صفحہ 775

6۔ برٹش پیپرز 69-1958،(آکسفورڈ)،صفحہ 795

7۔مصنف سے انٹرویو،ستمبر 2008ء،لاہور

8۔ایضاً

9۔سٹینلے وولپرٹ،زلفی بھٹو آف پاکستان،صفحہ 126

10۔ایضاً،صفحہ 127

11۔ایوب خان،ایوب خان کی ڈائری 72-1966ء،جمعرات 28نومبر 1968ء،(آکسفورڈ)، صفحہ 287

12۔ایضاً،اتوار 8دسمبر 1968ء،صفحہ 289

13۔ڈاکٹر مبشر حسن،پاکستان کے بحران اوران کا حل،صفحہ 55-49

14۔ ایوب خان،ایوب خان کی ڈائری 72-1966ء،اتوار 9مارچ 1969ء،(آکسفورڈ)، صفحہ 305

15۔ایضاً،جمعرات،20مارچ 1969ء،صفحہ 308

16۔بشیر بختیار،فلپ ای جونز کے ساتھ لیبر ہال میں انٹرویو،نسبت روڈ لاہور،31اکتوبر 1973ء، شائع شدہ ''پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان''،صفحہ 166

17۔فیلڈ مین،بحران سے بحران تک(انگریزی)،صفحہ 261

18۔ پاکستان ٹائمز، 19 مارچ 1969ء

19۔ مصنف سے انٹرویو، ستمبر 2008ء

20۔ سکرنڈ کانفرنس، ہفت روزہ لیل ونہار، کراچی، 19 جولائی 1970ء

21۔ منہاج برنا، پی ایف یو جے ایک تحریک، www.pfuj.info

22۔ ایضاً

23۔ ڈان 3 مارچ 1969ء

24۔ فلپ ای جونز، ''پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان'' (انگریزی)، (آکسفورڈ)، 2003، صفحہ 324

25۔ مصنف سے انٹرویو، جون 1996ء، راولپنڈی

انقلاب کی گواہی

1968-69ء کی انقلابی بغاوت کے سپاہی

انسان اپنی تاریخ خود بناتے ہیں۔لیکن ایسا وہ اپنی مرضی سے نہیں کرتے' وہ جن حالات میں ایسا کرتے ہیں وہ انہوں نے خود منتخب نہیں کیے ہوتے بلکہ ماضی سے وراثت میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماضی کی تمام نسلوں کی روایات زندہ انسانوں کے ذہنوں میں ایک ڈراؤنے خواب کی طرح بسی ہوتی ہیں۔اور جب وہ خود میں اور حالات میں انقلابی تبدیلی لاتے ہیں' کچھ نیا تخلیق کرتے ہیں جو ماضی میں نہیں ہوتا۔تو یہی وہ انقلابی بحران کے حالات ہوتے ہیں جب وہ ماضی کی طاقتوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور ماضی کے نام' جنگی ترانے اور لباس زندہ کرتے ہیں تاکہ عالمی تاریخ کو تبدیل کرنے کے لیے برسرپیکار ہوسکیں''۔(1)

کارل مارکس(1818-1883ء)

1968/69ء کے عظیم واقعات میں لاکھوں مزدوروں' کسانوں اور طالبعلموں نے شرکت کی تھی۔انسانوں کی ایک پوری نسل پاکستان میں اپنی تقدیریں بدلنے کیلئے تاریخ کے میدان میں اتر پڑی تھی جو کامیابی کیلئے لڑی اور ایک انقلاب کیلئے ان سے جو کچھ بن پڑا وہ کر کے دکھا دیا۔پچھلے چالیس سالوں کے دوران بہت سے افراد جو ان زندہ واقعات میں سرگرم رہے اب ہم میں نہیں رہے ہیں مگر ایسے کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جن کے سینے ان زندہ و تابندہ واقعات سے ابھی تک سلگ رہے ہیں اور جن کی

یادیں ان روشن دنوں کی حدت سے منور ہیں۔ہمیں ایسے ہی کچھ ساتھیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان میں سے چند ایک کے ساتھ مصنف کے دیرینہ مراسم بھی ہیں۔ہم نے اس حوالے سے ان دوستوں کے انٹرویو کیے اور ان سے اس انقلاب کی یادیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو شاید اب سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئی۔

عثمان بلوچ (کراچی)

اس انقلاب کے نمایاں ترین ساتھیوں میں سے ایک بڑا نام مزدور رہنما عثمان بلوچ کا ہے،عثمان کو اس عظیم انقلابی تحریک میں بہت نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔کراچی میں مزدوروں کے ایک علاقے سے تعلق رکھنے والے عثمان کو ایک افسانوی کردار کی طرح سے یاد کیا جاتا ہے جس سے اس تحریک کے دوران جرات و بہادری کی بڑی بڑی داستانیں بھی منسوب ہوئیں جن میں سے کچھ کی عثمان نے تردید بھی کی۔ مصنف کے ساتھ اپنے انٹرویو میں اس نے انقلابی تحریک کو انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ یاد کیا۔60 کی دہائی میں وہ ایک نوجوان تھا جس کے والد گریکس سالٹ کمپنی ماڑی پور کراچی میں کام کرتے تھے اور وہاں کی یونین کے لیڈر تھے۔ان کی رہائش لیاری میں تھی جہاں ہزاروں مزدور رہتے تھے جو زیادہ تر غیر روایتی شعبہ جات سے تعلق رکھتے تھے۔اس کے والد اکثر اپنے مزدور ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر یونین کے معاملات اور مالکان کے برتاؤ کے بارے میں اور ان سے تنازعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔جسے یہ نوجوان بڑی توجہ سے سنا کرتا تھا۔

یہ وہ دن تھے جب مزدوروں کے حقوق تسلیم نہیں کیے گئے تھے اور مالکان اپنی مرضی سے سب کچھ کیا کرتے تھے۔اگر کوئی بھی اپنے حقوق کے بارے میں بات یا مطالبہ کرتا تو اسے مادر وطن کا غدار اور بھارت کا ہمدرد قرار دے دیا جاتا تھا۔بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح سے عثمان بھی سوشلزم کے انقلابی نظریات سے متاثر ہو رہا تھا اور مارکسی لٹریچر پڑھ رہا تھا۔اس نے جوانی میں ہی لینن کی دو کتابوں ''ریاست اور انقلاب'' اور ''کیا کیا جائے'' اور دستوفیسکی کی ''جرم و سزا'' کو پڑھ لیا تھا۔اپنی جوانی میں ہی اسے ریاست کے کردار کے بارے میں ادراک حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا۔جس واقعے نے اسے اور کئی دوسرے نوجوانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ 1963ء میں کراچی میں ہونے والی عام ہڑتال تھی جو کئی دنوں تک چلی اور جس میں بھاری تعداد میں مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔اس نے مزدوروں کے شعور

پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔سب سے اہم سبق اس ہڑتال سے جو سامنے آیا وہ ٹریڈ یونین قیادت کی اپنے ہڑتالی محنت کشوں کے ساتھ کی جانے والی غداری تھی۔مزدور اپنے حقوق کیلئے لڑنے کو تیار تھے جبکہ ان کی قیادت ظالم انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات اور مصالحت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔عثمان نے مجھے بتایا کہ اکثر لیڈر حضرات پولیس کی ایک وین میں آئے اور ورکروں سے اپیل کی کہ وہ ہڑتال کو ختم کر دیں۔کچھ ہی دنوں بعد کراچی کے حاکم اعلیٰ ڈپٹی کمشنر نے لیڈروں کے ساتھ کیے گئے سبھی معاہدے یک جنبش قلم منسوخ کر دیئے اور حکم دیا کہ اس کے احکامات پر عملدرآمد یقینی بنایا جائے۔لیڈروں کی مصالحت نے محنت کشوں کے ان پر اعتماد کو ہلا کے رکھ دیا۔اس ہڑتال کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ اسے صنعتی علاقے سے باہر عام لوگوں کے ساتھ نہیں جوڑا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ شہریوں کی حمایت اور ہمدردی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ہڑتال کے بعد ریاستی ادارے اور رائے عامہ مزدوروں کے خلاف ہوتی چلی گئی۔

ایک اور اہم واقعہ جو عثمان نے بتایا وہ 1967ء میں اس وقت پیش آیا جب ایوب خان کراچی شپ یارڈ پر ایک نئے بحری جہاز ایس۔ایس۔شمس کا افتتاح کرنے آنے والا تھا۔صدر پاکستان کے والہانہ استقبال کی بھرپور تیاریاں زوروں پر تھیں۔ایک ظہرانہ بھی دیا جا رہا تھا۔افتتاح سے پہلے شپ یارڈ کے مزدوروں نے اپنی اجرتوں میں اضافے، بونس اور بہتر حالات کار کے مطالبات پیش کر دیئے۔ایوب جو اس وقت مکمل اقتدار کے مزے میں تھا اور فیلڈ مارشل بھی تھا۔اس نے انتہائی رعونت سے مزدوروں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔جس سے مزدور غصے میں آ گئے ،انہوں نے ظہرانے کیلئے سجی دھجی سبھی میزیں الٹ دیں اور کراکری کو اٹھا کے سمندر میں پھینک دیا۔جبکہ انہوں نے ایوب کے خلاف سخت نعرے بازی بھی شروع کر دی۔

عثمان بلوچ کا اہم کارنامہ کراچی اٹامک نیوکلیر پاور پلانٹ (KANUPP) میں یونین کی تشکیل تھا۔ان دنوں میں کینیڈا کے تعاون سے اس کی تعمیر کی جا رہی تھی اور اسے ریاست کے اہم سٹریٹجک ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔چنانچہ یہاں ٹریڈ یونین ازم سمیت ہر قسم کی سرگرمی مجرمانہ قرار پائی تھی۔ان دنوں تعمیراتی کام کے مزدوروں کے ساتھ غلاموں کی طرح کا برتاؤ کیا جاتا تھا اور ان سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ان کو کم اجرتیں ملتی تھیں اور سوشل سکیورٹی کا کوئی نام ونشان تک نہیں ہوتا تھا۔سارے مغربی پاکستان سے تعمیراتی مزدور کام اور روزگار کی تلاش میں کراچی کی طرف کھنچے آ رہے تھے۔یہاں تک کہ منگلا ڈیم پروجیکٹ سے فارغ ہونے والے مزدور بھی ان میں شامل تھے۔کراچی کی

ٹریڈ یونین قیادت کی اکثریت غیر روایتی شعبہ جات کے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے خائف تھی۔عثمان بلوچ نے ایسے مزدوروں کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایااور انہیں ان کے حقوق کے حصول کیلئے رہنمائی فراہم کرنا شروع کردی۔عثمان کے بقول ان دنوں یہ خاصا پیچیدہ اور مشکل مرحلہ ہوتا تھا کہ آپ باہر سے آئے ہوئے مزدوروں کا اعتماد جیت سکیں۔مگران کے ساتھ قریبی رابطے اوران کے فارغ اوقات میں روزانہ کی میٹنگوں کے ذریعے ،عثمان نے نہ صرف ان کا اعتماد جیتا بلکہ ان کے ساتھ ذاتی سرگرم اور پرجوش تعلقات بھی مستحکم کرلیے۔کچھ مہینوں کے اندر ایک یونین کی تشکیل کا مرحلہ طے پا گیا جس کا صدر عثمان بلوچ کو بنایا گیا۔ جب وہ لیبر ڈیپارٹمنٹ اس کو رجسٹر کرانے کیلئے گئے تو ان کو صاف انکار کردیا گیا کہ اس قسم کی نیوکلیئر پاور پلانٹ جیسی حساس جگہوں پر کسی قسم کی سرگرمی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مگر مزدوروں کا اپنا ہی مسئلہ اور ایجنڈا تھا۔انہوں نے 26 اکتوبر 1968ء کی شام پلانٹ پر قبضہ کرلیا۔مزدوروں نے سارے گیٹ بند کرکے گارڈز کے فرائض سنبھال لیے۔سبھی غیر ملکی انتظامی افسران محصور ہوکے رہ گئے۔یہ محاصرہ کئی گھنٹے ہی جاری رہا اور پھر مزدوروں نے رضا کارانہ طور پر اسے ختم بھی کردیا۔یہ ریاست کیلئے ایک واضح انتباہ اور اعلان تھا۔مزدوروں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اس طریقے سے وہ اپنے غصے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کریں گے۔اس محاصرے کے بعد پلانٹ کے 2500 مزدوروں کے سبھی مطالبات لیبر ڈیپارٹمنٹ کی فوری مداخلت سے، رجسٹریشن اور اجرتوں کی بروقت ادائیگی سمیت تسلیم کرلیے گئے۔یحییٰ کے مارشل لا کے بعد فوج نے ہر سٹریٹجک ادارے کا کنٹرول سنبھال لیا تھا مگر اس ادارے کو مارشل لا لگنے سے ایک ماہ پہلے ہی کنٹرول کرلیا گیا تھا۔

10 اکتوبر 1969ء کو عثمان اپنے 62 مزدور ساتھیوں کے ہمراہ MLC (میکڈونلڈ لیٹن کیسٹن) ویسٹ وہارف سے اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ ادارے میں تعمیراتی کام کرنے والوں کو منظم کرنے میں مصروف تھا۔گرفتاری کے وقت وہ انتظامیہ کے ساتھ ان مزدوروں کے مطالبات کیلئے مذاکرات کر رہا تھا۔اسے ایک سال کی سزا سنادی گئی۔اس کی سرگرمیوں اور مقبولیت سے ٹریڈ یونین کی روایتی قیادت اس سے حاسد اور خائف ہونے لگی اور انہوں نے عثمان بلوچ پر کمیونسٹ ہوجانے کا الزام عائد کردیا۔ عثمان بلوچ کے لی مارکیٹ اور گزری کے تعمیراتی مزدوروں سمیت رشید ٹیکسٹائل ملز، ولیکا ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں کے ساتھ بھی گہرے روابط اور تعلقات استوار تھے۔وہ کسی طور کوئی نامی گرامی مزدور لیڈر نہیں تھا

مگر مزدوروں اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ اس کے دکھ سکھ کے رشتوں نے اسے اپنے وقت کا مقبول ترین مزدور لیڈر بنا دیا۔ وہ لینن کا ذوق وشوق سے مطالعہ کیا کرتا تھا اور اس کا مداح تھا، وہ مزدوروں کے روزمرہ کے مسائل پر لیفلیٹس چھاپتا رہتا تھا جس کیلئے وہ فنڈز بھی مزدوروں سے ہی لیتا تھا۔ ہر مزدور پچاس پیسے یا ایک روپیہ فنڈ دیتا تھا، ان دنوں مزدور کی ماہانہ اوسط اجرت پچاس روپے تک ہوتی تھی۔ فنڈز اکٹھا کرنے کیلئے مزدوروں کی ایک خصوصی ٹیم تشکیل دی جاتی تھی۔ اس وقت کراچی میں دور دراز کے مختلف علاقوں اور قومیتوں کے مزدور جمع ہوتے جا رہے تھے جن کیلئے کوئی بھی ایسا ایک پلیٹ فارم موجود نہیں تھا جس پر وہ متحد و منظم ہو سکتے۔ اس وقت ڈھیروں ٹریڈ یونین فیڈریشنز موجود تھیں مگر ان کے بالائی ڈھانچوں کو مزدوروں کے روزمرہ کے مسائل سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ عثمان نے ان سب مختلف رنگوں، علاقوں زبانوں اور قومیتوں کے مزدوروں کو اکٹھا کرنا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لانا شروع کیا۔ شادی بیاہ اور دیگر سماجی تقریبات کے ذریعے طبقاتی جڑت اور ہم آہنگی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ اس نے مزدوروں کو اس بات پر قائل اور آمادہ کیا کہ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شراکت کتنی اہمیت رکھتی ہے، اس سے قطع نظر کہ مزدور کا رنگ، نسل یا قوم کون سی ہے۔

ایک اور اہم قدم جو ترویج دیا گیا وہ سالوں سخت کام کے بعد چھٹی لے کر اپنے گھر جانے والے ہر مزدور بھائی کو الوداع کہنا تھا۔ عام طور پر انتہائی دور افتادہ شمالی علاقہ جات کے مزدور دو تین ماہ کی طویل چھٹی پر جاتے تھے۔ جب وہ واپس کام کیلئے لوٹ کر آتے تو فیکٹری انتظامیہ ان کی سابقہ ملازمت کو شمار کرنے سے انکار کر دیا کرتی تھی اور انہیں نئے سرے سے کام شروع کرنے کا کہتی۔ اس طرز استحصال کی وجہ سے انہیں کم اجرت پر کام دیا جاتا اور وہ اسے قبول کر لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ یوں چھٹی ان کیلئے کام سے ہی چھٹی کا باعث بن جاتی نہ کہ آرام وسکون کا۔ انہیں بہت منت سماجت کے بعد ہی کام پر دوبارہ رکھا جاتا۔ انہیں دور دراز اپنے اہل خانہ کیلئے کمانا پڑتا تھا جبکہ ان کی بچتیں بھی نہ ہونے کے برابر ہوا کرتی تھیں۔

اپنے کسی دور دراز گھر جاتے ساتھی مزدور کو الوداع کرنے کی رسم کی بنیاد عثمان بلوچ نے ڈالی تھی۔ یہ رسم معاشی طور پر مزدوروں کیلئے انتہائی سود مند ثابت ہوئی۔ سب سے پہلے ایک مزدور ساتھی گھر جانے والے مزدور ساتھی کے لیے خالی بوری لے کر آتا تھا۔ جبکہ باقی ساتھی اس جانے والے کیلئے راشن اور دوسری اشیا لے کر آتے تھے۔ ان میں چینی، چائے، گھی، آٹا وغیرہ ہوتا تھا جو یہ مزدور اپنی اپنی

جیبوں سے خرید کر لاتے۔ جبکہ کئی اسے الوداع کہنے ریلوے سٹیشن تک جایا کرتے۔ جب یہ مزدور اپنے گھر جاتے تو انتہائی خوش اور مطمئن ہوتے تھے کہ ہم خالی ہاتھ گھروں کو نہیں جا رہے ہیں۔ یوں وہ زیادہ اطمینان اور خوشی سے گھروں میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ اس کے بعد واپس آنے والے مزدور کو کام پر دوبارہ نہ رکھنا انتظامیہ کیلئے مشکل ہوتا گیا کہ اب مزدور متحد ہو کر اپنا دباؤ بڑھا دیا کرتے تھے۔ جب کوئی مینیجر کسی مزدور کو پہچاننے سے ہی مکر جاتا تھا تو وہ سب بتاتے کہ ہم نے ہی تو اسے بہت سی چیزیں دے کر گھر بھیجا تھا۔ یوں اس سانجھ اور یکجہتی کی وجہ سے وہ اپنے روزگار پر واپس آ جاتا۔ یہ باقی دوسری روایتوں کی طرح ایک انتہائی شاندار اور جاندار ثقافت تھی جو اس وقت رواج پائی۔

ایسی ہی ثقافتی یکجہتی کی ایک اور شاندار مثال زیب تن ٹیکسٹائل ملز میں عمل میں لائی گئی جہاں عثمان مزدوروں کا رہنما تھا۔ اس نے مزدوروں سے چندہ اکٹھا کر کے اس سے جمع ہونے والی رقم سے وہاں چھوٹا سا ایک ہوٹل کھولا۔ مزدوروں کو وہاں مفت کھانا ملتا جس کے پیسے مزدور ہی اکٹھے کرتے تھے۔ مزدور یہاں کھانے پینے کیلئے اکٹھے ہوتے تھے اور یوں یہ جگہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنتی چلی گئی۔ جہاں فارغ اوقات میں چائے اور بحثیں شروع ہو جاتی تھیں۔ قرب و جوار کی فیکٹریوں سے بھی مزدور وہاں آنے لگ گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کنٹین کی اہمیت اس کی جگہ کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ اور ایک وقت آیا کہ ہر وقت درجنوں مزدور وہاں جمع ہوتے تھے جو اپنے روزمرہ مسائل پر بحثیں کرتے' احتجاجی سرگرمیوں کے بارے میں لائحہ عمل بناتے' ثقافتی سرگرمیاں کرتے اور اپنے دکھ سکھ بانٹتے رہتے تھے۔ جب تحریک شروع ہوئی تو یہی جگہ تھی جہاں سے مزدور جمع ہو کر سرگرمیاں مرتب اور منظّم کیا کرتے تھے۔ انتظامیہ نے سر توڑ کوشش کی کہ یہ کسی طرح بند ہو جائے مگر مزدوروں کی شدید مزاحمت کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔

ایک اہم واقعہ فروری 71ء میں اس وقت پیش آیا جب مزدوروں نے ولیکا ٹیکسٹائل ملز پر قبضہ کر لیا، عثمان بلوچ ہی تھا جو اس جدوجہد کا روح رواں تھا۔ مصنف کو اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے عثمان نے کہا کہ شروع میں ہمارا ایسا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا مگر یہ تو مزدوروں کا اپنا ہی جوش جذبہ تھا کہ وہ اس حد تک جانے کو تیار ہو گئے اور ایسا جراتمندانہ قدم اٹھا لیا۔ اس مل میں ایک انتہائی سرگرم مزدور سلیم ہوتا تھا جو مل مالکان کے خلاف جدوجہد میں عثمان کے ساتھ شانہ بشانہ کام کر رہا تھا۔ عثمان کو اندیشہ تھا کہ اسے گرفتار کر لیا گیا تو اس پر بدترین تشدد کیا جائے گا جس کے مزدوروں پر حوصلہ شکن اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ مگر اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک مکمل ہڑتال بھی ابھی غیر دانشمندانہ قدم ہو گی۔ اس دن مل کے اندر اور

باہر پولیس کی بھاری نفری تعینات کی گئی تھی جو سلیم اور دیگر مزدوروں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔عثمان بلوچ چاہتا تھا کہ سلیم کو کسی نہ کسی طرح فیکٹری سے باہر نکال کر کہیں چھپا دیا جائے، یوں وہ گرفتاری سے بچ جائے گا جسے انتظامیہ ہر حال میں شفٹ تبدیلی کے وقت پکڑنا چاہ رہی تھی۔دوسرا رستہ یہ تھا کہ مزدوروں سے اپیل کی جائے کہ شفٹ نہ تبدیل ہو اور پرانی شفٹ ہی کام کرتی رہے۔اس سے پولیس کو اسے گرفتار کرنے میں مشکل آئے گی۔جب شفٹ بدلنے کا وقت آیا تو انتظامیہ نے سلیم سے بحث مباحثہ شروع کر دیا تا کہ وہ کسی طرح اشتعال میں آجائے۔پولیس کی بھاری نفری اور پھر انتظامیہ کی سلیم کے ساتھ تکرار سے مزدوروں میں اشتعال پھیلنا شروع ہو گیا اور انہوں نے گھنٹیاں بجا کر کام روکنا شروع کر دیا۔فیکٹری کے سب دروازے بند کر دیئے گئے اور پولیس کو باہر دھکیل دیا گیا۔

قبضے کے بعد مزدوروں نے سب سے پہلے خام مال کو سنبھالا تا کہ کوئی شر پسند اسے آگ نہ لگا سکے۔مزدوروں کی ایک ہنگامی میٹنگ کی گئی جس میں طے ہوا کہ انتظامیہ یا پولیس کے کسی بھی فرد کو فیکٹری حدود کے اندر نہیں آنے دیا جائے گا۔کچھ ہی بحث کے بعد ایک انتظامی کمیٹی منتخب کر لی گئی جس نے جلدی سے ساری فیکٹری کا کنٹرول سنبھال لیا۔سپر وائزر سٹاف کی چھٹی کرا دی گئی۔مل کو چلانے کیلئے مختلف نوعیت کے اجتماعی فیصلے کیے گئے۔اگر چہ یہ قبضہ چند دنوں تک ہی جاری رہا مگر اس سے ایک بات ضرور آشکار ہو گئی کہ مزدور مل کو چلانے کی مکمل صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔اور یہ بات دیگر فیکٹریوں کے مزدوروں پر بھی عیاں ہو گئی اور ان کیلئے مثال بن گئی۔فیکٹری میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ پرانی پڑی ہوئی مشینری کو بیچنے کی بجائے اس کی مرمت کر کے اسے کام کے قابل بنایا جائے گا۔اسی طرح اکاؤنٹس اور اجرتوں کے بارے میں بھی کئی فیصلے کیے گئے مگر ان پر مکمل عملدرآمد نہیں کیا جا سکا۔اس سارے واقعے میں کوئی ایک چیز بھی گم یا چوری نہیں ہوئی ہاں البتہ جب پولیس فیکٹری میں داخل ہوئی تو کچھ سویٹرز اور جرابیں انہوں نے اٹھالی تھیں۔مزدوروں نے فیکٹری کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو محفوظ رکھا۔کچھ دنوں بعد پولیس، فوج اور انتظامیہ نے مزدوروں سے کنٹرول چھڑانے کیلئے کریک ڈاؤن کر دیا۔سرگرم مزدوروں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا جبکہ باقیوں پر بھی ظلم کا بازار گرم کر دیا گیا۔1972ء میں کراچی میں بے شمار فیکٹریوں پر مزدوروں نے کنٹرول کر لیا تھا۔ان میں سے ایک اہم داؤد ملز پر ہونے والا قبضہ تھا جس کی قیادت عزیز الحسن اور ریاض احمد کر رہے تھے۔حکومت نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں ہتھکڑیاں لگا کر عدالت میں پیش کیا گیا۔یہ قبضہ دس دنوں تک جاری رہا تھا۔

اس تحریک کا ایک اور اہم واقعہ وہ تھا جب عثمان بلوچ نے امریکی وزیر دفاع رابرٹ میکنا مارا کو تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ وہ حیدر آباد میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہا تھا جب عثمان بلوچ اپنے حیدر آباد کے ایک معروف مزدور لیڈر اور ساتھی احسان عظیم کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ میکنا مارا اپنی ساری سامراجی رعونت سمیت بیٹھا ہوا تھا جبکہ پاکستانی افسر شاہی غلاموں کی طرح اس کی آؤ بھگت کیے جا رہی تھی۔ اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے عثمان نے کہا کہ میں نے سوالات کے وقفے کے دوران اس سے امریکی محنت کشوں کی جدوجہد اور شکاگو کے مزدوروں کے حوالے سے سوال کیا جس پر اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں مزدوروں کے حقوق کی مکمل پاسداری ہوتی ہے اور وہ ہر قانونی معاملے میں ان کا ساتھ دیتی ہے۔ عثمان نے اسے کہا کہ بینک آف امریکہ جس کی برانچ پاکستان میں بھی ہے، میں یونین سازی کی اجازت نہیں۔ یہ بات کرتے وقت میں اس کے نزدیک پہنچتا چلا گیا۔ میرے سوال پر میکنا مارا کچھ پریشان سا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ہم یہاں ہر کسی ایرے غیرے کے منہ لگنے نہیں آئے۔ اس توہین آمیز فقرے کا جواب بلوچ نے میکنا مارا کے گال پر ایک تھپڑ کی شکل میں دیا۔ عثمان نے امریکی سامراج مردہ باد کا نعرہ لگایا۔ جس پر بھگدڑ سی مچ گئی۔ عثمان کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ پاکستان کی مزدور تحریک کا ایک اور بڑا واقعہ 6 جون 1972ء کو فیروز سلطان ملز میں پیش آیا تھا جب پیپلز پارٹی کی حکومت برسر اقتدار تھی۔ اس واقعے کو بیان کرتے وقت عثمان بلوچ کی آنکھیں غصے، دکھ اور اذیت سے سرخ ہوتی گئیں اور اس کی سانس تیز ہوتی چلی گئی۔

اس مل کی یونین کی قیادت کنیز فاطمہ کرتی تھی جو عثمان کی شہرت اور مقبولیت سے ہمیشہ خائف رہتی تھی۔ وہ کراچی شپ یارڈ یونین کی بھی لیڈر تھی۔ کنیز فاطمہ نے مصنف کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ مزدور اجرتوں میں اضافے کی مانگ کر رہے تھے۔ جس کے بعد میں نے انتظامیہ سے بات کی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ کوئی اتنا گھمبیر مسئلہ نہیں جس پر اتنا شور مچایا جائے یہ دو دنوں میں ہی طے ہو جائے گا۔ اس گفتگو کے دوران کنیز فاطمہ نے عثمان بلوچ کی مہم جویانہ طبیعت پر اس کی سخت مذمت کی۔

عثمان بلوچ کے مطابق فیروز سلطان ملز کے مزدور اجرتوں کی عدم ادائیگی پر احتجاج کر رہے تھے، اس کے ساتھ ہی انہیں بونس کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیا گیا تھا۔ انتظامیہ مزدوروں کے رویے سے کئی سالوں سے تنگ آئی ہوئی تھی اور انہیں سبق سکھانے اور کچلنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ پولیس کو بلا کر اسے مزدوروں کے خلاف کاروائی کرنے کا کہہ دیا گیا۔

پولیس انسپکٹر نے مزدوروں کو دیکھتے ہی اپنے پستول سے فائرنگ کردی جس سے تین مزدور ہلاک ہو گئے۔انتظامیہ نے دو مزدوروں کی لاشیں لے جانے کی کوشش کی مگر مزدوروں نے ان میں سے ایک شعیب خان کی لاش واپس لے لی اور اسے اٹھا کر پٹھان کالونی لے گئے جو ہزاروں مزدوروں کی رہائشی آبادی تھی۔عثمان بلوچ زیب تن ملز سے ہزاروں مزدوروں کا جلوس لے کر پہنچا جو فیروز سلطان ملز کے مزدوروں کے ساتھ آملا۔اسی دن ہی ٹریڈ یونینز فیڈریشن کی ایک میٹنگ بھی ہونی تھی جس میں مزدوروں کے مطالبات ترتیب دیئے جانے تھے۔پولیس کو اطلاع ملی تو اس نے میٹنگ کی جگہ پر چھاپہ مارا،سبھی ٹریڈ یونین لیڈرز زیر زمین چلے گئے۔

اس کیفیت میں عثمان بلوچ اکیلا ہی رہ گیا جسے مزدوروں کو سنبھالنا تھا۔جب پولیس فائرنگ سے ہلاک ہونے والے مزدور کی لاش پٹھان کالونی پہنچی تو ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جانے والے مزدوروں میں سخت اشتعال اور غم وغصہ پھیل گیا اور انہوں نے احتجاج شروع کر دیا۔عثمان بلوچ نے مزدوروں سے کہا کہ لاش کو ایک جلوس کی شکل میں گورنر ہاؤس لے کر چلا جائے۔مزدور انتہائی جوش میں تھے اور راستے میں جو بھی رکاوٹ نظر آئی وہ اسے تہس نہس کرتے چلے گئے۔کراچی میں جس مزدور کو بھی اس واقعے کا پتہ چلا وہ یکجہتی کیلئے پہنچنا شروع ہو گیا یوں ان کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔جب یہ جلوس پٹھان کالونی سے نکلنے لگا تو پولیس کی بہت بھاری تعداد ان پر بندوقیں تانے موجود تھی۔کالونی سے نکلتے ہی پولیس نے ان پر فائرنگ شروع کر دی اور تین مزید مزدور جاں بحق کر دیئے گئے۔پولیس نے اعلان کیا کہ جو بھی آگے بڑھے گا اسے مار دیا جائے گا۔جلوس میں شریک مزدوروں کا جوش وجذبہ بھی بھڑکا ہوا تھا اور وہ ہر صورتحال سے نمٹنے کیلئے تیار تھے۔جبکہ پولیس کو بھی حکم تھا کہ انہیں کسی طور آگے نہیں بڑھنے دیا جائے۔

پولیس نے جلوس کے شرکا کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں جس پر عثمان نے مزدوروں سے کہا کہ بیس قبریں مزید بھی تیار کی جائیں۔''میرا یہ کہنے کا ایک ہی مقصد تھا کہ مزدوروں کے حوصلے کو بلند رکھا جائے۔ہم حکومت کو پیغام دینا چاہتے تھے کہ ہم بدترین حالات کیلئے بھی تیار ہیں مگر اپنے مطالبات سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ان قبروں کی تصویریں اگلے دن روزنامہ مشرق میں بھی شائع ہوئیں۔

پھر حکومت اور انتظامیہ کے نمائندوں نے ملاقات میں کہا کہ ہم بیٹھ کر بات چیت کے ذریعے آرام وسکون سے معاملات طے کرنا چاہتے ہیں۔اس وقت تک بڑی تعداد میں مزدور گرفتار بھی ہو چکے تھے۔عثمان کے الفاظ میں وہ متذبذب تھا کہ مذاکرات کیلئے جائے یا نہ جائے۔کئی مزدوروں نے عثمان

سے کہا کہ وہ مذاکرات کیلئے نہ جائے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اسے گرفتار کر کے اس پر بدترین تشدد کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔مگر پھر بھی اس نے جانے کا فیصلہ کیا یہ سوچتے ہوئے کہ پیپلز پارٹی کی نئی حکومت آئی ہے اور ایسا نہ ہو کہ میرے کسی اقدام کی وجہ سے یہ اپنے مزدور پرور پروگرام سے ہی دستبردار ہوجائے۔پارٹی کے وزیر محنت ستار گبول کے ساتھ عثمان بلوچ کے مذاکرات شروع ہو گئے جو اسی علاقے لیاری سے ہی منتخب ہوا تھا جہاں عثمان بلوچ بھی رہتا تھا۔

گبول کو مزدوروں کے مسائل و معاملات کے بارے میں آگاہی نہ ہونے کے برابر تھی۔مذاکرات کے دوران عثمان نے جب بھی ایک نیا ایشو سامنے رکھا تو گبول پیٹ میں خرابی کا کہہ کر کھڑا ہوجاتا اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا۔عثمان نے اس سے پوچھا کہ اسے معدے کی زیادہ تکلیف تو نہیں ہے!ایک بار جب گبول ٹائلٹ جانے کا کہہ کر گیا تو اس دوران ایک ملازم چائے لے کر آ گیا اس نے بلوچی زبان میں عثمان کو بتایا کہ وہ افسروں کے سامنے بات کرنے سے ڈرتا ہے،اصل معاملہ یوں ہے کہ ساتھ والے کمرے میں ایک بکاؤ مزدور رہنما موجود ہے جو وزیر موصوف کو رہنمائی اور ہدایات دے رہا ہے۔وہ آدمی دراصل اپنے وقت کا ایک معروف ماؤاسٹ تھا۔عثمان نے وزیر موصوف سے پوچھا کہ کیا حکومت اپنے سوشلسٹ پروگرام پر عملدرآمد کرنے کا ارادہ رکھتی ہے یا پھر مزدوروں کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی پڑے گی۔عثمان نے پٹھان کالونی سمیت مزدوروں کے سبھی رہائشی علاقوں میں بجلی،سڑکوں،پانی،سیوریج سمیت کئی دیگر سہولتوں کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔گبول نے وعدہ کیا کہ سبھی مطالبات تسلیم کر لیے گئے ہیں اور ان پر عملدرآمد ہوجائے گا۔مگر اصلاح پسندوں سے کوئی وعدہ وفا نہیں کیا جاسکا اور یہ سب مذاکرات محض جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کی ایک چال اور ڈھونگ ہی تھا۔

اس واقعہ نے لانڈھی،سائٹ اور کراچی کے دیگر صنعتی علاقوں سمیت حیدر آباد ملتان لاہور اور دوسرے شہروں کے مزدوروں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اگلے ہی دن سبھی ٹریڈ یونین لیڈروں نے عثمان کو مہم جو،خبطی موقع پرست وغیرہ قرار دے دیا،پیپلز پارٹی کے لیڈروں نے اسے کمیونسٹ جبکہ سٹالنسٹوں نے اس پر پیپلز پارٹی کا کٹھ پتلی ہونے کا الزام عائد کر دیا۔پاکستان نیشنل فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کی ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں عثمان کو مزدوروں کے مفادات کا دشمن قرار دیا گیا۔اس میٹنگ سے قبل فیڈریشن بھٹو کی سخت مخالف تھی۔مگر اس واقعے کے بعد ان کی بھٹو کے ساتھ کراچی میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ معاملات طے کیے اور فیصلہ کیا کہ ایک دوسرے کے

ساتھ بھرپور تعاون جاری رکھا جائے گا۔فیڈریشن والوں نے بھٹو سے کہا کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں مگر عثمان کے ساتھ آپ خود بات کریں۔جس پر بھٹو نے عثمان کو دھمکی دی کہ یا تو تم باز آ جاؤ یا پھر انجام کیلئے تیار رہو۔تب سے عثمان اور بھٹو کے مابین قائم طویل تعلق ختم ہو گیا۔

بھٹو، ایوب کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد ایک مقبول لیڈر کے طور پر ابھرنا چاہتا تھا۔وہ ایسے لوگوں کے بارے میں پتہ کرتا رہتا تھا جن کی مزدوروں اور عام لوگوں میں مقبولیت اور شہرت ہو۔عثمان کے بھی پٹھان کالونی،فرنٹیر کالونی اور سائٹ کے رہائشیوں سے تعلقات تھے۔بھٹو عام طور پر کراچی کے مزدوروں کی ہمدردی اور حمایت کے حصول کیلئے عثمان بلوچ سے مشاورت کرتا رہتا تھا۔عثمان نے ہی بھٹو سے کہا تھا کہ وہ لیاری جا کر مزدوروں کے چھوٹے سے ہوٹل، رحمان ہوٹل میں جا کر ان کے ساتھ کھانا کھائے۔اور پھر اس کے بعد وہاں قریب ہی واقع چاکیواڑہ چوک میں سلیمانی چائے والے سے چائے پیئے اور قریبی کھوکھے سے پان لے کر کھائے۔''جب تم اپنا بٹوہ نکال کر پیسے دینے لگو گے تو وہ کہے گا ارے بھٹو صاحب تو اپنا بھائی ہے تیرے سے پیسے نہیں لے گا۔اگر اس نے ایسا کہہ دیا تو سمجھ لو تم مزدوروں کا دل جیتنے میں کامیاب ہو چکے ہو''۔بھٹو اگلے دن اپنی کار میں لیاری کی مٹی سے اٹی گلیوں میں سے ہوتا ہوا اس چھوٹے سے رحمان ہوٹل میں پہنچا اور پھر وہاں سے سیدھا سلیمانی چائے والے کے پاس چلا گیا۔بھٹو نے اس کے ساتھ کھلے دل سے گپ شپ لگائی اور گرمجوشی کے ساتھ اس سے باتیں کیں۔جب اس نے پان اور سگریٹ کے پیسے دینے چاہے تو چائے والے نے اسے کہا کہ چھوڑیں جی آپ تو میرے بھائی ہو۔یوں پہلی بار بھٹو نے لیاری میں اپنے قدم جمائے،تب سے اب تک یہ پیپلز پارٹی کا گڑھ چلا آ رہا ہے۔

ان دنوں محنت کش عام طور پر ہفتہ وار چھٹی کے موقع پر 20/30 کی ٹولیوں میں سینما دیکھنے جایا کرتے تھے۔عثمان نے بھٹو سے کہا کہ وہ اس موقع پر بمبینو سینما جائے جب شو ختم ہو رہا ہو مگر ایسا تاثر دے کہ وہ وہاں سے گزر رہا تھا۔میں بھی اپنے ساتھیوں سمیت وہاں پہنچ جاؤں گا وہاں بہت دوست اکٹھے ہوں گے۔اگلے دن بھٹو شو ختم ہونے کے وقت سینما پہنچا جہاں ایک انگلش فلم لگی ہوئی تھی۔عثمان اپنے تیس ساتھیوں سمیت فلم دیکھنے پہنچا ہوا تھا۔اس نے جیسے ہی بھٹو کو دیکھا تو ساتھیوں سے کہا وہ دیکھو بھٹو آیا ہوا ہے آؤ اس سے ملتے ہیں۔یہ سب بھٹو کے پاس پہنچ گئے اور کچھ ہی دیر میں بھٹو کے پاس ہجوم اکٹھا ہو گیا۔عثمان بلوچ آج بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ صرف سوشلزم ہی سرمایہ داری نظام کی دی گئی محرومیوں کا واحد حل ہے۔

ڈاکٹر مبشر حسن (لاہور)

پیشے کے اعتبار سے انجینئر ڈاکٹر مبشر حسن کا شمار پیپلز پارٹی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ پارٹی کا تاسیسی کنونشن بھی مین بلیوارڈ گلبرگ میں واقع مبشر حسن کے گھر کے لان میں ہی ہوا تھا۔ کنونشن میں شریک کسی کو بھی شاید اس وقت یہ احساس نہیں تھا کہ وہ ایک تاریخ ساز میٹنگ میں شریک ہو رہا ہے جس میں ایک نئی پارٹی تشکیل دی جا رہی ہے کہ جس پارٹی نے پاکستان کی تاریخ میں مختصر ترین وقت میں عوام کی سیاسی روایت بن جانا ہے۔ ان 41 سالوں کے دوران کیا کچھ نہیں بدلا مگر یہ گھر اب تک ویسے کا ویسا ہے۔ اس کا فرنیچر، اس کا طرز تعمیر یہاں تک کہ ڈاکٹر مبشر کی گاڑی ووکس ویگن تک بھی وہی ویسی کی ویسی ہے۔ مین بلیوارڈ کے اس علاقے کا، اس وقت کا شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جو ایک بڑے عظیم الشان پلازے میں نہ ڈھل چکا ہو۔ یہاں جائیدادوں کی قیمتیں انتہاؤں کو پہنچی ہوئی ہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر مبشر کا ہی کمال ہے کہ یہ گھر ابھی تک ویسے کا ویسے قائم رکھا ہوا ہے۔

چالیس سال پہلے کے ان واقعات پر اپنے گھر میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر مبشر حسن نے 1968/69ء کے بارے میں اپنے احساسات سے آگاہ کیا۔ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے وقت انکی آنکھیں جیسے انہی انقلابی لمحات کے جگمگاتے جذبات سے منور ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر مبشر نے بتایا کہ پیپلز پارٹی کی بنیادی دستاویزات کی تیاری میں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگا تھا۔ جنوری، فروری 1967ء میں ریلوے کی ہڑتال نے ایک عجیب وغریب سرشاری کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس ہڑتال نے بائیں بازو میں ایک نئی امید اور امنگ بھر دی تھی۔ اور بہت سے بائیں بازو کے کارکن جو سٹالنزم کی جکڑ بندیوں اور گھٹن سے اکتا چکے تھے ان کو ایک نئے راستے اور وسیلے کی جستجو تھی۔ یہی وہ جستجو اور لگن تھی جو کہ پی پی پی کی تشکیل کا سبب اور اس کے سوشلسٹ پروگرام کی بنیاد بھی بنی۔

ڈاکٹر مبشر حسن کے بقول پارٹی کی بنیادی دستاویز تین مقالوں کی روشنی میں تیار ہوئی تھی جو بھٹو، جلال الدین اکبر رحیم اور ڈاکٹر مبشر نے تیار کیے تھے۔ بھٹو نے ایک نئی پارٹی کی ضرورت، سماجی ومعاشی وسیاسی بحران، رحیم نے سوشلزم کی ضرورت اور سماج کی تبدیلی جبکہ مبشر نے معاشی پالیسیوں کی تفصیلات کو اپنا موضوع بنایا۔ جن میں صحت، تعلیم اور انفراسٹرکچر کو سوشلسٹ تناظر میں پیش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر کے بقول اس تاسیسی کنونشن میں کسی بھی قسم کی کے مذہبی کلمات نہیں پڑھے گئے تھے جو عمومی

طور پر آج پاکستانی سیاست کا وطیرہ ہے۔مبشر نے اس بات پر زور دیا کہ پارٹی کا چیئرمین بھٹو پاکستان کے کسی بھی جاگیردار کے مقابلے میں سب سے زیادہ سرمایہ داروں کے خلاف تھا۔یہی وجہ تھی کہ سارا روایتی بایاں بازو نوخیز سرمایہ داروں کا حمایتی تھا جبکہ بھٹو اور پیپلز پارٹی نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی اور بورژوا حکمرانی اور نظام کے خلاف نعرہ لگایا۔تاہم مبشر حسن سے گفتگو کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ 1967ء کے کنونشن میں شریک تقریباً سبھی شرکا سائنسی سوشلزم اور مارکسی فلسفے و معیشت کے بارے میں بہت ہی کم یا بالکل ہی نہیں جانتے تھے۔اس کے باوجود اس تاریخی کنونشن کے سبھی شرکا سوشلزم کے حوالے سے جوش وجذبے سے معمور تھے۔یہ کنونشن ایوب آمریت کے جبر کے سائے تلے منعقد ہوا تھا اور انتظامیہ نے اس کے انعقاد کو روکنے کیلئے کئی حربے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ہمیں کوئی ہال یا عمارت استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جہاں عام طور پر ایسی تقریبات کی جاتی ہیں۔چاروناچار میرے گھر میں یہ کنونشن کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ کنونشن ایک نیم خفیہ اور پراسرار ماحول میں منعقد ہو رہا تھا کیونکہ حکومت کو اس بات کا تصور تک بھی نہیں تھا کہ آگے چل کر یہ پارٹی کیا کیا کرے گی۔ایوب خان کو خود بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔اس نے اپنی ڈائریوں میں بھی لکھا ہے کہ ''سرکاری پریس کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ بھٹو دو دن کا کوئی کنونشن کر رہا ہے جس میں وہ کوئی نام نہاد پیپلز پارٹی بنانے جا رہا ہے۔رپورٹوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب فضول اور بچگانہ سرگرمی ہے، وہ طلبہ کو غلط استعمال کر رہا ہے۔وہ آگ سے کھیل رہا ہے۔لیکن ہم اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔اگر اس نے حدود سے تجاوز کیا تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی''(2)

اپنی بحث میں مبشر حسن نے ایک اور اہم پہلو کی بھی نشاندہی کی کہ ایوب کے رخصت ہونے کے باوجود تحریک نہیں رکی تھی، جیسا کہ عام طور پر تاثر پایا جاتا ہے۔تحریک نے ہی 70ء کے الیکشن میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔حالانکہ ان کا مقصد ہی یہی تھا کہ تحریک کا رخ موڑ دیا جائے اور الیکشن کی طرف لے جا کر اس کے انقلابی جذبے کو انتخابی جذبے میں تبدیل کر دیا جائے۔الیکشن کے دوران پیپلز پارٹی انتہائی تیزی کے ساتھ پھلتی پھولتی چلی جا رہی تھی۔لاہور جو ان دنوں آج کی نسبت بہت کم آبادی کا حامل شہر تھا، یہاں پارٹی کے 450 تنظیمی یونٹ اس انقلابی دھارے کے نتیجے میں قائم ہو چکے تھے۔بلاشبہ یہ کسی بالشویک پارٹی کے یونٹ نہیں تھے کیونکہ جس تیزی کے ساتھ انقلابی واقعات وقوع پذیر ہوتے چلے

جارہے تھے،ان حالات کی موجودگی میں انقلابی' نظریاتی اور تنظیمی تعلیم وتربیت کے امکانات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم یہ جیسی تیسی ایک کمزور کاوش تھی جس کی کوئی نظریاتی اساس تھی نہ ہی اس کے ڈھانچے لینسٹ جمہوری مرکزیت کے تنظیمی اصولوں پر مبنی تھے۔ نہ تو ان کی پیش بندی کی گئی تھی ، نہ ہی قیادت اس کیلئے تیار تھی اور نہ ہی اسے توقع تھی کہ حالات اس قدر تیزی سے اس نوعیت اور شدت کے ساتھ سامنے آتے جائیں گے۔ سوشلزم کیلئے جوش' جذبہ' امنگ اور ترنگ دیدنی تھا مگر اس کیلئے درکار نظریے کی گہری سمجھ بوجھ اور انقلاب کرنے کی حکمت عملی مفقود تھی کہ جس سے تحریک کو انقلاب میں تبدیل کردیا جاتا۔

ڈاکٹر مبشر حسن کا کہنا تھا کہ لاہور میں قائم ہونے والی پارٹی تنظیمیں سوویتوں کی طرح سے ہی تھیں جو سماج کو چلانے کیلئے عمل میں لائی گئی تھیں۔ انہوں نے جرائم کے کئی مراکز جن میں جوئے خانے کے اڈے وغیرہ شامل تھے کی نشاندہی اور قلع قمع کیا اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے اپنے علاقوں کے اندر سماجی نظام چلانے کی ذمہ داری بھی سرانجام دینا شروع کردی تھی۔ ڈاکٹر مبشر نے کہا کہ کم از کم لاہور کی حد تک تو ایسا ہی کیا گیا تھا کیونکہ وہ خود یہاں قیادت کررہا تھا۔ کمیٹیوں نے کئی ٹھگوں اور دیگر جرائم پیشہ گروہوں کا پتہ چلایا اور پھر شہریوں کی مدد ومعاونت سے ان کی سرگرمیوں اور تشدد کی کاروائیوں کا سدباب بھی کیا۔ ملاؤں کا ان کمیٹیوں میں کوئی سماجی کردار نہیں تھا۔ ان کمیٹیوں کو لاہور میں سبھی مزدوروں کے کوارٹروں اور پسماندہ علاقوں میں موثر کنٹرول حاصل تھا۔ ان کمیٹیوں کو ایک طرف پولیس سمیت دیگر ریاستی اداروں کے جبر واستحصال کو روکنے کا ذریعہ بنایا گیا تو دوسری طرف یہ نظم ونسق کے نظام کو سنبھالنے اور ضروری اشیا کی مناسب بروقت فراہمی کا کام بھی سرانجام دے رہی تھیں۔ یہی کمیٹیاں ہی بعدازاں الیکشن مہم کے دوران پیپلز پارٹی کی سرگرمیوں اور الیکشن میں اس کی شاندار کامیابیوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئیں۔ انہی کی بدولت پاکستان کی تاریخ کے واحد غیر متنازعہ نتائج سامنے آئے۔ اس الیکشن میں بڑے بڑے نامی گرامی اور کبھی بھی شکست نہ کھانے والے امیدواروں کو پیپلز پارٹی کے نچلے اور درمیانے طبقے کے امیدواروں نے تاریخی شکست سے دوچار کردیا۔

بھٹو کو سننے کیلئے لاکھوں لوگ جمع ہوجاتے تھے۔ دور دراز سے بھی اس کے جلسے میں شریک ہونے کیلئے لوگ آتے تھے وہ اس کی تقریریں سننے کیلئے بیتاب ہوتے ،ان دنوں یہ تقریریں دن بدن انقلابی ہوتی جارہی تھیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن خود بھی اس الیکشن میں لاہور کے ایک شمال مشرقی حلقے سے امیدوار

تھا جس کی 92% آبادی پرولتاریہ پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تر ریلوے مزدور اور ان کے اہل خانہ شامل تھے۔اس حلقے سے مبشر حسن نے 87000 ووٹ لے کر کامیابی حاصل کی تھی جبکہ جماعت اسلامی کے امیدوار نے 15000 ووٹ اور سٹالنسٹ امیدوار کو صرف 4000 ووٹ مل سکے' وہ بھی ایک ایسے حلقے سے جو پرولتاریہ کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔ڈاکٹر مبشر حسن نے ملک میں سب سے زیادہ ووٹ لیے تھے اور وہ پیپلز پارٹی کے اندر سوشلزم کی نمائندگی اور علمبرداری کرنے والوں کا سرخیل تھا۔

ذاکر حسین (مالاکنڈ)

پشتونخواہ میں جس کا برطانوی راج سے لے کر ابھی تک سرکاری نام این ڈبلیو ایف پی چلا آ رہا ہے' انقلاب کی طوفانی لہریں اتنی ہی شدید تھیں جتنی کہیں اور۔کامریڈ ذاکر اس وقت سکول جانے والا ایک طالبعلم تھا جب 1968/69ء کا انقلاب پھٹ پڑا تھا۔ذاکر پر ان واقعات نے گہرے اثرات مرتب کیے اور اسے چھوٹی عمر میں ہی انقلابی کر دیا۔کچھ ہی سالوں کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے یوتھ اینڈ سٹوڈنٹس ونگ پشتونخواہ کا صدر بن گیا۔مصنف کے ساتھ اپنی ملاقاتوں میں ذاکر نے ان واقعات کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا کہ جن میں پشاور' مردان سمیت کئی شہروں اور علاقوں میں طلبہ اور نوجوانوں نے اس انقلابی تحریک میں جوش جذبے اور ولولے سے شرکت کی تھی۔سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس تحریک نے اپنا زور یونیورسٹیوں' کالجوں اور سکولوں میں دکھایا جیسا کہ باقی ملک میں بھی ہوا تھا۔لیکن پھر جلد ہی نئے اور نوخیز پرولتاریہ نے بھی تاریخ کے اس میدان میں قدم رکھ دیا۔کئی فیکٹریوں میں ہڑتالیں اور قبضے ہونے شروع ہو گئے۔ان میں اہم مردان کی شوگر ملز، بنوں ملز، کالونی ٹیکسٹائل ملز نوشہرہ، چارسدہ پیپر اینڈ شوگر ملز سوات کی سلک پروسیسنگ فیکٹریز سمیت پشاور اور مالاکنڈ کی کئی ملیں شامل تھیں۔1972ء میں یہاں پولیس کی ہڑتال ہوئی جس نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ملک کے ایک حساس صوبے میں قانون نافذ کرنے والے ادارے نے قانون کے خلاف ہی ہڑتال کر دی تھی۔مختلف بار ایسوسی ایشنیں، انجینئر اور سماج کے کئی دوسرے شعبے بھی اس انقلابی تحریک میں بھرپور شریک ہو چکے تھے۔اس خطے میں چلنے والی کسان تحریک (1960ء کی دہائی کے آخر اور 1970ء کی دہائی کے شروع میں) طبقاتی ابھار کے تاریخی عمل کا فطری نتیجہ تھی۔اس تحریک کے پس پردہ عناصر سماجی ترقی کے عمل میں پوشیدہ تھے جو سرمایہ داری کے تحت پرانے سماجی بندھنوں کے خاتمے اور نئی سماجی شکلیں

قائم کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ یہ سماجی عمل پرانے جاگیرداری ڈھانچوں کو توڑنا چاہ رہا تھا۔ زمینوں کے مالکان اپنے مزارعین پر بدترین تشدد کرتے چلے آرہے تھے۔ یوں یہ سماجی تضادات پھٹنا شروع ہو چکے تھے۔ اگرچہ یہ تحریک کسی طور کسان اقتدار حاصل نہیں کر سکی تھی اور ردانقلابی رجعتی میلانات کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ مگر یہ تحریک بڑی حد تک سماجی ڈھانچے میں نئی بنیادی تبدیلیوں کو ضرور جنم دے گئی تھی۔ اس کی وجہ سے جاگیرداروں کا زمین پر اجارہ ختم یا کمزور ہو گیا اور نئی سماجی پرتیں بھی زمین کی مالک بن گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی وجہ سے بیگار یا جبری مزدوری کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح یہ عرصہ قدیم سے چلی آرہی قبیح رسم ''بندھک مزدور'' کو بھی ختم کرنے میں کامیاب رہی۔ ماضی کی سبھی وہ جابرانہ روایتیں جو کسانوں کا مقدر بنی ہوئی تھیں ان کو اس تحریک نے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ جس کی وجہ سے کسانوں کو کچھ سکھ چین کا زمانہ میسر آ گیا۔ برطانیہ کے سامراجیوں نے اپنے نوآبادیاتی تسلط کے دوران ایک جاگیردار اشرافیہ تشکیل دے کر اپنے استبداد کو تقویت دی تھی۔ سامراج سے نوآبادیات کی طرف کے سفر میں ایک نئی طرز کی گماشتہ بورژوازی (کمپراڈور بورژوازی) پیدا ہوئی، جو اپنی طرز، نوع اور تقاضوں کی وجہ سے رجعتی تھی، جسے یہ سب ان کے آقاؤں کی طرف سے تفویض کیا گیا تھا۔

جاگیردارانہ طرز کے پیداواری تعلقات کی وجہ سے پختون علاقہ سخت گیر ظالمانہ ثقافت و مزاج کی گرفت میں چلا آرہا تھا۔ زائد پیداوار اور پھر تاریخی ترقی کی وجہ سے تجارت نے قدم رکھا اور یوں سماجی ترتیب میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ جس سے کسانوں کی نسلوں سے رکی ہوئی نفسیات میں بھی ارتعاش اور بدلاؤ آنا شروع ہو گیا۔ پاکستان کے دیگر طبقات کی طرح سے پختون کسان بھی جدوجہد میں بھرپور شریک ہوئے۔ اگر ایک سائنسی بنیادوں کی حامل انقلابی قیادت اور قوت موجود ہوتی تو کسانوں کی یہ شاندار جدوجہد عظیم اور تاریخی مقاصد کو یقینی طور پر حاصل کر سکتی تھی۔ موضوعی عنصر کہیں موجود ہی نہیں تھا۔ اس تحریک نے نئی اور چھوٹی زمینداری تو پیدا کر دی مگر اس نے بھی سوائے مالکان کی ایک نئی پرت پیدا کرنے کے کچھ نہیں کیا۔ اور اس سے زرعی سماج میں کوئی انقلابی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکی۔ تحریک پشتونخواہ کے دیہاتی علاقوں پر ہی مشتمل رہی۔ شہروں کے صنعتی مزدور طبقے یہاں تک کہ درمیانے طبقے سے اس کی جڑت بہت محدود رہی۔ اس علاقے میں دیہی سماج کا طبقاتی ڈھانچہ چار طبقات کا حامل تھا' زمین کے مالکان، کسان' کھیت مزدور اور ٹھیکے پر زمین کاشت کرنے والے۔ تحریک کی قیادت نے محض کسانوں تک ہی اپنی توجہ محدود رکھی جبکہ دیگر استحصال زدہ زرعی پرتوں اور شہری مزدوروں کو چھیڑا بھی نہیں گیا اور انہیں

الگ تھلگ رکھا گیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ مفادات کے ٹکراؤ نے تحریک کے اپنے اندر ہی نازنخرہ اور بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔اور دیہی مزدور طبقات سمیت کوئی بھی اتحادی پرت اس تحریک کے ساتھ نہیں جوڑی جا سکی۔ ان فطری اتحادی طبقات کے درمیان فاصلے اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔اور آپس میں تال میل کی ذرا برابر بھی گنجائش نہیں بچی۔جس کی وجہ سے کسان تنہا رہ گئے اور جغرافیائی اعتبار سے یہ کسان تحریک بہت ہی محدود علاقے تک سمٹ کے رہ گئی۔یہ تحریک چارسدہ، مالاکنڈ، سوات کے کچھ علاقوں اور مردان کے علاقے رستم تک ہی رہی۔جغرافیائی محدودیت اور طبقاتی تنگ نظری کی وجہ سے اس میں ایک اور خرابی در آئی وہ یہ کہ رجعتی قوتیں اس میں شامل ہو گئیں اور ان کی وجہ سے قبائل کے آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے۔مثال کے طور پر ہشت نگر چارسدہ میں اسے احمد زئی اور مہمند قبائل کے مابین لڑائی کا نام دے دیا گیا۔مالاکنڈ میں یہ یوسف زئی اور روغانی قبائل کی لڑائی قرار پائی۔جبکہ مردان میں یہ یوسف زئی اور مہمند قبائل کا جھگڑا بن گیا۔اور پھر یہ تحریک ملک کے دوسرے حصوں سے بھی کٹی رہی۔

اگرچہ پشتونخواہ میں چلنے والی یہ کسان تحریک ابھی تک فاتح نہیں ہوئی تاہم اس نے بہت ہی مثبت تبدیلیوں کا ایک سلسلہ ضرور جنم دیا۔یہ 1968/69ء کی تحریک کا ایک انتہائی اہم حصہ تھی اور یہ مستقبل کیلئے علاقے اور خطے میں امید اور جدوجہد کی شاندار علامت بن کے سامنے آئی۔اپنی تمام تر کمزوریوں خامیوں کے باوجود کسانوں اور جاگیرداروں کے مابین شدید اور خونریز لڑائیاں ہوئیں۔مالاکنڈ ضلع میں ایک کسان لیڈر صوفی محمد صادق اور ایک جاگیردار مکرم خان اس لڑائی میں مارے گئے۔ہشت نگر میں ایک بہت بڑے زمیندار واوا خان کو شکست فاش ہوئی۔اس کی زمینوں پر کسانوں نے قبضہ کر لیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔اسی طرح سے دیر اور سوات میں سینکڑوں ایکڑوں کے مالکان جنہیں خان کہا جاتا تھا کی زمینوں پر کسانوں نے قبضے کر لیے تھے۔

منو بھائی (راولپنڈی)

معروف کالم نگار اور ڈرامہ نویس منو بھائی 1968/69ء میں راولپنڈی پریس کلب کے جنرل سیکرٹری تھے۔منو بھائی پچھلے پچپن سالوں سے ملک بھر کے معتبر جریدوں اور اخبارات میں مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔منو بھائی نے اس تحریک میں حکومت کے خلاف کئی احتجاجی مظاہرے منظم کیے تھے۔منو بھائی نے اس تحریک میں پنڈی کینٹ کے شروع ہونے والے راستے پر طالبات کے دھرنے سے متاثر ہو کر اپنا

مشہور و معروف ڈرامہ ''جلوس'' لکھا تھا۔ یہ طالبات نالہ لئی کا پل عبور کر کے چھاؤنی کو جانا چاہ رہی تھیں مگر پولیس نے انہیں روکے رکھا۔ طالبات چھ گھنٹوں تک دھرنا دیے بیٹھی رہیں بعدازاں بیگم نصرت بھٹو وہاں پہنچیں اور وہ طالبات کے جلوس کی قیادت کر کے چھاؤنی داخل ہوگئیں۔ جب منو بھائی لیاقت باغ میں پی ایف یو جے کے اجتماع کی تیاری میں مصروف تھے تو اس وقت کے وزیر اطلاعات جنرل شیر علی نے رابطہ کر کے دس ہزار روپے کی رشوت کی آفر کی جو شکریے کے ساتھ ٹھکرا دی گئی۔ اس گستاخی پر منو بھائی کا ملتان تبادلہ کر دیا گیا۔ جب مصنف نے منو بھائی سے 1968/69ء کی یادداشتوں کے بارے میں بات کی تو منو بھائی جیسے جذبوں کی کسی سرشار دنیا میں پہنچ گئے۔ منو بھائی نے بتایا کہ لاہور کے مال روڈ پر آئے روز لاکھوں لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ مردوں نے سرخ پگڑیاں تو عورتوں نے سرخ دوپٹے پہنے ہوئے ہوتے تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں سرخ دوپٹے اور پگڑیاں اس سے پہلے اور اس کے بعد میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔ ان دنوں کے اہم واقعات سناتے ہوئے منو بھائی نے لاہور اچھرہ میں ایک اجتماع کا احوال سنوایا جس میں جماعت اسلامی کا امیر مودودی اپنے ایک ہاتھ میں روٹی اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھام کر لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ تمہیں کیا چاہیے روٹی یا قرآن؟ لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے گھروں میں قرآن تو ہے مگر روٹی نہیں' اس لیے ہم روٹی کو ووٹ دیں گے۔

بھٹو کو پھانسی ہو جانے کے بعد منو بھائی نے بیگم نصرت بھٹو سے روزنامہ مساوات کیلئے انٹرویو لیا تھا۔ نصرت بھٹو نے بتایا کہ جب وہ بھٹو سے آخری بار ملنے موت کی کال کوٹھڑی میں گئی تو بھٹو نے مجھ سے پوچھا کہ میری پارٹی میرے لیے کیوں کچھ نہیں کر رہی؟ جس پر میں نے جواب دیا کہ ذوالفقار تم کون سی اپنے پیچھے کوئی بالشویک پارٹی چھوڑ کر آئے ہو کہ وہ تمہارے لیے کچھ کرے!

ایک اور اہم دلچسپ واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے منو بھائی نے کہا کہ ہم 70 کی الیکشن کمپین کے سلسلے میں بھٹو صاحب کے ساتھ جی ٹی روڈ کے ذریعے لاہور سے جہلم کی طرف جا رہے تھے، مصطفیٰ کھر (سابق گورنر پنجاب) کار چلا رہا تھا جبکہ حنیف رامے (سابق وزیر اعلیٰ پنجاب) میرے ساتھ پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ جب کار گجرات پہنچی تو فیکٹریوں کے مزدوروں کے ایک جلوس نے بھٹو کے قافلے کو روک لیا، ان مزدوروں نے اپنی قمیصیں اتاری ہوئی تھیں، ان میں سے کچھ تپتی ہوئی سڑک پر لیٹ گئے۔ انہوں نے بھٹو سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ تقریر کرے۔ بھٹو ہچکچا رہا تھا کیونکہ پہلے ہی ہمیں جہلم پہنچنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ مگر مزدوروں کا جوش و جذبہ دیکھتے ہوئے کھر نے بھٹو سے کہا کہ ان کے ساتھ کچھ بات کر ہی لی

جائے۔بھٹو نے ایک انتہائی جوشیلی انقلابی تقریر کرتے ہوئے مزدوروں کو ولولے سے بھر دیا۔بھٹو تقریر کر کے واپس کار میں آیا اور قافلہ جہلم کی طرف روانہ ہونے لگا تو مزدوروں نے ہماری کار کے بونٹ پر اپنی ہتھیلیاں بجاتے ہوئے سوشلزم سوشلزم کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ جب نعرے لگاتے ہوئے یہ مزدور گزر گئے تو کچھ لمحوں بعد بھٹو نے فرنٹ سیٹ سے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا ''سوشلزم ہمارے لیے معنی بے شک نہ رکھتا ہو' لیکن ان کے لیے یہ اہم معنی رکھتا ہے!

معراج محمد خان (کراچی)

1960ء کی دہائی کی ابھرنے والی قیادت میں سے ایک اہم نام معراج محمد خان کا ہے جس کا طلبہ سیاست میں بہت معتبر و موثر مقام تھا۔ایوب دور میں نوجوانوں کی سیاسی جدوجہد کے حوالے سے معراج کا نام علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کتاب کے سلسلے میں مصنف کے ساتھ اپنی ملاقات اور گفتگو کے دوران معراج محمد خان نے کہا کہ میں تو اتنے بڑے طوفانی واقعات کا محض ایک چھوٹا سا قطرہ تھا مگر ایک ایسا قطرہ جو کانٹوں پر ناچنے کا دلدادہ تھا۔

معراج کی عمر اب بڑی حد تک ڈھل چکی ہے، پھیپھڑوں کے ساتھ نہ دینے کی وجہ سے اب زیادہ دیر بات کرنا بھی مشکل ہو چکا ہے اور سرگرمیوں میں شرکت بھی محال ہو چکی ہے۔جب معراج گفتگو کیلئے بیٹھنے والے کمرے میں آئے تو سانس بھی زور زور سے ہی چل رہی تھی اور کھانسی بھی شدید تھی۔معراج کا یہ کمرہ اس کی بڑی بڑی تصاویر سے سجا ہوا تھا جس میں وہ پاکستان کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے لاکھوں کے عوامی اجتماعات سے خطاب کر رہا تھا۔گفتگو کے خاتمے کے وقت معراج محمد خان نے کہا کہ میں تو سوچ کر آیا تھا کہ بس پندرہ منٹوں کے اندر ہی ہماری بات ختم ہو جائے گی مگر جب میں نے اپنی یادداشت میں سے 1968/69ء کے تاریخی لمحات اور واقعات کو کھنگالنا شروع کیا تو انہوں نے مجھ میں اتنی طاقت اور حرارت پیدا کر دی کہ میں مسلسل پانچ گھنٹے بول گیا۔

میں ایک چھوٹا سا بچہ اور ہائی سکول کا طالبعلم تھا جب کوئٹہ سے کراچی آیا تھا۔فٹبال کھیلنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا، مگر میں ایک بہت اچھا مقرر بھی تھا۔ میں نے اپنے جاندار انداز کی وجہ سے کراچی بھر کے کالجوں کے طلبہ کے مابین ایک تقریری مقابلہ جیتا تھا۔اس مقابلے کے وقت کمیونسٹ پارٹی کے کچھ ارکان بھی وہاں ہال میں موجود تھے جنہوں نے مجھے پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔اس کے بعد میری

کمیونسٹوں کے ساتھ بحثیں شروع ہوگئیں۔ یوں انقلابی سیاست کی طرف میرا سفر شروع ہوگیا۔

معراج محمد خان نے NSF کو طلبہ حقوق کی ایک پرجوش نمائندہ تنظیم میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ 1957ء کے یونینوں کے الیکشن میں NSF نے کراچی کے 90% کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کامیابی حاصل کرلی۔ ڈاؤ میڈیکل کالج اور ڈی جے سائنس کالج NSF کے مضبوط گڑھ تھے۔ کراچی کے دیگر معروف طلبہ قائدین میں حسین نقی، فتحیاب علی خان، خرم مرزا، نفیس صدیقی، علی مختار رضوی، امیر حیدر کاظمی، سید سعید حسن، آغا جعفر، وحید بشیر، نواز بٹ، جوہر حسن اور علی یاور شامل تھے۔ معراج محمد خان 1967ء تک NSF کا صدر رہا۔ جس کے بعد رشید حسن خان کو 1970ء میں لاہور میں ہونے والی کونسل میٹنگ میں NSF کا صدر بنا دیا گیا جس کا تعلق ڈاؤ میڈیکل کالج سے تھا۔ معراج محمد خان نے بعد ازاں قومی سیاسی دھارے میں آنے کا فیصلہ کیا اور پارٹی کی ہدایات کی روشنی میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوگیا جو اس وقت ایک بڑی سیاسی قوت کے طور پر سامنے آچکی تھی اور جب بھٹو ایک بڑے مقبول عام سیاسی رہنما کے طور پر ابھر چکا تھا۔ 70ء کے الیکشن میں بھٹو نے معراج خان کو لالوکھیت کراچی سے امیدوار بنا دیا جہاں وہ عوام میں احترام کا حامل ایک مقبول لیڈر تھا۔ ایوب حکومت اکثر و بیشتر معراج کے پیچھے پڑی رہتی تھی کہ اسے گرفتار کرلیا جائے اور وہ اسی علاقے میں آکر چھپ جاتا تھا۔ مصنف کو معراج خان نے بتایا کہ لالوکھیت میں گرفتاری سے بچنے کیلئے بھاگتے وقت وہ کسی بھی کھلے دروازے سے کسی گھر میں داخل ہوتا تو گھر والوں کو صرف اتنا بتاتا تھا کہ میں معراج محمد خان ہوں اور پولیس میرے پیچھے ہے۔ تو وہ اس کے ساتھ انتہائی عزت احترام سے پیش آتے اور بچاتے ہوئے ادھر اُدھر سے نکلنے کا رستہ بھی بتا دیتے۔ جب پولیس اس گھر میں داخل ہوتی تو ان پر برس پڑتی اور ان پر تشدد کرتی مگر کوئی بھی میرے بارے میں پولیس کو کچھ بھی نہیں بتاتا تھا۔

وہ اس حلقے سے بھاری اکثریت کے ساتھ الیکشن جیتنے والا متوقع امیدوار تھا مگر اس دوران وہ جیل میں تھا تو کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر اسے ملنے آیا اور حکم دیا کہ بھٹو کو پارٹی کا ٹکٹ واپس کر کے الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا جائے۔ معراج خان کے بقول وہ اس فیصلے پر انتہائی حیران ہوا۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ میں پارٹی کے ڈسپلن کی پابندی کروں گا مگر مجھے اس فیصلے سے اختلاف ہے۔ بھٹو نے پھر ایک اور غیر معروف آدمی کو وہ ٹکٹ دے دیا جو جماعت اسلامی کے امیدوار سے صرف پانچ ہزار ووٹوں کے معمولی فرق سے ہار گیا۔ معراج محمد خان کو بھٹو نے کابینہ میں شامل کیا تھا مگر کسی وزارت کے بغیر۔

بعدازاں NSF اور معراج محمد خان دونوں بھٹو حکومت سے اس وقت باہر ہو گئے جب بھٹو نے 1973ء میں اپنے سوشلسٹ ایجنڈے پر مصالحت شروع کر دی اور حکومت مزدور دشمن پالیسیوں پر اتر آئی۔ کچھ سالوں کے بعد بھٹو سے اختلاف ہو جانے کے بعد معراج محمد خان نے پیپلز پارٹی چھوڑ دی اور قومی محاذ آزادی کے نام سے اپنی جماعت بنالی اور ساتھ ہی NSF کا اپنا ایک دھڑا بھی قائم کر لیا۔ اور یوں طلبہ سیاست کا نامور و درخشندہ ستارہ سیاسی تنہائی کا شکار ہوتا چلا گیا اور دوبارہ کبھی پہلی سی شہرت اور ساکھ حاصل نہیں کر سکا۔ 7 نومبر 1967ء کو NSF کے طلبہ کی پولیس کے ہاتھوں شہادت کے ذکر پر معراج بہت ہی جذباتی ہو گئے۔ اس واقعہ نے 1968/69ء انقلاب کی بنیاد رکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ ہم تو اس تیاری میں لگے تھے کہ پنجاب میں مزاحمتی تحریک کو تیز کیا جائے۔ ہمیں بھی توقع نہیں تھی کہ پولیس فائرنگ سے نوجوان طالب علم کی ہلاکت اتنے بڑے ایک انقلاب کو جنم دینے کا باعث بن جائے گی۔

پرویز ملک (اٹک)

کامریڈ پرویز ملک 1968/69ء کے انقلاب کے دنوں میں کیمبل پور، جو آج کل اٹک کہلاتا ہے، میں NSF کے نہایت سرگرم کارکن تھے۔ مصنف کو اس حوالے سے انٹرویو دیتے ہوئے کامریڈ ملک نے بتایا کہ جب 1968ء میں ایوب نے ''دس سالہ جشن ترقی'' منانے کا اعلان کیا تو NSF نے اس کے مقابلے میں ''دس سالہ عہد تنزلی'' منانے کا فیصلہ کرتے ہوئے مطالبات کا ہفتہ منانے کا اعلان کر دیا۔ 7 نومبر کے واقعے نے تو واقعات کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کو جنم دے دیا۔ ہر طرف غصے اور بغاوت کا اظہار شروع ہوتا چلا گیا۔ کوئی ایک شہر قصبہ یا دیہات ایسا نہیں تھا جہاں لوگ سڑکوں پر نہ نکل آئے ہوں۔ ایوب کے خاتمے اور سماج کو بدلنے کے نعرے ہر طرف لگنے شروع ہو گئے۔ عوام صرف احتجاج ہی نہیں بلکہ اس نظام کو ہی اکھاڑ پھینکنے کیلئے سرکش ہو چکے تھے اور وہ مروجہ پیداواری رشتوں کو ماننے سے انکاری ہوتے جا رہے تھے۔ گھروں اور دکانوں، بسوں اور ٹرینوں کے کرائے دینے بند کر دیئے گئے تھے۔

راولپنڈی میں ڈویژنل سطح پر ایک سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جب کمیٹی کے صدر شیخ عبدالرشید کو گورڈن کالج سے گرفتار کیا گیا تو سارے ڈویژن میں شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام کر دیا گیا۔ بی بی سی نے خبر نشر کی تھی کہ سارا علاقہ اس ہڑتال کی وجہ سے جام ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی دوران کیمبل پور میں NSF

تشکیل پا چکی تھی اور اس ضمن میں ایک آرگنائزنگ کمیٹی بھی بنائی گئی تھی۔ایک ضلعی کنونشن منعقد کرا کے ایک ضلعی یونٹ بھی تشکیل دیا گیا تھا۔ایوب خان کی رخصتی سے پہلے ہی ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار ہونے والے سبھی سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔NSF کی مرکزی قیادت میں سے گرفتار ہونے والے چار لیڈروں کو کیمبل پور جیل سے رہا کیا گیا تھا جب وہ رہا ہوئے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور ایک بہت بڑی ریلی کے ساتھ شہر میں لایا گیا۔ہزاروں لوگ ان کو دیکھنے سننے کیلئے جمع ہوئے جن سے انہوں نے خطاب کیا۔پرویز ملک کو ان میں سے تین کے نام یاد تھے،شہریار مرزا،منیر عزیز سعود اور کنور قطب الدین۔چوتھے طالبعلم لیڈر کا تعلق بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن سے تھا۔تین تو چلے گئے جبکہ شہریار مرزا وہیں رک گیا اور ایوب حکومت کی رخصتی تک کیمبل پور ہی میں قیام کیا۔اپنے قیام کے دوران شہریار مرزا نے علاقے کے تعلیمی اداروں کے دورے کیے،میٹنگیں کیں اور انقلابی جلسوں سے خطاب کیا۔شہریار کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے NSF کو بھی منظم و مضبوط اور مزید فعال بنایا گیا۔ راولپنڈی میں یہ واحد تنظیم تھی کہ جس کا اپنا آفس تھا اور جس میں پیپلز پارٹی بھی حصہ دار تھی۔اس دوران ہم نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے ارکان سے بھی محمود الحسن منٹو کے گھر پر جا کر ملاقات کی،جس میں نوابزادہ نصر اللہ،مولوی فرید احمد،چوہدری محمد علی اور کچھ دیگر قائدین شریک تھے۔جب مولوی فرید نے مرزا کا تعارف ایک مقبول عوامی لیڈر کے طور پر کرانے کی کوشش کی تو اس نے ٹوک دیا اور کہا کہ میں جو بھی ہوں اپنی تنظیم،اپنے نظریات کی وجہ سے ہوں اور تنظیموں میں افراد کی اتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے نہ حیثیت۔مرزا نے اپنے مطالبات ان کے سامنے رکھے مگر ان کے رویے سے مایوس ہو کر واک آوٹ کر گیا۔واپسی پر مرزا نے ہمیں کہا کہ یہ سب رجعتی ردانقلابی لوگ ہیں جو ریاست اور نظام کو بچانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ہمیں ان جیسوں کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔کیونکہ ان کے مفادات مزدوروں کے مفادات کے دشمن ہیں۔شہریار مرزا نے کہا کہ اگر آج پاکستان میں ایک انقلابی پارٹی ہوتی تو ملک میں جاری انقلابی کیفیت بلاشبہ ایک سوشلسٹ انقلاب کیلئے تیار ہو چکی ہے۔پھر ایوب کی رخصتی ہو گئی اور یحییٰ کا مارشل لا آ گیا،تحریک میں جز وقتی وقفہ آ گیا مگر یہ پھر دوبارہ چل پڑی۔اسی دوران گورنمنٹ کالج نوشہرہ پشتونخواہ میں پولیس فائرنگ سے ایک طالبعلم ظاہر نقوی جو NSF کا سرگرم کارکن بھی تھا ہلاک کر دیا گیا جس کا تعلق ہمارے شہر سے تھا۔شاید یہ اکتوبر 69ء کا واقعہ ہے،اس قتل پر احتجاج کیلئے سارے شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔پولیس نے بدترین لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس کے گولوں کی

برسات کردی مگر مشتعل لوگوں نے پولیس کو بھاگ جانے پر مجبور کردیا۔ظاہر کے چہلم کی تقریب ایک بڑے جلسے کی شکل اختیار کرگئی جس میں اس کے کالج سے سینکڑوں طلبہ شریک ہوئے۔پولیس نے اجتماع پر ہلہ بول دیا اور کئی طلبہ گرفتار کر لیے۔جس پر چہلم کے سبھی شرکا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے تھانے پہنچ گئے اور مجبوراً انتظامیہ کو سبھی گرفتار شدگان کو رہا کرنا پڑ گیا۔

منظور رضی (کراچی)

ریلوے ورکرز یونین کے رہنما منظور رضی کے مطابق پاکستان میں ٹریڈ یونین کی بنیاد مرزا ابراہیم (1905-1999ء) نے رکھی تھی۔11 اگست 1999ء کو 94 سال کی عمر میں انتقال کر جانے والے مرزا ابراہیم کی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ سلاخوں کے پیچھے گزرا تھا جبکہ بدنام زمانہ لاہور کے شاہی قلعے میں قید و بند کی بربریت اس کے علاوہ ہے۔مرزا ابراہیم نے 1924ء میں راولپنڈی میں ایک خشت مزدور کی حیثیت سے محنت مزدوری شروع کی تھی جبکہ کچھ عرصہ ایک برطانوی افسر کے گھر میں مالی کے طور پر بھی کام کیا تھا۔اس کے بعد مرزا کو جہلم میں ریلوے میں ملازمت مل گئی۔اور پھر یہی ریل کی ملازمت مرزا کی شناخت بنتی چلی گئی۔تاہم مرزا کی سیاسی زندگی کا صحیح معنوں میں آغاز تب ہوا جب اس کا 1930ء میں لاہور تبادلہ ہوا۔لاہور نوآبادیاتی دور سے ہی سیاست وثقافت کا ایک مضبوط گڑھ اور محور و مرکز بن چکا تھا۔یہاں مرزا کا ٹریڈ یونین تحریک اور بائیں بازو کے ساتھ رابطہ اور تعلق قائم ہوا۔ان دنوں ریلوے میں دو یونینیں ہوا کرتی تھیں۔ایک نارتھ ویسٹرن ریلویز NWR، جس کا صدر ایک برطانوی جے بی ملز تھا جو کہ ایک ریلوے گارڈ تھا۔جبکہ ایم اے خان اس کا جنرل سیکرٹری تھا۔دوسری یونین یونائٹڈ یونین ایک پاکٹ یونین ہوتی تھی جس کی سربراہی محمد دین مرزا کے پاس تھی۔مرزا نے NWR میں شمولیت کرلی، اسے ورکشاپس کا صدر منتخب کرلیا گیا۔بعد میں مرزا ابراہیم نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شمولیت اختیار کرلی اور ٹریڈ یونین تحریک کا انتہائی سرگرم رکن بن گیا جس کے نتیجے میں وہ ریلویز فیڈریشن کا مرکزی نائب صدر منتخب ہوگیا۔جبکہ صدر وی وی گری تھا جو بعد میں بھارت کا صدر بھی بنا۔بھارتی مغربی بنگال کا لمبے عرصے تک وزیر اعلیٰ رہنے والا جیوتی باسو بھی ان دنوں میں مرزا ابراہیم کی قیادت میں ٹریڈ یونین تحریک میں سرگرم کردار ادا کرتا رہا۔

1946ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلابی سال تھا۔دوسری عالمی جنگ کے بعد حکومت

ریلوے کے ہزاروں مزدوروں کو ملازمت سے برطرف کرنا چاہتی تھی۔ یہ جواز پیش کیا گیا کہ جنگ کے بعد ان کے کام کرنے کی مزید ضرورت نہیں رہی۔ یکم مئی 1946ء کو ریلوے کے مزدوروں نے مرزا ابراہیم کی قیادت میں عام ہڑتال کردی، جو ان دنوں NWR کا مرکزی صدر تھا۔ اس دن صبح سات سے گیارہ بجے تک جاری رہنے والی مزدوروں کی ایک بہت بڑی میٹنگ کے بعد ریل کا پہیہ روک دیا گیا۔ اس کے بعد 27 جون کو رات بارہ بجے ایک اور ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ فیڈریشن سے وابستہ کئی یونینوں نے خود کو اس سے الگ کرلیا مگر مرزا ابراہیم نے فوری طور پر ایک ہڑتالی کمیٹی قائم کر دی، 96000 مزدوروں نے اس ہڑتال کے حق میں ووٹ دے دیا۔ مرزا ابراہیم کو اس ہڑتال سے خود کو الگ رکھنے کیلئے ایک لاکھ روپے اور ورکشاپ میں بطور اسسٹنٹ ورکس مینیجر تعیناتی کی پیشکش کی گئی مگر مرزا نے اسے ٹھکرا دیا۔

حکومت کو لامحالہ مزدوروں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے۔ ہڑتال سے صرف ان کی ملازمتیں ہی نہیں بچیں بلکہ ان کی اجرتوں میں 20 روپے فی مزدور اضافہ بھی تسلیم کرلیا گیا۔ مگر مرزا کو اس سرگرمی کے جرم میں بٹوارے سے پانچ مہینے پہلے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ وہ اس وقت واٹرمین کے طور پر ملازمت کر رہا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن PTUF کی تعمیر و تشکیل میں سرگرم ہو گیا۔ جو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے منسلک تھی۔ فیض احمد فیض اور سی آر اسلم جیسے معروف کمیونسٹوں کو ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں صنعتی مزدوروں کو منظم کرنے میں مدد و معاونت کریں گے۔ فیڈریشن نے مرزا ابراہیم کو اپنا صدر منتخب کرلیا۔ فیض احمد فیض کی موجودگی علامتی تھی مگر وہ اس کے نائب صدر بن گئے۔ 1951ء میں پنڈی سازش کیس میں انہیں دھر لیا گیا اور لاہور کے شاہی قلعے میں تشدد و بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ منظور رضی خود بھی 60ء کی دہائی کی شاندار جدوجہد کا اہم متحرک کردار رہا، اس نے مصنف کو 1967ء کی کراچی میں ریلوے کی ہڑتال کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔

کراچی ریلوے کی ہر جگہ انقلابی سرگرمیوں کا گڑھ بن چکی تھی۔ ہر ریلوے سٹیشن، ورکشاپ، انجنوں، مرکزی دروازوں پر سرخ جھنڈے اور انقلابی بینرز لگے ہوئے ہوتے تھے۔ ہڑتالی مزدوروں کے سٹڈی سرکلوں میں مارکس اور لینن کو پڑھا اور سنا جاتا تھا۔ ریاست اسے روکنے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ مکمل پہیہ جام ہو چکا تھا اور ایک انقلابی جوش و جذبہ ہر طرف جھلکتا اور چھلکتا نظر آتا تھا۔ منظور رضی مرزا ابراہیم کا ایک مخلص اور وفادار ساتھی رہا مگر چالیس سالوں کی رفاقت کے بعد منظور نے اعتراف کیا

کہ دومرحلوں کا نظریہ ہی مرزا ابراہیم جیسے عظیم لیڈر کی 1970ء کے الیکشن میں شکست کی بنیادی اور سب سے بڑی وجہ تھی۔ مرزا نے اس الیکشن میں حصہ لیا مگر اس بار اس کی عظمت کو ووٹروں اور مزدوروں نے تسلیم کرنے سے گریز کیا اور بھٹو کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ ریلوے مزدوروں نے مرزا کیلئے پیپلز پارٹی کی ٹکٹ کیلئے لابنگ بھی کر لی ہوئی تھی اور یہ ٹکٹ ملنے والا بھی تھا مگر مرزا دومرحلوں کے نظریے کے زیر اثر رہا۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ سے الیکشن لڑے۔ مگر دوسری طرف پیپلز پارٹی زبانی طور پر ہی سہی سوشلسٹ انقلاب کا نعرہ لگا چکی تھی۔

پروفیسر محمد یحییٰ (ڈیرہ اسماعیل خان)

اس انقلاب نے پاکستان کے پسماندہ اور دور افتادہ علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والے پروفیسر محمد یحییٰ اس انقلاب میں شامل ہزاروں کارکنوں میں سے ہی ایک ہیں۔ راقم کے ساتھ اپنی گفتگو میں پروفیسر یحییٰ نے ان دنوں کے زندہ واقعات کے منظر و پس منظر کے بارے میں بتایا۔ ہمارے علاقے میں NSF اور ''دہقان قلم'' نامی ایک تنظیم طبقاتی شعور کو اجاگر کرنے میں اہم اور سرگرم کردار ادا کر رہی تھی۔ بھٹو کی یہاں آمد سے پہلے ہی کامریڈ شائستہ بلوچ، حمید خاکوانی اور کامریڈ حق نواز گنڈاپور پیپلز پارٹی کے تاسیسی کنونشن میں شرکت کر کے آ چکے تھے۔ بھٹو سے پہلے ہمارے یہاں کی بائیں بازو کی روایت مدن موہن مالویا سے وابستہ ہے جو کامریڈ بھگت سنگھ کا ساتھی تھا۔ گاندھی کی عدم تشدد تحریک ''اہنسا'' جو قومی آزادی کی تحریک میں سے انقلابی رجحان کے خاتمے کیلئے شروع کی گئی تھی، کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جب اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تو اس نے کئی افراد کو ہلاک کرنے کے بعد خود کو بھی ہلاک کر ڈالا تھا۔ ہمارے ہاں ایک اور کامریڈ سرفراز بھی تھا جو بظاہر کانگریس میں ہوتا تھا مگر وہ بالشویک انقلاب کا بہت زیادہ مداح تھا۔

جب بھٹو نے ڈیرہ اسماعیل خان آنا تھا تو اس سے پہلے کئی قسم کی رکاوٹیں کھڑی اور پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ تاکہ یہ دورہ سبوتاژ کیا جا سکے۔ کنونشن مسلم لیگ غنڈوں اور بدمعاشوں کی بارہ بسیں بھر کر لائی تاکہ جلسہ گاہ میں لوگوں کو تتر بتر کیا جا سکے۔ ایک بہت بڑا بینر لکھوا کر آویزاں کرایا گیا جس پر درج تھا ''بزدل بھٹو واپس جاؤ''۔ تاہم اس سب کے باوجود پیپلز پارٹی کے ایک درجن سے زائد بانی ارکان دن رات اس جلسے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ کیلے کے درختوں سے مزین کئی استقبالی گیٹ سجا

دیئے گئے تھے۔جن پر پارٹی پرچم اور پارٹی کے نعروں کے بینرز بھی لگائے گئے تھے۔ یہ نعرے شہر بھر کی دیواروں پر بھی لکھ دیئے گئے تھے۔ جب مسلم لیگی غنڈوں نے ان جھنڈوں اور بینروں کو پھاڑنا شروع کیا تو مین بازار میں پارٹی کارکنوں کے ساتھ ان کا تصادم ہوگیا۔ یہ دو طبقوں کے نمائندوں کی لڑائی تھی ایک طرف جاگیرداروں کے پالتو غنڈے تھے تو دوسری طرف مزدوروں اور کسانوں کے نمائندے تھے۔ بالآخر حق نواز گنڈاپور کی ہدایت پر لوگ ان بارہ بسوں کے سامنے لیٹ گئے۔تاکہ وہ جلسہ گاہ کو خراب نہ کر پائیں۔کارکن لاٹھیوں سے ان غنڈوں کا مقابلہ کرتے رہے، پھر سارا بازار بند کر دیا گیا۔

بھٹو نے 31 دسمبر 1968ء کو یہاں جلال پارک میں جو اب حق نواز پارک کہلاتا ہے عوامی جلسے سے خطاب کرنا تھا۔محمد نواز ایڈووکیٹ نے بار سے خطاب کی دعوت دی ہوئی تھی جبکہ یکم نومبر کو ورکرز کنونشن سے خطاب تھا۔ جب یہ غنڈہ عناصر پہنچے تو کارکنوں' مزدوروں اور کسانوں نے ان کو پکڑ لیا اور مار مار کر جاگیرداروں کے ان پالتو غنڈوں کا بھرکس نکال دیا۔مگر ایک طریقہ جو اس جلسے کو خراب کرنے میں کامیاب رہا وہ یہ تھا کہ پارک کے اندر پانی چھوڑ دیا گیا۔جلسہ گاہ میں تو کوئی نہ جاسکا مگر لوگ اپنے قائد کو سننے کیلئے بہت بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔ڈپٹی کمشنر سجاد حسین کو حکم دیا گیا تھا کہ ہر طرح ہر طریقے سے اس سیاسی پروگرام کو سبوتاژ کر دیا جائے۔مگر دوسری طرف بھی لوگ تھے جو ایک ایسے قائد کو سننے کیلئے آئے تھے جو اپنی تقریروں میں سماج کو بدلنے کی باتیں کرنے آرہا تھا۔ ہزاروں لوگ سرکلر روڈ پر امڈ آئے تھے اور اس جھگڑے کا انجام کرنا چاہ رہے تھے۔ جب بھٹو نے دیکھا کہ پارک میں جلسہ ممکن نہیں رہا تو وہ لوگوں کو لے کر مین بازار کی طرف بڑھا۔بھٹو شاہانی منزل جو کہ بھکر کے شہانیوں کی ملکیت تھی، کے نیچے واقع ایک دکان کے پاس پہنچا اور اوپر چڑھنے لگا چوکیداروں نے بھٹو کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔

بھٹو شائستہ بلوچ اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ اوپر بالکونی میں پہنچ گیا۔اس یادگار جلسے کی تصاویر آج بھی موجود ہیں۔حق نواز گنڈاپو نے ایک گوریلے جنگجو کی طرح سے بندوق سنبھالی ہوئی تھی۔بھٹو نے ابھی ایک منٹ کی تقریر کی تھی کہ پولیس نے ہلہ بول دیا۔مگر اس کے باوجود بھی بھٹو کے یہ 70 سیکنڈ ڈیرہ اسماعیل خان کا مزاج بدل گئے۔اس نے ان لمحوں میں پوچھا ''کیا تمہیں آٹا ملتا ہے؟ کیا تمہیں گھی ملتا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا ''نہیں'' بھٹو نے کہا کہ آج چینی مہنگی ہو چکی ہے، غریب انسان کیلئے زندگی گزارنا محال ہو چکا ہے۔پیپلز پارٹی تمہیں یہ سب کچھ دے گی، روٹی کپڑا اور مکان۔اور یہ سوشلزم کے

ذریعے مہیا کرے گی"۔(3) اس کے بعد پولیس نے لوگوں پر حملہ کر دیا اور عینی شاہدین کے مطابق ایک بھیانک سفاک اور بدترین لاٹھی چارج کیا گیا۔شہر میں پہلی بار آنسو گیس فائر کی جا رہی تھی اور سارا شہر لڑائی کا میدان بن چکا تھا۔مگر جلسے میں آئے لوگ اپنی جگہ پر جمے ہوئے تھے جس پر پولیس نے فائر کھول دیئے۔جس سے بے شمار لوگ زخمی ہو گئے تھے"۔ یحییٰ کے بقول وہ خود بھی میلوں دور سے بھٹو کی تقریر سننے آیا تھا۔بھٹو اس کے بعد قرب و جوار کے کئی چھوٹے بڑے شہروں کلاچی، ٹانک، گالوٹی، وغیرہ بھی پہنچا تا کہ عوام سے اپنے لیے حمایت حاصل کر سکے۔ایوب خان نے ایک بار کہا تھا کہ ایک چھوٹے سے قصبے سے شروع ہونے والی چنگاری آگ بن کر سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ایوب کا اشارہ ڈیرہ اسماعیل خان کے اسی واقعے کی طرف تھا جس میں کنونشن مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کا تصادم ہوا تھا جبکہ اس سے قبل راولپنڈی میں ایک طالب علم پولیس فائرنگ سے ہلاک ہو چکا تھا۔ان واقعات کے بعد سارا ملک ایشیا سرخ ہے کے نعروں سے گونج اٹھا تھا۔

حق نواز گنڈاپور ایک سچا اور کھرا پر جوش انقلابی تھا جس کی وجہ سے تحریک ہر دم رواں دواں رہی۔ وہ پیپلز پارٹی کا بانی رکن تھا،اس نے ہالہ کنونشن میں بھی شرکت کی تھی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے سچا سوشلسٹ تھا۔اور اس نے چھوٹی عمر سے ہی جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے خلاف لڑائی شروع کر دی تھی۔جب جاگیردار پیپلز پارٹی میں شامل ہونے لگے تو وہ بھٹو سے ناراض ہو گیا اور اپنی ہی کسان پارٹی بنا کر کوہ سلیمان کے پہاڑوں کی 12000 فٹ بلندی پر چڑھ گیا۔دو درجن ساتھیوں سمیت اس نے وہاں سٹڈی سرکل شروع کر دیئے۔جہاں وہ بڑے شامیانوں میں رہتے اور اپنا کھانا پکانا خود ہی کرتے تھے۔آج بھی وہ جگہ ویسے ہی بارونق ہے روزانہ وہاں کھانا پکتا ہے اور لوگوں میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ کامریڈ کے ساتھی اس کی یاد کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔تاہم گنڈاپور 1969ء میں پارٹی میں واپس آ گیا تھا۔

گنڈاپور ہر جمعہ کے دن بینروں پر لکھے سوشلسٹ نعروں کے ساتھ جلوس نکالا کرتا تھا۔وہ کسی نہ کسی بڑے چوک پر پہنچ جاتا اور جلسہ شروع کر دیتا تھا۔ان جلسوں جلوسوں کے زیادہ تر شرکا کسان اور مزدور ہوا کرتے تھے۔ان جلسوں کے مرکزی مقررین میں فاروق شائستہ، صفدر بخاری، زرداد اور خود گنڈاپور شامل ہوتے تھے۔بھٹو کے دورے کے بعد پیپلز پارٹی کو علاقے میں پذیرائی ملنے کی رفتار میں مزید اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔محنتی اور سرکش قسم کے کارکن گھر گھر جاتے اور پارٹی کا پیغام پہنچاتے۔

بھٹو کے دورے کے بعد پیپلز پارٹی نے لوگوں میں وسیع عوامی بنیادیں حاصل کرنی شروع کر دیں۔ سخت کوش، سخت جان کارکنوں نے گھر گھر جا کر لوگوں سے بحثیں کیں اور انہیں پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ تحریک تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ڈیرہ اسماعیل خان سوشلزم کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ جن سے خوف زدہ ہو کر کئی جاگیردار اپنے تحفظ کے لیے پیپلز پارٹی میں شامل ہوتے گئے، حق نواز گنڈا پور پارٹی کا صوبائی اور مرکزی رہنما تھا۔ وہ جب ایک دیہات سے دوسرے دیہات کی طرف سفر کرتا اور لوگوں کو انقلابی نظریات سے آگاہ کر کے ان کے دل جیتنے کے سفر پر نکلتا تو اس کے پاس سارے دن کیلئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور پیاز ہوتا تھا۔ وہ گاؤں گاؤں پھر کر جاگیرداری، سرمایہ داری کے جبر و استبداد اور لوٹ مار کے خلاف اور سوشلزم کے نظریات پر لوگوں کو لیکچر دیتا اور انہیں بڑی تعداد میں پارٹی میں شامل کرتا۔ اس کے لیکچر سننے کے لیے عام لوگوں کی بڑی تعداد اکٹھی ہو جایا کرتی تھی۔ اسے بنیاد پرستوں کے ایک مرکز کو آگ لگانے کے الزام میں گرفتار کیا گیا جسے انتہا پسند پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور نوجوانوں پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن چودہ دن کی طویل بھوک ہڑتال کے بعد حکومت اسے، اس کے ساتھیوں سمیت رہا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ ایک مقبول عام لیڈر کے طور پر ابھرا۔ اور وہاں کے تمام قبائل کے جاگیردار اس سے خوف زدہ ہو گئے۔ انہیں یہ وہم ہو گیا کہ حق نواز انہیں تباہ کر دے گا۔ 25 اگست 1970ء کی رات وہ ایک نواحی گاؤں بڈھ میں ایک سوشلسٹ سٹڈی سرکل کر کے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں چند نامعلوم افراد نے اسے قتل کر دیا۔ حکومت نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ آسمانی بجلی گرنے سے ہلاک ہوا ہے۔ اس کا قتل علاقے کے غریب لوگوں کے لیے بہت بڑا دھچکا اور نقصان تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان شہر تین دن تک اس کے سوگ میں بند رہا۔ یہاں تک کہ ہوٹل اور میڈیکل سٹور بھی بند رہے۔ اس کی تدفین کے موقع پر لاکھوں لوگ انقلاب کے شہید کی آخری رسومات میں شریک ہوئے۔ بھٹو اس کی تدفین کے دوسرے دن آیا اور اس کی قبر پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کی۔

کچھ لوگوں نے افواہیں اڑائیں کہ وہ آسمانی بجلی سے ہلاک ہوا ہے مگر حقیقی صورت حال وہی ہے جو اس کے بیٹے طفیل گنڈا پور نے پروفیسر یحییٰ کو بتائی کہ اسے مقامی جاگیرداروں کے غنڈوں نے قتل کیا تھا۔ حق نواز گنڈہ پور کی دوسری برسی کے موقع پر بھٹو نے ڈیرہ اسماعیل خان جیسے پسماندہ علاقے میں گومل یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ وہ پارک جہاں بھٹو اپنے پہلے جلسے میں تقریر نہیں کر سکا تھا۔ اس کا نام تبدیل کر کے حق نواز گنڈہ پور پارک رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد سے یہ جگہ انقلابی عوامی جلسوں کا مرکز بنی چلی آ رہی ہے۔

سوہنا خان بلوچ ان دنوں ڈیرہ اسماعیل خان کے مین بازار میں چائے کا ہوٹل چلاتا تھا۔ جب بھی کوئی مولوی چائے پینے وہاں آتا تو اس پر فقرے کستا اور سوشلزم کی تعریف کیا کرتا۔ اس نے اپنے چائے خانے کا ماحول ہمیشہ سیاسی بنائے رکھا اور وہ غریب، مزدوروں کے ذاتی مسائل کو نظام کے استحصال کے ساتھ جوڑتا۔ مثال کے طور پر اگر اس کی جگہ کے کرائے میں اضافہ ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ یہ اس لیے ہوا ہے کیونکہ اس دکان کا مالک ایک مولوی ہے۔ وہ مزید کہتا تھا کہ اسی وجہ سے اس چھوٹے ہوٹل کو بھی بھٹو قومی تحویل میں لے لے گا۔ کالو خان منیاری کا بھی یہی حال تھا جو ایک ترقی پسند انسان تھا اور جس کی اپنی ایک دکان تھی۔ وہ ہر آنے جانے والوں کو سوشلسٹ نظریات کے بارے میں بتاتا رہتا۔ اخبارات میں بھٹو کے بارے میں جو بھی خبر چھپتی وہ اسے اپنا موضوع گفتگو بناتا۔ اس کا بیٹا بلند اقبال بعد میں NSF میں شامل ہو گیا اور سرگرم کارکن بنا۔

ان دنوں معراج محمد خان مقبولیت کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ بھاٹیہ بازار میں ڈاکخانے کے نزدیک NSF کا ایک دفتر بنایا گیا۔ یہ دفتر کنور اقبال نامی ایک شخص نے تعمیر کیا تھا۔ جسے ''ایشیاء سرخ ہے'' کے نعرے سے والہانہ عشق ہو گیا تھا۔ ''روزنامہ مساوات'' اور سوشلسٹ میگزین ''نصرت'' اس آفس میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ شین عادل اور یونس تھہیم، داؤد خان، بلند اقبال، تسلیم فیروز، صلاح الدین گنڈاپور جیسے کامریڈز اور کئی دوسرے ٹریڈ یونین رہنما اس آفس میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ہر یوم مئی کے موقع پر یہ سب لوگ سرخ جھنڈوں کے ساتھ سارے شہر کا چکر لگاتے ہوئے ایک جلسہ کرتے اور شکاگو کے شہیدوں کو یاد کیا کرتے۔ ان جلسوں میں مزدوروں کے لیے بہتر اجرتوں اور بہتر حالات زندگی کے مطالبات پیش کیے جاتے۔ ان میں سے بہت سے رہنما اپنی احتجاجی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہوئے اور انہیں سات سال تک کی سزائیں بھی سنائی گئیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے میں ایسے واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کا نظریہ پاکستان کے پسماندہ ترین علاقوں میں بھی عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

شاہد محمود ندیم (لاہور)

شاہد ندیم ایک ڈرامہ نویس، تھیٹر اور ٹیلی ویژن کے ہدایت کار و پروڈیوسر، ایک بائیں بازو کا دانشور اور اپنی طرز کا سرگرم سیاسی کارکن ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند تھیٹر کو زندہ رکھنے میں اس کا کردار

مثالی رہا ہے۔ 1980ء کی دہائی کے آخر میں اس کے ریاستی مشینری کے خلاف بنائے گئے ڈراموں نے عوام میں بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ اسے حال ہی میں ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر پاکستان ٹیلی ویژن (ریاستی ٹیلیویژن نیٹ ورک) کے عہدے سے برخاست کیا گیا ہے۔ اس کی برخاستگی زرداری حکومت کے لگائے گئے ایک دائیں بازو کے نمائندے کی طرف سے عمل میں لائی گئی۔ اس کتاب کے حوالے سے اپنے تجربات کو بیان کرتے ہوئے شاہد محمود نے مصنف کو بتایا کہ ''میں نے گورنمنٹ کالج سے 1967ء میں گریجوایشن کی اور اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج کی عمارت ایک پرانے طرز تعمیر کا شاہکار تھی اور اپنے پرانے تعلیمی ریکارڈ، کھیلوں، مباحثوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ اس کالج کے طلباء کے بارے میں تاثر تھا کہ یہ سیاست اور کسی قسم کے احتجاج اور تحریکوں میں شامل نہیں ہوتے۔ میں ان طالب علموں میں تھا کہ جب ایوب خان اپنی کامیابی کا جشن منانے کے سلسلے میں گورنمنٹ کالج کے دورہ پر آیا تو میں نے خود اس کا خوشی سے استقبال کیا تھا۔ مگر پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ یہ ایک قسم کے سماجی اور ثقافتی جزیرے کی طرح ہے۔ یہ کھلی، لبرل، اور کسی حد تک طلباء کی نگرانی کرنے والی ایجنسیوں سے بچی ہوئی جگہ بھی تھی۔ مزید برآں طالبات کی زیادہ تعداد گریز اور کشش دونوں رویوں کو جنم دے رہی ہوتی تھی۔ کیفے ٹیریا کے اردگرد واقع لان اور نہر کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے راستے رومان پسندوں کے لیے ایک بہترین ماحول فراہم کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے طالب علم مختلف سماجی طبقوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں شہروں کے بالادست طبقات سے تعلق رکھنے والے بھی، دور دراز پسماندہ علاقوں سے آئے ہوئے دیہاتی طالب علم بھی اور نو دولتیوں کے بگڑے ہوئے بچے بھی، اور ان کے ساتھ اونچے درجے کے صنعتی اور جاگیردار خاندانوں کے طلبا اور برقع پوش مگر محنت کرنے والی طالبات بھی ان میں شامل ہوتی تھیں۔ وہاں مارکسی سٹڈی سرکلوں اور تبلیغی جماعت کے اجتماعات دونوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ شراب آسانی سے مل جاتی تھی، شاعری عام ہوتی تھی اور گرم نظریاتی بحثیں بھی ذوق وشوق سے سنی جاتی تھیں۔ طالب علموں میں جوش اور جذبہ ہوتا تھا۔ ان میں اعتماد اور اظہار کی فراوانی ہوتی تھی اور وہ ایک بہتر مستقبل کی امید سے لبریز ہوا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ جگہ مختلف سوچوں اور مختلف ثقافتوں کے حامل لوگوں کا مرکز تھا۔

میں نے اس ماحول کو اپنے لیے بہت ہی دلچسپ اور پرکشش پایا، اس میں وسعت اور چاشنی تھی جس کی وجہ سے میں سیاسی اور سماجی طور پر باشعور ہوتا چلا گیا۔ اور تبدیلی کے عمل میں حصہ لینے کے لیے

میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے مباحثے کا ایک گروپ ''نئے لوگ'' کے نام سے تشکیل دیا۔ جہاں ہم کہانیاں، نظمیں، مضامین پڑھا کرتے اور سنجیدہ سیاسی بحثیں کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنا پہلا افسانہ اسی فورم پر پڑھا۔ یہ ''نئے لوگ'' کی ایک میٹنگ تھی جس میں ہمارا تعارف کچھ بائیں بازو کے اساتذہ اور سوشلسٹ دانشوروں کے ساتھ ہوا جو اکثر و بیشتر کیمپس میں آتے رہتے تھے۔ انہوں نے میرے جیسے غیر متعلقہ کئی طالب علموں کو اپنی طرف راغب کیا جو سماج کو بدلنے کی جستجو رکھتے تھے۔ لیکن ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان لوگوں میں عزیز الحق، عزیز الدین، خالد محمود اور انیس عالم جیسے معتبر لوگ شامل تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم نے محسوس کیا کہ پنجاب یونیورسٹی میں کوئی سٹوڈنٹس یونین نہیں ہے۔ یونین پر جنرل ایوب خان کی حکومت نے کچھ سال پہلے پابندی عائد کردی تھی۔ اور اس کی بجائے بلواسطہ چنی ہوئی سوسائٹیاں مسلط کی گئیں۔ یہ بنیادی جمہوریت کے جیسا ہی ایک نظام تھا جسے ایوب خان نے قومی سطح پر مسلط کیا ہوا تھا۔ مجھے اور میرے بہت سے دوستوں کو محسوس ہوا کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا جارہا تھا اور ہم سے ایک مضبوط طلباء ادارے کا انتخاب کرنے کا حق چھین کر ہماری توہین کی جارہی تھی۔ سیاسی پارٹیوں کے مروجہ سیاسی ونگ بدقسمتی سے یونین کی پابندی کو قبول کر چکے تھے۔ اور کوئی ایسا پلیٹ فارم موجود نہیں تھا جس کے ذریعے طلباء یونین کی بحالی کی تحریک چلائی جاسکتی۔ پنجاب یونیورسٹی کو ایک آمر وائس چانسلر حمید احمد خان کے ذریعے چلایا جارہا تھا جو اپنے مزاج میں ایوب خان سے مشابہت رکھتا تھا۔ وہ ایک انتہائی طاقتور وائس چانسلر تھا جو قدیم طرز کے خوف اور سخت کنٹرول کے ذریعے انتہائی سخت نظم ونسق کی پالیسی کا قائل تھا۔ اساتذہ اور طلباء دونوں اس کی سختی سے خوف زدہ رہتے تھے۔ سٹوڈنٹس افیئر ڈیپارٹمنٹ، انٹیلی جنس ایجنسیوں اور پولیس کے ادارے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جو طلباء کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ کسی کو یونین کے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کچھ ہمت کر کے چند ایک خود ساختہ انقلابیوں سے اس معاملے میں بات چیت کی مگر انہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ طلباء یونین کی بحالی کو فضول اور وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔ مگر میں نے اپنی بات کرنا نہیں چھوڑی یہاں تک کہ غیر سیاسی، غیر سنجیدہ دوستوں سے بھی اس بارے میں بات کرتا رہا جس کے نتیجے میں دو ہم نوا ساتھی میسر آ گئے۔ ہم نے اپنے تئیں طلباء یونین کی بحالی کیلئے ایک خفیہ کمیٹی تشکیل دی اور پمفلٹس اور ہاتھ سے لکھے ہوئے پوسٹرز تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔

سب سے ڈرامائی واقعہ شعبہ نفسیات کی نمائش کے موقع پر پیش آیا۔ وائس چانسلر اس نمائش کے

افتتاح کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب وہ رخصت ہوا تو اس کے کوٹ کی جیب میں یونین کی بحالی کے حوالے سے ہینڈ بلوں کا ایک بنڈل پہنچ چکا تھا جو میں نے اس وقت ڈالا جب وہ میرے سٹال پر آلات کے معائنے کے لیے پہنچا۔ جب وائس چانسلر نے گھر جا کر ان کو پڑھا تو وہ حیران رہ گیا۔ اپلائیڈ سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کو فوری طور پر بلایا گیا اور اسے کاروائی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اسے کہا گیا کہ تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں صرف سات لڑکے ہیں اور تم انہیں بھی کنٹرول نہیں کر سکتے۔ بیشتر ماہرین نفسیات کی طرح ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ڈاکٹر غلام جیلانی بھی ایک ہونق انسان تھا جو اکثر و بیشتر اعصابی تناؤ کا شکار رہتا تھا۔ اس واقعے کے بعد یونین کی بحالی کی تحریک عام ہو چکی تھی۔ ہم کیمپس کے اندر چھوٹے چھوٹے مظاہرے کرنے کے قابل ہو گئے جس میں ہم نعرے لگاتے اور جوشیلی تقریریں کرتے اور یونیورسٹی کے اوپر مسلط آمرانہ حکمرانی سمیت ملک کے اوپر مسلط آمرانہ حکومت کے خلاف بھی نعرے لگاتے۔ مختلف شعبوں کے طالب علم آہستہ آہستہ ہمارے مظاہروں میں شریک ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کچھ بائیں بازو کے طلباء بھی ہمارے ساتھ آ ملے۔

اسی دوران سوسائٹیوں کے انتخابات کا اعلان ہوا۔ ملک میں ہونے والے بنیادی جمہوریت کے الیکشن کی طرح ان سوسائٹیوں کا انتخاب بھی بالواسطہ ہوتا تھا۔ ہر ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے ان سوسائٹیوں کے ممبروں کا انتخاب کرتے جو بعد میں ایک ایڈہاک کمیٹی کا انتخاب کرتے تھے۔ ہم نے اس پر طویل بحث ومباحثہ کیا کہ کیا ہمیں ان الیکشن میں حصہ لینا چاہیے یا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ ان میں حصہ لینے کا مطلب انہیں قانونی طور پر درست تسلیم کرنا تھا۔ جبکہ ان کا بائیکاٹ کر کے ہم یونین پرست عناصر سے کٹ کر رہ جاتے۔ میرا موقف یہ تھا کہ اگر ہم اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ہم اس بیہودہ طریق کار کو ننگا کرتے ہوئے یونین کی بحالی کی حمایت کا اعلان کر دیں گے۔ مجھے اعتماد تھا کہ ہمارے امیدوار جیت جائیں گے۔ آخر کار میرے موقف کو درست تسلیم کیا گیا۔ ہم نے یونین پرست پلیٹ فارم سے الیکشن میں حصہ لیا اور اکثریت سے جیت گئے۔ الیکشن جیتنے کے فوراً بعد ہم نے یونین کی بحالی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ سوسائٹی کے صدور کی بڑی اکثریت نے ایڈہاک کمیٹی کے کنوینر کے طور پر مجھے امیدوار لانے کی حمایت کی۔ مگر اس الیکشن سے پہلے ہی پاکستان میں انقلابی واقعات نے جنم لینا شروع کر دیا۔

یہ اکتوبر 1968ء کی بات ہے جب فورٹریس سٹیڈیم میں ایوب آمریت کے دس سالہ جشن کی تقریبات منائی جا رہی تھیں۔ وہاں ہر روز پریڈ، نمائش اور مظاہرے کیے جاتے اور آمر کی شان میں قصیدہ

گوئی کی جاتی تھی۔ دوسرے اداروں کی طرح پنجاب یونیورسٹی کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ سٹیڈیم کو بھرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ طالب علم بھیجے جائیں۔ ہر روز ہر ڈیپارٹمنٹ سے کہا گیا کہ وہ سٹیڈیم میں لازمی اپنے طلباء کو بھجوائے۔ ہم نے خفیہ طور پر ایک گیت تیار کیا جس میں فوجی آمر کی تعریف کی بجائے اس کی مذمت کی گئی تھی اور جس میں ہم نے دس سالہ جشن کی بجائے دس سالہ اداسی کو موضوع بنایا۔ ہم سینئر آرمی افسروں اور بیوروکریٹس کے ہمراہ بریگیڈیئر انکلوژر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب پریڈ شروع ہوئی اور اناؤنسر نے ایوب خان کی عظیم نجات دہندہ کے طور پر تعریف شروع کی تو ہم نے اپنا لکھا ہوا گیت ایک فلمی گانے کی طرز پر با آواز بلند گنگنانا شروع کر دیا۔ اس کے ابتدائی کلمات یوں تھے:

''ان دس سالوں نے ہمیں بے انتہا اداس کیا ہے۔ ہم نے ایک نہیں دو نہیں یہ سارے دس سال ضائع کیے ہیں۔'' یہ گیت سننے کے بعد فوجی افسروں اور بیوروکریٹس کے چہرے سرخ ہوتے چلے گئے۔ وہ حواس باختہ، پریشان اور بھڑک گئے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمیں کچا کھا جائیں۔ لیکن ہم طالب علم بھی نوجوان لڑکے، لڑکیوں پر مشتمل تھے اور ایک دوسرے کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ واقعہ ڈاکٹر جیلانی کے لیے گہرا صدمہ ثابت ہوا اور اس کے اعصاب مزید تناؤ کا شکار ہو گئے۔ میرے ہم جماعت طلباء سے بات کرتے ہوئے اس نے کہا کہ مجھے شاہد ایک بلا کی شکل میں خواب میں نظر آتا ہے۔ انہی دنوں ہم کلینیکل سائیکالوجی کا مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس کلاس میں ہم اپنے ادارے کے سربراہ کے خواب کو ہی زیر بحث لاتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد یونین کی بحالی کی ہماری چھوٹی سی احتجاجی مہم جمہوریت کی بحالی کے ساتھ شامل ہو گئی۔ یہ بہت ہی انقلابی اور جوش و جذبے والے دن تھے جب ساری دنیا میں انقلاب اور آزادی کی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ یہ تحریکیں دن بدن زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ ویت نام جنگ کے خلاف مہم نے ساری دنیا کے امن پسند نوجوانوں کو ایک عالمگیر جوش اور جذبے سے سرشار کر دیا تھا۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں انقلابی طالب علموں نے اپنی تحریک کے ذریعے سرمایہ دارانہ سماج کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک عالمی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ ہم باقاعدگی کے ساتھ یورپ میں ہونے والے واقعات اور خاص طور پر طلباء اور پولیس کے درمیان ہونے والے جھگڑوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہماری تحریک کو حوصلہ دینے والا ایک اور ذریعہ مشرقی پاکستان میں طلباء احتجاج تھا جو دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہمارے لیے مشرقی پاکستان کے طلباء سیاسی طور پر زیادہ مضبوط، مستحکم، منظم اور متحرک قوت کے

طور پر مثال بنتے چلے گئے۔

ایک اور طاقت جو ہماری سرزمین پر زور پکڑ رہی تھی وہ سندھ سے تعلق رکھنے والا مقبول عام نوجوان کرشماتی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو تھا۔ ایوب خان کی کابینہ کو چھوڑنے کے بعد اور پاکستان پیپلز پارٹی کو قائم کر کے بھٹو نے ایک مقبول عام سوشلسٹ نعرہ بلند کرتے ہوئے جرأت کے ساتھ ایوب خان کے آمرانہ اقتدار کو چیلنج کیا۔ ہم میں سے بہت سے نوجوانوں کے لیے بھٹو بطور ایک نوجوان، ایک کرشمہ، ایک جرأت مند انسان اور ایک ترقی پسند کے طور پر ابھرا۔ میں بھی انہی نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنا جو مضمون لکھا وہ بھٹو کے متعلق تھا جس کا عنوان تھا ''صحرا میں اگنے والا پھول''۔ بھٹو جب ایوب خان کی کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد ریل کے ذریعے لاہور پہنچا تو میں بھی ان لاکھوں انسانوں میں سے ایک تھا جو اس تاریخی اور پاگل کر دینے والے استقبال میں شریک تھا۔ اس کے بعد نومبر آیا، جس میں راولپنڈی کے پولی ٹیکنیکل کے طالب علم عبدالحمید کو ایک مظاہرے کے دوران پولیس نے فائرنگ کر کے شہید کر دیا تھا۔ راولپنڈی سے پھوٹنے والے یہ مظاہرے لاہور اور پھر کراچی میں پھیل گئے اور اس کے بعد ایسا لگا کہ جیسے سارے پاکستان کے نوجوان اس کا انتظار کر رہے تھے۔ آمریت کے دس سال، چاپلوسانہ جمہوریت، سیاسی کارکنوں پر جبر و تشدد، امیری اور غریبی کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، چھوٹے صوبوں میں تنہائی کا احساس، اور نوجوانوں کو آزادیاں نہ ملنے کا احساس ان سب نے مل کر طالب علموں کو ایک زندہ و جاوید سیاسی تحریک کی لڑی میں پرو دیا۔ ہم نیو کیمپس کے طالب علم پہلے ہی بھڑکے ہوئے تھے اور یونین کی بحالی کی تحریک کے ساتھ ساتھ دس سالہ جشن کے خلاف سرگرمیوں میں شریک اور ملوث تھے۔ راولپنڈی میں ہونے والے قتل نے ساری کیفیت کو بدل کے رکھ دیا۔ ہم نے اس قتل کے خلاف نیو کیمپس سے شہر میں واقع اولڈ کیمپس تک احتجاجی مارچ کا فیصلہ کیا۔ یہ فاصلہ چھ کلومیٹر سے زیادہ بنتا ہے۔ طلباء سے ملنے والے رسپانس نے ہمیں حیران کر کے رکھ دیا۔ سولڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل جلوس جھنڈے اور پلے کارڈ ہاتھوں میں لیے ہمارے ساتھ اس ریلی میں شریک ہونے کے لیے تیار تھا۔ اس ریلی میں ایف۔ سی کالج، سمیت دوسرے کالجز کے طلبا و طالبات بھی شامل ہو گئے۔ ہمیں شہر کے مرکز میں واقع اولڈ کیمپس تک پہنچتے ہوئے چار گھنٹے لگ گئے۔ یہ ریلی منظم اور پرامن تھی۔ یہ نئے سے پرانے کیمپس کی طرف ابتدائی ریلی تھی۔ جس کے بعد یہ ایک نہ رکنے والا سلسلہ بن گیا۔ اب ہمارے رابطے ایم۔ اے۔ او کالج، اسلامیہ کالج اور دیال سنگھ کالج سے بھی قائم ہو چکے تھے۔ ہم نیو کیمپس سے شروع ہو کر کینال بینک روڈ اور

وہاں سے اپر مال سے ہوتے ہوئے چیئرنگ کراس یا ریگل چوک پر پہنچ جاتے۔ جہاں دوسرے کالجوں کے طلباء آ کر ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ چیئرنگ کراس اور ریگل کے درمیان کا علاقہ طالب علموں سے بھر جاتا، ٹریفک کا بہاؤ اور نظم ونسق طلباء کی ذمہ داری بن کر رہ گیا۔ خود میں نے بھی کئی بار ٹریفک وارڈن کی ڈیوٹی سرانجام دی۔ ٹریفک کے بہاؤ کو کنٹرول کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی حرکت کا انداز مجھے ایک نیا منفرد تجربہ محسوس ہوا۔ میں آج تک طاقت کے اس احساس کو یاد کرتا ہوں کہ جب ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر کاروں، سکوٹروں وغیرہ کو میں جب چاہتا روک دیتا اور جب ہاتھ ہلاتا انہیں جانے دیتا۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہمارے رابطے راولپنڈی، پشاور، کراچی اور کوئٹہ کی طلباء قیادت کے ساتھ قائم ہو چکے تھے جو شروع میں تو آگے آگے تھے مگر پھر کمزور پڑتے چلے جا رہے تھے۔ وہ نظریاتی طور پر اتنے مضبوط اور سیاسی طور پر اتنے سنجیدہ نہ تھے۔ مگر کراچی اور پشاور کے طلباء متحرک اور منظم تھے اور ان کو سیاسی حمایت بھی حاصل تھی۔ جب کہ مشرقی پاکستان کے طلباء کی قیادت ایک اور مختلف انداز میں تھی۔ ان کا قومی اور سیاسی انداز دلوں کو چھو لینے والا تھا جس نے حقیقت میں ہمیں بہت متاثر کیا۔ ہم ان کے لیے ہمدردی اور یک جہتی کے جذبات سے سرشار تھے۔ جب بھی، جہاں بھی مشرقی پاکستان میں پولیس طلباء کو گرفتار کرتی یا ہلاک یا زخمی کرتی تو ہم ان کے ساتھ یک جہتی کے لیے جلوس نکالتے اور بھرپور انداز میں ان کی حمایت کا اعلان کرتے۔ مغربی پاکستان میں بھٹو ایک قومی ہیرو کے طور پر ابھر رہا تھا اور وہ تحریک کا قائد بن چکا تھا۔ اس کا اسلامی سوشلزم کا نعرہ خاص طور پر نوجوانوں میں بہت مقبول ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے انہیں اسلام اور سوشلزم کے مابین انتخاب کرنے کی تکلیف سے بچنے کا ایک آسان راستہ میسر آ گیا تھا۔ بھٹو کا عوامی طرز ایک طرف انقلابی جوش وجذبے اور دوسری طرف مقامی بہادری کا مرکب تھا اور عوام اس سے محبت کرتے تھے۔ اس نے حکمرانوں کا مذاق اڑایا، ان کی نقالی کی، ان کی توہین کی، ان کو برا بھلا کہا جس پر عوام اس کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ بھٹو کے لاہور کے دورے نے تحریک کو بڑی تقویت دی۔ ابھی تک اس تحریک پر طلباء حاوی تھے مگر اب پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے طلباء اس میں اہم اور مرکزی کردار ادا کر رہے تھے۔ مشہور کالجوں کے طالب علم رہنما جلسوں سے تقریریں کرنے، بیانات جاری کرنے، پریس کانفرنسیں کرنے اور انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کرنے میں پیش پیش رہے۔ لیکن جب تحریک گلیوں میں پھیلی، پولیس مقابلے شروع ہوئے، سادہ کپڑوں والی پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہوا، بڑی دکانوں کے شیشے ٹوٹنے شروع ہو گئے تو پیپلز پارٹی کے جوانوں نے پولیس کو شکست سے دوچار کیا۔ پولیس

کے جبر واستبداد کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اور آنسو گیس کی شیلنگ کا سامنا کرنا ہمارے لیے حیران کن عمل تھا۔ یہ چند دنوں کی ہی بات تھی کہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے طلباء ونگ بھی ایک ایسی تحریک میں آ شامل ہوئے جسے وہ بورژوا قرار دیتے چلے آ رہے تھے۔ اب تحریک میں پیپلز پارٹی کے جھنڈوں اور سیاسی بینروں کے ساتھ ساتھ دوسری جماعتوں کے بینر بھی نظر آنے شروع ہو گئے جن میں آمریت کے خاتمے اور طلباء مطالبات کا ذکر تھا۔ وہ باقاعدہ طالب علم رہنما جنہوں نے اس تحریک کا آغاز کیا ان کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ نوجوان سیاسی کارکنوں نے ''ان کی تحریک کو ہائی جیک کر لیا ہے'' اور اسے ایک پارٹی کا سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے۔ شروع شروع میں طلباء مظاہرے اور پارٹی مظاہرے الگ الگ اور اپنے کردار میں بالکل مختلف ہوتے تھے۔ لیکن جلد ہی یہ فاصلے یا تو ختم یا غیر متعلقہ ہونے شروع ہو گئے۔ ان کو اکائی میں جوڑنے والا عنصر پولیس کا بلا امتیاز اور بے رحم جبر وتشدد اور اندھا دھند گرفتاریاں تھا۔ میں انٹر کالجیٹ باڈی کا منتخب جنرل سیکرٹری تھا جو شہر کے کالجوں کی طلباء کی منتخب شدہ باڈیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس حوالے سے یہ باڈی لاہور کے طلباء کی مستند جمہوری آواز بن کر سامنے آئی۔ اس باڈی نے سیاسی مطالبات کے تحت طلباء کو جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ کچھ دنوں تک اس باڈی نے اپنا آزاد تشخص برقرار رکھا۔ مگر تحریک تیزی سے پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ سماج کے بہت سے حصے اس میں شریک ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کئی اور سیاسی پارٹیاں اس میں ملوث ہو رہی تھیں۔ ان میں نیپ (بھاشانی)، نیپ (ولی خان) سوشلسٹ پارٹی، مزدور کسان پارٹی اور عوامی لیگ شامل تھے۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن اور نیشنلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن جوش وجذبے کے ساتھ سرگرم ہو چکی تھیں۔ ٹریڈ یونین اور مزدوروں کی دوسری تنظیمیں بھی تحریک کا حصہ بن چکی تھیں۔ اس لیے اب یہ غیر حقیقی یا احمقانہ بات لگتی تھی کہ اس تحریک کو ''صرف طلباء تحریک'' ہی قرار دیا جاتا۔

پولیس ہر وقت میری تلاش میں تھی اور میں انہیں دھوکہ دیتے پھر رہا تھا۔ میں اچانک ایک بڑے مظاہرے میں نظر آتا اور تقریر کرتا، اور پھر ایک گروپ میری حفاظت کرتا، پھر بعد میں لاہور کی گلیوں میں غائب ہو جاتا۔ یہ ایک کھیل تھا مگر گرفتاری اور اس کے بعد ہونے والے نتائج وعواقب کا خوف بھی میرے ساتھ چمٹا رہتا۔ مگر یہ خوف مجھے روک نہیں سکا۔ تحریک کا جوش و جذبہ اور مجھ سے وابستہ دوسروں کی توقعات اور سب سے بڑھ کر ایک آمر کو چیلنج کرنے کی خوشی کسی طور پر چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ مگر بالآخر فروری 1969ء میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میں ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں میں بظاہر محفوظ تھا۔ میرے

گھر پر کمانڈوز سٹائل میں رات کو چھاپہ مارا گیا۔ وہ میرے کمرے میں کھڑکیوں اور پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔ انہوں نے میرے کمرے کو اتھل پتھل کر ڈالا۔ میرے باپ کو حراست میں لے لیا گیا۔ اسی دوران میرے ایک ہمسائے کا بچہ جب یہ دیکھنے آیا کہ یہاں کیا ہو رہا تو اسے بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ میرے والد کو پولیس سٹیشن میں لے گئے ہیں تو میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ مجھے ایک بدنام زمانہ ڈی۔ ایس۔ پی اصغر خان (ہلاکو خان) کی خدمت میں سول لائنز پولیس سٹیشن میں پیش کیا گیا۔ اس نے مجھے ایک سٹول پر بیٹھنے کو کہا اور ٹیبل لیمپ کا رخ میرے چہرے کی طرف کر دیا۔ اس نے اپنی چھڑی گھماتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر چیخ کر بولا تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟ مجھے اس کے سوال پر تعجب ہوا اور اسکی کرختگی اور مصنوعی پن سے دھمکانے کے انداز پر مجھے ہنسی آئی اور میں نے سوچا کہ اس نے بہت سی ڈراؤنی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن ہلاکو مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا' تنگ آ کر اس نے مارٹوف کاک ٹیل بم والا فارمولا استعمال کیا جو جرمنی اور فرانس میں انقلابی طلباء کے مابین بہت مقبول ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا' یہ کتاب تمہاری ہے؟۔ اسی سٹائل میں وہ ڈرامائی انداز میں مجھ پر چیختا چلاتا رہا اور مجھ سے یہ اعتراف کرانے میں ناکام رہا کہ میں ایک ٹراٹسکائٹ انقلابی تھا جو بم نصب کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا اور جس کے پاس کامریڈوں کا اپنا ایک خفیہ نیٹ ورک تھا۔ بالآخر اس نے مجھے حوالات میں بھیج دیا۔ میں نے دو راتیں وہاں گزاریں۔ یہ مکمل طور پر خالی جگہ تھی۔ نہ کوئی بستر ، نہ کوئی کمبل جسے میں فروری کی ٹھٹھرتی ہوئی راتوں میں اپنے کام لاتا۔ یہاں تک کہ کھڑکیاں اور دروازے بھی لوہے کی سلاخوں پر مشتمل تھے۔ وہاں کاغذ کا ایک ٹکڑا تک بھی موجود نہ تھا۔ ماسوائے ردی کے ایک پرانے اخبار کے ٹکڑے کے۔ میں نے رات کا زیادہ تر حصہ اٹیچ ٹوائلٹ میں گزارا جو بدترین بدبو کے باوجود بڑی حد تک گرم تھا۔ یہ قید میرے لیے ہلا دینے والی تھی مگر میں ایک اور پل عبور کر چکا تھا۔ میں اپنے ایک اور خوف پر قابو پا چکا تھا۔ ہمیں ہائی کورٹ کے حکم پر کچھ دنوں بعد ضمانت پر رہا کر دیا گیا مگر میں اندر سے تبدیل ہو چکا تھا۔ پیپلز پارٹی کے سرگرم جیالے عام طور پر طلباء رہنماؤں کو نرم مزاج سمجھتے تھے جو پولیس کے تشدد اور گرفتاریوں یا پھر پولیس اور دکانوں پر پتھراؤ سے گریز کرتے تھے۔ لیکن اب وہ مجھے قبول کرنے پر تیار ہو گئے، میں ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے اس وقت ان کے ساتھ شریک ہو گیا جب انہوں نے پنجاب سیکرٹریٹ پر دھاوا بولا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا پڑھا لکھا مقرر اب ایک شعلہ جوالہ بن کر

سامنے آچکا تھا۔ میرے اندر آنے والی یہ تبدیلی صرف ظاہری اور نعروں کی حد تک نہ تھی بلکہ یہ ایک حقیقی بامعنی اور ایک نظریاتی تبدیلی تھی۔ دنیا کو دیکھنے اور پرکھنے کے لیے اپنے سیاسی عقائد کے اعتبار سے میں ایک کمیونسٹ بن چکا تھا۔ میں نے مزدوروں کی طاقت اور عوام کی قوت کا بے پناہ مظاہرہ دیکھ لیا تھا۔ فروری کے آخر تک کارخانے میں کام کرنے والے مزدور شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئے تھے۔ لاہور کی مال روڈ سمیت شہر کے سبھی اہم مقامات ان کے کنٹرول میں آچکے تھے۔ وہ سڑکیں اور چوراہے جہاں کبھی ہم طالب علم حکمرانی کرتے تھے اب ان کے کنٹرول میں آچکے تھے۔ مزدوروں کے پیچھے پیچھے مارچ کے مہینے میں کسان اور کھیت مزدور بھی اس تحریک کا حصہ بن گئے تھے۔ اور یہ صرف لاہور میں نہیں ہو رہا تھا بلکہ سارے پاکستان میں عوام اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے عوامی مظاہرے ہر طرف ہر جگہ چھوٹے بڑے شہروں میں منعقد ہو رہے تھے۔ پولیس کے ساتھ جھڑپیں، روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ ہزاروں افراد گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں اپوزیشن کے سیاسی قائدین بھی شامل تھے۔ جنہیں ایوب خان کے نافذ کردہ ایبڈو قوانین کے ذریعے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ایوب خان نے گول میز کانفرنس کے ذریعے اپوزیشن کے ساتھ بات چیت اور مصالحت کی کوشش کی مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ عوامی تحریک کا سیلاب کسی کے روکے نہیں رک رہا تھا۔ مارچ کے آخر میں جنرل ایوب خان نے استعفیٰ دے دیا۔ مگر فوجی ہونے کے ناطے سے اس نے اپنی جگہ جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دی تھی۔ میں بھی دوسرے طالب علم لیڈروں کی طرح اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ ایک جنرل کی دوسرے جنرل سے تبدیلی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ہم جرنیلوں کی نہیں نظام کی تبدیلی کے لیے لڑ رہے تھے' ایک جمہوری منصفانہ اور سوشلسٹ نظام کے لیے۔ جلد ہی لوگ یحییٰ حکومت کو پہچان گئے اور احتجاج دوبارہ شروع ہو گیا۔

میں اب ایک بائیں بازو سے وابستہ NSF اور ینگ پیپلز فرنٹ کا ممبر تھا۔ یہ چھوٹا سا بائیں بازو کا گروپ ڈاکٹر عزیز الحق نے تشکیل دیا۔ بھٹو اور بنگالی انقلابی لیڈر بھاشانی یحییٰ حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ جبکہ جماعت اسلامی جو اس وقت کے وزیر اطلاعات جنرل شیر علی کی آشیر باد سے کام کر رہی تھی نے یہ فیصلہ کیا کہ کمیونسٹ ان کے سب سے بڑے دشمن اور فوجی حکمران ان کے دوست اور اتحادی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی عوامی تحریک کی قیادت کر رہی تھیں جبکہ جماعت اسلامی فوجی حکومت کے ساتھ ان کی وحشیانہ بربریت میں مکمل امداد و معاونت کر رہی تھی۔ بالآخر ہم طلباء کا ایک اہم مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی یونین بحال کر کے الیکشن کا اعلان کر دیا

گیا۔ مگر بہت جلد یہ واضح ہو گیا کہ یحییٰ حکومت اسلامی جمعیت طلباء کو پنجاب یونیورسٹی میں مسلط کرنا چاہتی ہے۔ جب ہم نے دھاندلی زدہ، بدنیتی پر مبنی الیکشن پر احتجاج کرنا چاہا تو ہمیں ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اس بار ہمارا مقدمہ ایک فوجی عدالت میں چلایا گیا۔ ہم نے اس عدالت کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے بہادری سے مقدمہ کا سامنا کیا۔ اس بار میں نے دو مہینے جیل میں گزارے۔ اب ہم باقاعدہ طور پر ایک جمہوری تبدیلی کے لیے جدوجہد کرنے والی مقبول عام انقلابی تحریک کا باقاعدہ حصہ بن گئے تھے۔ جیل میں گزرے ہوئے اس وقت نے مجھے سیاسی کارکنوں، بڑے نامی گرامی مجرموں اور بے یارومددگار قیدیوں سے میل جول کا موقع فراہم کیا۔ یہ قید میرے لیے یونیورسٹی ڈگری کے بعد سیاسی عمل کی تربیت گاہ ثابت ہوئی۔ جیل کے یہ میرے ساتھی بعد میں میرے ڈراموں کا کردار بھی بنے۔ جیلوں کی نگرانی کے انتظام نے مجھے ایک غیر معمولی بصیرت عطا کی۔ جس کے بعد میں اپنے ملک کے سیاسی اور سماجی نظام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگا۔ جب میں رہا ہوا تو میں نے اپنے آپ سے انقلابی نظریات کے لیے اور زیادہ بڑھ چڑھ کر کام کرنے کا عہد کیا۔ میں رہائی کے فوری بعد مزدوروں اور کسانوں کی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والی تاریخ ساز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے پہنچ گیا۔ سرخ پگڑیاں اور ٹوپیاں پہنے ہوئے مزدوروں، جوش اور جذبے سے لبریز طالب علموں، سخت کوش اور جرأت مند ٹریڈ یونینسٹوں اور سوشلسٹ دانشوروں کا یہ ایک ایسا اجتماع تھا جہاں سب کے سب انقلابی تبدیلی کے مقصد سے لبریز تھے۔

اکتوبر 1968ء سے مارچ 1969ء تک ایک تاریخ ساز عرصہ تھا۔ یہ پاکستان کے عوام کی ایک آمر کے خلاف پہلی جدوجہد تھی۔ یہ پہلی تحریک تھی جسے طلباء نے شروع بھی کیا اور رہنمائی بھی کی۔ یہ تحریک اپنی بنیاد میں پاپولر اور بائیں بازو سے وابستہ تھی۔ اس دوران دائیں بازو کی قوتیں چپ سادھے رہیں اور کچھ کرنے کے قابل نہ تھیں۔ اس تحریک نے طالب علموں کی پوری نسل کو انقلابی بنا دیا۔ جنہوں نے بعد میں پاکستان کی مستقبل کی سیاست کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے کئی آج بھی ملکی سیاسی پارٹیوں میں اہم عہدوں پر ہیں۔ انہی میں سے کئی ایک نے ثقافت، تعلیم و تدریس اور ادب و فن کے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ فنکاروں، لکھاریوں، شاعروں، صحافیوں، مفکروں، سیاسی کارکنوں، ٹریڈ یونینسٹوں، ہر شکل میں ان کے اندر 1968ء کے انقلاب کی روح موجزن ہے۔ جس انقلاب کا ہم نے خواب دیکھا اور جس کے لیے ہم نے جدوجہد کی، وہ نہیں آ سکا۔ عالمی انقلاب کے شکست کھانے میں کئی بڑی وجوہات تھیں۔ مگر 1968ء کے انقلاب نے ہماری زندگیوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ میرے

لیے تو یہ انقلاب ایک مکمل انقلاب ثابت ہوا۔ میں اور میرے بے شمار ساتھی اپنے اپنے انداز میں اپنی اپنی جگہوں پر ابھی تک انقلاب کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔''

جام ساقی (حیدرآباد)

کامریڈ جام ساقی برصغیر پاک و ہند کے معروف ترین بائیں بازو کے لیڈروں میں سے ایک ہیں۔ نوے کی دہائی کے شروع تک جام ساقی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ہر پاکستانی حکومت خاص طور پر فوجی حکومتوں نے انہیں اپنے جبر و تشدد کا نشانہ بنائے رکھا۔ جنرل ضیاء کے وحشیانہ دور حکومت میں جام ساقی نے آٹھ سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اب وہ عالمی مارکسی رجحان کے ایک سرگرم ممبر ہیں۔ سندھ کی بائیں بازو کی سیاست میں وہ ایک معتبر نام ہیں۔ سندھ کے ہر گھر میں ان کا احترام کیا جاتا ہے وہ 69-1968ء کی تحریک کے صرف چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ سرگرم کردار بھی رہے ہیں، جس نے ایوب خان کی حکومت کی بنیادوں کو نہیں بلکہ پاکستان کے سرمایہ دارانہ نظام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جام ساقی ان دنوں ایک سرگرم طالب علم لیڈر تھے۔ تحریک کے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے مصنف کو انہوں نے بتایا:

''4 مارچ 1967ء کو مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور سماج کے دوسرے کچلے ہوئے طبقات نے سندھ میں ایک تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے مطالبات و مقاصد میں آمریت کا خاتمہ اور سماج میں سوشلسٹ معاشی اور سماجی تبدیلیاں لانا تھا۔ کامریڈ جام ساقی نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا جب تحریک شروع ہوئی تو میں ایک طالب علم لیڈر تھا۔ ہم مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کا دورہ کر کے طالب علموں اور نوجوانوں کو تحریک میں شمولیت کے لیے آمادہ کرتے۔ صورتحال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ صرف اخبار میں پریس ریلیز لگنے سے ہی طالب علم اور مزدور ہڑتال کر دیا کرتے تھے۔ جب تحریک شروع ہوئی تو میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی صوبہ سندھ کی کمیٹی کا سیکرٹری تھا۔ پارٹی کی مرکزی قیادت نے طلباء مزدور کسان رابطہ کمیٹی قائم کی تھی تاکہ ایک دوسرے کے کام کو جدوجہد کے مرحلہ میں باہم جوڑا اور مربوط کیا جائے۔ سندھ ہاری کمیٹی جسے حیدر بخش جتوئی نے قائم کیا تھا، ان کی بھرپور حمایت کر رہی تھی۔ بھٹو بھی سیاست میں متحرک تھا۔ لیکن تحریک کے شروع ہونے تک وہ اتنا مقبول نہیں تھا۔ تحریک نے اسے مقبولیت دی کیونکہ وہ سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں عوام کا انقلابی ابھار بھٹو کو متاثر کرتے ہوئے

اسے زیادہ سے زیادہ اور دن بدن بائیں بازو کی طرف کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ جام کے الفاظ میں تحریک کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ پولیس اور فوج کو کسی بھی غریب اور مجبور شخص کے ساتھ بدتمیزی کرنے کی جرأت نہیں تھی جو اس سے پہلے روزمرہ کا معمول ہوتی تھی۔ جام نے بتایا کہ پاکستان ریلوے کے مزدوروں کی ٹریڈ یونین سب سے بڑی اور موثر ترین یونین تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ 1967ء کی ریلوے مزدوروں کی ہڑتال ان بڑے واقعات میں سے ہے جو اسے ابھی تک زبانی یاد ہیں۔ یہ ایک بہت ہی مشہور ہڑتال تھی، دوسری بڑی موثر ٹریڈ یونین واپڈا کے مزدوروں کی تھی ان دونوں یونینوں نے دیگر چھوٹی یونینوں کے ساتھ مل کر سرمایہ دارانہ نظام اور ریاست کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے جام نے بتایا کہ پاکستان ریلوے کے مزدور جب ہڑتال پر تھے تو انتظامیہ نے ہڑتال کو توڑنے کے لیے ٹرینوں کو زبردستی چلانے کی کوشش کی۔ روہڑی ریلوے سٹیشن پر ریلوے کے مزدور ریل کی پٹڑی پر لیٹ گئے اور ریلوے ٹریفک کو بلاک کر دیا۔ یہ اس تحریک کے جوش جذبے اور جرأت کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس وقت واپڈا اور ریلوے کے مزدوروں کی حمایت کا رخ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی طرف تھا۔ لیکن ان کی ٹریڈ یونین پارٹی ڈسپلن کی پابند نہیں تھی صرف ایک آل پاکستان ٹریڈ یونین آرگنائزیشن کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ 14 فروری 1969ء کو پاکستان کی دائیں اور بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں پر مشتمل ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی نے ایک ہڑتال کی کال دی۔ کمیونسٹ پارٹی نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ بھی اس ہڑتال میں شریک ہوگی اور اس ہڑتال میں مزدور طبقہ کی شرکت کو یقینی بنائے گی۔ کمیونسٹ پارٹی کے دو لیڈر جن میں سے ایک معروف ٹریڈ یونین لیڈر شمیم واسطی تھے اور دوسرے ڈاکٹر اعزاز نذیر تھے ان کو ایکشن کمیٹی کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے بھیجا گیا۔ اس میٹنگ میں انہوں نے صنعتی مزدوروں کو ہڑتال میں شریک کرنے کی تجویز نہیں رکھی۔ اگر صنعتی مزدور اس ہڑتال میں شریک ہو جاتے تو یہ ایک بہت ہی کامیاب عام ہڑتال ثابت ہوتی جس سے کمیونسٹ پارٹی کو وسیع عوامی حمایت بھی حاصل ہوتی اور وہ عوامی ابھار کے ان لمحات میں ایک بڑی قوت بن کر سامنے آجاتی۔ اس گفتگو میں جام ساقی نے بتایا کہ اس تحریک کے دوران جب وہ طالب علم لیڈر تھا تو ریاستی ایجنسیوں نے اسے مختلف قسم کی مراعات اور رشوتیں دینے کی پیش کش کی۔ اسے ڈھاکہ یا پشاور یونیورسٹی میں سکالرشپ کی پیش کش کی گئی اس کے انکار پر اسے ڈپٹی کمشنر کا عہدہ بھی پیش کیا گیا بشرطیکہ وہ صرف سول سروسز کے امتحان میں شامل ہو جائے۔ لیکن اس نے ہر قسم کی رشوت اور بدعنوانی سے صاف انکار کر دیا۔

تحریک کے ان دنوں میں رجعتی قوتیں اور مذہبی انتہا پسند شکست خوردگی کے عالم میں تھے اور دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ عوام کے انقلابی جوش اور جذبے کو دیکھتے ہوئے ملاؤں اور ان کی سیاسی پارٹیوں مثلاً جماعت اسلامی کو بائیں بازو کا مقابلہ کرنے کی توفیق ہی نہ رہی تھی۔ رجعتی مذہبی پارٹی، جماعت اسلامی نے حیدر آباد میں 1967ء میں ایک مظاہرہ منظم کیا۔ اسے تعلقہ سے لے کر گڑھی کھادا کے علاقے تک مارچ کرنا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ جمال عبدالناصر کی تصاویر جلانا چاہتے ہیں۔ ناصر مصر کا وہ صدر تھا جس نے مذہبی انتہا پسندوں کے مصری انقلابیوں پر کیے جانے والے فاشسٹ حملوں کو سختی سے کچل دیا تھا۔ جام ساقی کے بقول اگرچہ تمام جلوس اس کے پیچھے تھا۔ اور ان کی پیروی کر رہا تھا لیکن کسی کو جمال کی تصویریں جلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ جبکہ ہم صرف دس ساتھی اس جلوس میں شریک تھے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ جانتے تھے کہ ہماری عوام میں خاصی توقیر ہے۔ اور اگر انہوں نے ہماری مخالفت کی تو لوگ ان کیخلاف ہماری حمایت کریں گے۔ کامریڈ جام ساقی کا اب کہنا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی قیادت سمیت دیگر بائیں بازو کی پارٹیوں کی 69-1968ء کی تحریک کے دوران سب سے بڑی کمزوری ان کا دو مرحلوں کا نظریاتی موقف تھا' جس کی وجہ سے وہ تحریک کے سوشلسٹ کردار کو سمجھنے میں بری طرح ناکام رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک پر ذوالفقار علی بھٹو کو حاوی ہونے کا موقع مل گیا۔ کمیونسٹ پارٹی اور اس کی قیادت یہ سوچ رہی تھی کہ تحریک صرف ایوب خان حکومت کے خلاف ایک ردعمل کے سوا کچھ نہیں اور اس نظام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا مگر وہ اس تحریک کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق ایک واضح پروگرام دینے میں ناکام رہے۔ یہ تحریک اپنی فطرت میں سوشلسٹ تھی۔ یہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کی ایک فاش اور بھیانک غلطی تھی۔ بھٹو اس وقت بہت سے کمیونسٹوں کو پیپلز پارٹی کی طرف جیتنے میں کامیاب رہا جس میں جام ساقی بھی شامل تھا۔ بھٹو نے دوسری بار جام ساقی اور سوبھو گیان چندانی کو الیکشن میں پارٹی کی ٹکٹ آفر کی جو انہوں نے مسترد کر دی۔ کامریڈ جام ساقی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کمیونسٹ پارٹی تحریک کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہی۔ اگر وہ نظریہ مسلسل انقلاب کو سمجھ لیتے اور اس تناظر میں انقلابی کیڈر اور نوجوانوں کو تیار کرتے تو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان تیزی کے ساتھ عوامی حمایت بھی حاصل کر لیتی اور انقلاب کو ایک سوشلسٹ فتح سے بھی ہمکنار کر لیتی۔ سٹالنسٹ فلسفے کی بدولت وہ پاکستان کی تاریخ کے اس اہم اور فیصلہ کن موڑ پر فاش غلطی کر گئے۔

خاور نعیم ہاشمی (لاہور)

خاور نعیم ہاشمی پاکستان کی اردو صحافت کا ایک معتبر نام اور لاہور میں جیو ٹیلی ویژن کا بیورو چیف ہے اس نے ضیاء آمریت کے خلاف جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ 13 مئی 1978ء کو فوجی جنتا کی طرف سے اسے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں مکمل برہنہ کر کے سرعام کوڑے مارے گئے تھے۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ آزادی اظہار کا علم بردار تھا۔ 1968ء میں وہ این ڈی اسلامیہ ہائی سکول اچھرہ موڑ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا' جہاں سے وہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں داخل ہوا۔ تحریک کے دوران سول لائنز کالج سے تقریباً بیس اساتذہ اور پچاس طلباء ایوب آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے اور سوشلسٹ ہونے کے الزام میں نکال دیئے گئے۔ ان میں مشہور استاد ایرک سپرین، پروفیسر منظور حسین اور امین مغل بھی شامل تھے۔ بعد میں ان اساتذہ نے لارنس روڈ پر شاہ حسین کالج قائم کر لیا جو بہت جلد سیاسی اور نظریاتی بحث مباحثوں اور احتجاجی سیاست کا مرکز بن گیا۔ 69-1968ء کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے خاور نعیم ہاشمی نے بتایا کہ ان دنوں کالج اور سکول کے طلباء انتہائی جوش، جذبے اور ولولے سے لبریز تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی رکنیت کے فارم چار آنے میں دستیاب تھے۔ خاور کے بقول اگرچہ میں بالغ نہیں تھا کہ اپنا ووٹ کاسٹ کر سکوں مگر میں نے پیپلز پارٹی کی ممبر شپ حاصل کر لی تھی۔ میں بڑے ذوق وشوق اور جوش وجذبے کے ساتھ اپنے سکول کے ساتھیوں کے ہمراہ ہڑتال اور مظاہروں میں شریک ہوتا تھا۔ خاور کے والد نعیم ہاشمی 50ء سے 70ء کی دہائی تک کے ایک معروف ترقی پسند اداکار تھے۔ جنہوں نے اپنا اداکاری کا کیریئر تقسیم سے پہلے کلکتہ سے شروع کیا تھا جب کہ بعد میں وہ لاہور میں منتقل ہو گئے تھے۔

ایک فلمی نقاد اور مورخ کے طور پر خاور نے ثقافتی ماحول میں انقلابی تحریک کے ابھار سے پیدا ہونے والے اثرات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ شاید فلم' ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے فنکار، پینٹرز، رقاص اور موسیقار یہ سب لوگ اس وقت کی انقلابی تحریک سے شدید متاثر ہو رہے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے فلم اور فنون کے مختلف شعبوں میں اپنی بہترین صلاحیتوں اور کاوشوں کے ساتھ کیا۔ 1968ء میں سو سے زیادہ فلمیں ریلیز ہوئیں' جس میں سے 64 اردو فلمیں تھیں جو پاکستانی فلم کی تاریخ میں ایک سال میں بننے والی ریکارڈ تعداد ہے۔ نامور مصنف ریاض شاہد کی فلم ''زرقا'' 1969ء میں ریلیز ہوئی جو پاکستان

کی سب سے پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم قرار پائی، جس کی کراچی میں مسلسل 101 ہفتے نمائش ہوئی۔ اپنی مقبولیت میں فلمی مورخوں کے نزدیک یہ اب بھی ریکارڈ ہولڈر فلم ہے۔ یہ فلم فلسطین کی تحریک مزاحمت کے موضوع پر بنائی گئی۔ یہ فلسطین کے ان لوگوں کے بارے میں تھی جو اسرائیلی قبضے اور تسلط کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ اس فلم کے گیت مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب نے تحریر کیے تھے۔ جس کا ایک مشہور گانا ''رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔۔۔'' عظیم گلوکار مہدی حسن نے گایا۔ جس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ علاقائی فلمیں بھی بڑی تعداد میں بن رہی تھیں جن میں پشتو، بنگالی اور سندھی فلمیں شامل تھیں۔ لاہور کی فلمی صنعت میں مشرقی پاکستان کے فنکاروں کا راج تھا اور وہ پورے ملک میں انتہائی مقبول تھے۔ نہ صرف فلموں بلکہ ادب کی دوسری صفوں میں بھی اس عوامی انقلابی تحریک نے انتہائی گہرے نقوش مرتب کیے۔ مشہور مصور صادقین نے اپنی زندگی کی بہترین پینٹنگز انہی دنوں میں بنائیں۔ یہ عظیم الشان پینٹنگز 1967ء میں منگلا ڈیم کی دیواروں اور 1968ء میں پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کی چھت پر بنائی گئیں۔ صادقین نے چالیس کی دہائی میں ہی پروگریسو، رائیٹرز اینڈ آرٹسٹ موومنٹ میں شمولیت کر لی تھی۔ بشیر مرزا نے بھی سماج کے اندر سے پھوٹنے والی اس انقلابی تحریک سے متاثر ہو کر اپنے قلم سے شاہکار تخلیق کیے۔ 1965ء کی جنگ پر مبنی تصاویر کی سیریز میں انہوں نے جنگ کی تباہی اور بربادیوں کو انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ انہیں اپنے فن میں کمال اور یکتائی حاصل تھی، جسے عوام میں بے پناہ مقبولیت اور شہرت میسر آئی۔ ان کا ایک اور بڑا شاہکار، پورٹ فولیو آف پاکستان 1967ء میں سامنے آیا۔ پاکستان کے مختلف صوبوں سے عام لوگوں کے پورٹریٹ جو قلم اور سیاہی سے بنائے گئے تھے بہت مقبول ہوئے۔ پاکستان کی تاریخ کا سب سے مقبول مصور شاکر علی بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے کام نے اس وقت لاہور کے باقی فنکاروں پر اثرات مرتب کیے۔

خاور نعیم ہاشمی کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں پاکستانی فلموں کی ہیروئن بھی مارلن منرو اور مدھو بالا کی طرح حسین اور جوان ہوا کرتی تھیں۔ مسرت نذیر، صبیحہ خانم، نیلو اور نیر سلطانہ لوگوں کے دلوں میں رہا کرتی تھیں۔ فلم بینوں کے عشق بھی بدلتے تھے حسن اس قدر فراوانی میں تھا کہ ایک چہرے پر مرکوز رہنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

کنیز فاطمہ (کراچی)

مصنف کے ساتھ اپنے انٹرویو میں کراچی میں بات کرتے ہوئے کنیز فاطمہ نے اپنی کہانی کچھ یوں بیان کی:

''میرا تعلق ٹریڈ یونینسٹوں اور کمیونسٹوں کے ایک مشہور خاندان سے تھا۔ میرا والد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ایک سرگرم رکن تھا' جسے انڈین نیشنل کانگریس میں کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میرے والد نے ریاست کے خلاف سرگرمیوں کے الزام میں چودہ سال قید کی سزا کاٹی تھی۔ میرا بڑا بھائی بھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔ اپنے اس سیاسی پس منظر کی وجہ سے میں نیشنل عوامی پارٹی میں اوائل عمر میں ہی شامل ہوگئی تھی۔ میری پہلی سیاسی سرگرمی کراچی میں 1963ء کی مزدوروں میں تحریک میں شمولیت تھی۔ سکیورٹی پرنٹنگ پریس کراچی میں یہ ہڑتال کئی دنوں تک جاری رہی۔ اپنے مفاد پرستانہ کردار کی وجہ سے پرانی قیادت مزدوروں پر عیاں ہوچکی تھی اور وہ اپنی ساکھ کھو چکے تھے اور ایک نئی قیادت پیدا ہوچکی تھی۔ میں مزدوروں کے اہل خانہ کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لئے وہاں گئی جو پچھلے تین مہینوں سے ہڑتال کیے ہوئے تھے۔ میں نے اس علاقے کی سبھی عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کیا اور ان سب کو ریگل چوک پر لے آئی اور جھولی فنڈ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ مزدوروں کی بیویوں اور بہنوں کی گودوں میں ان کے چیختے اور چلاتے ہوئے ننھے بچے تھے۔ اس عمل کے ذریعے ہم نے نہ صرف بہت سا فنڈ اکٹھا کیا بلکہ مزدوروں کے علاقے سے بے شمار ہمدردیاں بھی جیتیں۔ تیسرے دن جب ہم فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے گئے تو مزدوروں کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے تھے۔ مولانا بھاشانی نے اپنے کراچی دورے کے دوران ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے اپنی پارٹی کے ٹریڈ یونین بیورو میں کام کرنے کا کہا' جس کے بعد میں رشید ٹیکسٹائل ملز اور دوسرے کارخانوں میں گئی اور وہاں گیٹ میٹنگز شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ میں لیبر کالونیوں میں جانے لگی اور سٹڈی سرکل کرنے شروع کر دیئے۔ ایوب آمریت کے دوران مجھے کئی بار گرفتار اور شہر بدر کیا گیا جبکہ مزدوروں کے حق میں آواز بلند کرنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کی پاداش میں صنعت کاروں نے کئی بار میری جان لینے کی کوشش کی۔

1966ء میں ہم نے مختلف صنعتوں میں کام کرنے والی مزدور عورتوں کی ایک بہت بڑی ریلی نکالی اس وقت مکمل اختیارات کے حامل کراچی کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ ڈی سی نے مجھ سے

کہا کہ اس کے پاس مکمل اختیارات ہیں اور وہ مجھے تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر پیپر ویٹ اٹھا کر مارا اور اسے کہا کہ طاقت تمہارے پاس نہیں میرے پاس ہے۔ اگلے دن مجھے شہر سے نکال کر ٹھٹھہ روانہ کر دیا گیا۔ وہاں بھی میں نے مزدوروں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ میری سب سے بڑی قوت کراچی شپ یارڈ کے مزدوروں کی یونین تھی جو ایک پر جوش کردار کی حامل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے کراچی میونسپل کارپوریشن کے میونسپل ملازمین کو بھی منظم کیا۔ میں مشرقی پاکستان بھی گئی جہاں میں نے سبھی بائیں بازو کی پارٹیوں کی نمائندہ سنتوش کانفرنس میں شرکت کی تاکہ مزدور تحریک کی نئی حکمت عملی مرتب کی جا سکے۔ حکومتی اہلکاروں نے مجھے ڈھاکہ ائیر پورٹ سے باہر آنے کی اجازت نہ دی۔ مگر میرے استقبال کے لیے آنے والے لوگوں نے ائیر پورٹ کے دروازے توڑ کر مجھے اپنے ساتھ لیا اور کانفرنس تک لے گئے۔ اس وقت یہ نعرہ لگا ''دروازے بھان دو' کنیز فاطمہ کو آن دو''۔

میں 67ء میں کراچی واپس آئی اور مزدور سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ 69ء میں یحییٰ حکومت نے ایک بار پھر مجھے کراچی سے شہر بدر کر دیا۔ مجھے میری غیر موجودگی میں شپ یارڈ یونین کا صدر منتخب کیا گیا اور جب میں واپس آئی تو کراچی شپ یارڈ پر ساڑھے سات ہزار مزدوروں نے میرا استقبال کیا۔

کنیز فاطمہ کا مزدور تحریک میں موثر کردار تھا۔ بلاشبہ وہ مزدوروں کی ایک معروف رہنما تھی اور ایوب حکومت کے خلاف مزاحمت میں اس کا بھرپور کردار تھا۔ لیکن نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کی ماؤاسٹ زوال پذیری کی وجہ سے وہ مرکزی کردار ادا نہ کر سکی۔ وہ اپنی پارٹی کی مرکزی نائب صدر تھی اور ان کا ایوب خاں کی حکومت کے خلاف رویہ ہمدردانہ تھا۔ کیونکہ ایوب کے چینی سٹالنسٹ قیادت کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ مصنف سے اپنے انٹرویو کے دوران کنیز فاطمہ نے کہا کہ میں نے بھاشانی پر زور دیا کہ وہ چین جائے اور ایوب اور چینی حکومت کے درمیان معاہدہ ختم کرائے۔ جس پر پہلے تو مولانا راضی نہ ہوا۔ وہ کراچی میں تھا اور سخت بیمار تھا اور میں اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ چین جانے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ بالآخر وہ راضی ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے اسلام آباد فون کیا اور مولانا کی چین جانے کی خوش خبری سنائی۔ ہم سب بہت خوش تھے۔(4)

ماؤزے تنگ کے ساتھ اپنی ملاقات کے بعد مولانا بھاشانی ایوب کے خلاف موثر احتجاج نہیں کر سکا اور مایوس ہو کر واپس اپنی کشتی میں سوار ہو گیا' جس کے بعد وہ کبھی باہر نہ نکل سکا۔ جس کے نتیجہ

میں بورژ وا قوم پرست مجیب الرحمٰن اور اس کی پارٹی عوامی لیگ نے مشرقی بنگال میں تحریک پر کنٹرول حاصل کرلیا۔

پی۔آئی۔اے سے تعلق رکھنے والے معروف ٹریڈ یونین لیڈر جی۔ایم انجم نے مصنف کو بتایا کہ سبھی یونینیں ایوب کے خلاف ہڑتال کرنے کے لیے تیار تھیں سوائے ان یونینوں کے جن کی قیادت ماؤاسٹ پارٹیاں کررہی تھیں۔جس کی ایک مثال پی۔آئی۔اے کی طفیل عباس کی یونین ہے۔

فاطمہ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والی کسان کانفرنس کے حوالے سے بھی بات کی۔انہوں نے بتایا کہ میں مولانا بھاشانی اور مرزا ابراہیم کے ساتھ ایک اونٹ گاڑی پر سوار ہوکر ٹوبہ ٹیک سنگھ جارہی تھی کہ راستے میں نوجوان لڑکوں کا ایک گروپ پیپلز پارٹی کے جھنڈے اٹھائے بھٹو بھاشانی بھائی بھائی کے نعرے لگاتا ہوا ملا' جس پر مولانا بھاشانی سخت غصے میں آگئے اور ان لڑکوں سے پیپلز پارٹی کے جھنڈے چھین کر پھینک دیئے اور کہا کہ بھاشانی کبھی بھی ایک جاگیردار اور زمیندار کا بھائی نہیں بن سکتا۔میں مزدوروں اور کسانوں کا بھائی بنوں گا۔(5) اس واقعہ سے مہم جوئی اور موقع پرستی کے درمیان تال میل صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔70ء کے الیکشن میں کنیز فاطمہ نے نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا اور وہ تیسرے نمبر پر آئی۔کراچی کے اس حلقے سے جماعت اسلامی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔الیکشن ہارنے کے بعد بھاشانی نے مجھ سے پوچھا کیا کراچی میں گوریلا جنگ کرنا ممکن ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔۔۔یہاں تو نہیں۔ہاں البتہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے کچھ علاقوں میں ممکن ہے۔۔۔بھاشانی نے مجھے جواب دیا کہ اس کا مطلب ہے کہ یہاں انقلاب ممکن نہیں۔''(6)

الیاس خان (ملتان)

ملتان سے تعلق رکھنے والے انقلابی مارکسسٹ الیاس خان ان انقلابی دنوں میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ملتان بھی اس انقلاب کے دوران مظاہروں، احتجاجوں اور جدوجہد کا مرکز تھا۔ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تاریخی کانفرنس میں ملتان اور گردونواح کے سینکڑوں کسانوں نے تاج لنگاہ، رب نواز چاون، نور محمد چوہان، پرویز آفتاب، ملک الطاف علی کھوکھر اور محمود نواز بابر کی قیادت میں شرکت کی تھی۔ملتان میں مزدوروں نے کئی فیکٹریوں پر قبضے کرلیے تھے جن میں اللہ وسایا ٹیکسٹائل ملز، اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز شامل تھی۔ان میں خان محمد نثار، عزیز نیازی، پرویز آفتاب اور دیگر شامل تھے۔

شیخ رشید اپنی کتاب ''جہد مسلسل'' میں لکھتا ہے کہ اس نے پنجاب کے مزدوروں اور کسانوں کی ایک میٹنگ بلائی اور اس میں صوبے بھر کی تمام فیکٹریوں اور جاگیروں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت بھٹو ڈھاکہ میں تھا مگر جب واپس آیا تو شیخ رشید کے ساتھ اس فیصلے پر بہت ناراض ہوا اور قبضہ کرنے کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ فیصل آباد میں مختار رانا اور اس کی بہن کی قیادت میں فیکٹریوں پر مزدوروں نے قبضے کیے تھے۔ ہالہ' سندھ کے شہر میں بھٹو نے پارٹی کی کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں آئندہ الیکشن میں حصہ لینے پر بحث ہوئی۔ بائیں بازو کے کچھ لیڈر انقلاب کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے اور ان کے مطابق پارٹی کو انتخاب کی بجائے انقلاب کی طرف قدم بڑھانا چاہیے تھا۔ انہوں نے برچھی یا پرچی کا نعرہ بلند کیا۔ مگر دائیں بازو کے لیڈروں کے تسلط کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ انقلاب نہیں بلکہ انتخاب کی جانب پیش قدمی کی جائے۔ پیپلز پارٹی کے کچھ بائیں بازو کے لیڈر بھٹو کی شخصیت سے انتہائی متاثر تھے انکی اس کمزوری کی وجہ سے اس بھیانک پالیسی پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا گیا۔

کرامت علی (کراچی)

کرامت علی ایک معروف سرگرم ٹریڈ یونینسٹ اور پاک بھارت عوام دوستی برائے امن کے علمبرداروں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ 69-68ء کی تحریک کا ایک اہم کردار بھی ہے۔ وہ پاکستان میں اس وقت کے چند ایک ٹراٹسکائیٹوں میں سے ایک تھا۔ مصنف کے ساتھ اپنے انٹرویو میں اس نے ان پر جوش دنوں کے حالات کے بارے میں بتایا:

''ایوب آمریت کے دس سالہ دور کے خلاف جنم لینے والی 69-1968ء کی انقلابی تحریک پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی عوامی تحریک تھی۔ یہ اس لحاظ سے منفرد تھی کہ اس کی ابتدا طالب علموں نے کی تھی اور بعد میں تقریباً چھ ماہ تک مزدوروں کی غیر معمولی شراکت کی حامل رہی۔ تحریک کا سماجی اور سیاسی مزاج مزدور طبقے کی امنگوں اور خواہشات کا شروع سے ہی واضح طور پر اظہار کر رہا تھا کہ وہ کیا چاہ رہے تھے؟ اس کے مطالبات اور نعرے کسی شک وشبہ کے بغیر مزدوروں، کسانوں اور نچلے درمیانے طبقے کی اس ضرورت کی عکاسی کرتے تھے کہ وہ ایک باعزت زندگی' سماجی انصاف' برابری اور سب کے لیے آزادی کے طلب گار تھے اور اکثر وبیشتر ان مطالبات کا براہ راست اظہار وہ ملک میں سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ تحریک نے اپنا آغاز اکتوبر 68ء کے پہلے ہفتے میں کیا۔ جب نیشنل سٹوڈنٹ

فیڈریشن (NSF) میں کراچی میں ہفتہ مطالبات منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ان دنوں NSF طلباء کی انتہائی موثر انقلابی تنظیم تھی۔اس کے باوجود یہ دو دھڑوں معراج گروپ اور کاظمی گروپ میں تقسیم تھی۔بنیادی طور پر یہ تقسیم چین اور روس کے باہمی تنازعے کی عکاسی کرتی تھی جس نے پوری دنیا میں کمیونسٹ تحریک میں پھوٹ ڈال دی تھی۔تاشقند معاہدے کے فوری بعد ہی پس منظر میں رہنے والی یہ پھوٹ کھل کر سامنے آ گئی۔یہ معاہدہ پاکستانی اور بھارتی حکمرانوں کے مابین ستمبر 65ء کی جنگ کے بعد تشکیل پایا تھا۔اس معاہدہ کی دلالی روسی قیادت نے کی تھی۔اس لیے پیکنگ کے حمایت یافتہ ماؤاسٹوں نے اس معاہدے کی مخالفت کرنا اپنا نصب العین قرار دے دیا۔معراج گروپ، پیکنگ نواز اور کاظمی گروپ ماسکو نواز تھا۔اس دوران صدر ایوب کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے تاشقند معاہدہ کی مخالفت کر دی۔لہذا اسے کابینہ سے نکال دیا گیا۔جس پر بھٹو نے اس معاہدے اور ایوب حکومت کے خلاف عوام میں جانے کا فیصلہ کیا اور اپنی نئی سیاسی پارٹی ''پاکستان پیپلز پارٹی'' قائم کر لی جسکی معاونت انقلابی طلباء رہنماؤں مثلاً معراج محمد خان اور ٹریڈ یونینسٹوں سمیت کچھ بائیں بازو کے دانشوروں نے کی۔بھٹو نے معاشی اصلاحات کا ایک انقلابی پروگرام تشکیل دیا اور اسے سوشلسٹ رنگ روپ دینے کے ساتھ ساتھ بھارت دشمن جذبات ابھارتے ہوئے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد خاص طور پر پیکنگ نواز طلباء اور مزدور رہنماؤں اور کارکنوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔تمام تر تقسیم اور اختلاف کے باوجود بایاں بازو پاکستان کی طلباء اور مزدور تنظیموں پر حاوی رہا۔ایوب حکومت کے دس سالہ جشن ترقی کے مقابلے اور جواب میں NSF نے ہفتہ مطالبات منانے کا اعلان کیا۔NSF معراج گروپ جواب رشید گروپ کہلاتا ہے کے ایک ممبر کے طور پر میں جناح کالج ناظم آباد کراچی میں ایک طالب علم تھا۔اس سال NSF کالج میں طلباء یونین کا الیکشن جیت چکی تھی۔NSF کے کچھ بہترین قائدین کا تعلق ہمارے کالج سے تھا۔ان میں طلباء یونین کا صدر ضیاء اللہ، ممتاز میکھڑی، جو اس وقت کا عظیم احتجاج کرنے والا لیڈر تھا اور بصیر نوید شامل ہیں۔

ہفتہ مطالبات کے پہلے دن ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے کالج کے بالمقابل واقع بورڈ آف سیکنڈری انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے ہال میں ایوب خان کو اس کی تعلیم کے شعبہ میں خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے۔کالج کے طلباء اس سیمینار میں چلے گئے اور وہاں جا کر نعرے بازی شروع کر دی۔اس کے بعد برنس روڈ پر جلوس نکالا گیا جہاں کئی کالجوں کی عمارتیں واقع ہیں، وہاں سے بڑی تعداد میں طالب علم ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔اور اس طرح یہ جلوس ڈی۔جے۔کالج

تک پہنچا جہاں ہزاروں طلباء اس میں شریک ہوئے۔ ہمارے لیے بھی اتنی بڑی تعداد حیران کن تھی۔ اس جلوس نے آنے والے دنوں کے امکانات کو بھی مزید واضح اور وسیع کر دیا تھا۔ اگلے چھ دن تک شہر کے ہر کونے میں واقع سکولوں اور کالجوں سے طلباء جوق در جوق جلوس نکالنے لگے۔ جس سے شہر کے سبھی کالج اور سکول بند ہوتے چلے گئے۔ یہ ہفتہ مطالبات صرف کراچی شہر تک محدود نہیں رہا اور صرف کراچی کو ہی اس نے متاثر نہیں کیا بلکہ اس کی تاثیر اور وسعت پورے مغربی پاکستان میں محسوس کی گئی۔ ہفتہ مطالبات کے بعد پاکستان بھر میں طالب علموں اور مزدوروں کے درمیان ایک براہ راست تعلق اور رشتہ قائم ہو گیا جس نے پاکستان بھر میں ایوب آمریت کے خلاف ملک گیر تحریک کی بنیاد رکھ دی' جس کے نتیجے میں ایوب کو جانا پڑا اور اس کی جگہ 25 مارچ 1969ء کو جنرل یحییٰ خان کی شکل میں ایک نیا مارشل لاء مسلط کر دیا گیا۔

اتنی بڑی تحریک اچانک واقع نہیں ہوئی تھی۔ یہ کراچی شہر میں خاص طور پر اور باقی ملک میں طالب علموں اور مزدوروں کے مستقل اور مسلسل احتجاج کے ایک لمبے عمل کا ہی لازمی اظہار تھا۔ ان واقعات میں ایک اہم عنصر ہندوستان میں جبل پور میں ہونے والے مسلم کش فسادات پر پاکستانی طلباء کی طرف سے کیا جانے والا احتجاج تھا۔ اسی مہم میں تین سالہ ڈگری کی تجویز کے خلاف احتجاج پر بارہ معروف طالب علم رہنماؤں کو کراچی سے نکال دیا گیا اور یہ سلسلہ ہر شہر میں ہوتا چلا گیا اور انہیں نکالا جاتا رہا یہاں تک کہ وہ طالب علم ملتان پہنچے' جہاں ایمرسن کالج کے طلباء ان کے حق میں احتجاج پر نکل آئے۔ مرحوم علی مختار رضوی کی اس موقع پر کی جانے والی تقریر نے سبھی طلباء کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جس پر سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ وہ غیر معینہ مدت تک ہڑتال کریں گے۔ اس دباؤ کے نتیجے میں ملتان کی انتظامیہ کراچی کے ان طلباء قائدین کو ان کی خواہش اور مرضی کے مطابق ملتان میں قیام کرنے کی اجازت دینے پر تیار ہو گئی۔ میں اس وقت کالج میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا جب مجھے اس طلباء تحریک کا پتہ چلا تو میں نے 1963ء میں کراچی آنے پر طلبہ قیادت سے رابطے قائم کیے اور میں نے 1964ء میں NSF میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی طرح کی سرکش بغاوتیں انہی سالوں میں مزدوروں کی طرف سے بھی کی گئیں جس کے نتیجے میں ریاست کی پروردہ اینٹی کمیونسٹ ٹریڈ یونین کنفیڈریشن زوال پذیر ہو گئی۔ جس کے بعد مختلف آزاد یونینیں تشکیل پاتی گئیں' جن میں بڑی تعداد میں ترقی پسند مزدور لیڈروں نے فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے ساتھ بھی گہرے روابط قائم کر لیے۔ 1962ء میں مزدوروں کو متحرک

کرنے کی یہ انفرادی کوششیں مارچ 1963ء میں ٹیکسٹائل مزدوروں کی بڑی جدوجہد کی شکل میں سامنے آ گئیں۔ اس کے بعد 1967ء کی ریلوے مزدوروں کی ہڑتال 69-1968ء کے انقلاب کے لیے جذبہ محرکہ ثابت ہوئی۔ ان واقعات میں مزدوروں نے بڑے پیمانے کی ٹیکسٹائل ملوں اور دوسری فیکٹریوں پر قبضہ کر کے مالکان اور ریاست کو اپنے جائز مطالبات تسلیم کرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

1954ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگنے کے بعد کمیونسٹ گروپوں کو زیر زمین یا پھر قومی دھارے کی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر کام کرنا پڑ گیا۔ ان گروپوں پر روا رکھے جانے والے بدترین ریاستی جبر نے اس عمل کو اور بھی تیز کر دیا۔ تاہم یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اس کیفیت میں بھی وہ مزدوروں اور طلباء کی تحریک کو متحرک اور منظم کرتے رہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو تقسیم کر کے تحریکوں پر منفی اثرات مرتب کیے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری تحریکوں کو علمی قیادت مہیا کرنے میں ان کی نااہلی تھی۔ ماسکو نواز اور پیکنگ نواز لیفٹ کے دونوں دھڑے اندھا دھند اور غلامانہ طور پر روس اور چین کی افسر شاہی کی نظریاتی اور سٹریٹجک ہدایات کی تقلید کر رہے تھے۔ درحقیقت ان کے تناظر ان دونوں باہم برسرپیکار ''سوشلسٹ'' ریاستوں کی خارجہ پالیسیوں کے آئینہ دار تھے۔ اسی وجہ سے سماج اور ریاست کے باشعور تجزیہ پر مبنی ہوتے ہر شعبے میں ہر سطح پر ان کے ایک دوسرے کے ساتھ رویے، معاندانہ اور فرقہ پرستانہ تھے۔ بحث، گفتگو اور تبادلہ خیال کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ دونوں پارٹیوں کے مابین ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک طرف ماؤ اسٹ سرخ کتاب کو اپنے سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ تو دوسری طرف ترمیم پسند، کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کے پبلشنگ ہاؤس سے چھپنے والی ہر کتاب کو مقدس کتاب کی طرح اپنی بغل میں لیے پھرتے تھے۔ دونوں دھڑے اپنے کارکنوں اور کیڈروں کو دوسرے دھڑے کی کتاب کو ہاتھ لگانے سے بھی منع کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے پاکستانی حکومت اور ریاست کے ساتھ تعلقات کا دارومدار بھی ان کے ماسکو یا پیکنگ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر مبنی ہوتا تھا۔ 60ء کی دہائی کے آخر میں ایوب حکومت کے سر سے اس کے مغربی سرپرستوں نے اپنا دست شفقت اٹھا لیا تھا خاص طور پر امریکہ نے۔ جس پر ایوب چین کی طرف زیادہ اور کسی حد تک روس کی طرف راغب ہونا شروع ہو گیا۔ پاکستان کے بائیں بازو کی قیادت ایوب کی اس کیفیت کو سامراج دشمنی سمجھتے ہوئے اس کی طرف مائل ہونے لگی اور اس کی مخالفت سے گریز کرنے لگی۔ حالانکہ ایوب حکومت سرمایہ دارانہ استحصالی اور عوام دشمن کردار کی حامل حکومت تھی۔ چنانچہ

1968ء میں طلبا اور اس کے بعد مزدوروں کی تحریک بائیں بازو قیادت کی پرواہ کیے بغیر شروع ہوئی۔ اس کے باوجود کہ انہی کے کیڈر اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر NSF نے اپنا ہفتہ مطالبات اپنے سابق صدر معراج محمد خان کے کہنے پر شروع کیا تھا جو اس وقت پیپلز پارٹی میں شامل تھا جسے اس احتجاج کی ضرورت تھی۔ جبکہ NSF کی مرکزی قیادت ماؤاسٹ تھی، طفیل عباس اور اس کے دیگر ساتھی اس طلباء تحریک اور اس کی کامیابی کے بارے میں مشکوک تھے۔ دوسری طرف ماؤسٹوں نے تاشقند معاہدے کے خلاف بھٹو کی مخالفت کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی طرف جھکانا شروع کر دیا۔ کیونکہ تاشقند معاہدہ روس کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ اس کے مدمقابل ماسکو نواز گروپوں میں ایوب حکومت کے حق میں تاشقند معاہدے کے حوالے سے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ جب 1968ء کی تحریک شروع ہوئی تو دونوں طرف کی قیادتیں حیران رہ گئیں۔ ماسکو نواز کے دھڑے کے ایک اہم لیڈر انیس ہاشمی نے مجھے اپنے گھر بلایا اور کہا کہ ''ہم طالب علم ایوب حکومت کی مخالفت کر کے بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور سوشلسٹ کیمپ کے ساتھ ایوب کی قربت سے پریشان ہو کر امریکی سی۔آئی۔اے ایوب خان کو اقتدار سے الگ کرنے پر تل گئی ہے''۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ ''عوام آخر کیوں ایوب حکومت کے خلاف بھڑکے ہوئے ہیں''۔ تو اس نے مجھے جواب دیا کہ ''سامراج کی مخالفت ہر چیز سے مقدم ہونی چاہیے''۔ بائیں بازو کی قیادت واضح طور پر عوام کی نبض شناسی میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی تھی اور وہ ان کی سچی امنگوں کو سمجھنے سے قاصر رہی جس کی بنیاد پر وہ تاریخ کے اس عظیم انقلاب کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے لاکھوں محروم انسانوں کی زندگیاں بدلنے کا یہ موقع گنوا بیٹھی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے پاؤں جمانے کا موقع مل گیا۔ اس نے نہ صرف عوام کی وسیع حمایت حاصل کی بلکہ اپنی تنظیمی بنیادیں بھی مستحکم کر لیں۔ اس کا فائدہ اس نے انتہائی موثر اور مرتکز انداز میں 1970ء کے الیکشن میں اپنی پارٹی کی بہترین کارکردگی کے ذریعے حاصل ہونے والی کامیابی کی شکل میں حاصل کیا۔ دوسری طرف وہ لوگ جنہوں نے اس تحریک کی ابتداء کی تھی، ہر سطح پر بدترین ناکامی سے دوچار ہوئے۔

جب جنرل یحییٰ خان نے 25 مارچ 1969ء کو ایک اور مارشل لا مسلط کیا تو کسی طرف سے کوئی احتجاج سامنے نہیں آیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ تحریک کا مقصد صرف ایوب خان سے نجات حاصل کرنا تھا۔ مارچ 1969ء کے بعد کے عرصے میں NSF کو بڑھوتری دینے کی کوشش کی گئی۔ صرف

کراچی میں کچھ دنوں کے اندر دس ہزار سے زائد ممبر بنائے گئے۔ تاہم پارٹی قیادت نے پارٹی قیادت کے انتخاب کے لیے خفیہ بیلٹ سے ووٹنگ کرانے سے انکار کر دیا۔ اور اصرار کیا کہ پارٹی کو ہر حالت میں اپنی قیادت کو منتخب کرنے کی بجائے نامزد کرنا چاہیے۔ خواہ وہ طلباء ہوں یا مزدور۔ جب دسمبر 1970ء میں عام الیکشن کا شیڈول جاری کیا گیا تو پیکنگ نواز گروپ ایک بے ہودہ نعرے ''پرچی نہیں برچھی'' لگاتے ہوئے سامنے آیا اور ان الیکشن کے بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہاں تک کہ معراج محمد خان نے بھی الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ اس قسم کے نظریاتی دیوالیہ پن کا یہ نتیجہ نکلا کہ تقریباً پچاس سوشلسٹ اور مزدور قائدین پارلیمنٹ میں پہنچنے سے روک دیئے گئے۔ بات کو سمیٹا جائے تو تمام بائیں بازو کی قیادت کی ان ناکامیوں اور غلطیوں کے باجود، جن سے بچا جا سکتا تھا، یہ تحریک ہزاروں اور لاکھوں طالب علموں اور مزدوروں کے لیے نجات حاصل کرنے کی کوشش کا ایک عظیم تجربہ ثابت ہوئی۔ صرف ان کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر اس عام انسان کے لیے جس نے اس تحریک میں حصہ لیا یا اس کو قریب سے بھی دیکھا''۔

1968-69ء کا انقلاب نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برصغیر کے لیے ایک مینارہ نور، ایک مشعل راہ تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جنوبی ایشیاء کے کسی ایک ملک میں تقسیم کے بعد عوام اتنی بڑی انقلابی شدت کے ساتھ باہر آئے ہوں۔ یہ پاکستان میں کئی مہینوں تک دوہرے اقتدار کی ایک کلاسیکل صورت حال تھی۔ طاقت ریاست اور حکمران طبقات کے ہاتھوں سے پھسل کر گلیوں، فیکٹریوں، قصبوں، دیہاتوں میں عوام کے ہاتھ میں پوری شدت اور توانائی کے ساتھ منتقل ہو چکی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انقلاب ایک سوشلسٹ فتح سے ہمکنار نہیں ہو سکا اور ایک ظالمانہ استحصالی نظام کا خاتمہ نہیں کر سکا البتہ اس نے عوام اور سماج کی نفسیات کو بدل کر رکھ دیا۔ سرمایہ دارانہ حکمرانی کے سبھی طریقے، اس کی اخلاقیات، اس کے دھوکے، اس کے فریب، اس کے دانشور، اس کے وظیفہ خوار ملاں، اس کا تنخواہ دار میڈیا، اور سبھی ڈھانچے عوام کی بغاوت نے اکھاڑ کر پھینک دیئے تھے۔ تاریخ کے صفحات میں جب بھی کبھی بڑے اور عظیم واقعات کا ذکر ہوگا تو پاکستان کے محروم عوام کا یہ انقلاب ایک درخشاں باب کی حیثیت میں شامل ہوگا۔ پاکستان کی آنے والی نسل کے لیے اس نے ایک مثال قائم کر دی کہ ان کے بڑوں نے مروجہ ظالمانہ نظام کو چیلنج کرنے کی جرأت کر دکھائی تھی۔ اور اس انقلاب کے ذریعے انہوں نے ریاست اور حکمران طبقات کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ اسی ملک، اسی دھرتی پر ہوا تھا اور یہ ایک بار پھر دہرایا جائے گا مگر ایک بلند معیار پر دہرایا جائے گا اور یہ پہلے کی طرح نہ تو نامکمل رہے گا نہ ہی ادھورا۔

نوٹس

1۔کارل مارکس،لوئی بونا پارٹ کی اٹھارویں برومئیر، پیکنگ 1978ء،صفحہ 10-9

2۔ ایوب خان،ایوب خان کی ڈائری 72-1966ء، ہفتہ 2دسمبر 1967ء،(آکسفورڈ)، صفحہ 181

3۔مصنف سے انٹرویو، جون 2008ء

4۔مصنف سے انٹرویو، جولائی 2008ء

5۔ایضاً

6۔ایضاً

جنگ، جبر اور اصلاح پسندی

ایک زائل ہوئے انقلاب کے اسباق

''سرمایہ دارانہ نظام میں محض اصلاحات اب کوئی قابل عمل حل نہیں۔ 1969ء کے عوامی ابھار نے سرمایہ دارانہ ڈھانچے کو مسترد کر دیا تھا۔ ایک ایسا اصلاح شدہ نظام جس کی خواہش عوام اور سیاستدانوں کی طرف سے کی جاری ہے، جس میں سبھی مزدوروں کو ایک مناسب بنیادی اجرت دی جائے، منافعوں میں مزدوروں کی شراکت ہو، سرمایہ داروں کی سماجی ذمہ داری ہو، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سویڈن یا پھر یوگوسلاویہ میں تو ہوسکتا ہے مگر پاکستان جیسے ملک میں یہ عمل ارتقائی مراحل کے ذریعے ممکن نہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق (98-1934ء)(1)

25 مارچ 1969ء کو پاکستان کی تاریخ کے سب سے مضبوط حکمران ایوب خان کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ اپنی آخری تقریر میں اس نے کہا ''یہ آخری بار ہے کہ میں صدر پاکستان کی حیثیت سے آپ لوگوں سے خطاب کر رہا ہوں۔۔۔ مملکت کے سبھی انتظامی ادارے مفلوج کر کے رکھ دیے گئے ہیں۔ جا بجا عوام اپنی مرضی سے گھیراؤ کر رہے ہیں اور زور زبردستی سے اپنے مطالبات منوا رہے ہیں۔ مملکت کی خدمت سرانجام دینے پر مامور لوگ ان عوام کے خلاف کچھ کرنے سے ڈر گئے ہیں۔۔۔ میری

خواہش ہے کہ سیاسی اقتدار کی منتقلی آئینی تقاضوں کے مطابق بطور احسن سرانجام پائے۔جس قسم کے حالات ملک میں پیدا ہو چکے ہیں ان میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانا ممکن نہیں۔کچھ ارکان تو ڈر کے مارے اجلاس میں شرکت کیلئے آنے سے ہی انکاری ہیں۔۔۔مجھے دکھ سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ صورتحال اب حکومت کے کنٹرول سے بے قابو ہو چکی ہے۔حکومت کے سبھی ادارے انتشار' خلفشار اور خوفزدگی کی زد میں آ چکے ہیں۔اور ملک کے سبھی مسئلے اب سڑکوں پر' گلیوں' محلوں میں حل ہونا شروع ہو چکے ہیں''۔(2)

یحییٰ خان کی حکومت

ایوب کی آخری تقریر اس بے پناہ دباؤ کی واضح عکاسی کرتی ہے جو نیچے سے انقلاب نے ریاست اور حکمران اشرافیہ پر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔امریکی سامراج،فوج کے اعلیٰ افسران اور حکمران طبقات کی طرف سے ایوب خان کو اقتدار سے الگ ہو جانے کی ہدایت دینے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی رخصتی کو انقلابی جوش و جذبے کو ٹھنڈا کرنے کے کام لانا چاہ رہے تھے جو سارے سماج میں پھیل چکا تھا۔اگرچہ حزب مخالف کے بورژوا سیاستدان صرف ایوب خان کی ذات سے نفرت کو ہی تحریک کا محور قرار دینے کا واویلا کرنے میں مصروف تھے مگر اس کی رخصتی بھی مزدوروں' کسانوں اور نوجوانوں کی اس انقلابی تحریک کا جوش و جذبہ ماند نہیں کر سکی۔تقریباً سبھی پارٹیوں کی قیادت اس صورتحال میں بھاگم بھاگ جنرل یحییٰ کی سربراہی میں قائم ہونے والی نئی فوجی حکومت کے پاس پہنچ گئی تاکہ اس کے ساتھ مذاکرات کر کے مصالحت کا کوئی راستہ نکالا جا سکے۔ان مذاکرات میں جو موضوعات زیر بحث لائے جا رہے تھے ان میں پارلیمانی جمہوریت،آئین،مغربی پاکستان میں وفاقی یونٹوں کی تشکیل،قومیتوں کو برابری کے حقوق اور اسی نوعیت کے قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے اور مطالبات شامل تھے۔مگر سڑکوں پر نکلے ہوئے عوام نہ تو رعایتوں سے نہ ہی اصلاحات سے مطمئن ہونے والے تھے وہ تو اپنی فتح کے احساس سے سرشار تھے اور اسے مکمل کرنا اور دیکھنا چاہتے تھے۔وہ اپنی جنگ حتمی فیصلے تک لڑنے کے لیے تیار تھے۔تحریک کی شدت اور حدت نے جو اچانک ہی سماج میں سے نکل آئی تھی،اسلام آباد سے لندن اور واشنگٹن تک اقتدار کے ایوانوں کو لرزا کے رکھ دیا تھا اور وہاں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئی تھیں۔حکمران طبقات اور ریاستی اہلکاروں کی حالت ایسے ہو گئی تھی جیسے ان کو کسی جنگ میں شکست فاش ہو گئی ہو۔خوف کی شدت سے وہ دہل کے رہ گئے تھے۔ان کی بدحواسی دیدنی تھی اور جب ایوب کے جانے کے بعد تحریک میں قدرے وقفہ

محسوس کیا گیا تو حکمران طبقات اچانک اصلاحات پر اتر آئے۔ان میں سے ایک لیبر پالیسی تھی جو کم از کم کاغذوں کی حد تک پاکستان کی تاریخ کی سب سے مزدور پرور دستاویز قرار دی جاسکتی ہے۔شومیءِ قسمت یہ لیبر پالیسی جنرل یحیٰی کی آمریت کے دوران متعارف ہوئی۔

جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں،ایوب حکومت کے ''اصلاحات کے دس سالہ دور'' کے دوران ہونے والی معیشت کی بلند شرح ترقی سماج کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کسی کام نہیں آسکی،جیسا کہ اس شرح ترقی نے صنعتی انقلابات کے دوران جدید ملکوں میں کر دکھایا تھا جب سرمایہ دارنہ نظام اپنے عروج پر تھا۔تاہم اس کے برعکس اس معاشی ترقی نے عوام اور مزدوروں کا معیار زندگی گرانا شروع کر دیا تھا جن کے لئے کینیشئن طرز کی معاشی ترقی وارتقا عذاب بن چکا تھا۔1969ء کا مارشل لاء اس سیاسی اور معاشی بحران کا جواب تھا جس کی جڑیں ان سماجی معاشی مسائل میں گہری پیوست تھیں جنہوں نے خود سرمایہ دارانہ نظام کو ہی خطرے میں ڈال دیا تھا۔اس مارشل لاء کی مذمت یا مزاحمت کی توفیق ایک بھی بڑے لیڈر کو نہیں ہوسکی۔بلکہ یوں کہا جائے کہ ان سب نے اسے خوش آمدید کہا وہ بھی ایک ایسے وقت اور کیفیت میں جب سیاسی صورتحال ان سب کے کنٹرول میں نہیں رہی تھی اور عوام ان کے قابو نہیں آرہے تھے۔تحریک اگرچہ ''بے راہبر'' تھی مگر یہی تحریک ہی تھی جو پاکستان کی سیاست کو چلا رہی تھی۔اس بحران زدہ کیفیت کو سمجھتے ہوئے یحیٰی خان نے مصالحانہ نوعیت کے کچھ اعلانات کیے جو ''سماجی برابری'' سے متعلق تھے۔لیکن یہ اسی قسم کے خیالات ہی تھے جو اس کے پیشرو اس قسم کے موقع پر کرتے چلے آرہے تھے۔

''جو حالات ان دنوں ہمیں درپیش ہیں ان میں منصوبہ بند (سوشلسٹ) معاشی ترقی کے سوا ہمارے پاس کوئی متبادل نہیں۔مگر منصوبہ بند ترقی کو سماجی انصاف کے تقاضوں سے الگ رہ کر ممکن نہیں بنایا جاسکتا۔سماج کی مختلف پرتوں کے درمیان جو وسیع خلیج موجود ہے اور ان کے مابین جو عدم توازن حائل ہے ،ان کی وجہ سے سماجی بے چینی اور تنازعات میں شدید اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے،اس کا لازمی طور پر خاتمہ کیا جانا ضروری ہے۔منصوبہ بند معاشی ترقی کا ہدف سارے ملک کے عمومی معیار زندگی میں اضافہ کرنا اور بہتری لانا ہے۔نہ کہ ایک ایسا مراعات یافتہ طبقہ پیدا کرنا جو دوسروں کیلئے تباہی اور ذلت کا باعث بن جائے''۔(3)

مارشل لاء کے نفاذ نے محنت کشوں کی تحریک کو کمزور کرنے کی بجائے اس کے جوش و جذبے کو اور زیادہ ولولے سے لبریز کر دیا۔اس مارشل لاء کے ایک ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور تعلیم،صحت،لیبر اور

سوشل ویلفیئر کی وزارتوں پر براجمان وزیر ائیر مارشل نور خان نے ان حالات میں اپنے ذمے ایک ہی کام لگالیا کہ وہ تحریک کی قیادت کے ساتھ رابطہ کرے اور اس کا اعتماد جیتنے کی کوشش کرے۔اس کوشش میں نور خان نے کچھ بیانات جاری کیے جن میں محنت کشوں کے سماجی معاشی حالات کی جھلک نظر آتی تھی کہ انہیں علاج تک کی بھی سہولت میسر نہیں تھی۔

کراچی میں ایک سہ فریقی کانفرنس بلائی گئی جس میں مزدور قائدین کو دعوت دی گئی کہ وہ مالکان، حکومتی نمائندوں اور مشیروں کے ساتھ مل بیٹھ کر ایک نئی اور زیادہ حقیقی لیبر پالیسی کے خطوط طے کر سکیں۔''اس بحث نے ایک موقع فراہم کیا جہاں مزدور راہنما طاقت کے ایوانوں میں بیٹھنے والوں کے ساتھ بات کر کے اپنے دکھ درد سے آگاہ کر سکیں۔اس سے وہ اپنا مدعا' اپنا کرب ان کے سامنے ظاہر کر سکے، یہی نہیں بلکہ وہ مالکان اور حکومتی نمائندوں کے ساتھ مل کر اہمیت اور برابری کے احساس سے بھی روشناس ہوئے''۔(4)

ان میں سے کئی ایک کیلئے یہ ایک نیا تجربہ تھا اور پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ ان کو سنا جا رہا تھا، توجہ دی جا رہی تھی، یہ ایوب دور میں خواب وخیال ہی تھا۔نور خان کی طرف سے ہونے والی سہ فریقی کانفرنس کی یہ کاوش اور اس میں بے شمار مزدور نمائندوں کو بلانے کے عمل نے ٹریڈ یونین اور مزدور قائدین کی نفسیات پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب کیے۔ایوب خان کے خلاف تحریک میں سرگرم کئی لوگوں کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ ایوب کی رخصتی سے حالات میں سنجیدہ تبدیلی سامنے آئے گی اور ایک نیا عہد طلوع ہوگا۔جس کے نتیجے میں ''غیر سیاسی'' مزدور قائدین کو حکومت کی حکمت عملی سے شدید توقعات وابستہ ہو گئیں۔دوسری طرف حکومت کی طرف سے مالکان پر شدید تنقید کی گئی اور دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مزدوروں کی فلاح و بہبود کیلئے کوئی عملی اقدام کریں۔ارسطو نے کہا تھا کہ ایکشن ہی ڈرامے کا بنیادی اصول ہوا کرتا ہے۔پاکستان میں تاریخ کے سٹیج پر انقلابی ڈرامہ جاری تھا اور اس سے خوفزدہ ریاست اور بورژوازی کے الفاظ ان کی بوکھلاہٹ کو ان کے لفظوں سے عیاں اور بیاں کرتے جا رہے تھے۔

''صنعتکاروں کی یہ پہلی نسل ہر حوالے سے اس شراکت کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس وادراک کرنے سے قاصر تھی جو ایک پر جوش اور تر و تازہ پرولتاریہ نے ان کی پیداوار اور منافع کیلئے کی تھی۔ انہوں نے ٹریڈ یونین کو سازشوں اور بدعنوانیوں کے آلے کے طور پر استعمال کیا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کو باہمی لین دین کے ادارے کے طور پر کام میں لایا جاتا، تنازعات سے بچا جاتا اور اپنی پیداواری

صلاحیت کو بھی بڑھایا جاتا''(5)

''مزدوروں کے ساتھ خوشگوار ہم آہنگ تعلقات'' کو یقینی بنانے کیلئے حکومت نے ''اجتماعی سوداکاری ایجنٹ''(CBA) کا خیال تجویز کیا۔اس کا مقصد ایک ہی ادارے میں ٹریڈ یونینوں کے معاملے میں دشمنی اور اختلاف کے مسئلے کو حل کرنا اور پاکٹ یونینوں کا خاتمہ کرنا قرار دیا گیا۔الیکشن میں جو بھی یونین سی بی اے کا سٹیٹس حاصل کرے گی اسے حکومت کے لیبر ڈیپارٹمنٹ اور اپنے متعلقہ ادارے کی انتظامیہ کا حصہ سمجھا جائے گا۔یہ سمجھنا انتہائی آسان ہے کہ ایک بار اجتماعی سوداکار ایجنٹ بن جانے والی یونین کی قیادت ہر وہ اقدام کرے گی جس سے وہ ہار جانے والی یونین یا یونینوں کو دبانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے۔جنہیں اجتماعی سوداکاری ایجنٹ بننے کیلئے اگلے الیکشن کے انتظار کی تکلیف سے گزرنا پڑے گا۔ایسی ہاری ہوئی یونین ہر حوالے سے کسی بھی بڑی سرگرمی میں حصہ لینے یا کچھ کر دکھانے سے محروم رہے گی۔تاہم یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اس وقت کی مزدور قیادت نے اس قانون کی عملی پیچیدگیوں پر غور نہیں کیا تھا۔

کراچی کی دوسری بڑی آدم جی ٹیکسٹائل ملز میں دو بڑی یونینیں تھیں جو آپس میں مدمقابل ہوا کرتی تھیں۔وہاں صنعتی تعلقات کے آرڈیننس کے مطابق الیکشن کرایا گیا جو سندھ لیبر ڈائریکٹوریٹ کی زیرنگرانی ملز کے احاطے میں منعقد ہوا۔پہلے سے سوداکاری ایجنٹ چلی آنے والی یونین اس الیکشن میں جیت کر اگلے دو سالوں کیلئے باقاعدہ سی بی اے بن گئی۔مدمقابل یونین نے لیبر ڈیپارٹمنٹ اور مل انتظامیہ پر الزام عائد کیا کہ انہوں نے اپنی مرضی کی یونین کو جتوایا ہے۔اس یونین نے جو دلائل دیئے ان کے مطابق:۔

1۔اسے ملز کی حدود میں داخل ہو کر اپنی حمایت کیلئے کمپئین بھی نہیں کرنے دی گئی۔

2۔من پسند یونین کو ہر قسم کی مراعات اور سہولتیں فراہم کی گئیں اور مزدوروں کو مفت کھانا دیا گیا۔

3 ۔پولیس نے ان کی یونین کے عہدیداروں کو ملز کے گیٹ پر قائم یونین آفس میں بھی نہیں بیٹھنے دیا۔ہمارے بینرز پھاڑ دیئے گئے اور ہمارے کارکنوں کی شرٹوں پر لگے سٹکر بھی اتار لیے گئے۔

4۔ملز انتظامیہ نے اخبار والوں کو بھی ملز کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیا تاکہ وہ الیکشن کی کوریج کر سکیں۔

چنانچہ حکومت اور انتظامیہ کیلئے یہ قدرے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی یونین کو الیکشن میں

جتوا کر اسے سی بی اے قرار دلوا سکیں اور پھر اس کی اس کامیابی کو جتنے لمبے عرصے تک چاہیں قائم ودائم بھی رکھ سکیں۔ یوں غیر قانونی ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کو کنٹرول کرنے کا حکومتی ہدف جو کسی بھی حکومت کا سب سے اہم اصول ہوا کرتا ہے اس طریقے سے حاصل کر لیا گیا۔ قانونی سمجھا جانے والا ہڑتال یا تالہ بندی کا طریق کار پیچیدہ اور طویل بنا دیا گیا اور اس میں حکومت کو مختلف مرحلوں پر ممکنہ مذاکرات کے مواقع فراہم کیے گئے۔ اگر کسی حیلے بہانے سے ایک قانونی ہڑتال یا تالہ بندی کی کوئی شکل بن بھی جائے تو حکومت نے اسے قابو میں کرنے کیلئے ایک شق اس آرڈیننس میں شامل کی ہے جس کی رو سے اگر یہ عمل لوگوں کیلئے مسائل پیدا کر رہا ہے یا قومی مفاد کے خلاف کوئی تعصب پیدا کرنے کا باعث ہے تو حکومت اسے کسی بھی طریقے سے روک دے گی۔ ''اگر کوئی ہڑتال یا تالہ بندی وفاقی حکومت، نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کمیشنز، صوبائی حکومت یا پھر کسی لیبر کورٹ یا ٹریبونل کے احکامات کے باوجود بھی جاری رہتی ہے تو یہ غیر قانونی قرار دے دی جائے گی''۔(6)

ظفر شہید یحییٰ حکومت کی اس اصلاح پسندانہ سازش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''نور خان کے تعاون سے جاری کی جانے والی اس لیبر پالیسی نے کچھ جرا تمندانہ اور آزاد خیال حصوں کے اہم لوگوں کو گمراہ کر دیا اور وہ یقین کر بیٹھے کہ لیبر قوانین کی تاریخ میں یہ سب سے ترقی پسندانہ پالیسی ہے جو آج سے پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی گئی۔ یہ ایک ایسی سوچی سمجھی چال تھی جس کا بظاہر مقصد تو مزدوروں کے مفادات کا تحفظ تھا مگر اپنے عملی اثرات میں یہ ان کے مفادات کی قاتل تھی، دوئم اس نے مزدور تحریک کے اندر ان موقع پرست اور مفاد پرستوں کو تقویت بخشی جنہوں نے عام مزدوروں میں موجود جوش وجذبے کو مضمحل کر دیا''۔(7)

''محنت کش جس تحریک میں برسر پیکار تھے، اسے کسی قسم کے قوانین اور قواعد وضوابط کے ذریعے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس عرصے میں صنعت کی صورتحال یہ تھی کہ آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن (اپٹما) کے صدر نے حکومت کو شکایت کی کہ ٹیکسٹائل صنعت 1969ء کے آغاز سے ہی مزدوروں کے گھیراؤ کی زد میں ہے اور محصور ہے''۔(8)

درحقیقت یحییٰ حکومت کے آغاز سے ہی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی اور اس میں اضافہ کرتے ہوئے اس کا اطلاق صنعتی سرگرمیوں پر بھی کر دیا گیا تھا۔ ''1969ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے خلاف وسیع پیمانے پر کراچی میں فسادات پھوٹ پڑے، 45000 مزدوروں کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا

تھا'' (9) ''ملٹری کورٹ نے مزدور راہنماؤں اور مزدوروں سمیت طالبعلموں اور سیاسی کارکنوں کو جیل بھجوا دیا۔حکومت کی جاری کردہ لیبر پالیسی کے محض کم مدتی مقاصد تھے،ان کا اصولی مقصد کام کو روکے جانے کو کم سے کم اور شہروں کی فضا اور ماحول کو پرسکون رکھنا تھا''۔معاملات کی اس نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر حکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ یحییٰ حکومت نہ تو معاشی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی اہل تھی نہ ہی آرزومند۔اس کمزور حکومت کے لیے خوشگوار اور قابل قبول صنعتی تعلقات کا فروغ ایک لازمی بنیادی تقاضا تھا یہی اس کی لیبر پالیسی کا مطمع نظر بھی تھا۔ بہرصورت حکومت پہلے ہی الیکشن کمپین کی وجہ سے خاصے دباؤ میں تھی جو جنوری سے دسمبر 1970ء تک چلتی رہی اور پھر ایک سیاسی بحران جو بھارت کے ساتھ جنگ اور پھر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی

25 مارچ 1969ء کے مارشل لاء نے پاکستان کو 1968/69ء کے انقلابی زلزلے کے جھٹکوں سے محض ایک سرسری سا وقفہ فراہم کیا۔ایسے کئی شواہد اور اشارے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نومبر کی تحریک میں اپنی طاقت اور اعتماد گنوا چکنے کے بعد بڑے صنعتی اور کاروباری اداروں کی طرف سے مذہبی انتہا پسندی کی نشوونما اور فروغ کا رستہ سوچا اور اختیار کیا گیا تاکہ الیکشن کی تیاری کی جاسکے اور عوام کے انقلابی تصورات کو بھی گمراہ کر دیا جائے۔بڑے شہروں میں جماعت اسلامی نے جسے سعودی عرب اور مقامی صنعتی مالکان کے ذرائع کی طرف سے بھاری سرمایہ فراہم کیا جارہا تھا، اس نے انقلابی تحریک کی شکست کے بعد پیدا ہونے والی ردانقلابی رجعتیت کی سپہ سالاری سنبھال لی۔''اگست 1969ء کی ابتدا میں ہی پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کے مابین چھوٹے شہروں میں جھگڑے شروع ہو گئے جبکہ ستمبر میں کراچی، لاہور اور لائل پور (فیصل آباد) میں پارٹی اور جماعت کے درمیان جھڑپیں اور جھگڑے شدت اختیار کر گئے''۔(10)

جماعت اسلامی نے پاکستان کو انڈونیشیا بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔اس قسم کی باتوں نے پاکستان میں ان دنوں امریکی سفیر جوزف فارلینڈ کو خاصا متوجہ کیا۔یہی جوزف فارلینڈ انڈونیشیا میں امریکہ کا سفیر رہ چکا تھا جب سہارتو کی طرف سے سوئیکارنو حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور جب کمیونسٹ

پارٹی آف انڈونیشیا کو خونریز قتل عام کی بھینٹ چڑھایا گیا تھا۔ ستمبر 1965ء میں سوئیکارنو کے خلاف ایک بغاوت منظم کی گئی تھی جو کہ سامراج کی مخالفت میں بیان پر بیان دیئے جا رہا تھا۔ سی آئی اے (CIA) نے سراکت الاسلام سمیت کئی دیگر اسلامی بنیاد پرست تنظیموں کی (جن میں سے کچھ پاکستان میں سرگرم جماعت اسلامی کی شریک کار تھیں) بھرپور معاونت سے انڈونیشیا کی فوج کو استعمال کرتے ہوئے ایک قتل عام کو منظم کیا جس میں کمیونسٹوں کو ان کے اہل خانہ سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ محتاط اندازوں کے مطابق امریکی احکام اور امداد سے ہونے والے اس قتل عام کے اس خونی ردانقلاب کے دوران 1 5 لاکھ کمیونسٹوں کو ذبح کر دیا گیا۔ ''فارلینڈ، پاکستان میں، امریکہ مخالف منافرت کی علامت بن کر رہ گیا اور بائیں بازو نے تو اسے آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا''۔(11) فارلینڈ ملک میں جہاں بھی جاتا وہاں اسے عوامی مظاہروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ایسا ہی ایک واقعہ 5 مارچ 1970ء کو ہوا ''نشتر میڈیکل کالج ملتان میں امریکی سفیر فارلینڈ کو طالبعلموں نے گھیر لیا اور فلسطین زندہ باد، ویت نام زندہ باد، چین زندہ باد اور امریکی سامراج مردہ باد کے نعرے لگاتے رہے''۔(12)

''لاہور شہر کی دیواروں پر ''انجمن سرفروشان اسلام'' کی جانب سے پوسٹرز آویزاں کر دیئے گئے جن میں سبھی شاعروں، ادیبوں اور دیگر دانشوروں کو دھمکی دی گئی کہ وہ ہوش کے ناخن لیں ورنہ ان کے قلم توڑ دیئے جائیں گے اور ان کی زبانوں کو کھینچ لیا جائے گا اور ان کے سروں کو کچل کے رکھ دیا جائے گا۔ پیپلز پارٹی اور نیپ (NAP) بھاشانی گروپ نے بھی جماعت کی پالتو ایک تنظیم کی نشاندہی کی جو گلیوں محلوں میں حملے کرتے تھے، اور دعویٰ کیا کہ جماعت اسلامی اپنے 'آقاؤں (امریکی سامراج، جاگیرداروں اور اجارہ دار سرمایہ داروں) کے مفادات' کے تحفظ کیلئے نازی دہشت گردی جیسے طریق کار اپنا رہی ہے''۔(13)

جماعت اسلامی کی پی پی پی مخالف مہم اس وقت شدید ہوگئی جب بھٹو پر صادق آباد ضلع رحیم یار خان میں مشتعل ملاؤں اور نوجوانوں نے پتھروں اور اینٹوں سے حملہ کر دیا۔ اس کے بعد سے پارٹی کے قائدین نے خود حفاظتی اقدامات کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں پیپلز گارڈ تشکیل دے دی گئی جس کا انچارج میجر جنرل ریٹائرڈ اکبر خان کو بنایا گیا۔(14)

مئی 1969ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ترقی پسند اساتذہ کے نکال دیئے جانے پر بائیں اور دائیں بازو کی سیاست کی بحث ایک بار پھر زور پکڑ گئی۔ یہ وہ کالج تھا جسے انجمن حمایت اسلام کے تحت

چلایا جارہا تھا۔اس انجمن کو آج کل کچھ قدامت پسند تاجروں کے حلقے مل کر چلا رہے ہیں۔

جنوری 1970ء کے شروع میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کارپوریشن PIAC میں جماعت اسلامی کی نئی قائم شدہ ایمپلائز یونین کو دھاندلی سے جتوا دیا گیا اور ائیر ویز ایمپلائز یونین کو ہروا دیا گیا جس کی قیادت طفیل عباس کر رہا تھا جو نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) کے قائد معراج محمد خان کا قریبی ساتھی تھا۔ پی آئی اے (PIA) میں جماعت کی یہ کامیابی ایک انتہائی قابل ذکر موڑ تھا اور جماعت اسلامی کی طرف سے مزدور تحریک کے اندر گھسنے کے منصوبے کی طرف اہم پیش رفت تھی جس کے تحت انتہائی منظم اور مالیاتی طور پر مستحکم یونینیں تشکیل دی گئیں۔

پیپلز پارٹی کو مزدور تحریک کے اندر زیادہ بہتر اور موثر مداخلت کا موقع ملا کیونکہ اس نے روایتی بنی بنائی یونینوں کو کم ہی توجہ دی اور نئے صنعتی مراکز ،قدیم صنعتوں اور ان جگہوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو ابھی یونین سازی سے محروم تھے۔

نومبر 1968ء کی تحریک نے صنعتی مزدوروں کو سیاسی طور پر انتہائی باشعور اور متحرک کر دیا تھا۔ان کے جوش وجذبے کا اظہار ایوب حکومت کے آخری دنوں میں کارخانوں پر ان کے قبضوں کے سلسلے سے ہوتا ہے۔یحییٰ مارشل لاء کے بعد بھی ان اداروں کے اندر فضا انتہائی کشیدہ رہی کیونکہ تحریک کے بعد کے معاشی بحران اور گرفتاریوں نے انتظامیہ کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ سبھی سرگرم مزدوروں کو ملازمت سے باہر نکال دے۔ لاہور کوٹ لکھپت کے مضافات میں واقع ایک بڑے کارخانے پیکیجز لمیٹڈ میں بھی ایسا ہی ہوا جس میں 2500 مزدور کام کرتے تھے۔

یکم نومبر 1969ء کو ہونے والی ہڑتال میں کئی اہم معاملات کو ایشو بنایا گیا تھا ان میں نظر بندیاں، یونین آفس ہولڈروں کو نشانہ بنایا جانا، عارضی لیبر کا زیادہ عرصے تک استعمال، ورک چارج سسٹم اور کم سے کم اجرتوں کے سکیل پر عملدرآمد کا نہ کیا جانا شامل تھا۔ 4 نومبر کو ہڑتال پر غنڈوں نے حملہ کر دیا جبکہ 7 نومبر کو نئے انڈسٹریل ریلیشنز آرڈیننس کا اجرا کر دیا گیا۔اس میں جہاں مزدوروں کو ہڑتال کا حق دیا گیا وہیں مالکان کو بھی قانونی طور پر اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی فیکٹری کی تالہ بندی کر سکتے ہیں۔

پیکیجز فیکٹری کی ہڑتال نے تو جیسے کوٹ لکھپت کی بڑی فیکٹریوں میں بھی ہڑتالوں کی وبا پھیلا دی۔اور تین ہفتوں کے اس ہڑتالی عمل نے راوی کنارے سے ادھر شاہدرہ میں بیکو فیکٹری کو بھی زد میں لے لیا، وہاں سے یہ کالا شاہ کاکو میں نئے کیمیکل کمپلیکس ،اور پھر یہ لہر لائل پور اور ملتان کے صنعتی علاقوں

تک پہنچ گئی۔اور یہاں تک ہی نہیں یہ کراچی میں لانڈھی' کورنگی اور سائیٹ کے بڑے صنعتی مراکز تک پہنچ گئی۔ ہڑتال کی اس انتہائی بڑی لہر نے صرف صنعتی مزدوروں کو ہی نہیں بلکہ چھوٹے سرکاری ملازمین کو بھی متاثر کیا۔ بعد میں تو یہ اتنی پھیل گئی کہ اس کی رپورٹ مرتب کرنا بھی محال ہو گیا۔اس دوران میں ایک قابل ذکر واقعہ ملٹری اکاؤنٹس آفس میں ہونے والی کام چھوڑ ہڑتال تھی۔نومبر دسمبر 1969ء کی اس ہڑتال کا ایک اہم اور دلچسپ پہلو صنعتی مزدوروں کے ساتھ قرب وجوار کے دیہاتیوں کا باہمی تعامل اور تعاون تھا۔کالا شاہ کاکو،کوٹ لکھپت اور لاہور شیخوپورہ کے درمیان واقع داؤد ہرکولیس فرٹیلائزرز فیکٹری جیسے علاقے اپنی نوع کے اعتبار سے دیہی مزاج کے حامل تھے۔جو اپنے صنعتی روزگار کو اپنی دیہی اور زرعی شناخت کا ایک اضافی ذریعہ معاش سمجھتے تھے۔کئی دیہی مزدور اس امید میں کام کر رہے تھے کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وہ اپنے لیے زمین کا کوئی ٹکڑا خریدنے کے قابل ہو جائیں گے۔جبکہ کئی اپنی دیہی زندگی سے اکتائے ہوئے تھے اور یہ سوچ کر مزدور بن گئے تھے کہ اب یہی کام کرنا ہے اور اپنے اجداد کے گاؤں لوٹ کر نہیں جانا۔

لاہور اور اس کے مضافات میں ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کے دوران کی وہ کیفیت انتہائی جاندار اور بے مثال تھی جب نور خان انتظامیہ نے کریک ڈاؤن کا حتمی فیصلہ کیا تو لاہور' شیخوپورہ اور گوجرانوالہ کے دیہاتوں سے ہزاروں کی تعداد میں دیہاتی اپنے ہڑتالی صنعتی مزدور بھائیوں کے ساتھ آ شامل ہوئے اور ان کے شانہ بشانہ پولیس کے خلاف لڑے۔

اس قسم کے ماحول میں یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ ہڑتال کی صورتحال انتہائی سیاسی رنگ اختیار کر جائے۔ جماعت اسلامی نے کھل کر صنعتکاروں کی حمایت کا اعلان کیا اس نے اپنی ایک اشاعت میں ہڑتال کو بائیں بازو کی ایک سازش قرار دیا جس کا مقصد الیکشن کے انعقاد کو روکنا تھا۔

17 نومبر 1969ء کو مغربی پاکستان کے امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد نے ایک بیان جاری کیا۔''ایک اجنبی زندگی کی بات کرنے والوں کے ہتھیار اتنے تیز ہوئے ہیں کہ انہوں نے سادہ دل مزدوروں میں بھوک کا احساس اتنا شدید کر دیا ہے کہ اگر سبھی کارخانے ان مزدوروں کے حوالے کر بھی دیئے جائیں تو بھی ان حالات میں نہ تو ان کی بھوک ختم ہو گی اور نہ ہی ان کی تسلی و تشفی ہو گی''۔

بھٹو نے پیکیجز فیکٹری کے مزدورں کے ہڑتالی کیمپ کا دورہ کیا اور وہاں ایک پر جوش تقریر کی جس میں اس نے نئے صنعتی تعلقات کے آرڈیننس میں تالہ بندی کے قانون کی سخت الفاظ میں

مذمت کی۔(15)

پاکستان پیپلز پارٹی کا جریدہ ''نصرت'' ہڑتال کی تحریک کے دوران اردو میں مزدوروں کا سب سے موثر نمائندہ بن کر سامنے آیا۔ جبکہ پارٹی کے کئی انقلابی کیڈروں نے ہڑتالوں کو منظم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کے باوجود کہ پارٹی ہڑتال کو جوش جذبے کے ساتھ حمایت فراہم کر رہی تھی، پارٹی کی مرکزی قیادت اور پنجاب کی قیادت کے مابین اس بات پر اختلافات اور فاصلے موجود تھے کہ طلبہ اور مزدوروں کی اس تحریک کا کس حد تک اور کتنا ساتھ دیا جائے۔ پارٹی کی پنجاب باڈی اس دوران اپنا طلباء، مزدور اور کلچرل ونگ تشکیل دے چکی تھی۔ پنجاب کی پارٹی کا موقف تھا کہ ان متوازی ونگز کی تشکیل سے سماج کی ان پرتوں کے اندر پارٹی کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوں گی۔

''بائیں بازو کے سوشلسٹوں کا کہنا تھا کہ ماضی کی مزدور تحریک کی کمزوری کی وجہ سیاسی عمل میں شریک ہونے سے ہمارا انکار کرنا تھا''۔(16) انہوں نے ایک ٹریڈ یونین فیڈریشن تشکیل دینے کا فیصلہ کیا جس کا پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد ہوگا اور جو باہم مل کر معاشی اور سیاسی سرگرمیاں کریں گی۔ بعد میں انہوں نے متحدہ مزدور مجلس عمل کو منظم و متحرک کرنا شروع کر دیا اور پیپلز پارٹی کے ساتھ تال میل اور تعلق ختم کر دیا۔ تاہم پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت ہر طریقے سے طلبہ اور مزدوروں کی وسیع پرتوں کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی اور سبھی بائیں بازو کے انقلابی گروپوں کے ساتھ زیادہ قربت اختیار کر کے اپنے اس تعلق کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ فیکٹریوں پر مزدوروں کے قبضے کے معاملے میں، جیسا کہ اللہ وسایا ٹیکسٹائل ملز ملتان کے معاملے میں ہوا جہاں پیپلز پارٹی کے انقلابی لیڈروں محمود بابر اور اشفاق خان اور ملتان مزدور مجلس عمل کی قیادت میں قبضہ ہوا تھا، پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے اسے ''بائیں بازو کی مہم جوئی'' قرار دیا۔ 25 نومبر 1971ء کو ملتان بار ایسوسی ایشن کے ہنگامہ خیز اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ پیپلز پارٹی کسی طور بھی سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے پرتشدد راستے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دے گی اور یہ پرامن اور آئینی طور طریقوں پر یقین رکھتی ہے۔

شہروں کے اندر جہاں پیپلز پارٹی کی تنظیمیں بہت مضبوط تھیں، الیکشن کے بعد ہونے والے قیمتوں میں اچانک اور تیز اضافے کے ساتھ بڑی اور درمیانی صنعتوں میں مزدوروں کی برطرفیوں نے تناؤ اور تنازعات کی فضا پیدا کر دی۔ 1970ء کے الیکشن میں کامیابی کی خوشی سے سرشار پیپلز پارٹی کے بائیں بازو اور پارٹی کی مزدور کمیٹیوں نے فوری طور پر ملک میں پارٹی اقتدار کو ''کسان مزدور راج'' میں ڈھالنے

کا مطالبہ کر دیا۔ سبھی بڑے صنعتی شہروں میں فیکٹریوں پر قبضے، ہڑتالوں، گھیراؤ کے واقعات میں اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن لائل پور میں کچھ زیادہ سنجیدہ اور تلخ واقعات رونما ہوئے، جہاں 25 مارچ 1971ء کو مختار رانا، جو ایم این اے بھی تھا اور فیصل آباد میں پارٹی کا سربراہ بھی تھا، کی گرفتاری کے بعد پارٹی کارکنوں کی قیادت میں عوام سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے ایک عام ہڑتال کے ذریعے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ پیپلز گارڈ نے مورچہ بند ہو کر پولیس کا مقابلہ کیا۔ اس دوران جھنگ بازار پولیس سٹیشن تباہ کر دیا گیا۔ ''رات گئے شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا اور نظم و نسق کی بحالی کیلئے فوج کو طلب کر لیا گیا''۔(17)

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ پنجاب میں سے کوئی ایک بھی ٹریڈ یونین لیڈر قومی یا صوبائی اسمبلی میں نہیں پہنچ سکا۔ ضیاالدین بٹ سمیت پارٹی ٹکٹ مانگنے والوں کو پارٹی کی مرکزی پارلیمانی ریویو بورڈ کی جانب سے انکار کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ الیکشن سے پہلے ہی مرکزی قیادت نے یہ طے کر لیا تھا کہ اسمبلی کے اندر پیپلز پارٹی کو ملے جلے رجحانات کی ہی نمائندگی دی جائے گی۔ پیپلز پارٹی کا بایاں بازو صنعتی اداروں کے اندر زیادہ وسیع اور گہرا اثر و رسوخ قائم کر چکا تھا۔ وہاں مہنگائی میں اضافے، مزدوروں کی برطرفیوں اور یونین والوں کے ساتھ کیے جانے والے برتاؤ نے مزدوروں اور انتظامیہ کے مابین تناؤ کے بحران کو بلندیوں پر پہنچا دیا۔ پیپلز پارٹی کا ایم این اے مختار رانا جو ایک انقلابی سماجی رہنما، کسان مزدور راج کا علمبردار تھا' کے گرد پیپلز پارٹی کی حمایتی یونینوں نے لائل پور، سرگودھا اور ملتان میں صنعتی اداروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ مختار رانا کا دعویٰ تھا کہ اسے بھٹو کی ہدایت تھی کہ جن اداروں میں مزدوروں کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس کو شیخ رشید (''بابائے سوشلزم'') اور پنجاب پیپلز پارٹی تنظیم کی بھرپور تائید و حمایت حاصل تھی۔ لائل پور میں 25 مارچ کو ہونے والے فسادات کے ضمن میں یہ ہدایات نہ صرف صنعتکاروں سے متعلق تھیں بلکہ یونینوں کی انتظامیہ کے بارے میں بھی تھیں۔ اس سارے عرصے کے دوران پیپلز پارٹی کی حمایتی یونینوں کے کئی گروپ سامنے آ چکے تھے جو پرانی اور کم سیاسی یونینوں کی جگہ لیتے جا رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ان کا پیپلز پارٹی میں چور دروازوں سے داخل ہونے والے دائیں بازو اور بالادست طبقے کے خلاف غم و غصہ بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی کی حمایت یافتہ یونینوں کی طاقت کا واضح ثبوت سبھی سکہ بند یونینوں کی طرف سے ان کی اندھا دھند اور اندھی مخالفت اور سرمایہ دار طبقے کے ان پر ہونے والے حملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ مغربی پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونین WPFTU نے 70ء کے الیکشن میں جمعیت علمائے اسلام کی حمایت کی تھی مگر وقت نے دکھایا کہ خود اس

کے اپنے ''حلقہ انتخاب'' نے گرمجوشی کے ساتھ بھاری تعداد میں پیپلز پارٹی کو ووٹ ڈالے۔ 26/27 دسمبر 1970ء کو لاہور میں ہونے والی آل پاکستان لیبر کانفرنس میں روایتی سکہ بند یونینوں کی گھبراہٹ اور تذبذب واضح ہو کر سامنے آ گیا جب وہ کوئی متوازن فیصلہ کرنے میں ناکام رہے۔ یہ صرف بشیر بختیار (WPFTU اور پاکستان لیبر پارٹی کا صدر) ہی تھا جس نے پیپلز پارٹی کے حق میں تقریریں کرنی شروع کر دی تھیں۔

آخر کار جب مزدوروں کی تحریک زوروں پر تھی، 22 مارچ 1971ء کو پاکستان لیبر پارٹی کو تحلیل کر کے اسے پیپلز پارٹی میں ضم کر دیا گیا۔ اس قدم کو بڑی حد تک ایک حفاظتی اقدام قرار دیا گیا مگر اس حوالے سے یہ شکوک وشبہات بھی بیان کیے گئے کہ ایسا لیبر پارٹی کی قیادت کی خواہش پر کیا گیا جو چاہتی تھی کہ صنعتی محنت کشوں میں پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کے تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو روکا جائے۔

جنگ

مزدوروں کی طرف سے فیکٹریوں پر قبضے، زمینوں پر کسانوں کے محاصرے، خواتین کے شعور میں ہونے والی بڑھوتری اور طالبعلموں اور نوجوانوں کی جرات و بہادری نے مشرقی ومغربی دونوں پاکستانوں میں انقلابی صورتحال پیدا کی ہوئی تھی۔ انقلاب میں تاخیر نے مشرقی بنگال میں تحریک کو قوم پرستانہ رجحانات کی طرف دھکیل دیا۔ جنگی جنونیت اور وحشت کو پاگل پن کی حد تک ہوا دی جانے لگی جو ایک انتہائی سفاک اور ہولناک خانہ جنگی اور پھر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں سامنے آئی۔ پاکستانی فوج کو بنگالی عوام کے ہاتھوں بدترین ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ خانہ جنگی کے دوران ہزاروں افراد پاکستانی فوج کے ہاتھوں مار دیئے گئے جبکہ ان گنت خواتین کے ساتھ زنا بالجبر بھی کیا گیا۔

پاکستانی فوج کی طرف سے کیے جانے والے بنگالیوں کے اس بے رحمانہ اور بہیمانہ قتل عام کو اسلامی بنیاد پرستوں کی طرف سے ملنے والی مدد نے اور بھی وحشی بنا دیا۔ پاکستانی فوج کی معاون طاقت کے طور پر سرگرم ان مذہبی جنونی تنظیموں میں سے دو کا تعلق اسلامی بنیاد پرست پارٹی جماعت اسلامی کے ساتھ تھا جن کے نام ''الشمس'' اور ''البدر'' تھے۔(18) جنونیوں کے یہ لشکر بدقماش عناصر سے ترتیب دیئے گئے تھے جن کو ریاست پاکستان کی طرف سے بھاری تعداد میں اسلحہ اور سرمایہ فراہم کیا گیا، حقیقتاً یہ

سب سی آئی اے (CIA) کی معاونت اور مدد سے کیا جا رہا تھا۔ ان جنونیوں کی زیادتیاں اور بدمعاشیاں پاکستان کی فوج سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ سب کچھ کافی حد تک ایک فوجی نظم وضبط کی ماتحتی میں ہو رہا تھا مگر بنگالیوں کا قتل عام کرتے ہوئے کسی کم سے کم معیار کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ اسی معرکہ آرائی کے دوران ہی البدر اور الشمس نے پاکستانی فوج کی عسکری اور مادی امداد کے ذریعے کمیونسٹ اور سوشلسٹ طالبعلموں، ٹریڈ یونینسٹوں اور سیاسی کارکنوں کو اپنے ہدف پہ رکھتے ہوئے ان کو چن چن کر قتل کیا۔ اس خانہ جنگی کو آڑ بناتے ہوئے مشرقی بنگال میں جاری انقلابی تحریک کو ایک بدترین ردانقلاب کے ذریعے کچل کے رکھ دیا گیا۔ یہی وہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ جس کے باعث قوم پرستوں کو عوام اور تحریک پر قابو پانے کا باآسانی رستہ مل گیا جبکہ اس انقلاب کے بانی سوشلسٹ بائیں بازو کے قائدین کو تاریخ کے کسی کونے میں بٹھا دیا گیا۔

جماعت اسلامی کی مشرقی بنگال کے ''آپریشن بلٹز'' (Operation Blitz) میں گہری مداخلت کو جنرل ریٹائرڈ قریشی نے اپنی کتاب میں بے نقاب کیا ہے جو دیناج پور/سید پور (مشرقی بنگال کے اضلاع) کا بٹالین کمانڈر رہا تھا۔ اس نے صاف لکھا ہے کہ کیسے امیر جماعت اسلامی کو وہاں کے ضلعی کمبیٹ ٹروپس فارمیشن سنٹرز (Combat Troops Formations) تک باآسانی رسائی حاصل ہوتی تھی جہاں وہ اسلامی جنونی جانبازوں کی حوصلہ افزائی اور پیش قدمی کیلئے وقتاً فوقتاً جاتا تھا، ان جہادی گروپوں کے ڈھانچے اور کاروائیوں کے طریق کار نازی جرمنی کے ''شاک ٹروپرز'' اور زار روس کے ''بلیک ہنڈرڈز'' سے مماثلت رکھتے تھے۔ جنرل قریشی لکھتا ہے ''ملٹری ایکشن کے بعد مولانا طفیل نے ہمارے کیمپ کا دورہ کیا۔ وہ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کے دور دراز علاقوں کا دورہ کرنے والا واحد پاکستانی لیڈر تھا جو وہاں درپیش حالات کا ذاتی طور پر جائزہ لینے آیا تھا۔ ہمیں یہ جان کر اچھا لگا کہ ہم وردی والوں کے علاوہ بھی کوئی اور ہے جو اس نظریاتی اور جغرافیائی حوالے سے اس منفرد ملک کے مستقبل کے بارے میں اتنا ہی پریشان ہے جتنا ہم۔ مولانا کو ان رضا کاروں کے بارے میں بہت تشویش تھی جو مقامی طور پر ان کی جماعت میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔ اسے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہے کہ وہ ایک شاندار کردار ادا کر رہے ہیں۔ مولانا نے ہنستے ہوئے مذاق کے انداز میں ہمیں کہا کہ ہمارے جانبازوں نے ہمیشہ کڑے وقت میں پاکستانی فوج کا دلجمعی سے ساتھ نبھایا ہے۔ اس وقت میری جو ذہنی حالت تھی تب میں نے سوچا کہ یہ تصور ہی محدود نوعیت کا ہے کہ فوج اور جماعت اسلامی ایک دوسرے کی حمایت کر

رہے ہیں دراصل نہ تو فوج اپنے تحفظ کی لڑائی لڑ رہی تھی اور نہ ہی مجاہدین فوج کے کردار کو بڑھاوا دے رہے تھے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بجائے درحقیقت ملکی مفاد میں باہمی تعاون کر رہے تھے۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ یہ جماعت اسلامی اور اس کے تیار کردہ بنگالی مسلمانوں کو ہی اعزاز جاتا ہے کہ انہوں نے اس وقت تک ہمارا بھرپور ساتھ دیا جب تک ہم وہاں موجود رہے۔ یہ سب تو پاکستان اور اسلام کے نام پر مر مٹنے کیلئے تیار تھے مگر بدقسمتی سے ہمیں سفید جھنڈے بلند کرنے پڑ گئے''۔(19)

یہی جنرل قریشی آگے وضاحت کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ فوج نے اپنے فوجی آپریشنز میں ان متعصب بنیاد پرستوں کو کس آخری حد تک استعمال کیا۔''جنرل آفیسر کمانڈنگ GOC نے نو تشکیل کردہ ''ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز'' اور ''مجاہد'' یونٹس کے بارے میں بحث کی۔ ہم نے ان دونوں کے حوالے سے گفتگو کی کہ کس طرح ان مددگار مجاہدوں کو نچلی سطح تک باقاعدہ فوج کے ساتھ ملانا ہے اور ان کی کمان فوج کے پاس ہی رکھنی ہے۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ان رضا کاروں کی آمد سے افرادی قوت میں اضافہ ہوگا اور ہم مزید مستحکم ہوں گے اور ہمارے دائرہ کار کے سارے علاقے میں راشن، اسلحہ بارود اور دیگر انتظامی کمک کی بروقت فراہمی بھی بہتر ہوگی''۔(20)

دسمبر 1971ء میں پاکستان آرمی کی پسپائی کے بعد مشرقی پاکستان میں ایک نیا تنازعہ شروع ہوگیا۔ قومی آزادی کی جنگ کے دوران پاک فوج سے چھڑائے گئے علاقوں کے اندر سوویتیں قائم ہونی شروع ہوگئیں۔ بھارت کی جارح فوج نے مشرقی بنگال کی رجعتی بورژوا قوم پرست قوتوں کی مدد سے ان سوویتوں کو کچلنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دوران امریکی بحریہ کا ساتواں بیڑہ خلیج بنگال میں اپنے لاؤ لشکر سمیت موجود تھا۔ امریکی سامراجی خوفزدہ تھے کہ شاید بھارتی فوج ان سوویتوں کو کچلنے میں ناکام رہے جو سماج میں ایک نئے نظام کے طور پر جنم لے رہی تھیں۔ یہ سوویتیں مکتی باہنی اور نیشنل لبریشن موومنٹ کے بائیں بازو جاتیو سماج تانترک دل JSD کی زیر نگرانی سرگرم ہو رہی تھیں۔ دونوں دشمن ممالک کے سینئر فوجی افسران کی بھائی چارے اور دوستی کی فضا جو تقسیم سے پہلے ایک ساتھ مشترکہ تعلیم یا ملازمت کے دوران بنی تھی وہ پچیس سال بعد بھی اور تین جنگیں لڑے جانے کے باوجود بھی قائم و دائم تھی۔ بنگلہ دیش جنگ کے ختم ہونے کے ایک دن بعد پاکستان کی مسلح افواج کی ایک کور کے افسروں کے ایک گروپ نے اس بھارتی فوجی گروپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا جس کے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔ انہیں ایک کلب کے شراب خانے میں بھارتی کیولری کا ایک افسر مل گیا جس نے ان

کی شکست قبول کرنے سے پہلے انہیں اپنے ساتھ پینے کی پیشکش کر دی۔''بھارتی فوج کی پیش قدمی کرنے والی گارڈ جو سب سے پہلے شہر میں داخل ہوئی تھی، کی سربراہی کرنے والے میجر جنرل گندھارو ناگرانے کہا کہ بہت جانی نقصان ہو چکا ہے، ہر طرف تباہی ہی تباہی کا سماں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی ہمارے جنرل نیازی سے ملاقات ہوئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہاں میں اسے ملا ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہم کالج سے ہی ایک دوسرے کے شناسا ہیں''۔(21)

جب پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنے کیلئے اس کے یونٹ میں لایا گیا تو میدان جنگ سے فارغ ہو کے تازہ دم بھارتی اور پاکستانی فوجیوں نے دھان کے خالی میدانوں میں ہاکی اور فٹبال کے میچوں کا ایک راؤنڈ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ کھیلوں کے اس خیر سگالی مرحلے کے دوران ہی بھارتی کمانڈر کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کے دفتر سے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا۔ اس فوری پیغام میں اسے یاددہانی کرائی گئی تھی کہ ''تمہیں جنگ کیلئے بھیجا گیا تھا کرکٹ کھیلنے نہیں''۔ اگر مشرقی بنگال میں انقلاب پھیل جاتا تو اسے کوئی بھی مغربی بنگال کے ساتھ وابستہ اور منسلک ہونے سے نہیں روک سکتا تھا جہاں کمیونسٹ پہلے ہی مضبوط اور سماج انقلابی ہو چکا تھا۔ بعد از جنگ کے بحران زدہ برصغیر میں ایک سرخ بنگال جو کہ اپنی سرکشیوں اور بغاوتوں کی درخشندہ روایات کا حامل ہے۔ ایک سرخ بنگال سارے خطے کو انقلاب کی طرف کھینچ کے لے جاسکتا تھا۔ اس سے نہ صرف برصغیر میں سرمائے کی حکمرانی کا خاتمہ ہو جاتا بلکہ اس کے امریکی و مغربی سامراج کیلئے بھی دوررس تباہ کن اثرات مرتب ہوتے۔ خلیج بنگال پر ساتویں امریکی بیڑے کی موجودگی کسی طور بھی اتفاقیہ یا حادثاتی نہیں تھی۔

مغربی پاکستان میں شکستہ اور شکست خوردہ فوج کسی طور بھی کسی نئی عوامی سرکشی کا مقابلہ کرنے سے مکمل طور پر قاصر تھی۔ مسلح افواج اپنی ساکھ اور سماجی بنیادوں سے محروم ہو چکی تھی۔ جبکہ یہ اندر سے بھی تھک ہار چکی تھی۔ جنرل گل حسن نے اپنی خودنوشت یادداشتوں میں تفصیل کے ساتھ مشرقی بنگال میں عوام کی بغاوت کا احوال بیان کیا ہے۔ جہاں تحریک نے فوج کو شکست سے دوچار کر دیا تھا اور جہاں کمزوروں اور محکوموں نے نظام کو اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ جنرل گل نے اس صورتحال پر روشنی ڈالی ہے جب ابھی بھارتی فوج بھی وہاں نہیں آئی تھی۔

''جنرل ٹکا خان کے ہتھیار ڈالنے سے بھی پہلے، بے عزتی اور گالیوں سے بچنے کیلئے ہمارے فوجی چھاؤنیوں تک ہی محدود ہو کے رہ گئے تھے۔ اس وقت عوامی لیگ کے کارکن فوجیوں پر حملہ کر دیا کرتے

تھے۔معاملات اس وقت اور بھی بدترین ہو جاتے تھے جب بنگالی ٹھیکیدار ہمارے لیے خوراک کی سپلائی کو بند کر دیتے تھے اور جب ان کی بجلی اور پانی کی فراہمی کاٹ دی جاتی تھی۔ یہ ایک انتہائی بدترین کیفیت تھی۔ یہ سب فطری تھا کہ جب آرمی ایکشن بند کر دیا گیا تھا تو فوج کسی طور بھی عوامی لیگ کے غنڈوں کی طرف سے ہونے والی توہین کو فراموش نہ کرتی''۔

''چین سے اپنے دورے کی واپسی پر میں دو دنوں کیلئے مشرقی پاکستان رکا، یہ دو دن میں سفر پر رہا اور مختلف کمانڈروں کے ساتھ حال احوال کرتا رہا جو کہ باغیوں کے ساتھ لڑائی میں شریک تھے۔وہ پراعتماد تو تھے لیکن مغربی پاکستان کے ان بے شمار افسروں کے قتل سے پریشان بھی تھے جو سول آرمڈ فورسز اور ایسٹ بنگال رجمنٹس کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہے تھے اور جو اپنے ہی جوانوں کی طرف سے قتل کیے جا رہے تھے۔میری ان کے ساتھ جو بات چیت ہوئی اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا اور جس کی بعد میں جنرل ٹکا خان نے بھی تصدیق کی جب میں نے اسے اپنی واپسی سے قبل ڈنر پر دعوت دی، کہ وہاں کوئی شے بھی حرکت میں نہیں تھی ،نہ ریلیں' نہ بسیں' نہ سٹیمر، کیونکہ یہ یا تو سرحد سے باہر جا چکے تھے یا پھر چھپا دیئے گئے تھے۔یہ فوج سے ڈر گئے تھے یا پھر باغیوں سے سہم گئے تھے جو ان کے حکومت کے ساتھ تعاون کے سخت مخالف تھے ،اس حکومت کے جس کی اتھارٹی جنرل ٹکا خان تعمیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔یہ قطعی کوئی حوصلہ افزا صورتحال نہ تھی جو میں اپنے ساتھ واپس لایا''۔

''کھلنا ہیڈکوارٹرز پر میں نے دیکھا کہ ہماری وائرلیس سروس میں بھی باغیوں کی جانب سے مداخلت کی جا رہی تھی۔میں نے سپیکر پر میجر جلیل کی آواز سنی جو ایک بہت اچھا افسر اور ساتھی تھا اور جو میرے ساتھ 1 آرمرڈ ڈویژن میں کام کر چکا تھا لیکن جو اب فوج سے بھاگ کر باغیوں کی قیادت کر رہا تھا۔مجھے انتہائی شدید جھٹکا لگا کہ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس جیسا افسر بھی ایسا کرے گا۔مشرقی پاکستان ڈوب چکا تھا اور ہم جس قسم کی کوششیں کر رہے تھے ان کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا، ہم وہاں صرف وقت ضائع کر رہے تھے''۔(22)

انقلابی ابھار کو روکنے میں ناکامی پر برصغیر کے حکمرانوں نے انتہائی اقدام اٹھانے کا فیصلہ کر لیا کہ ایک بڑی جنگ شروع کر دی جائے اور انقلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔جنگ میں شکست نے فوج کو مکمل طور پر نڈھال اور شکست وریخت سے دوچار کر دیا تھا۔کئی چھاؤنیوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ایسی رپورٹیں آ رہی تھیں جن کے مطابق سپاہیوں نے اپنے افسروں کی مار پیٹ کرنا، انہیں قید کرنا

یہاں تک کہ قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ریاست کا یہ ناقابل شکست ستون اپنی بنیادوں تک لرز چکا تھا اور لڑکھڑا رہا تھا۔ ملکی اور عالمی میڈیا انتہائی سخت سنسر شپ اور پابندیوں کے باعث ان واقعات کو چھپا رہا تھا۔ خاص طور پر یہ سختی ان واقعات کے سلسلے میں اور بھی زیادہ تھی جن میں شکست خوردہ فوجی اپنے افسروں، اپنے حکمرانوں اور خود نظام کے خلاف بغاوت پر اتر آئے تھے۔ تاہم جو بھی ہو ہم یہاں ایک بار پھر اس موضوع سے متعلق سب سے معتبر حوالے جنرل گل حسن کی بات کو سامنے لاتے ہیں جو بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان کا پہلا اور آخری کمانڈر انچیف تھا۔ اسے ہٹانے کے بعد بھٹو نے پاکستان آرمڈ فورسز کی ''چین آف کمانڈ'' کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ سب علامتی تھا اور یہ تبدیلی دکھاوے کیلئے ہی کی گئی تھی۔ کمانڈر انچیف C-in-C کے عہدے کو چیف آف آرمی سٹاف COAS میں بدل دیا گیا۔ آرمی کمانڈر کی جگہ ایک جوائنٹ چیف آف آرمی سٹاف کمیٹی JCSC قائم کر دی گئی۔ جنرل گل حسن اپنی یادداشت میں ''Tremors in the Army'' کے عنوان سے باب میں لکھتا ہے:

''جب تک بھی میرے قویٰ قائم رہیں گے، 19 دسمبر کا دن کبھی بھی میری یادداشت سے محو نہیں ہو سکے گا' یہ راولپنڈی کا ایک خوشگوار دن تھا لیکن جو موسم ہمارے اندر تھا اس سے یہ کسی طور بھی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمارے اندر کیا کیا طوفان بپھرے ہوئے تھے۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ آج جی ایچ کیو (G.H.Q) جا کر کام کیا جائے جیسا کہ اچھے دنوں میں میری عادت ہوا کرتی تھی۔ میں انتہائی مایوس اور دل برداشتہ تھا کہ ہم اپنے ساتھ یہ کیا کر بیٹھے ہیں؟ میں سوچ رہا تھا کہ دفتر میں کتنے ایسے معاملات کی فائلیں پڑی ہیں جو سیز فائر کے حکم کی خلاف ورزی کیے جانے سے متعلق تھیں، جنہیں میں نے دیکھنا تھا اور ان کے متعلق فیصلہ کرنا تھا''۔

''محاذ جنگ سے لڑائی کے بارے میں غلط رپورٹیں آئی ہوئی ہوں گی کہ اپنے پچھلے غلط دعووں کو سچ ثابت کرنے کیلئے بھارتی فوج اپنے ہاتھ سے نکل جانے والے علاقوں کی بازیابی کیلئے بے دریغ لڑ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے افسران بھی اپنے اپنے محاذوں پر قابض ہیں۔ ہمارے افسران کی طرف سے بھی مطالبات کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے۔ اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے لمحوں میں مجھے اپنے ان فوجیوں کی حالت کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا جو جنگی قیدی بن چکے تھے۔ میرا سر بوجھل ہو چکا تھا۔ اس دوران میں نے سڑک پر نگاہ دوڑائی تو میں نے دیکھا کہ راہ چلتے لوگ جی ایچ کیو (G.H.Q) کی جانب جاتی ہوئی ہماری گاڑیوں کو نفرت اور حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اپنے اوپر بہت

ملامت ہوئی''۔

''میں جب اپنے دفتر پہنچا تو میرے سٹاف افسر نے مجھے اطلاع دی کہ آج چیف آف سٹاف راولپنڈی گیریژن کے افسروں سے خطاب کرے گا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ آج کا موضوع کیا ہوگا مگر مجھے اتنا ضرور احساس تھا کہ آج جنرل حامد کو اپنی زندگی کے سب سے مشکل ہدف کو سرانجام دینا تھا۔ میں نے اس کا استقبال کیا، اسے ہال کے اندر تک لے گیا اور خود جا کر پہلی قطار میں بیٹھ گیا۔ مجھے قطعی یاد نہیں کہ اس نے کیا کہا۔ میں جذباتی سطح پر اتنا بددل ہو چکا تھا کہ میری توجہ ہی کہیں مرکوز نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں اس کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکا۔ اور پھر وہ بھی کب مسلسل بول سکا تھا۔ نیچے سے اسے نیم باغی اور برہم اجتماع بار بار ٹوک رہا تھا۔ چیف کو اپنے آپ کو سنبھالنے کیلئے ایک دو بار ڈائس سے بھی ہٹنا پڑ گیا اور پھر اپنی بات شروع کرنی پڑی۔ میں نے منظّم افراد کے اس طرح کے کسی اجتماع میں ایسی کارکردگی پہلے کبھی اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔ لیکن میں نے اس ضمن میں انہیں غلط بھی نہیں سمجھا۔ مجھے یہ بھی کچھ کچھ یاد پڑ رہا ہے کہ ہال میں بیٹھے سبھی لوگ یہ مطالبہ بار بار دہرا رہے تھے کہ سبھی افسروں کے میس بند کر دیئے جائیں''۔

''اپنی اس زبوں حال کیفیت میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس صورتحال کا کیسے مقابلہ کیا جائے، کس طرح اس سے نکلا جائے۔ ہمارا مستقبل کیا ہوگا، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ سہ پہر کو مجھے بتایا گیا کہ کرنل عالم آفریدی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں اور جلد ہی اس کا مجھے فون بھی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ گوجرانوالہ میں فوجی سپاہی مشرقی پاکستان کے سقوط پر انتہائی مشتعل ہیں اور احتجاج کر رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ میں وہاں آؤں اور ان کو مطمئن کروں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ میں جی ایچ کیو نہیں چھوڑ سکتا، البتہ وہ مجھ سے ملنے آ جائے۔ اگرچہ مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کو ملنے سے کیا حاصل ہوگا؟ آفریدی کافی دیر مجھ سے بات کرتا رہا اور مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ گوجرانوالہ میں فوجی سپاہی بغاوت پر اتر آئے تھے۔ آفریدی کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس کے فوجی مطالبہ کر رہے ہیں کہ جنرل ٹکا خان کو فوراً ہٹایا جائے''۔

یحییٰ کی رخصتی! بھٹو کی آمد!

''میجر جنرل ایم آئی کریم، جو 6 آرمرڈ ڈویژن کا کمانڈر اور ایک مشرقی پاکستانی افسر تھا، نے بھی تصدیق کی کہ فوج مشرقی پاکستان کے چھن جانے سے دہل چکی تھی اور ہر طرف فوجیوں میں اضطراب و اشتعال بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے یہ ساری باتیں صدر مملکت کے گوش گزار کیں۔ اس نے مجھے یقین

دلایا کہ وہ جلد سے جلد اقتدار سے الگ ہو رہا ہے اور اسے ایک عوام کے منتخب نمائندے کے سپرد کر دے گا۔ 19 دسمبر کا یہ دن واقعی مجھے کبھی بھی نہیں بھولے گا۔ اپنی ساری طویل ملازمت کے دوران کوئی اور دن مجھ پر اتنا بھاری نہیں گزرا۔ آرمی کا ڈسپلن تنکوں کی طرح بکھرتا جا رہا تھا اور ہر طرف انتشار ہی انتشار تھا۔ صورتحال اس حوالے سے اور بھی بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی کہ کوئی بھی ایسی اتھارٹی موجود نہیں تھی جو اس کو سمیٹتی یا سنبھالتی۔ یہ بھیانک پرخطر واقعات کا سلسلہ تھا جس نے فوج کے وجود کو ہی سوالیہ نشان بنا کے رکھ دیا تھا، پاکستان کا اب رہ بھی کیا گیا تھا! کون تھا جو اس صورتحال میں فوج کو بچاتا اور اسے بحال کرتا؟''۔(23)

یہ ایسی صورتحال تھی جب 7 نومبر 1968ء کے بعد ایک بار پھر سوشلسٹ انقلاب برپا کیا جا سکتا تھا اور استحصالی سرمایہ دارانہ نظام اور سامراجی لوٹ مار کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اکھاڑ کے پھینکا جا سکتا تھا۔ ٹراٹسکی نے چوتھی انٹرنیشنل کی بنیادی دستاویزات کے عبوری پروگرام میں لکھا ہے ''نسل انسانی کا تاریخی بحران آج سمٹ کر انقلابی قیادت کے بحران میں ڈھل چکا ہے''۔(24)

پاکستان پیپلز پارٹی نہ تو کوئی بالشویک پارٹی تھی اور نہ ہی بھٹو کوئی لینن تھا۔ انقلابی پارٹی کی غیر موجودگی نے اس انقلابی موقع کو پاکستانی پرولتاریہ اور محروم و مقہور عوام کے ہاتھوں سے گنوا دیا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ اور مشرقی پاکستان کی تحریک اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں مگر بہت کم کتابیں یا مواد ایسا ہے جو 1971ء کے مشرقی پاکستان کے سانحے پر طبقاتی نقطہء نظر سے لکھا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اس موضوع کا درست احاطہ کرنے کیلئے ایک الگ مکمل کتاب درکار ہے۔ چونکہ اس وقت ہمارا موضوع یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے لہٰذا ہم اپنے تجزیے کو انہی اہم اور قابل ذکر واقعات کی نشاندہی تک ہی محدود رکھ رہے ہیں جو ان ہلا دینے والے دنوں میں ہوئے اور جن کے اثرات ابھی تک پاکستان میں موجود ہیں۔ فوجی آپریشن اور پھر اس کے نتیجے میں منہ پر لگنے والے شکست کے زوردار طمانچے کے دوران یحییٰ آمریت نے اپنے سائے تلے ایک مصنوعی عبوری حکومت تشکیل دی۔ مشرقی بنگال سے نورالامین کو وزیراعظم جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کو اس حکومتی سیٹ اپ کا مجوزہ ڈپٹی وزیراعظم اور وزیر خارجہ بنایا گیا۔

بھٹو 8 دسمبر 1971ء کو نیویارک پہنچا جہاں اس نے سفارتی محاذ پر بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان کے کھوئے ہوئے اعتماد کی بحالی کی کوشش کی۔ اپنی روانگی کے وقت اس نے کراچی ایئرپورٹ پر

الوداع کہنے کیلئے آئے ہوئے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے،خواہ ہمیں ہزار سال کیوں نہ لگ جائیں مگر ہم پاکستان کی مقدس سرزمین کو بھارت کی جارحیت سے پاک کر کے رہیں گے''۔بھٹو نے 11 دسمبر کو پیئر میں کچھ دیر قیام کے بعد والڈروف ٹاورز میں اقوام متحدہ میں امریکی سفیر جارج بش کے دفتر میں ہنری کسنجر کے ساتھ ناشتہ کیا اور اس سے ملاقات کی۔کسنجر اس ملاقات کا احوال لکھتا ہے''پروقار،گفتگو میں تاثیر،ذہین بھٹو بالآخر ایک ایسا نمائندہ سامنے آ گیا تھا جو عوامی معاملات میں بھارتی قیادت سے مقابلہ کر سکتا تھا۔عدم اعتماد کی فضا میں اس کی دلکش طرز گفتگو اور برمحل و برموقع برتاؤ نے ہماری حکومت کو مشکل میں ڈال دیا''۔(25)

کسنجر نے بھٹو کو مشورہ دیا کہ ''محض جذباتی گفتگو کرنے سے پاکستان کو نہیں بچایا جا سکے گا۔ایسا نہیں ہے کہ ہم تمہاری مدد نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم تمہیں بچانا چاہتے ہیں۔اصولوں کی فکر کرنا اور ان پر بات کرنا اچھی بات ہوتی ہے لیکن ہمیں ہر حال میں تمہاری بقا کو یقینی بنانا ہے۔اگلے اڑتالیس گھنٹے انتہائی اہم اور فیصلہ کن ہیں۔ہمیں ان کو تاریخ میں نام زندہ رکھنے کیلئے ضائع نہیں کرنا۔بھٹو بہت سلجھا ہوا،بہت معاملہ فہم انسان تھا۔اسے حقائق سے درست آگاہی بھی تھی۔وہ ایک ایسا آدمی تھا جو کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا اور جو موقع اور حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔مگر جو کچھ اس کے ملک میں اب بچا تھا اسے بچانا انتہائی دردناک مرحلہ تھا''۔(26)

''ٹائیگر نیازی'' نے 16 دسمبر کو ہتھیار ڈالے اور اگلے دن ڈھاکہ کے ریس کورس گراؤنڈ میں دوپہر کو ساری فوج سرنگوں ہو گئی۔پاکستان کے 93000 افسر اور فوجی قید کر لیے گئے۔یہ قومی تاریخ کی سب سے بدترین ذلت آمیز شکست تھی۔ایک ایسی شکست جسے بھٹو جیسے لیڈر کی شعلہ بیانی بھی مغربی پاکستان کے کروڑوں لوگوں کے سامنے عریاں ہونے سے نہیں بچا سکی تھی۔جس نے ہر ممکن امید دلانے ،دعا کرنے اور تھک ہار کے ہر ممکن جھوٹ بول کر اپنے عوام کو دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔نیویارک سے بھٹو 17 دسمبر کو،صدر نکسن اور ہنری کسنجر کے ساتھ مذاکرات کیلئے فلوریڈا میں کی بسکین پر پہنچا۔یہ ملاقات بیب ریبوزو کی کشتی پر ہوئی تھی جہاں اسے ہر طرح کی عسکری و مالی امداد کی یقین دہانی کرائی گئی۔18 دسمبر کی شام کو وہ پان امریکہ کی فلائیٹ سے واپسی کے طویل سفر کیلئے روانہ ہوا۔ایک ایسی قوم کی طرف جو شکست سے نڈھال و بے حال ہو چکی تھی اور جس کی اسے آگے چل کر قیادت کرنی تھی۔وہ روم (اٹلی) پہنچا جہاں سے اسے ایئر مارشل رحیم خان کے حکم پر پی آئی اے کا ایک خصوصی جہاز کراچی لانے کیلئے بھیجا گیا

تھا۔واپسی کے اس اداس مگر فاتح سفر میں بھٹو کو تہران اترنے اور شاہ ایران کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

''یحییٰ کو پھانسی دو'' کا نعرہ اب ''سدا جیوے بھٹو'' میں بدل چکا تھا۔یحییٰ کو پھانسی دینے کا مطالبہ زوروں پر تھا، جب اس کے چیف آف سٹاف نے 20 دسمبر کو نیشنل ڈیفنس کالج پنڈی میں جونیئر افسروں کے گروپ سے خطاب کرتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بریفنگ دینے کی کوشش کی تو اسے انتہائی سخت سوالات اور سخت جملوں کا سامنا کرنا پڑ گیا۔''نوجوان افسران چلا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے ''باسٹرڈ'' ''شرابی'' ''ذلیل'' ''بے شرم''۔۔۔جنرل حامد خان چپ ہو کر سنتا رہا جبکہ اگلی صفوں میں بیٹھے جرنیلوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔یحییٰ خان کے سارے حربے ناکام ہو چکے تھے۔کھیل ختم ہو گیا تھا''۔(27)

جب نیشنل ڈیفنس کالج میں ہونے والا یہ شاندار سٹیج ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا اور یحییٰ کو یہ بتا دیا گیا کہ وہ صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت کچھ ہار چکا ہے، بھٹو راولپنڈی پہنچا جہاں اس کا با اعتماد ساتھی مصطفیٰ کھر ایئر پورٹ کے دروازے کے ساتھ ایک نیلی مرسیڈیز کے اندر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔یہاں سے وہ دونوں ایوان صدر کیلئے روانہ ہوئے۔خاردار تاروں اور فولادی دروازوں کی حامل یہ عمارت بہت جلد بھٹو کی رہائش گاہ بننے والی تھی۔یحییٰ انتہائی بیتابی کے ساتھ اپنے ہارے ہوئے دو جرنیلوں حامد اور پیرزادہ کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔تینوں سوڈے کے بغیر وسکی سے شغل فرما رہے تھے۔

20 دسمبر 1971ء کو یحییٰ خان کو ہٹا کر بھٹو کو پاکستان کا نیا صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا حلف لینے کے بعد پنجاب ہاؤس پنڈی لے جایا گیا۔یحییٰ کو جلد سے جلد ایوان صدر خالی کرنے کا کہا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان کو پنجاب ہاؤس بلایا گیا، صدارتی عمل کی سیڑھیاں چڑھتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ وہ یحییٰ سے ملنے جا رہا ہے۔بھٹو نے اسے کہا کہ وہ یحییٰ کی جگہ آرمی کمانڈر انچیف کا منصب سنبھال لے کیونکہ وہ اس پوزیشن کو سنبھالنے کا اہل نہیں تھا۔موجودہ چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر جنرل گل حسن سبھی جرنیلوں سے ذاتی طور پر بخوبی واقف تھا بلکہ ان میں سے کئی ایک کی تو وہ تربیت بھی کر چکا تھا۔انہی شاگردوں میں سے ایک چرب زبان ''ڈارک ہارس'' کے طور پر مشہور میجر جنرل ضیاء الحق (1924/88ء) بھی تھا۔ایک نئے صدر کے سامنے حیران جنرل گل نے سوچنے کیلئے وقت مانگا۔ پاکستانی فوج کی تازہ شکست کے بعد اس کے سربراہ کا عہدہ قبول کرنا کانٹوں کا ایک تاج تو ہو سکتا تھا مگر

عزت کا باعث نہیں۔

ایک بار پھر ہم اپنے سابق کنوارے کمانڈر ان چیف C-in-C سے سنتے ہیں کہ اس صورتحال کو وہ خود اپنے الفاظ میں کیسے بیان کرتا ہے۔ اپنی یادداشتوں میں جنرل گل حسن لکھتا ہے۔

''12.00 بجے مجھے میرے سٹاف افسر نے اطلاع دی کہ صدر پاکستان مجھ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرا خیال کل کی صورتحال کی طرف چلا گیا کہ میں کیسے یہ سب صدر کے گوش گزار کر سکوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میں اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت جاوید ناصر آیا اور اس نے میرے ڈرائیور سے کہا کہ صاحب کو پنجاب ہاؤس لے جاؤ۔ میں نے جاوید سے پوچھا کہ صدر کو پنجاب ہاؤس میں کیا کام پڑ گیا کہ وہ وہاں چلے گئے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے صدر کے ملٹری سیکرٹری کا یہی پیغام ملا ہے بس۔ یہ ایک نیا معمہ تھا کیونکہ صدر یا تو ایوان صدر یا پھر اپنے سیکرٹریٹ میں ہوتا تھا۔ پنجاب ہاؤس تو بس گورنر ٹھہرا کرتا تھا جب وہ پنڈی آتا۔

میں جب پنجاب ہاؤس پہنچا تو دونوں گیٹ بند تھے، گارڈ نے مجھے دیکھ کر گیٹ کھولا مگر میں نے دیکھا کہ وہاں بے شمار لوگ موجود تھے اور ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے میں دقت ہو رہی تھی۔ تاہم جیسے کیسے میں سیڑھیوں تک پہنچا تو ملٹری سیکرٹری نے مجھے ایک کمرے میں جانے کو کہا، میں وہاں بھٹو کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

بھٹو اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھا اور مجھے گلے لگاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔ جو مجھے اس وقت سچے لگے۔ اگرچہ مجھے بعد میں پتہ چلا وہ مگرمچھ والے آنسو بہانے میں بھی ماہر تھا۔ بھٹو نے فوری طور پر اپنا مدعا بیان کیا کہ وہ مجھے ملٹری چیف دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یحییٰ خان اور حامد کو ہٹا دیا گیا ہے۔ میں اس صورتحال پر ششدر رہ گیا اور پوچھا کہ وہ کیسے اور کیونکر اس فیصلے پر پہنچا ہے! اس نے کہا کہ میں یحییٰ کی جگہ پاکستان کا صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن چکا ہوں۔ میں نے بھٹو کو کہا کہ میں اس عہدے کا کسی طور طلبگار نہیں ہوں۔ جب فوج کی سرحد سے واپسی مکمل ہو جائے گی تو میں چاہوں گا کہ ریٹائر ہو جاؤں۔ میں نے جتنا کرنا تھا کر چکا۔ بھٹو نے کہا کہ وہ میرے خیال اور ارادے سے متفق نہیں۔ تم میرے اچھے دوست ہو اور تم فوج کو اس کے پاؤں پر کھڑا کرنے کیلئے میری مدد کرو۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا فیصلہ کر چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ سے بہتر اور سینئر کئی اور ہیں جو آپ کی معاونت کیلئے تیار بھی ہوں گے۔

یہ بحث مباحثہ کافی دیر تک یونہی چلتا رہا جس پر میں نے کہا کہ مجھے سوچنے کے لیے کچھ دن چاہییں۔ بھٹو نے انکار کرتے ہوئے کہا نہیں میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے آج ہی قوم سے خطاب کرنا ہے۔ جس کیلئے تمہاری تقرری ہی میری تقریر کا مرکزی نقطہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ تقریر کے مرکزی نکات کیا ہوں گے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ قوم کو اس سے بھی کہیں زیادہ اہم باتوں کی ضرورت ہے جنہیں سننے کیلئے وہ بے چین ہے۔ بھٹو نے کہا کہ اسے میری ''نہ'' نہیں چاہیے۔ جس پر میں نے دو چار دن کا وقت مانگا کہ مجھے سوچنے دیا جائے تا کہ میں اپنا ذہن تیار کر سکوں کہ کرنا ہے یا نہیں۔ اس پر بھٹو نے پھر سے مجھے ایک لمبا لیکچر دیا اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مجھ پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔ مجھے دوستی بھائی چارے سمیت کئی واسطے دیئے۔ میں مشکل کیفیت میں پھنس چکا تھا اور مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میرا نکلنا اتنا آسان نہیں۔ میں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ مجھے سوچنے دو، آدھے گھنٹے میں تمہارا منصوبہ کہیں نہیں چلا جائے گا۔ بھٹو وہاں سے مجھے ساتھ ملحقہ ایک کمرے میں لے گیا۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے چائے کا ایک کپ مل سکتا ہے تو اس نے کہا ابھی لو۔

قریب چالیس منٹ کے بعد میں بھٹو کے کمرے میں گیا اور میں نے اسے بتایا کہ میں کچھ شرائط کے ساتھ اس عہدے پر کام کرنا قبول کر سکتا ہوں۔ پہلی یہ کہ میں اسی رینک پر کام کروں گا جو میرے پاس ہے یعنی لیفٹیننٹ جنرل، اس حقیقت کے باوجود کہ کمانڈر ان چیف C-in-C بھی ایک فور سٹار جنرل ہی ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ اسے سرحدوں پر سے فوج کو واپس بلانا ہوگا۔ یہ ہمارے قید ہو جانے والے فوجیوں کیلئے اچھا قدم ہوگا اور ان کی جس قدر جلد رہائی ہو سکے گی بہتر اور سود مند رہے گا۔ بھٹو نے کہا کہ وہ بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا اور ان پر کام بھی کر رہا تھا۔ آخری بات جو میں نے کہی وہ یہ تھی کہ اگر مجھے فوج کا انچارج بنایا جاتا ہے تو کوئی بھی میرے معاملات اور معمولات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ نہ خود بھٹو اور نہ ہی اس کی کابینہ کا کوئی وزیر۔ اس پر بھٹو مسکرایا اور کہا کہ یہی وہ خوبی ہے جس کی بنا پر اس نے میرا انتخاب کیا ہے۔ بھٹو کی طرف سے میرے کمانڈر ان چیف C-in-C بننے کیلئے بتائی گئی پوزیشن پر اتفاق کے بعد میرے لئے اور کوئی رستہ نہیں بچا تھا کہ میں اقرار نہ کروں۔ میں وہاں سے واپس جی ایچ کیو (G.H.Q) چلا آیا۔ میں اپنی تقرری پر خوش نہیں تھا مجھے کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ میں خود کو ٹوٹا پھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ میں جو لے کر لوٹا تھا وہ میرا مطمع نظر تھا ہی نہیں۔ مجھے اچھی طرح پتہ تھا کہ میں گلابوں کی سیج پر نہیں

جارہا تھا کیونکہ فوج کو مشرقی پاکستان میں شکست ہو چکی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر 19 دسمبر کا واقعہ۔ میں خود کو نیم مردہ، نیم شکستہ محسوس کر رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ہی اس عہدے کو سب سے زیادہ ناپسند کرنے والا شخص تھا''۔(28)

یہ انتہائی غیر معمولی تاریخی لمحات تھے جو صاف اور سیدھے انداز میں کسی شک وشبہ کے بغیر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مقبول قیادتوں کی سبھی قسمیں خواہ وہ اصلاح پسند ہوں یا مرکزیت پسند یا پھر انقلابی سوشلسٹ نعرے لگانے والے، یہ ہر انقلابی موقع پر بورژوا ریاست اور نظام کے ساتھ مصالحت کر لیا کرتے ہیں۔

بھٹو کی واپسی سے پہلے ہی واشنگٹن، نیویارک، کی بسکائن اور فلوریڈا میں یہ منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا۔ فوج کو اس کی مقبولیت سمیت بحال کیا جانا، سماج میں اس کی ساکھ کو دوبارہ معتبر بنانا، یہ سب طے ہو چکا تھا اس کے باوجود کہ یہ اس قسم کے بدترین حالات میں پاکستانی حکمران طبقات کیلئے انتہائی مشکل ہدف تھا۔ اس کیلئے ہر کولیس جیسی طاقت والا کوئی لیڈر ہی ہمت کر سکتا تھا اور یہ فریضہ بھٹو جیسا عوام کا ہر دلعزیز لیڈر ہی انجام دے سکتا تھا۔ مقبولیت پسندی کی اس دوا کو استحصال زدہ عوام کی بہتری کے پر جوش ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ملا کر، قوم پرستانہ پاکستانی تعصب کو بروئے کار لا کر اور ''انقلابی'' اصلاحات کے ذریعے اس معجزے کو رونما ہونے کے قابل بنا دیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ ایک بالشویک پارٹی کی تخلیق جو سماج کو انقلابی تبدیلی سے ہمکنار کرتی وہ بھی ایک طویل صبر آزما جدوجہد کے ذریعے، مارکسی کیڈروں کی تعلیم وتربیت کر کے، جہد مسلسل اور واقعات کی دہکتی ہوئی آگ میں فولاد کو کوئی شکل دے کر، یہ سب پاکستان میں موجود ہی نہیں تھا۔ صرف یہ نہیں تھا کہ بھٹو نے فوج کو دوبارہ پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا بلکہ اسے پاکستانی سماج کی تہوں میں پنپتے انقلابی جوش و جذبے کے ساتھ بھی نمٹنا تھا۔ عوام اس کے باوجود بھی ایک تبدیلی کیلئے تڑپ رہے تھے۔ ریاست کے اندرونی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بعد بھٹو نے عوام الناس کی طرف توجہ دی۔

20 دسمبر کی سرد رات کو اس نے قوم سے خطاب کیا ''میرے عزیز ہم وطنو! میرے پیارے دوستو! میرے پیارے طالب علمو! مزدورو اور کسانو! وہ جو پاکستان کیلئے لڑے۔۔۔ میں بہت دیر سے اس مقام تک پہنچا ہوں، یہ پاکستان کی تاریخ کے فیصلہ کن لمحات ہیں۔۔۔ ہم اپنے ملک کی زندگی کے بدترین بحران سے گزر رہے ہیں، ہمیں اپنے ٹکڑوں کو چننا ہے، یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔۔ مگر ہمیں ایک نیا

پاکستان بنانا ہے' ایک ترقی پسند خوشحال پاکستان، استحصال سے پاک پاکستان، وہ پاکستان جس کا خواب قائداعظم نے دیکھا تھا۔۔آپ کا تعاون مجھے ملا تو میں خود کو ہمالہ سے بھی بلند سمجھوں گا''۔(29)

''قائد عوام'' کی سب پہلی تقریر میں سے، جب وہ عنان اقتدار سنبھال چکا تھا، ''سوشلسٹ انقلاب'' کا ذکر تک موجود نہیں تھا۔البتہ اس نے فوج کے مقام ومرتبے کی بحالی کا تذکرہ ضروری سمجھا۔''میں اپنے بہادر فوجیوں کو جو مشرقی پاکستان میں جنگ لڑے ہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ہم آپ کی عزت نفس کی بحالی تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔اور یہ محض لفاظی نہیں۔ہم آپ کا ساتھ دیں گے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔آپ کا گرنا ہمارا گرنا ہوگا۔میری اس بات کو یاد رکھیں کہ ہم سے جو کچھ بن پڑا ہم کر کے رہیں گے''۔(30)

اگرچہ بھٹو نے محنت کشوں، جدید پرولتاریہ میں خصوصاً کراچی میں بہت سی توقعات پیدا کر دی تھیں مگر ان کو اصلاحات سے مطمئن نہیں کیا جاسکا۔اس نے ''انقلابی'' اصلاحات کی بھرمار کر دی تاکہ سماج میں کوئی تحریک نہ ابھر سکے لیکن وہ ایک بحران سے بھرپور نظام کے ہاتھوں ناکام ہونے سے نہیں بچ سکا۔ بائیں بازو کے انقلابیوں کا ایک حصہ جو مزدور تحریک میں متحرک تھا، ابتدا سے ہی پیپلز پارٹی کے ساتھ جڑ گیا تھا اور اس کی بدولت پیپلز پارٹی کو 1970ء کے الیکشن میں محنت کش طبقے کی طرف سے بھاری ووٹ پڑا۔مزدوروں کو توقع تھی کہ الیکشن کے دوران کیے گئے وعدے پورے کیے جائیں گے اور جب نئی حکومت قائم ہوئی تو ان کی طرف سے اصرار سامنے آنا شروع ہو گیا کہ وعدے پورے کیے جائیں۔پارٹی کے اقتدار کے وقت صنعت کی صورتحال کیا تھی، اس کا اندازہ خود حکومت کی اپنی شائع کردہ دستاویز سے لگایا جاسکتا ہے جو اس نے عوامی تشہیر کیلئے چھاپی تھی۔''ہڑتالیں، دھرنے، تالہ بندیاں عروج پر تھیں جن کی وجہ سے ساری صنعت متاثر ہو رہی تھی اور پیداوار تقریباً رک گئی تھی۔پھر جب بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی' جس نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ دیا تھا یعنی انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ اور مزدوروں' کسانوں کی بہتری کا' اقتدار میں آئی تو برسوں سے رکے عوام کے جذبات پھٹ پڑے''۔(31)

حکومت نے سبھی مالکان کو ہدایات جاری کیں جن میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ تحریک کے دوران ملازمتوں اور کام سے نکال دیئے جانے والے محنت کشوں کو بحال کریں۔اس کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے محنت کشوں کیلئے مراعات کی حامل ایک نئی ''جامع لیبر پالیسی'' کے اجرا کی بھی نوید سنائی گئی۔ جب وفاقی وزیر محنت نے اس کا اعلان کیا تو پارٹی نے اس بات کو نظرانداز نہیں کیا تھا کہ یہ محنت کش ہی تھے

جنہوں نے پارٹی کی کامیابی کیلئے بے شمار قربانیاں دی تھیں۔مگر دوسری طرف حکومت نے محنت کش طبقے میں پھیلے اضطراب سے ابھرتے تحریک کو بھانپتے ہوئے ''لاء اینڈ آرڈر'' کو تشویشناک قرار دیا اور کہا کہ ''دشمن کے ایجنٹ'' مزدوروں کی صفوں میں گھس کر امن وامان کے مسائل پیدا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ مالکان کی تنظیمیں دھمکیاں دے رہی تھیں کہ اگر صنعتوں میں جاری انتشار کو بند نہیں کرایا گیا تو وہ کاروبار بند کر دیں گے۔حکومت کا ارادہ اور نئی لیبر پالیسی اس بیان سے ہی واضح ہو جاتی ہے جو نئی لیبر پالیسی کو جاری کرتے وقت جاری کیا گیا۔حکومت نے اس بیان میں اس امید کا اظہار کیا کہ اب مزدور ''گھیراؤ'' جیسی ناقابل برداشت کاروائیوں سے گریز کریں گے اور اب وہ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ آئندہ امن خراب کرنے کی ہر کوشش کے ساتھ ریاستی طاقت سے نمٹا جائے گا۔

فروری 1972ء کو اعلان کی جانے والی لیبر پالیسی مزدورں کے عروج کو پہنچے ہوئے ولولے کا براہ راست جواب تھی،اس کے ساتھ ہی یہ اس بات کی بھی عکاسی کرتی تھی کہ حکومت مزدوروں کی طرف سے انتخابی مہم کے دوران کیے گئے تعاون کا بھی مداوا کرنا چاہتی تھی ۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اس لیبر پالیسی کے اثرات بجائے اس کے کہ محنت کشوں کو سہولت فراہم کرتے ،ان کی وجہ سے صنعتی تعلقات پر حکومتی پابندیوں کو اور بھی سخت کر دیا گیا۔اس حقیقت کا ظہور اس وقت ہوا جب اس کے عملی نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے۔1972ء کی لیبر پالیسی مزدوروں کی تسلی وتشفی کرانے کا اپنا مجوزہ ہدف پورا نہیں کر سکی یوں محنت کشوں کو دوسرے رستے اور طریقے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

تصادم

مزدوروں کی سرگرم قیادت کا زیادہ تر حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو 1968/69ء کی انقلابی یلغار سے ابھر کر سامنے آئے تھے اور جنہیں بعد میں مالکان نے مارشل لاء کے جبر کی چھتری تلے ملازمتوں سے برطرف کر دیا تھا۔صنعتی کاروائی شروع کر دی گئی،نئی حکومت کے ابتدائی چھ ماہ اس صورتحال سے نمٹنے میں لگ گئے۔اس صنعتی کاروائی کا بنیادی مقصد اپنے برطرف شدہ ساتھیوں کی بحالی اور ان تالہ بندیوں کا خاتمہ کرانا تھا جو حکومت کی ہدایات کے باوجود ابھی تک کی جا رہی تھیں۔''مزدوروں کی طرف سے شروع ہونے والے اس ابھار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ حکومت کو اپنے پہلے چالیس دنوں کے اندر ہی مزدوروں کی بڑی تعداد کو گرفتار کرنا پڑ گیا''۔(32) ''حکومت کی طرف سے لیبر پالیسی کے اعلان کے وقت حکومت کی

سخت گیری میں صنعتکاروں کی طرف سے ڈالے جانے والے شدید دباؤ نے اور بھی اضافہ کر دیا جب انہوں نے دھمکی دے دی کہ اگر لاقانونیت کو لگام نہ ڈالی گئی تو وہ سب کچھ بند کر دیں گے''۔(33)''مالکان کے مشترکہ موقف کا جواب دینے کیلئے چھ بڑی ٹریڈ یونینوں نے مل کر سندھ ورکرز کنونشن منعقد کرانے کا اعلان کر دیا۔ سندھ کی 75% منظم ورک فورس کے نمائندے اور کراچی کے مزدوروں کی اکثریت کے منتخب نمائندے اس کنونشن میں شریک ہوئے''۔(34)اس کنونشن کا مقصد ہڑتالوں پر پابندی جیسے ''مزدور دشمن اقدامات'' کا مقابلہ کرنا تھا۔ بڑی لیبر فیڈریشنوں کا یہ اکٹھ، کراچی کے صنعتی علاقوں کے مزدوروں کے ساتھ اتحاد کی کوششوں کا ہی ایک حصہ تھا۔اس صنعتی علاقے کے کارخانوں کی یونینیں پہلے ہی کراچی مزدور ایکشن کمیٹی کے تحت نچلی سطح تک منظم ہو چکی تھیں، سائیٹ کی ہر یونین کے دو نمائندے اس کا حصہ تھے۔ کراچی کے دیگر بڑے صنعتی علاقوں میں ''لانڈھی کورنگی لیبر آرگنائزنگ کمیٹی''(LKLOC) پہلے ہی 1970ء سے تشکیل پا چکی تھیں۔ بڑی حد تک یہی مزدوروں کی حقیقی نمائندہ تنظیمیں ہی مزدوروں کے مطالبات اور مفادات کیلئے جدوجہد کرتی چلی آ رہی تھیں۔ لیبر فیڈریشنیں اور وائٹ کالر'' آؤٹ سائیڈر'' مزدور قیادت جو مزدور تحریک میں اپنی حیثیت کو برقرار یا مستحکم کرنا چاہ رہے تھے، انہیں ان سرگرم کارکنوں کے ساتھ شریک ہونا پڑ گیا جو مزدور تحریک میں تیزی سے اہمیت حاصل کر رہے تھے۔ اس سندھ ورکرز کنونشن میں غیر حاضر رہنے والی ایک بڑی لیبر فیڈریشن اپنے کارکنوں کی حمایت سے ہی محروم ہو گئی بعد ازاں وہ اپنے اس غلط فیصلے پر اڑ گئی اور مزدور تحریک کے جوش و جذبے کا ساتھ نہ دینے کی پالیسی پر ہی گامزن رہی۔

محنت کشوں اور انتظامیہ کے مابین ایک بڑا تصادم کراچی کے دو بڑے صنعتی علاقوں میں سے ایک سائیٹ میں پیش آیا۔ 7 جون 1972ء کو پیش آنے والے اس تصادم میں تین مزدور ہلاک ہوئے، پولیس نے ان پر گولی چلا دی تھی۔ تنخواہ والے دن تنخواہ نہ ملنے پر فیروز سلطان ٹیکسٹائل ملز کے ان مزدوروں نے فیکٹری کا گھیراؤ کر لیا تھا۔''اگلے دن جب ہلاک ہونے والے ایک مزدور کے جنازے کا جلوس بنارس چوک پہنچا تو پولیس اور پیرا ملٹری فورسز نے اس پر گولی چلا دی۔ پولیس ذرائع کے مطابق اس کے نتیجے میں دس ہلاکتیں ہوئیں جن میں ایک خاتون اور ایک بچہ بھی شامل تھا''۔(35) اس ہولناک واقعے کے خلاف سائیٹ اور لانڈھی کے کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی جو 12 دن جاری رہی۔ فائرنگ کے اس واقعے کے بعد سرگرم دکانوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے رہنماؤں نے سائیٹ میں موجود

مزدور کالونیوں میں ڈیرے ڈال دیئے۔ان کے ساتھ کچھ وائٹ کالر آؤٹ سائیڈر مزدور رہنما اور کچھ دوسرے انقلابی لوگ بھی، جو ایک مخصوص لیبر فیڈریشن کے نمائندے تھے، شریک ہو گئے۔''حکومت نے اعلان کیا کہ وہ اسی مخصوص فیڈریشن کے نمائندوں کے ساتھ ہی مذاکرات کرے گی کیونکہ یہی صنعتی علاقوں کی صورتحال کو کنٹرول کیے ہوئے ہیں''(36) ریجنل کمیٹیاں قائم کی گئیں جن کو اپنے اپنے علاقوں میں میٹنگیں کرنی تھیں جبکہ دو عام میٹنگیں روزانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ تازہ ترین صورتحال سے آگاہی حاصل کی جا سکے۔''لانڈھی میں شروع ہونے والا تصادم ایک حکومتی مشین ٹول فیکٹری میں اجرتوں کے معاملے پر شروع ہوا۔یہ ہڑتال قریب کی سبھی ٹیکسٹائل ملوں میں پھیل گئی۔پیرا ملٹری فورسز نے ایک مل کی جانب بڑھتے ہوئے مزدوروں پر بدترین تشدد شروع کر دیا۔فائرنگ کے نتیجے میں چار مزدور ہلاک ہو گئے''۔(37) جب لانڈھی میں مزدور ہڑتال پر تھے، پولیس نے ''شرارتی اور فسادی لیڈروں'' کی گرفتاری کیلئے صنعتی علاقے کے پیچھے واقع پہاڑیوں میں تلاش شروع کر دی جہاں لیبر کالونیاں واقع تھیں۔ایک اور تصادم میں دو اور مزدور اس وقت ہلاک جبکہ پچاس سے زائد زخمی کر دیئے گئے جب مزدور اپنی میٹنگ کر رہے تھے۔اگرچہ حکومت نے لانڈھی اور سائیٹ میں ہلاک ہونے والے مزدوروں کے خاندانوں کو امدادی رقم فراہم کر دی تھی مگر مزدوروں کے مطالبات کا کوئی حل تو کیا ذکر تک کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا گیا۔وزیر اعلیٰ سندھ نے فیکٹری مالکان کو اجازت دے دی کہ وہ ہر اس مزدور یا ملازم کو برخاست کر سکتے ہیں جو اڑتالیس گھنٹوں کے اندر کام پر واپس نہیں آ جاتا۔

''لانڈھی میں فوج طلب کر لی گئی اور اس واقعے میں ایک مزدور ہلاک ہو گیا۔جبکہ دوسری طرف پولیس نے مزدوروں کو زبردستی ہانک کر فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور کر دیا''۔(38) اکتوبر کے دوران سائیٹ کے سبھی مزدور لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا تا کہ وہ صنعتی علاقوں میں کسی قسم کی ہڑتال یا سرگرمی نہ کر پائیں۔اکتوبر 1974ء میں ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے حکومت نے اپنی پوزیشن کو اور بھی مضبوط کر لیا۔اس آرڈیننس میں لیبر قوانین میں ترمیم کر دی گئی تھی اور اسے صنعتکاروں کی طرف سے یہ کہہ کر خوش آئند قرار دیا گیا کہ ''اسے بہت پہلے آ جانا چاہئے تھا اور یہ کہ اس آرڈیننس کے ذریعے ملک میں صنعتی امن و امان کو فروغ ملے گا''۔(39) ''فروری 1975ء میں وزیر محنت نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس آرڈیننس کا مقصد ٹریڈ یونینوں پر نظر رکھنا تھا جو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کو حد سے زیادہ فروغ دینے میں ملوث ہو رہی تھیں۔آرڈیننس میں ان بدعنوان مزدور لیڈروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا عندیہ

دیا گیا تھا جو اپنے مقاصد کیلئے صنعتی علاقوں میں بے چینی کو ہوا دیتے ہیں۔ایسے مزدور لیڈروں کو نہ تو مزدوروں نہ ہی عوام کا دوست قرار دیا گیا اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اس قسم کے دشمن عناصر اگر غیر قانونی ہڑتالیں کرنے یا کرانے کی کوشش کریں تو انہیں سخت سزا دی جائے۔(40)

تجزیہ

کسی بھی پرولتاری انقلاب کو کئی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔کئی اتار چڑھاؤ' نشیب وفراز اس کا لازمی خاصا ہوا کرتے ہیں۔تاریخ کے مختلف اوقات میں ان انقلابات کے کئی رنگ روپ سامنے آیا کرتے ہیں۔کئی مختلف عناصر وعوامل ان انقلابات کو متاثر کرتے ہیں۔تاریخ،ثقافت،سماجی ومعاشی ترقی کی جہتیں، یہاں تک کہ اس ملک کی آب وہوا جہاں یہ انقلاب رونما ہو رہا ہوتا ہے، یہ سب مل کر انقلابی تحریک پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔اور پھر ایک اہم عنصر وقت کا بھی ہوا کرتا ہے جس سے وہ انقلابی ابھار گزر رہا ہوتا ہے۔کچھ انقلابی تحریکیں معمولی اتار چڑھاؤ کے ساتھ سالوں تک بھی جاری رہ سکتی ہیں جبکہ کچھ انقلابی ابھار ہفتوں میں ہی اپنی دھماکہ خیز شدت کے ساتھ سامنے آجایا کرتے ہیں۔پاکستان میں 1968/69ء کے انقلاب کی توانائی کا بڑا ذریعہ سیاسی طور پر تازہ دم نوخیز پرولتاریہ کی طاقت تھی جس پر کسی قسم کی اصلاح پسندانہ ٹریڈ یونین یا سیاسی پارٹی کا سایہ تک بھی نہیں پڑا تھا۔لیکن پھر یہی انقلابی ابھار ایک اور اذیت سے بھی گزرا،ایک خالص مارکسی قیادت اور انقلابی تنظیم کی غیر موجودگی کی اذیت سے۔

انقلاب کی تکمیل کیلئے ایک واضح پروگرام،تناظر،درست نظریات، لچکدار حکمت عملی وطریق کار اور سب سے بڑھ کر ایک جرا تمند حوصلہ مند قیادت کی حامل پارٹی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔اس کی سب سے درخشندہ اور زندہ مثال لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں تشکیل پانے والی بالشویک پارٹی ہے۔1917ء کے انقلاب کے دوران لکھی جانے والی اپنی شاندار کتاب ''ریاست اور انقلاب'' میں لینن ایک قبل از انقلاب صورتحال کی نشاندہی واضح الفاظ میں کرتا ہے۔سب سے پہلی کیفیت یہ کہ حکمران طبقہ تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے اور ماضی کی طرح سے حکمرانی کرنے کے قابل نہیں رہتا۔دوسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ درمیانہ طبقہ متذبذب ہوتا ہے اور یہ کبھی حکمران تو کبھی مزدور طبقے کی طرف ڈول رہا ہوتا ہے۔تیسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مزدور طبقہ سرگرم اور تبدیلی کیلئے ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار ہوتا ہے۔اور آخری مگر سب سے اہم کیفیت ایک انقلابی تنظیم' ایک انقلابی قیادت کا موجود ہونا ہے جو خود کو مزدور طبقے

اوراس کی تحریک سے وابستہ رکھتے ہوئے لڑائی کواس کے انجام تک لے جاتی ہے۔

لینن کی یہ شرائط اور کیفیات 1968/69ء کے انقلاب کی صورتحال میں درست ثابت ہوئیں۔معیشت اور سماج کے بحران نے حکمران طبقات میں تضادات ابھار کران کوتقسیم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ نا قابل فتح سمجھے جانے والے ایوب خان کے اپنے ہی ساتھی اس کے خلاف نا قابل مصالحت بغاوت پر اتر آئے تھے اوراسے چھوڑ گئے تھے۔مغربی پاکستان میں اپنے جبر واستبداد کیلئے بدنام،ایوب کا چہیتا گورنر جو ہر وقت ایوب کا دم بھرتا رہتا تھا،چھوڑ کر چلا گیا جوایوب حکومت کیلئے ایک بڑا دھچکا تھا۔ یہاں تک کہ ایوب اور بھٹو کے مابین 1966ء میں پیدا ہونے والا تنازعہ بھی حکومت اور حکمران طبقے کی کمزوری اور تصادم کی ہی نشاندہی کرتا تھا۔ نیچے سے جنم لینے والی بے چینی ان تضادات کواور بھی بڑھاوا دے رہی تھی۔امریکیوں سمیت سرمائے کے سبھی حکمت ساز اس صورتحال سے خوفزدہ تھے اوراس سے نمٹنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کررہے تھے۔

بحران سماج کی ہر سطح پر پھیل چکا تھا اور ہر پرت کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ یہ سب سے پہلے طالب علموں میں سے ظاہر ہوا جو کہ خود اپنے اندر درمیانے طبقے کے اضطراب کی انتہا کا ہی عکاس تھا۔ ڈاکٹر،انجینئر اور دوسرے پیشوں سے وابستہ بے روزگار حکومت کے خلاف مزاحمت میں پیش پیش تھے۔ ایوب حکومت میں ہونے والی صنعت کاری اور شرح ترقی میں اضافہ کسی قسم کا روزگار پیدا کرنے سے قاصر تھا۔ یہاں تک کہ یہ ترقی پیشہ ورانہ قابلیت کے حامل درمیانے طبقے کی نچلی پرت کے سفید پوش محنت کشوں کو بھی کھپانے سے محروم تھی۔مرکزی شہروں اور بڑے قصبوں میں سائنس اور آرٹس کے مختلف مضامین کے ڈگری یافتگان نے چوکوں اور چوراہوں میں اپنی ڈگریاں جلانا شروع کر دی تھیں۔سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف درمیانے طبقے کی طرف سے یہی سب سے بڑا اور شدید احتجاج تھا،اس طبقے کی بے چینی اپنی انتہاؤں کو پہنچ چکی تھی اور کئی شکلوں میں پھٹ کر سامنے آرہی تھی۔اور بالکل یہی ہر انقلاب میں ہوا کرتا ہے کہ درمیانہ طبقہ نظام کے خلاف اپنا غم وغصہ اتارنے کیلئے محنت کش طبقے کے ساتھ آملتا ہے کیونکہ انہیں کوئی رستہ نظر نہیں آرہا ہوتا۔اس سے تحریک کو مزید قوت اور تیزی میسر آجاتی ہے اوراس کے اعتماد اور حوصلے میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

مگر سب سے بڑھ کر سب سے زیادہ قوت اور جرات کا مظاہرہ محنت کش طبقہ خود ہی کیا کرتا ہے۔ انہی کی صلاحیت اور جذبہ ہی تحریک کو انقلاب میں بدلنے کا باعث بنتا ہے۔ہم پچھلے باب میں تفصیل سے

بیان کر چکے ہیں کہ انقلابی ابھار سارے ملک کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ یہاں تک کہ پاکستان کے انتہائی دور دراز علاقے بھی انقلاب سے متاثر ہو چکے تھے۔ سندھ کے دور دراز علاقوں سے لے کر پختونخواہ تک کسانوں کی بے شمار اور بے مثال تحریکیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ زرعی اشرافیہ کے پاؤں تلے سے ہی نہیں ان کے قبضے سے بھی زمین نکل چکی تھی۔ ان کا جبر واستبداد، رعب و دبدبہ، شان وشوکت سب سرکش کسانوں نے روند ڈالا تھا۔ یہی اس عہد کا وہ زندہ اور طاقتور کردار تھا کہ جس نے مزدور قیادت کو ایسی طاقت سے بھر دیا جس کا وہ عام دنوں میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ان میں وہ قوت پیدا ہوگئی جس نے ناممکن کو ممکن میں بدل دیا۔ کارخانوں پر قبضے، پہیہ جام کے ذریعے سارے ملک کی حرکت کو روک دینا یہ سب ایسے واقعات تھے جو شاید کتابوں یا پھر کسی پرانے انقلاب کی کسی داستان کا ہی حصہ ہوا کرتے تھے۔

''کسی بھی ہڑتال کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے محنت کش طبقے کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ بھی سماج کی ایک زندہ اور موثر قوت ہے۔ ایک عام ہڑتال اس آگہی کا سب سے بڑا اظہار ہوتی ہے۔ لینن ایک جرمن گیت کا یہ فقرہ اکثر گنگنایا کرتا تھا کہ ''اگر تمہارے آہنی ہاتھ رک جائیں تو دنیا کی یہ ساری حرکتیں رک جائیں''۔ ایک ہڑتال کی کیفیت میں خاص طور پر جب یہ عوام کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے، مزدور اپنے اندر ایک بے پناہ طاقت محسوس کرتے ہیں۔ ہڑتال عوامل کو معتدل کر دیا کرتی ہے، یہ جدید محنت کشوں کی جدید ترین پرتوں کو سیاسی طور پر دوسری باشعور پرتوں کے ساتھ جوڑ کر انہیں باہم پیوست کر دیتی ہے۔ جو عمومی حالات کے عین وسط میں سے ابھر کر عمل میں آ رہے ہوتے ہیں''۔ (41)

ہاں ان دنوں ہلاکتیں بھی ہو رہی تھیں، تشدد بھی ہو رہا تھا اور بھی بہت کچھ ہو رہا تھا مگر یہ تاریخ کے ہر انقلاب کے ساتھ جڑے واقعات ہوا کرتے ہیں۔ لیکن پھر اس کی سب سے بڑی وجہ ایک انقلابی پارٹی کا نہ ہونا تھا۔ یہ ہوتی تو یہ تحریک کے جوش وجذبے کو منظم بھی کرتی اور مرتب بھی۔ انقلاب کسی لگے بندھے ضابطے یا ریت ورواج کے ساتھ نہیں ابھرا کرتے۔ یہ کسی موسیقار کی ترتیب دی ہوئی دھن پر کام کرنے والا آرکسٹرا نہیں ہوا کرتا۔ یہ طاقتوں کا ایک زندہ کھیل ہوتا ہے، یہ تو دو ملکوں کے مابین ہونے والی جنگ سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ عمل ہوتا ہے۔ 1968/69ء کا انقلاب اس طاقت اس شعور، اس صلاحیت کی زندہ وتابندہ مثال بن کر سامنے آیا جس کی بدولت محنت کش طبقہ سماج کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔ گلیوں میں، کارخانوں میں، کھیتوں کھلیانوں میں انہوں نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ جب یہ دبی ہوئی مخلوق انقلابی جذبے سے لیس اور سرشار ہو جاتی ہے تو یہ معجزے دکھانا شروع کر دیتی ہے۔ اور یہ اس نے پاکستان جیسی

خودساختہ مذہبی مملکت کے اندر کر کے دکھا دیا تھا۔

اپنے عمل میں ایک انقلاب محنت کش طبقے کیلئے ایسا سکول ہوتا ہے جہاں سے وہ فیصلہ کن اسباق سیکھتا ہے۔ 1968/69ء کے انقلاب کے دوران پسماندہ' ان پڑھ گنوار یہ سیکھ گئے کہ کیسے منظم ہوا جاتا ہے۔ کیسے بحثیں کی جاتی ہیں اور کیسے انقلاب کو جوش جذبے کے ساتھ آگے بڑھایا جاتا ہے۔ وہ چند گھنٹوں میں محاصرے کرنا، احتجاج کو منظم کرنا، آگے بڑھ کر لڑنا اور ریاستی حملوں سے خود کو بچانا اور پھر از سر نو منظم ہو کر متحرک ہونا سیکھ گئے۔ بڑے بڑے عوامی مظاہروں میں طبقاتی یکجہتی کی ایسی روح پیدا ہو چکی تھی جس کی نظیر پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے کی طرف بڑھتے لوگ، ایک ہاتھ کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا، کسی مسلمان کا ہاتھ ہے یا عیسائی کا۔ مذہب، جنس، قوم، نسل، رنگ، زبان، قبیلہ؛ یہ سب تعصبات انقلاب کی اس جدوجہد کی دہکتی آگ میں جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ سرخ بینر، سرخ جھنڈے اور سرخ پگڑیاں ہر طرف سرخ ہی سرخ رنگ دکھائی پڑتا تھا۔ یہ کسی اور ملک کی نہیں بلکہ ایک پسماندہ رجعتی ملک پاکستان کی داستان ہے جہاں کے عام مردوزن ''سرخے'' ہونے پر فخر کرنے لگ گئے تھے۔ سرخوشی اور تفاخر کا یہ ایک ایسا جنون بن چکا تھا جس کا ذائقہ پاکستان کے محروم عوام نے ان انقلابی واقعات سے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔

مگر اس جدوجہد سے درست نتائج اخذ کرنے اور انقلاب سے حقیقی اسباق مرتب کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس انقلاب کی نظریاتی اساس کو سمجھا جائے۔ عوام کی نفسیات سے جھلکنے والی اصولی تبدیلی کو پرکھا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ سمجھا جائے کہ وہ کیا تھا جسے وہ پانا اور حاصل کرنا چاہ رہے تھے؟ اس جستجو اس لگن میں ایک قطرہ تک بھی یاسیت کا نہیں تھا، مایوسی کا ایک اونس بھی ان کے مزاج اور جذبے میں شامل نہیں تھا۔ جوں جوں ریاست کا جبر و استبداد بڑھتا گیا، انقلاب کا نالہ اور بھی چڑھتا چلا گیا۔ نظام کے خلاف عوام اور بھی پرجوش ہوتے چلے گئے۔

نوجوانوں، طالب علموں نے بسوں اور ٹرینوں کے کرائے دینے سے انکار کر دیا تھا اور انتظامیہ کسی طور ان کو کرایہ دینے پر مجبور نہیں کر سکی۔ بڑے شہروں میں کرائے کے مکانوں میں رہائش رکھنے والوں نے کرائے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مزدوروں نے کارخانوں پر اور کسانوں نے زمینوں پر قبضے کر لیے تھے۔ یہ سب کیا تھا! یہ عوام کی طرف سے رائج الوقت پیداواری رشتوں کو تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ اور یہ طے ہے کہ ایک جمہوری انقلاب میں کبھی بھی ملکیت کے رشتوں کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک

سوشلسٹ انقلاب ہی کا یہ اولین فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ نظام میں نجی ملکیت کے مقدس حق کو چیلنج کرتا ہے۔ مروجہ پیداواری رشتوں کے خلاف بغاوت ہی وہ بنیادی نقطہ ہے جو 1968/69ء کے انقلاب کے سوشلسٹ کردار کو ظاہر کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ لینن کی 1917ء میں بیان کردہ قبل از انقلاب کیفیات یہاں موجود تھیں مگر 1968/69ء کے انقلاب کا ایک المیہ یہ تھا کہ موضوعی عنصر موجود نہیں تھا، وہ عنصر جسے انقلاب کو سوشلسٹ انقلاب میں بدلنا تھا۔ انقلابات روز روز برپا نہیں ہوا کرتے۔ معروضی صورتحال کے ساتھ موضوعی عنصر کی موجودگی فیصلہ کن ضرورت ہوا کرتی ہے۔ معروضی صورتحال مسلسل بدل رہی ہوتی ہے۔ مگر جب عوام کا شعور سماج کو بدلنے کی جستجو میں اجتماعی جدوجہد کا رستہ اختیار کرتا ہے تو ایسے میں موضوعی عنصر کی موجودگی ضروری ہو جایا کرتی ہے تاکہ تحریک کو تبدیلی کی طرف گامزن کرنے میں مہمیز دی جاسکے، تاکہ معروضی صورتحال میں مداخلت کی جاسکے اور اسے اس قابل بنایا جاسکے کہ یہ اپنے انقلابی جذبے سے مروجہ نظام کو اکھاڑ کر پھینک سکے۔ معروضی صورتحال اور موضوعی عنصر کو ایک جدلیاتی ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہوئے سوشلسٹ فتح کے حصول کیلئے انقلاب کو طاقت اور رہنمائی فراہم کرنا پڑتی ہے۔ اس ہم آہنگی اور ساتھ کے بغیر ایک کامیاب انقلاب کا نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

ایک انقلابی نتیجے کیلئے درکار معیاری تبدیلی کے حامل اس تاریخی عمل پر ٹراٹسکی نے 1928ء میں لکھا تھا:

''یہ ایک روایتی منشویک حیلہ سازی ہے کہ قیادت کی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے ہر الزام عوام کے سر تھوپ دیا جائے یا پھر عمومی طور پر قیادت کے کردار کی اہمیت کو کمتر ثابت کیا جائے۔ یہ محض اپنے احساس گناہ سے بچنے کا ہی ایک وطیرہ ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر اس وقت ہوتا ہے جب آپ بالائی ڈھانچے کی جدلیاتی سمجھ بوجھ کی اہلیت سے محروم ہوتے ہیں یعنی اس طبقے کے بالائی ڈھانچے کی جسے پارٹی کہتے ہیں' اس پارٹی کے بالائی ڈھانچے کی جو مرکزی قیادت کی شکل میں ہوتا ہے۔ ایسے عہد بھی ہوتے ہیں جب مارکس اور اینگلز جیسے عظیم انسان بھی تاریخی ترقی کے عمل کو ایک انچ بھی آگے نہیں لے جاسکتے اور ایسے بھی ادوار ہوتے ہیں جب بہت معمولی سطح کے فرد بھی تاریخ کے دھارے کو کئی سالوں تک روکے رکھتے ہیں۔ ایک پرولتاری انقلاب کو کئی مشکلات درپیش ہوا کرتی ہیں، ان میں سے ایک خاص' ٹھوس' مشکل' مخصوص ہوا کرتی ہے۔ یہ واقعات کے کسی اہم ترین موڑ پر انقلابی قیادت کے اہداف اور نقطہء نظر میں سے

ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انتہائی انقلابی پارٹیاں نئے درپیش فرائض اور چیلنجز کو دیکھ کر پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ماضی کے نعروں کو ترجیح دینے پر ہٹ دھرم ہو جایا کرتی ہیں۔(42)

روس کے 1917ء کے کامیاب انقلاب اور پاکستان کے 1968/69ء کے ناکام رہ جانے والے انقلاب سے ہم ایک انتہائی قیمتی سبق حاصل کر سکتے ہیں اور وہ سبق ہے معروض اور موضوع کے ملاپ کا فیصلہ کن ہونا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اصلاحات کی ناکامی کے بعد حکمران طبقات کو جنگ کا خونی کھیل کھیلنا پڑ گیا اور پھر جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انقلابات جنگوں کی کوکھ سے جنم لیا کرتے ہیں۔ تحریک اگرچہ ایوب کی رخصتی کے بعد کسی حد تک تعطل کا شکار ہو گئی تھی تاہم جنگ کے بعد پھر جدوجہد نئی شکلوں میں سامنے آ گئی۔ جنگ کے بعد جب فوج کے اندر سرکشی اور بغاوتیں ہو رہی تھیں، اسی وقت کراچی میں جدید پرولتاریہ اور دیگر صنعتی علاقوں میں نظام کے خلاف جدوجہد پھر عروج کو پہنچ گئی تھی۔ 1971ء کی ابتدا سے انتہا تک پاکستان پے در پے تحریکوں کی زد میں تھا۔ مگر اس دوران تحریک محنت کشوں کی باشعور پرتوں سے کٹی ہوئی تھی۔ 25 مارچ 1969ء کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو کسی بھی انقلاب کے دوران دیکھا جا سکتا ہے۔ پچھلی حکومت کے جانے پر عوام خوشیاں مناتے ہیں، ایک ہمہ گیر خوشی کا احساس جاگزیں ہو جاتا ہے، مرد و زن نئی حاصل کردہ آزادی کا جشن مناتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جسے جمہوریت کی خوش فہمی کہا جاتا ہے جب لوگ خوشی میں مست ہو جایا کرتے ہیں اور جھومتے گاتے ہوئے آزادی اور امید کے ایسے احساس میں کھو جاتے ہیں جس کی کوئی حد' کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ لیکن افسوس تہوار کا یہ روح پرور لمحہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ خوش فہمی کا عارضی لمحہ گزرتے ہی مایوسی کا دور جھنجھلاہٹ کی شکل میں حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور پھر شیکسپیئر کے میکبتھ کی طرح کف افسوس ملتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ''ہم نے سانپ کو مارا تو تھا مگر اسے ہلاک نہیں کر سکے تھے''۔

بتدریج عوام میں یہ خیال تقویت پانا شروع کر دیتا ہے کہ سب دکھاوا ہے' سب تقریریں ہیں' بدلا کچھ بھی نہیں۔ صرف انداز و اطوار بدلے ہیں باقی سب ویسے کا ویسا' وہی کا وہی ہے۔ آقا بھی وہی ہیں اور ہمارے مسائل بھی ویسے کے ویسے ہیں۔ مایوسی اور جھنجھلاہٹ کی یہ لہر یکدم ہی سارے عناصر کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی۔ یہ سب سے پہلے عوام کی سب سے باشعور پرتوں میں اپنی جگہ بناتی ہے۔ جنہیں یہ احساس کھانا شروع کر دیتا ہے کہ اتنی قربانیوں اور جدوجہد کے بعد حاصل ہونے والی طاقت ہاتھوں سے

نکلتی جارہی ہے۔سب سے پہلے یہی ہراول پرت حوصلہ ہارتی ہے اور کسی بھی انقلاب کیلئے یہ ایک انتہائی خطرناک لمحہ ہوتا ہے۔کیونکہ یہ ہراول پرت ہی ہوتی ہے جو عوام سے زیادہ معاملات اور واقعات کو سمجھنے کی اہل ہوتی ہے۔اس لئے بے صبری کا مظاہر کرتے ہوئے یہ فوراً سے پیشتر کچھ کرنے کو مائل ہو جاتی ہے۔یہ لازمی ہوتا ہے کہ سماج کے باقی حصوں کو جیتا جائے جو پست رو ہوتے ہیں اور اس طرح سے نتائج اخذ نہیں کر رہے ہوتے۔اگر ہراول پرت پیچھے ہٹتی اور عوام سے اپنا ناتا توڑ دیتی ہے تو یہ تنہا ہو سکتی ہے اور پھر ردانقلاب اسے کاٹ بھی سکتا ہے۔

پیپلز پارٹی کی نئی حکومت اصلاحات کے عمل اور مخصوص نوعیت کے استحصال کے ساتھ کام چلا رہی تھی۔1974ء تک تحریک مکمل طور پر تحلیل ہو چکی تھی۔ہر طرف مایوسی وبا بن کر پھیل گئی تھی۔انفرادیت اور خودغرضی سماج کی نفسیات پر پھر سے حاوی کر دیئے گئے تھے۔دہائیوں میں تیار ہونے والا انقلابی موقع ضائع ہو چکا تھا۔عوام کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔آنے والی دہائیوں کی سختیوں اور ذلتوں کا طوق عوام کی گردن میں ڈال دیا گیا۔آخری تجزیے میں ایک انقلابی پارٹی اور ایک واضح مارکسی قیادت کی غیر موجودگی واحد وجہ تھی کہ یہ انقلاب ناکام و نامراد رہا اور یہی 1968/69ء کے انقلاب کا سب سے اہم اور سب سے قیمتی سبق ہے۔

پارٹی اور عوامی تحریک کے مابین تعلق کے سوال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ مارکسزم کے مکمل سائنسی پروگرام اور عوام کی لازمی طور پر نامکمل اور تضادات سے بھرپور تحریک کے درمیان فرق کا تعلق ہے۔آج کی نسل کو ایک مارکسی انقلابی پارٹی کی تعمیر کی فیصلہ کن اہمیت کے سبق کو نہ صرف سیکھنا بلکہ جذب کرنا ہے۔ایک اور 68/69ء اس نسل کا منتظر ہے اور یہ انتظار اتنا طویل بھی نہیں ہے اس بار موضوعی عنصر ہی وہ فیصلہ کن عنصر ہوگا جو انقلاب کو اس کے حقیقی اور منطقی انجام تک لے جا سکے گا اور پھر اس بار جو جدوجہد ہوگی وہ صرف ایک نسل کی نہیں بلکہ وہ تہذیب اور انسانیت کی بقا کی جدوجہد ہوگی۔

نوٹس

1۔ پاکستان کے کلیدی معاشی منصوبہ دان کی حیثیت سے سب سے لمبا وقت گزارا۔ 1957ء میں پلاننگ کمیشن پاکستان سے وابستہ ہوئے۔ پاکستان کے قیام کے پہلے پچاس سالوں میں سے چالیس سال تک اکثر حکومتوں میں پلاننگ کمیشن کے چیف، وزیر خزانہ اور اہم معاشی منصوبہ دان رہے۔
یہ اقتباس ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک، (آکسفورڈ)، صفحہ 269 سے لیا گیا ہے۔

2۔ ایوب خان، ایوب خان کی ڈائری 72-1966ء، (آکسفورڈ)، صفحہ 548-547

3۔ ڈان، 11 اپریل 1969ء

4۔ ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک، (آکسفورڈ)، صفحہ 65

5۔ صنعتی تعلقات کے آرڈیننس (IRO) 1969ء کا تعارف

6۔ صنعتی تعلقات کا آرڈیننس (IRO) 1969ء، سیکشن 26 تا 32

7۔ ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک، (آکسفورڈ)، صفحہ 268

8۔ ڈان 12 جنوری 1972ء

9۔ ڈان 6 جنوری 1972ء

10۔ امروز (لاہور)، 20 ستمبر 1969ء؛ پاکستان آبزرور 21 ستمبر 1969ء

11۔ مساوات 22 جولائی 1970ء

12۔ کومبیٹ کراچی، 28 مارچ 1970ء

13۔ پاکستان ٹائمز 10 اکتوبر 1969ء

14۔ جنرل اکبر خان کو 1957ء میں بھی راولپنڈی سازش کیس میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دوسرے راہنماؤں کے ساتھ سزا دی گئی تھی، جن میں بائیں بازو کے مشہور شاعر فیض احمد فض بھی شامل

تھے۔انہیں بعد میں مختلف عرصوں کے دوران قید و بند کی سزائیں دی گئیں

15۔پاکستان ٹائمز،14نومبر 1969ء

16۔دہقان لاہور،جلد1'شمارہ2،13ستمبر 1971ء

17۔پاکستان ٹائمز،26مارچ1971ء

18۔وہ میدان جہاں8ویں صدی عیسویں میں اسلام کے آغاز میں غزوات لڑی گئیں۔

19۔میجر جنرل(ریٹائرڈ)حکیم ارشد قریشی،پاک ہند جنگ،(آکسفورڈ)،صفحہ 91,92

20۔ایضاً صفحہ 95

21۔گیون ینگ،آبزرور،لندن،19دسمبر 1971ء

22۔لیفٹننٹ جنرل(ریٹائرڈ)گل حسن،لیفٹننٹ جنرل گل حسن خان کی یادداشتیں،(آکسفورڈ)،صفحہ 275,313

23۔ایضاً صفحہ 346-339

24۔لیون ٹراٹسکی،عبوری پروگرام،صفحہ 17

25۔ہنری کسنجر،وائٹ ہاؤس میں گزرے سال،(انگریزی)،صفحہ 907

26۔ایضاً صفحہ 8-907

27۔تاثیر،بھٹو،صفحہ 130

28۔ لیفٹننٹ جنرل(ریٹائرڈ)گل حسن،لیفٹننٹ جنرل گل حسن خان کی یادداشتیں،(آکسفورڈ)،صفحہ 347-351

29۔ذوالفقار علی بھٹو،قوم سے خطاب،20دسمبر 1971ء،ذوالفقار علی بھٹو کی تقریریں اور بیانات،جلد 1،20دسمبر 1971 ءتا31مارچ1972ء (کراچی:حکومت پاکستان1972ء)،صفحہ 16-1، اقتباس صفحہ 1

30۔ایضاً صفحہ 17

31۔پاکستان باتصویر75-1973ء

32۔ڈان 30جنوری1972ء

33۔ڈان21تا 25مئی1972ء

34۔ڈان 30 مئی 1972ء

35۔ڈان 9 جون 1972ء

36۔ڈان 13 جون 1972ء

37۔ڈان 19 اکتوبر 1972ء

38۔ڈان 2 نومبر 1972ء

39۔ڈان 15 اکتوبر 1974ء

40۔ڈان 3 فروری 1975ء

41۔ایلن وڈز، بالشوازم راہ انقلاب، (انگریزی) صفحہ 211

42۔ٹراٹسکی، لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل، صفحہ 73

بائیں بازو کی قیادت کا بحران

پاکستان پیپلز پارٹی کا ابھار

''وہ جو انقلاب کو نامکمل اور ادھورا چھوڑتے ہیں، وہ اپنی قبر خود ہی کھودتے ہیں۔''

(لوئی ڈی سینٹ جسٹ)(1)

''میں اس آزمائش میں اس لیے مبتلا ہوں کیونکہ میں نے ملک کے شکستہ ڈھانچے کو پھر سے جوڑنے اور متضاد و متحارب طبقات کے مابین ایک آبرومندانہ اور منصفانہ مصالحت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فوجی بغاوت کا سبق یہ ہے کہ ایسی ہر مصالحت محض ایک یوٹوپیا' ایک دھوکہ ہے۔ فوجی بغاوت ثابت کرتی ہے کہ طبقاتی کشمکش ناقابل مصالحت ہے۔ اس میں ایک طبقے کی جیت دوسرے طبقے کی شکست بن جایا کرتی ہے، یہی نوشتہ دیوار ہے''۔

ذوالفقار علی بھٹو (1928-1979)(2)

سٹالنزم اور ماؤازم

پاکستان کا بایاں بازو پہلے ہی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طرف سے قومی آزادی کی جدوجہد کے عمل میں شدید جھٹکوں اور پھر بٹوارے کے المیے سے دوچار ہو چکا تھا۔ پاکستان میں نئی حکومت نے بائیں بازو پر شدید حملے شروع کر دیئے تھے۔ چین روس کے مابین پیدا ہو جانے والے تنازعے نے پاکستان کے بائیں بازو میں رہی سہی یکجہتی کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ 1960ء کی دہائی میں بائیں بازو کی پارٹیوں کے مابین اختلافات کو روس چین کے تنازعے نے اور بھی پیچیدہ کر دیا۔ اگرچہ ان دونوں کے مابین کوئی حقیقی نظریاتی سیاسی اختلافات اور تضادات نہیں تھے بلکہ یہ سب محض ماسکو اور پیکنگ سے ملنے والی ہدایات کی اندھی تقلید کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ اور یہ ہدایات ان سٹالنسٹ گروپوں یہاں تک کہ بڑی بڑی کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں سے اپنی اپنی خارجہ پالیسیوں پر عملدرآمد کرانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتی تھیں۔ 1964ء میں کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے ان دونوں ملکوں کے مابین تنازعات اور نوآبادیاتی انقلاب کے موضوع پر ایک مارکسی تجزیہ و تناظر تحریر کیا تھا۔ جس میں اس نے ان حقیقی ''نظریاتی'' تضادات اور ان کی وجوہات کا تفصیل سے تجزیہ کرتے ہوئے ان کے نوآبادیاتی انقلاب پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں لکھا:

''اس پھوٹ کے بارے میں ''نظریاتی'' توضیحات پیش کرنے کا واحد مقصد اپنے لیے عالمی سطح پر کمیونسٹ پارٹیوں کے اندر سے زیادہ سے زیادہ حمایت کا حصول ہے۔ اس وقت چینی زیادہ انقلابی نعروں کا آسرا لے کر عالمی سٹالنسٹ تحریک میں روس کے خلاف اپنے لیے حمایت حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ خاص طور پر یہ نوآبادیاتی ممالک کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ چونکہ اس وقت وہ انقلابی نعرے اپنائے ہوئے ہیں، اس لیے وہ سٹالنسٹ پارٹیوں میں سے ان لوگوں کی توجہ حاصل کرتے جا رہے ہیں جو کہ انقلاب کا رستہ تلاش کر رہے ہیں''۔

''دونوں ملکوں کی سٹالنسٹ افسر شاہی کے مابین قومی بنیادوں پر ہونے والی اس پھوٹ نے دنیا بھر میں عوام کی وسیع پرتوں میں الجھاؤ کو شدید کر کے رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ انقلابی مارکسزم کی زیادہ باشعور پرتیں بھی ایک ایسے حوصلہ افزا ماحول میں جب مارکسزم کی قوتیں تعمیر کی جا سکتی ہیں، اس تقسیم اور تنازعے کی بدولت پریشان ہو کے رہ گئی ہیں''۔(3)

جیسا کہ ہم اپنے پہلے ایک باب میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ برصغیر اور عالمی سطح پر بائیں بازو کی قیادت کی کمزوری کی ابتدا سوویت یونین کی تنزلی سے ہوئی۔ کریملن میں سٹا لنسٹ افسر شاہی کا حاوی ہو جانا اور اقتدار پر کنٹرول سنبھال لینا اور پھر 1920ء کی دہائی کے وسط میں تیسری انٹرنیشنل کا انحطاط اور تحلیل اس کی بنیاد بنی۔ برصغیر میں اس تنزلی نے مکمل ہونے میں بہت وقت لیا اور یہ 1936ء میں جا کر وقوع پذیر ہوئی۔ تقسیم کے دوران مسلمان کمیونسٹوں نے بھی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمیونسٹ بھی مذہبی اور قومی تقسیم کے قائل ہیں۔ یہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں تھا کہ مسلم لیگ کیلئے انتخابی منشور اور پروگرام لکھنے والا ایک کمیونسٹ دانیال لطیفی تھا۔ یہ نتیجہ تھا سٹالن کی قوم کی تعریف کا، جس کے مطابق مذہب بھی ایک بڑی قومی پہچان اور شناخت کا حامل ہو سکتا ہے۔ اس زریں اصول پر عملدرآمد نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو برصغیر جنوبی ایشیا کی عملی سیاست میں نظریاتی اور سیاسی تباہی سے دوچار کر دیا۔ بعد ازاں سٹالن کے 1953ء میں مرنے کے بعد سی پی آئی (CPI) کی قیادت نے اپنی سنٹرل کمیٹیوں اور کانگریسوں میں ان غلطیوں کی شدید الفاظ میں مذمت بھی کی۔ مگر اس کا خمیازہ پاکستان کو بھگتنا پڑا جہاں کمیونسٹ پارٹی کبھی بھی سماجی بنیادیں قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی، اس کی وجہ یہی غلط نظریاتی پالیسی تھی۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ پاکستان کے اندر قائم ہونے والی پے در پے حکومتیں انتہائی کمزور تھیں اور نوآدیاتی ملکوں سمیت اس خطے میں بھی سوشلسٹ تحریکوں کی شدت اور دباؤ میں اتنی طاقت تھی کہ سبھی حکمران بائیں بازو سے مسلسل خائف اور دہشت زدہ ہی رہے۔ اسی لیے ابتدائی پانچ دہائیوں کے دوران سبھی حکمران بائیں بازو کو اپنے جبر واستبداد کا نشانہ بناتے رہے۔ اس کے باوجود بھی کہ یہ اتنی بڑی اور موثر قوت میں نہیں تھے کہ ریاست اور اس مروجہ نظام کیلئے کسی خطرے کا باعث بن سکتے۔

ریاست کی طرف سے لگاتار کیا جانے والا جبر وتشدد ان کئی اہم عناصر میں سے ایک تھا جن کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹیاں سماج کی وسیع پرتوں تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ مگر کب اور کس ملک میں کمیونسٹ پارٹیاں، بالشویک پارٹی سمیت ریاستی جبر کا شکار نہیں رہیں۔ اس کے ہوتے ہوئے، اس کو سہتے ہوئے اور اس کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی سماج میں اور عوام میں اپنی بنیادیں تعمیر کی گئیں، سوشلسٹ انقلابات کی قیادت کی گئی اور سماج کو بھی بدلا گیا۔ پاکستان کے بائیں بازو کے دانشوروں اور مورخوں نے کمیونسٹ پارٹی کی تنظیمی غلطیوں اور قیادت کی انفرادی کوتاہیوں کو ان کی ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور یہ بات اتنی غلط بھی نہیں۔

ہمارا نقطہء نظر یہ ہے کہ اس ناکامی کی وجہ کسی طور بھی نہ تو مذہب تھا نہ ہی ریاست کا مذہبی ہونا، نہ ہی اس ناکامی کیلئے تنظیمی خامیوں یا انفرادی کمزوریوں یا قیادت کی غلطیوں کو موردالزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ سب کچھ نظریاتی' سیاسی اور فلسفیانہ بنیادوں پر ہوا جو تاریخی طور پر غلط اور تباہ کن تھیں۔ ایک انقلابی پارٹی کی تعمیر کیلئے درکار ہر طریق کار، ہر حکمت عملی کا تعلق اس تنظیم کی نظریاتی بنیادوں سے ہوا کرتا ہے جو اسے تعمیر کرنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ بائیں بازو کی اکثریت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بطن سے جنم لیا تھا یا پھر ان کا تعلق ایسی تنظیموں سے تھا جو یہ سمجھتی تھیں کہ نوآبادیاتی ملکوں میں انقلابات کا کردار سوشلسٹ نہیں بلکہ قومی جمہوری ہوگا۔ اس سے انہیں ایک مہلک رعایت مل گئی یا جواز میسر آ گیا جس کی وجہ سے وہ حکمران طبقات کی کسی نہ کسی پرت سے مل جائیں وہ بھی اس برخود غلط تصور کے ساتھ کہ ان کا کردار چونکہ ترقی پسندانہ ہے اس لیے ان کی حمایت کی جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہ تو خود کو نہ ہی پرولتاریہ کو اپنے ملک کے استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑنے کیلئے تیار کر رہے تھے جو جاگیردارانہ باقیات کے ساتھ بھی خلط ملط تھا اور سامراج کا غلام بھی تھا۔ چنانچہ سوشلسٹ انقلاب ان کے ایجنڈے سے ہی باہر نکل گیا تھا۔

ان کی ہر ''عملی'' اور ''عوامی'' سیاست نرالی تھی۔ محروم طبقات کو درپیش مسائل سرمایہ دارانہ نظام کی ننگی اور جارحانہ لوٹ مار کے ہاتھوں دن بدن گھمبیر اور شدید ہوتے جا رہے تھے، چنانچہ کمیونسٹ ہونے کے ناطے سے وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ عوام اور پرولتاریہ کی وسیع پرتوں کی ملکی سیاست میں ایک مضبوط و موثر قوت کے طور پر ابھرنے میں ان کی حمایت کریں۔ اس کیفیت نے ان کے ''کیڈروں'' کو تذبذب کا شکار کیے رکھنے میں اہم کردار ادا کیا جس سے بحران پیدا ہو گیا اختلافات ہوئے اور پھوٹ پڑی۔ لیکن پھر یہ سب کچھ حقیقی نظریاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ انفرادی، تنظیمی اور طریق کار کے معاملات پر ہوا۔

لینن اور ٹراٹسکی

اصلی اور حقیقی مسئلہ جو درپیش تھا وہ ایک خالص مارکسی رجحان کی غیر موجودگی تھی۔ جو بھی نظریاتی ماڈل دستیاب تھے وہ سب کے سب سٹالنزم کی مختلف شکلیں تھے۔ بدقسمتی یہ رہی کہ برطانیہ اور یورپ کی درسگاہوں سے پڑھ کر آنے والے کچھ پیٹی بورژوا طالبعلم عناصر نے، جو خود کو ٹراٹسکائیٹ کہلواتے تھے'

انتہائی موقع پرستانہ یا پھر الٹرا لیفٹ کردار ادا کیا کہ جس کی وجہ سے حقیقی مارکسزم اور ٹراٹسکی ازم کی قوتوں کی تعمیر کو مزید دھچکا لگا۔

مارکس، اینگلز اور لینن دنیا بھر میں بائیں بازو کیلئے عمومی قبولیت رکھتے تھے۔ یہ قبولیت صرف نظریاتی اور سیاسی آئیڈیل اور ادارے سے کہیں زیادہ بائیں بازو کی کرشماتی شخصیات کے طور پر تھی اور یہی وہ شکل وصورت تھی جو ان کی سٹالنزم نے بنائی اور دنیا بھر میں رائج کرنے کی کوشش بھی کی۔ 1950/60ء کی دہائیوں تک تو سٹالن ہی بائیں بازو کا ہیرو بنا رہا مگر بعد میں چینی منصوبہ بند معیشت نے ماؤزے تنگ کی قیادت میں تیزی سے جو ترقی کی، اس کے بعد ماؤ بھی بائیں بازو کی سیاست میں داخل ہونے والی نوخیز اور نوجوان پرتوں کا ہیرو بن گیا۔ ٹراٹسکی نہ صرف یہ کہ راندہ درگاہ تھا بلکہ وہ پاکستان میں سٹالنزم کے ہر دھڑے کی قیادت اور ان کے دانشوروں کی طرف سے غدار، ایک سامراجی ایجنٹ اور ایک نازی فاشسٹ قرار دے دیا گیا تھا۔ لینن اور ٹراٹسکی کو ایسے دو متحارب و مخالف مکاتب فکر، شخصیات اور نظریات قرار دیا گیا جن کی جنگ قطعی ناقابل مصالحت تھی۔ سٹالن کا من پسند لینن کا ''منتخب'' تصنیفی کام پاکستان میں سوشلسٹوں کے سٹڈی سرکلوں میں پڑھا اور زیر بحث لایا جاتا جو انہیں غلط نظریاتی جواز فراہم کرتا تھا۔ خاص طور پر لینن کی تصنیف ''سوشل ڈیموکریسی کے دو طریق کار'' کو بھونڈے طریقے کے ساتھ بروئے کار لاتے ہوئے اسے مرحلہ وار انقلاب two stage theory کے جواز اور درستگی کیلئے استعمال کیا جاتا رہا۔ یہ اپنی سرشت میں ہی ایک ضرر رساں اور بے سود عمل تھا اس سے کچھ حاصل تو کیا ہونا تھا مگر اس کی وجہ سے بائیں بازو کے گروپ، پرولتاریہ اور انقلابی نوجوانوں کی وسیع پرتوں سے کٹ کر رہ گئے جو ظالمانہ استحصالی نظام کے خلاف بغاوت کی جستجو اور لگن سے مالا مال تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لینن اور ٹراٹسکی کے مابین نظریات اور طریق کار پر اہم اختلافات تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ 1903ء میں RSDLP میں ہونے والی تقسیم سے لے کر 1917ء کے شروع تک لینن اور ٹراٹسکی کے مابین گرما گرم بحثیں اور اختلافی امور چلتے رہے۔ خاص طور پر منشویکوں اور بالشویکوں کو متحد کرنے کے معاملے پر اختلافی بحثیں مرکوز رہیں۔ ٹراٹسکی نے بعد ازاں اعتراف کیا تھا کہ اس نے اس کڑے وقت میں بالشویکوں کے ساتھ شامل نہ ہو کر غلطی کی تھی۔ مگر یہاں پاکستان کے سٹالنسٹ دانشوروں نے ٹراٹسکی کے خلاف انتہائی معاندانہ پروپیگنڈہ اختیار کیے رکھا۔ دروغ گوئی کی سٹالنسٹ درسگاہ شد و مد کے ساتھ مکروہ مہم چلائے ہوئے تھی اور کوئی ایسا ٹھوس مارکسی رجحان موجود نہیں تھا جو

اس گمراہ کن مکروہ مہم کا مقابلہ کرتا اور اس کا جواب دیتا۔ کریملن افسر شاہی نے اکتوبر انقلاب سے متعلقہ ہر کتاب، دستاویز، تصویر میں سے ٹراٹسکی کو گم کر دیا۔ انقلاب کے پہلے پانچ سالوں کے دوران ٹراٹسکی کی شاندار خدمات کو غائب کر دیا گیا۔ اسی طرح پاکستان کے سٹالنسٹ دانشوروں نے زمروالڈ کانفرنس میں ٹراٹسکی کے کردار کو بھی نظر انداز کیے رکھا جس میں اس نے دوسری انٹرنیشنل کی ''لیفٹ اپوزیشن'' کی بنیاد رکھنے کے ساتھ اکتوبر انقلاب کے دونوں قائدین کے مابین متفقہ و مشترکہ عمل کو ممکن کیا تھا۔ اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''بالشوازم راہ نجات'' میں ایلن وڈز نے لینن اور ٹراٹسکی کے درمیان اختلافات اور بعد میں ان کے اتفاقِ رائے اور ہم آہنگی کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اسی اتفاقِ رائے اور ہم آہنگی نے ہی 1917ء کے بالشویک انقلاب کی قیادت کرتے ہوئے اسے پایہء تکمیل تک پہنچایا۔

''روسی بورژوازی جرمن بورژوازی کے برعکس تاریخ کے میدان میں بہت ہی تاخیر سے داخل ہوئی تھی، اس بارے میں مارکس اور اینگلز نے 1848ء میں ہی تفصیل سے لکھا تھا۔ اس کی سماجی بنیادیں انتہائی کمزور تھیں جس کی وجہ سے یہ اپنے پرولتاریہ سے بہت زیادہ خوفزدہ بھی تھی اور سماج کو ترقی دینے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ صنعت زمیندارانہ سرمائے سے پیوستہ تھی اور یہ دونوں بینکوں کے محتاج تھے۔ غیر ملکی سرمائے پر انحصار نے روسی سرمایہ داری کیلئے ایک کامیاب قومی جمہوری انقلاب کرنا ناممکن بنا دیا تھا''۔

''لینن کی سبھی تحریروں اور تقریروں میں بورژوا ڈیموکریٹک لبرلز کے ردانقلابی کردار کے بارے میں کھل کر کہا اور لکھا گیا ہے۔ تاہم 1917ء تک خود لینن کو بھی اس بات پر یقین نہیں تھا کہ مغرب میں سوشلسٹ انقلاب برپا ہونے سے پہلے روس میں بھی مزدور انقلاب کر کے اقتدار حاصل کر لیں گے۔ یہ وہ تناظر تھا جسے ٹراٹسکی 1917ء سے پہلے اپنے نظریہ مسلسل انقلاب کی شکل میں پیش کر چکا تھا اور اس کا دفاع کرتا چلا آ رہا تھا۔ یہ روسی مزدور تحریک کے اندر طبقاتی مصالحت کے حامل دائیں باز و یعنی منشویکوں کے نظریاتی نقطہء نظر کا مکمل اور بھرپور جواب تھا۔ دو مرحلوں میں انقلاب کا نظریہ منشویکوں کی جانب سے روسی انقلاب کے تناظر کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر بیان کرتا ہے کہ چونکہ انقلاب کا پہلا اور ابتدائی مرحلہ قومی جمہوری انقلاب ہے اس لیے لازمی ہے کہ انقلاب کی قیادت قومی سرمایہ داروں کے سپرد کی جائے''۔

''ٹراٹسکی نے اس کے مقابلے میں کہا کہ اگر محنت کش طبقے کو قیادت کا فریضہ سونپ دیا جائے، تو یہ

استحصال کا شکار سماج کی دیگر پرتوں شہروں اور دیہاتوں کے درمیانے طبقے کی رہنمائی کرتے ہوئے اقتدار حاصل کرسکتا ہے اور پھر اس کے بعد یہ قومی جمہوری انقلاب کے فرائض (خاص طور پر زرعی اصلاحات کرتے ہوئے اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلاتے ہوئے) سرانجام دے گا۔ مگر ایک بار اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد پرولتاریہ یہیں رک نہیں جائے گا بلکہ سوشلسٹ اقدامات کرتے ہوئے سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکے گا اور چونکہ صرف ایک ملک میں ایسے اقدامات کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، وہ بھی ایک پسماندہ ملک میں، اس انقلاب کو عالمی انقلاب کا نقطہء آغاز بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ انقلاب دو حوالوں سے مسلسل کردار کا حامل ہوگا' یہ اپنا آغاز ایک بورژوا ہدف سے لے گا اور اسے سوشلسٹ اصولوں پر کے ساتھ نتھی کر دیا جائے گا اور دوسرا یہ ایک ملک سے شروع ہوگا اور عالمی سطح پر اپنا پھیلاؤ کرتا جائے گا''۔

''لینن نے اس پر اتفاق کیا کہ روسی روشن خیال قومی جمہوری انقلاب نہیں کر سکتے اور یہ فریضہ پرولتاریہ اپنے کسان بھائیوں کے ساتھ مل کر سرانجام دے گا۔ 1905ء سے لے کر 1917ء تک بورژوازی کے کردار کے حوالے سے لینن کا نقطہء نظر ٹراٹسکی کے بالکل قریب تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ ہم آہنگ تھا۔ لینن نے اس کا کھلے عام اعتراف لندن میں ہونے والی پانچویں کانگریس میں بھی کیا تھا، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مارکس کے اقدامات کی پیروی کرتے ہوئے، جس نے بورژوا ڈیموکریٹک پارٹی کو پہلے آزاد خیالوں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک قرار دیا تھا۔(4)

لینن نے واضح کہا تھا کہ روسی بورژوازی کا روسی محنت کشوں کا ساتھی یا خیر خواہ ہونا تو دور کی بات ہے، وقت آنے پر یہ ناگزیر طور پر ردانقلابی قوتوں کا ہی ساتھ دے گی۔ لینن نے 1905ء میں لکھا کہ عوام کے مقابلے میں بورژوازی لامحالہ ردانقلاب کا ساتھ دے گی اور یہ جلد سے جلد عوام دشمنی پر اتر آئے گی۔ کیونکہ یہ تنگ نظر بھی ہے، مفاد پرست بھی اور یہ موقع ملتے ہی جمہوریت سے بھی تائب اور الگ ہو جائے گی۔ (اور یہ ایسا کر بھی چکی ہے)''۔

''لینن کے خیال میں کون سا طبقہ قومی جمہوری انقلاب کی قیادت کرسکتا تھا؟ یہ عوام تھے، یعنی مزدور اور کسان۔ صرف پرولتاریہ ہی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ آخر تک یہ سب کچھ کرتا جائے۔ یہ جمہوری انقلاب سے کہیں آگے تک جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرولتاریہ ایک جمہوریہ کیلئے جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے اور اس کیلئے وہ بورژوازی کو اپنے ساتھ ملانے کے امکانات کی بیہودہ ناقابل اعتبار ہدایات

کوحقارت کے ساتھ رد کر دیتا ہے''۔(5)

ایلن وڈز اس اہم ایشو پر لینن کی سوچ کو مزید واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اس معاملے پر لینن نے ٹراٹسکی کے ساتھ اختلاف کیا کہ روسی پرولتاریہ مغرب میں انقلاب سے بھی پہلے یہاں انقلاب کر سکتا ہے۔ 1917ء تک یہ صرف ٹراٹسکی ہی تھا جو اس نقطہء نظر کا حامل اور حامی تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ خود لینن بھی اس امکان کو مسترد کرتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ روسی انقلاب کا کردار بورژوا ہوگا۔ محنت کش طبقہ غریب کسانوں کے ساتھ مل کر اشرافیہ کا تخت اکھاڑ پھینکے گا اور پھر شد و مد کے ساتھ قومی جمہوری اقدامات کے حامل پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دے گا۔ لینن دل سے اس بات کا متمنی تھا کہ زرعی اصلاحات کی جائیں، جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا جائے اور زمین قومی تحویل میں لے لی جائے۔ تاہم جیسا کہ لینن نے بارہا اس کا واضح اظہار بھی کیا تھا کہ زمین کی ریاستی تحویل ایک بورژوا مطالبہ ہے، سوشلسٹ نہیں جس کا مقصد جاگیرداری کا قلع قمع کرنا ہے۔ لینن نے درجنوں بار یہ بات زور دے کر کہی تھی کہ روس کے اندر سوشلزم کی تعمیر کیلئے درکار معروضی حالات کی غیر موجودگی کے باعث جس سے ہر کوئی متفق تھا، انقلاب سوشلسٹ فرائض پورے کرنے سے رک جائے گا۔ مگر لینن کی بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی تھی' وہ تو ایک ناقابل مصالحت انٹرنیشنلسٹ تھا۔ اس کا تو سارا تناظر ہی بین الاقوامی انقلاب پر مبنی تھا، جس کا روسی انقلاب ایک چھوٹا سا حصہ تھا''۔(6)

سٹالنسٹ دانشوروں' مورخوں اور لیڈروں کی تمام تر بہتان و دشنام طرازی کے باوجود لینن اور ٹراٹسکی کے مابین تعلقات و معاملات کی نوعیت اس سے قطعی مختلف تھی جو انہوں نے گڑھ لیے تھے۔ ٹراٹسکی ہمیشہ منشویکوں کی مرحلہ وار انقلاب کے انقلاب کے مقابلے میں لینن کے موقف کو سراہتا اور اسے ترقی پسند سمجھتا تھا۔ مگر وہ اس کی خامیوں اور کمزوریوں پر بھی تنقید کرتا تھا۔ اس نے 1909ء میں لکھا ''یہ سچ ہے کہ ان کے اس دوران اختلافات معمولی نہیں بلکہ توجہ کے قابل تھے۔ اس وقت جب کہ منشویکوں کے انقلاب دشمن خیالات کھل کر سب کے سامنے آ گئے تھے، ایسے وقت میں بالشویکوں کے نظریات ان کی فتح کی صورت میں سب سے بڑا خطرہ تھے''۔(7)

یہ باکمال فقرے اور ان میں بیان کردہ سچائی کو ہمیشہ ٹراٹسکی کے سٹالنسٹ ناقدین نے دانستہ نظر انداز کیا ہے۔ مگر انہی سے ہی وہ سچائی سامنے آتی ہے جو 1917ء میں منظر عام پر آئی جب لینن کے بالشویک قائدین کے ساتھ ''پرولتاریہ اور کسانوں کی جمہوری آمریت'' کے نعرے پر اختلافات سامنے

آئے اور جسے لینن نے ایک ایسی پالیسی کے حق میں ترک کر دیا جو نظریہ مسلسل انقلاب کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی رکھتی تھی۔ جب انقلاب کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی تو ٹراٹسکی نے اس کے حواشی میں لکھا ''جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ خطرہ کبھی وجود نہیں پا سکتا تھا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ کامریڈ لینن کی قیادت میں بالشویک پارٹی نے 1917ء کی بہار میں ہی اس انتہائی اہم معاملے پر (ایک بڑی اندرونی جدوجہد کے بعد) پالیسی لائن تبدیل کر لی تھی، یعنی اقتدار پر قبضے سے بھی پہلے''۔(8)

مادی نقطہء نظر سے ہر ایک نظریے کا کھرا یا کھوٹا ہونا اس کے عملی نتائج سے ثابت ہوا کرتا ہے۔ سبھی نظریات، سبھی پروگرام اور سبھی تناظر جو مختلف رجحانات کی طرف سے جوش جذبے اور سرگرمی کے ساتھ روسی مزدور تحریک کے اندر انقلاب کی نوعیت اور اس کیلئے جذبہ محرکہ کے طور پر پیش کیے جا رہے تھے، ان سب کا اصلی امتحان 1917ء کے انقلاب کے واقعات ہی تھے۔ یہی وہ وقت، وہ مرحلہ تھا جب لینن اور ٹراٹسکی کے درمیان موجود باریک سی لکیر بھی مکمل ختم ہو چکی تھی۔ لینن کی طرف Letter from Afar اور پھر April Thesis میں ہمیں وہی اور ویسا ہی لکھا ہوا مل جاتا ہے جسے ٹراٹسکی بھی انہی دنوں Novy Mir میں لکھتا چلا آ رہا تھا مگر وہ یہ سب ہزاروں میل دور امریکہ میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔

اور جیسا کہ ٹراٹسکی نے 1909ء میں ہی خبردار کیا تھا ''پرولتاریہ اور کسانوں کی جمہوری آمریت'' کے نظریے کا رد انقلابی رخ خود انقلاب کے زندہ جاوید واقعات میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا، جب کامینیف، زینوویف اور سٹالن نے اسے لینن کے خلاف استعمال کیا تا کہ بورژوا عبوری حکومت کی حمایت کو ثابت کیا جا سکے۔ جس پر لینن کے بالشویک قیادت کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے اور انہوں نے لینن پر الزام لگایا کہ وہ ٹراٹسکائیٹ ہو چکا ہے۔

اور سب سے بڑی سچائی تو یہ ہے کہ نظریہ مسلسل انقلاب کی درستگی کا سب سے بڑا، ناقابل تردید اور عملی ثبوت خود بالشویک انقلاب ہی کی شکل میں سامنے آیا۔ روس کا مزدور طبقہ جیسا کہ ٹراٹسکی نے 1904ء میں پیشین گوئی کر دی تھی، مغربی یورپ کے مزدور طبقے سے بھی پہلے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ روس کے مزدوروں نے بورژوا جمہوری انقلاب کے سبھی تقاضے پورے کر دکھائے، فوراً سے پیشتر صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی سوشلسٹ انقلاب کے مرحلوں سے بھی گزرنا شروع کر دیا گیا۔ بورژوازی نے کھلم کھلا انقلاب دشمنی کی، مگر اسے مزدوروں نے غریب کسانوں کی مدد و معاونت سے شکست دے دی۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی بالشویکوں نے دنیا بھر

کے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ اس انقلاب کا ساتھ دیں اور انقلاب کریں۔ لینن بخوبی سمجھتا اور جانتا تھا کہ جدید اور ترقی یافتہ ملکوں کے اندر خصوصاً جرمنی میں انقلاب نہ ہوا تو روس کا انقلاب، روس کی پسماندگی کی وجہ سے، تنہا رہ جائے گا۔ اور جو کچھ اس انقلاب کے ساتھ بعد میں ہوا وہ اس حقانیت کا کھلا ثبوت ہے۔ تیسری کمیونسٹ انٹرنیشنل کا ایک عالمی انقلاب کی علمبردار پارٹی کے طور پر قائم کیا جانا اسی ضرورت اور جستجو کا ہی آئینہ دار تھا۔

سرمایہ دار اور افسر شاہی

صورتحال آج بھی صاف اور واضح ہے۔ ہر ایک نوآبادیاتی ملک کی قومی سرمایہ داری نے تاریخ کے میدان میں بہت ہی تاخیر سے قدم رکھا کہ جب دنیا پہلے ہی چند ایک سامراجی ملکوں کے درمیان تقسیم ہو چکی تھی۔ اس ماحول میں ان ملکوں کی بورژوازی کوئی ترقی پسندانہ کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی ابتدا سے ہی اسے اپنے سابق سامراجی آقاؤں کی مکمل محتاجی میں آنا پڑا۔ ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ کی بدعنوان اور نحیف ونزار بورژوازی اپنے اپنے سماج کو چلانے کیلئے مکمل طور پر سامراج اور غیر ملکی سرمائے کی مطیع اور محتاج ہے۔ یہ ہزار تانوں بانوں کے ساتھ نہ صرف غیر ملکی سرمائے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے بلکہ یہ اندرونی طور پر جاگیروں کے مالکان کے ساتھ بھی شریک کار چلی آ رہی ہے اور یوں ایک ایسا رجعتی ورد انقلابی اتحاد قائم کیا ہوا ہے جو ہر قسم کی ترقی کا مخالف اور دشمن ہے۔ ان بظاہر آپس کے دشمن طبقات کے آپس میں جتنے بھی اور جیسے بھی تضادات اور اختلافات ہیں مگر عوام کی ترقی وخوشحالی کے معاملے میں یہ ایک ہیں اور وقت آنے پر ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے سبھی تضادات' تنازعات اور اختلافات بے معنی اور جھوٹے ہیں۔ صرف پرولتاریہ ہی یعنی محنت کش طبقہ اپنے دیہاتوں کے غریب کسانوں اور شہروں کے غریبوں کے ساتھ مل کر اقتدار کو اپنے قبضے میں لیتے ہوئے سامراجیت اور سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکنے اور سوشلسٹ اقدامات لیتے ہوئے سماج کو بدلنے کی حقیقی اہلیت اور جرات رکھتا ہے۔

اگر کمیونسٹ انٹرنیشنل، لینن اور ٹراٹسکی کی اس نظریاتی وسیاسی نقطہء نظر پر قائم وکاربند رہتی تو عالمی سوشلسٹ انقلاب کو برپا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ المیہ اور بدقسمتی یہ رہی کہ کمنٹرن کے ابتدائی سال جب یہ تشکیل کے مرحلے میں تھی، اس کی روس میں سٹالنسٹ رد انقلاب کے ساتھ مڈبھیڑ ہوگئی۔ جس کے دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ سٹالنسٹ افسر شاہی نے روس میں کنٹرول

حاصل کرتے ہی ایک انتہائی قدامت پرستانہ شکل اختیار کر لی۔ یہ نظریہ کہ سوشلزم ایک ملک کے اندر قائم اور برقرار رہ سکتا ہے، مارکس اور لینن دونوں کے تصورات کی نفی ہی نہیں تھی بلکہ یہ افسر شاہی کی ذہنیت کی حقیقی غمازی کرتا تھا جو انقلاب کے ابھار اور دباؤ سے سہمی ہوئی تھی اسی لیے اس نے ''ایک ہی ملک میں سوشلزم کی تعمیر'' کا ہدف اپنا لیا۔

طبقاتی آزادی کی انقلابی پالیسی کو بروئے کار لانے کی بجائے، جس کی لینن ہر وقت وکالت کرتا رہتا تھا، افسر شاہی نے دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں کو جمہوری انقلاب کے ذریعے ''ترقی پسند قومی بورژوازی'' کی حمایت کرنے کی ہدایات جاری کر دیں۔ (اگر کہیں یہ ترقی پسند سرمایہ داری نہیں بھی تھی تو کہا گیا کہ اسے ایجاد کیا جائے اور وہ تو شاید اس کیلئے پہلے سے تیار بیٹھے ہوتے تھے)۔ اور جب یہ ترقی پسند بورژوازی کہیں بعد کے کسی زمانے میں ترقی اور جمہوریت کو مکمل کر لے اور ملک پوری طرح سے پک کر سرمایہ دار ہو جائے تب سوشلزم کی جدوجہد اختیار کی جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے اب یہ دوسرا مرحلہ بھی ترک ہی کر دیا ہے اور اب یہ لبرل ڈیموکریسی اور زوال زدہ سرمایہ داری کے آگے گھٹنے ٹیک چکے ہیں۔ یہ پالیسی مکمل طور پر لینن ازم سے انحراف کی عکاسی کرتی ہے اور یہ منشوازم کے قدیم متروک موقف یعنی ''مرحلوں میں انقلاب'' کی ہی آئینہ دار ہے۔

بھارت میں مرحلہ واریت کا یہ منشوازم ماسکو نواز کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طرف سے اس شکل میں عملاً سامنے آیا جب بھارت کی خود ساختہ ترقی پسند بورژوا پارٹی کانگریس کی حمایت کی گئی جس کی قیادت نہرو کر رہا تھا۔ پے در پے موقف کی تبدیلیاں، غداریاں اور بورژوا کانگریس حکومت کے مزدور دشمن اقدامات کے حملوں نے کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں میں بے چینی پیدا کر دی اور عہدیداروں کے مابین تنازعات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پارٹی 1964ء میں تقسیم ہو گئی اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ اس تقسیم کے نتیجے میں قائم ہوئی جو پیکنگ نوازی کی طرف مائل ہو گئی۔ مگر ماسکو اور پیکنگ کے اس سٹالنزم کے مابین کوئی بنیادی حقیقی نظریاتی اختلاف اور فرق نہیں تھا۔ چنانچہ اس نئی پارٹی کو بھی بحرانوں نے لپیٹ میں لے لیا۔ وہاں بھی اختلافات نے پارٹی کو تقسیم کر دیا اور ایک نئی پارٹی اس کے بطن سے ابھری جس نے مارکسسٹ کے ساتھ لینئسٹ کا لقب اپنے ساتھ لگا لیا۔ بدقسمتی سے نظریاتی اختلاف اور فرق یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

تاہم 50/60/70ء کی دہائیوں میں ان پارٹیوں کے اندر سوشلزم اور کمیونزم نام کا کوئی شائبہ تو کم

ازکم موجود ہوا کرتا تھا۔ان پارٹیوں کی کیرالہ، مغربی بنگال اور تریپورہ میں قائم ہونے والی بائیں بازو کی حکومتوں نے کچھ اصلاحات تو کی تھیں۔مگر اب تو جیسے انہوں نے' خاص طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (M) نے مرحلہ وار نظریے کو بھی رد کر دیا ہے اور اس کی بجائے ایک مرحلے؛ مالیاتی سرمائے کی اشرافیہ کے زیر اثر بورژوا جمہوریت کی حکمرانی کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔اس سلسلے میں تو وہ اتنا آگے جا چکے ہیں کہ جن غریب کسانوں کو 1970/80ء کی دہائیوں میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (M) نے زرعی اصلاحات میں زمینیں دی تھیں اب ان کو انہی زمینوں سے ہی بے دخل کیا جا رہا ہے۔سنگھور اور نندی گرام اور دیگر علاقوں میں ریاستی تشدد اور کمیونسٹ پارٹی (M) کے کیڈروں کے ذریعے ان غریب کسانوں کو زمینوں سے زبردستی بے دخل کر دیا گیا۔یہ بے دخلیاں اس لیے کرائی گئیں تا کہ ملٹی نیشنل گروپوں کو جن میں بھارت کا ٹاٹا گروپ اور انڈونیشیا کا سلیم گروپ آف انڈسٹریز شامل تھے، کیلئے زمین خالی کرائی جائے اور وہاں سرمایہ کاری کی جا سکے۔نیولبرل سرمایہ دارانہ پالیسیاں بنگال سمیت بیشتر علاقوں میں بائیں بازو کی پارٹیوں کی وسیع حمایت کے حامل کسان علاقوں میں تباہی اور بربادی پھیلاتی جا رہی ہیں۔اس کے نتیجے میں ان بائیں بازو کی پارٹیوں کے عہدیداروں اور کارکنوں کے اندر غصہ واضطراب انتہاؤں کو پہنچا ہوا ہے۔نوجوانوں کی بڑی تعداد کے ماؤاسٹ گروپوں کی طرف رجحان اور مسلح جدوجہد کی طرف رغبت کے باوجود وہاں انقلابی سوشلزم کے پروگرام کیلئے بہت بڑی تعداد میں نوجوانوں اور مزدوروں کو مارکسزم کی طرف لانے کے امکانات روشن ہیں۔

طلباء

پاکستان کے اندر ماسکو نواز پارٹیاں بنی ہی جمہوری گورکھ دھندے کی محدودیت میں قید رہنے کے باعث عضو معطل بنی رہیں اور یوں وہ ایوب آمریت کے خلاف کوئی مزاحمت یا احتجاج منظم نہیں کر سکیں۔ جبکہ اس دوران چین میں ہونے والی ترقی نے نوجوانوں اور طلبہ کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔1950ء کی دہائی کے آخر اور 1960ء کی دہائی کے شروع میں این ایس ایف (NSF) نے کسی حد تک انقلابی طلبہ کے جوش وجذبے کو مرکزی دھارے میں جوڑا اور مرکز سے ضلعی سطح تک تنظیم سازی کرتے ہوئے ترقی پسند طلبہ جن میں قوم پرست، سوشلسٹ اور کمیونسٹ سبھی شامل تھے' کو منظم کیا۔یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ NSF کی سب سے مضبوط ترین قوت کا وقت تب تھا جب یہ ایوب آمریت کے ابتدائی

سالوں کے دوران اس سے متصادم ہوئی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو یونیورسٹی نظام کے اندر افسر شاہانہ مداخلت کے ذریعے طلبہ سیاست کو کنٹرول کرنے اور اپنی طرز پر چلانے کا موقع مل گیا۔ یونیورسٹی آرڈیننسز 1962ء مارشل لا دور کی ہی پیداوار تھے، جو اس کے خاتمے کے بعد بھی مسلط اور لاگو رہے۔ ان جارحانہ قوانین کے تحت ناپسندیدہ سیاسی سرگرمیوں پر جرمانے عائد کر دیئے جاتے، اساتذہ کی تنخواہوں، ترقیوں، غیر ملکی اکیڈمک رابطوں اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کو سیاسی کنٹرول کے تابع کر دیا گیا۔ ایک اور ناجائز ایکٹ جو مسلط اور لاگو کیا گیا وہ ''سٹوڈنٹس افیرز ڈیپارٹمنٹ'' تھا، جسے پنجاب یونیورسٹی میں کرمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ (CID) (جو پولیس کا انٹیلی جنس ادارہ ہے) کی کیمپس برانچ میں ڈھال دیا گیا۔ ''سیاسی طور پر قابل اعتماد اور معتبر'' طلبہ کو اس نئے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے وظائف سے نوازا جاتا تھا۔ مگر جو طلبہ ''بھروسے'' کے اہل نہیں ہوتے تھے ان کے پیچھے ہر وقت ہر طرف سی آئی ڈی (CID) لگا دی جاتی، انہیں یونیورسٹی سے نکال دیے جانے، شہر سے باہر لے جا کے زدوکوب کرے، چونا منڈی تھانے لے جانے یا پھر بدنام زمانہ شاہی قلعے کی یاترا کرانے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ ڈھاکہ، کراچی اور لاہور میں طلبہ کمیونٹیوں نے ان آرڈیننسوں کے خلاف شدید مظاہرے کیے، انہی مظاہروں میں ہی یہ طلبہ، فرانس کے الجزائر پر قبضے اور پیٹرائس لومبا کے قتل پر امریکہ کے خلاف بھی نعرے لگاتے رہے۔ ان سبھی طلبہ سرگرمیوں میں مضبوط حکومت مخالف جذبات کی جھلک صاف نظر آتی رہی۔

پاکستانی بائیں بازو میں ماؤازم پر بحث بہت زوروں پر تھی مگر طلبہ کی بڑی اکثریت کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ان کے سیاسی شعور سے جو بات جھلکتی تھی وہ امریکہ مخالف رجحان تھا جو ایک مارکسی نعرے بازی، اور چین نوازی سے کہیں زیادہ پاکستانی قوم پرستی کے جذبات سے مزین تھا۔ بھٹو کے ساتھ شریک اور سرگرم طلبہ کی اکثریت نہ تو مارکسی تھی نہ ہی انقلابی، بلکہ یہ سٹالنسٹ دھڑوں کی مختلف قوم پرست پرتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا مقصد بس اتنا تھا کہ کچھ ریاستی ڈھانچے میں تبدیلیوں کو عمل میں لاتے ہوئے ملک وقوم کو معاشی وعسکری لحاظ سے مضبوط و مستحکم بنایا جا سکے۔

چین اور پاکستان

مگر یہاں پھر المیہ یہ تھا کہ ماؤزے تنگ کی زیر قیادت چینی افسر شاہی کے پاکستانی حکومت کے

ساتھ خوشگوار تعلقات قائم تھے اور پاکستانی ریاست کی معاونت سے پاک چین دوستی کی حامل ایسوسی ایشنیں قائم تھیں۔اس کے باوجود بھی بیشتر بائیں بازو کی پارٹیاں اور طلبہ تنظیمیں چین نواز ہی تھیں۔اس کیفیت نے بدترین تذبذب اور الجھاؤ پیدا کر دیا۔پاکستان کی فوجی اشرافیہ کے اہم حصوں اور ریاستی افسر شاہی کے چینی افسر شاہی (کمیونسٹ پارٹی آف چائنہ) کے ساتھ قریبی اور گہرے تعلقات قائم تھے۔روس اور چین دونوں کی افسر شاہی نے ''ایک ملک میں سوشلزم'' کی پالیسی اپنائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کا سوشلزم بگڑ کر ایک قومی شاونزم کی شکل اختیار کر چکا تھا۔دونوں قوموں کے ''کامریڈز'' ایک دوسرے کے ساتھ بندوق اور گولہ بارود کی زبان میں بات کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ان تنازعات نے روس چین جھگڑے کو تقویت دی اور انہیں دوسرے سے بدظن کر دیا۔اس کے سوشلسٹ تحریکوں پر، خاص طور پر نوآبادیاتی ممالک میں انتہائی تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔لینن کے بین الاقوامیت کے طریق کار کے اصول کے بالکل برعکس یہ دونوں تنگ نظر قوم پرستانہ ایجنڈے کو اپنائے ہوئے تھے۔اسے ترجیح دینا درحقیقت ان دونوں ملکوں کی افسر شاہی کے مفادات میں تھا۔اگر چین' یونائیٹڈ سٹیٹس آف سوویت ریپبلکس USSR کا حصہ بن جاتا، جیسا کہ لینن کی خواہش تھی کہ USSR کو دنیا بھر کے سوشلسٹ ملکوں کی یونین بنا دیا جائے گا، تو آج دنیا کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔بالادست پاکستانی طبقات اور بھارتی حکمران طبقات کی باہمی دشمنی کی وجہ سے اور سوویت یونین کی طرف سے نہرو زدہ سوشلزم کی تائید وحمایت کرنے کے باعث، چینی افسر شاہی نے روس کا مقابلہ کرتے ہوئے پاکستان کی فوجی جنتا کی حکومت کی دامے درمے سخنے امداد شروع کر دی۔

ٹیڈ گرانٹ نے چینی افسر شاہی کے کردار اور قوم پرستانہ سوشلزم کی غارتگر سٹالنسٹ پالیسی کے بارے میں لکھا ''چینی سٹالنزم کا حقیقی چہرہ نوآبادیاتی ملکوں میں قیادت کی موقع پرستی سے عیاں ہو جاتا ہے۔جہاں کئی ملکوں میں فرسودہ استحصالی جاگیردار و سرمایہ دار بالادست طبقات کو بلا روک ٹوک حمایت سے نوازا جا رہا ہے۔یمن میں امام، افغانستان میں خوانین، سری لنکا و پاکستان کے حکمرانوں، انڈونیشیا کے سوئیکارنو وغیرہ۔وسائل میں مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے انہوں نے چینی معیشت کے کمتر ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے روسی افسر شاہی اور سامراج کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے۔ان کے نظریات اور ان کے تصورات تنگ نظر چینی بیوروکریسی کے قوم پرستی کے مفادات سے بلند نہیں ہو سکتے۔روسی افسر شاہی کی مانند ان کی ''بین الاقوامیت'' بھی اسی کمتر تنگ نظر سوچ کے سوا کچھ بھی نہیں جسے وہ

روسیوں کی عالمی حمایت لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اپنی ترقی کے مراحل طے کرنے کے معاملے میں ان کا نظریہ،ان کا طریق کار اوران کے رویے روسی افسر شاہی کی طرح سے ہی مارکسزم کے منافی اور قاطع ہیں''۔(9)

جنوری 1965ء کے دھاندلی زدہ انتخابات میں کامیابی کے بعد ایوب خان کو عالمی سطح پر سب سے پہلے جو مبارکباد ملی وہ چین کے وزیراعظم چو این لائی کی طرف سے تھی جس نے ایوب کی کامیابی کو ایک ''تاریخی'' فتح قرار دیا تھا اور کہا کہ یہ ایوب کو عوام کی بھرپور حمایت میسر ہونے کا ثبوت ہے۔1965ء کی جنگ کے بعد چین کی پیپلز لبریشن آرمی کے کمانڈر مارشل چین ین نے پاکستان کا دورہ کیا اور اس نے ایوب خان کی طرف سے قائم کردہ ''بنیادی جمہوریت'' کو چینی کمیونوں کا ہم پلہ قرار دیا۔اپنے ایک بیان میں اس نے ''جنرل ایوب کی ملک کو متحد و مستحکم رکھنے کی شاندار خدمات پر اسے خراج تحسین پیش کیا،جس کی قیادت میں دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے گئے''۔(10)

1967ء میں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے چینی تاجروں کے ایک وفد نے حسب ذیل بیان دیا''ایوب خان کی دلیرانہ قیادت میں پاکستان نے صنعت اور زراعت دونوں شعبوں میں مثالی حاصلات کی ہیں،اور وہ دن دور نہیں جب پاکستان ہر قسم کی معاشی غلامی سے آزاد ہو جائے گا''۔(11) ایسے بے شمار بیانات چینی افسر شاہی ایوب خان کی تعریف و توصیف میں جاری کرتی رہی جس کے بعد پاکستان میں چین نواز سوشلسٹوں کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا سوائے اس کے کہ وہ اس آمرانہ حکومت کی حمایت کریں۔پاکستان کے روس نواز اور چین نواز سوشلسٹوں کا مسئلہ یہ تھا کہ یہ ایک مارکسی تجزیے اور تناظر سے محروم تھے۔وہ ایک جدید،برمحل نظریاتی و سیاسی تناظر کی حامل ٹھوس کیڈر بنیاد تعمیر کرنے کی بجائے محض سرگرم عمل ہونے کو ہی اپنا وطیرہ بنائے ہوئے تھے۔روس اور چین دونوں ملکوں میں منصوبہ بند معیشت کے تحت تیز ترین ترقی نے ان میں ٹھہراؤ اور تعطل پیدا کر دیا تھا۔''بس عمل ہی سب کچھ ہے'' کی نفسیات ان میں رچ بس گئی تھی اور اس کی وجہ ان دونوں ملکوں میں ہونے والی ترقی کا موازنہ تھا جو یہ اپنے ملک کے ساتھ کیا کرتے تھے۔روس اور چین کی افسر شاہی کی تعریف و توصیف اور ٹراٹسکی سمیت کئی مارکسسٹوں کا مذاق اور تمسخر اڑانا،بس یہی ان کا سوشلزم تھا جنہوں نے دہائیوں پہلے لکھا تھا کہ ان سوشلسٹ ملکوں کا بالآخر انجام کیا ہوگا۔لینن نے 1921ء میں،اور اس کے بعد 1936ء میں ٹراٹسکی نے اپنی معرکتہ لآرا کتاب'' انقلاب سے غداری' (Revolution Betrayed)اور پھر ٹیڈ

گرانٹ نے 1943ء، 1951ء اور 1959ء میں لکھی گئی اپنی کئی تحریروں میں سوویت یونین کے زوال اور سٹالنزم کے تتر بتر ہو جانے اور عوامی جمہوریہ چین کی نام نہاد منصوبہ بند معیشت کے بکھر جانے کی پیشین گوئیاں کر دی تھیں۔

بکھرا ہوا بایاں بازو

ماسکو نواز کمیونسٹ پارٹی کے ایک ترجمان نے اپنے ایک بیان میں طبقاتی مصالحت کے حامل دو مرحلوں کے نظریے کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:

''ہماری جدید ابھرتی ہوئی بورژوازی بہت جلد عالمی منڈی میں امریکی اور یورپی بورژوازی کے تسلط کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک معاشی لازمے کے طور پر حبیب اللہ، ولیکا اور سہگل ان سب کو سوشلسٹ بلاک کے ساتھ تجارت کرنا ہوگی۔ یہ عمل ہمیں مغربی اجارہ داری پر قابو پانے میں مدد دے گا۔ یہی وہ سمت ہے جس کی طرف اس وقت ہم رواں دواں ہیں۔ اگر اس موقع پر میں صدر ایوب کی حکومت کی مذمت یا مخالفت کرتا ہوں' جب وہ بائیں بازو کے لیے یہ رستہ کھول رہا ہے تو یہ محض میرا پاگل پن ہی ہوگا''۔(12) طبقاتی تضاد کے معاملے میں اس قسم کی نظریاتی توضیحات اور تذبذب نے ناگزیر طور پر پاکستان کی سوشلسٹ تحریک کو شدید کوتاہ نظری کا شکار کر دیا۔ اور ایک بالشویک لیننسٹ پارٹی کی تعمیر و تشکیل کے رستے کی یہی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی جو ان دنوں پیش آنے والے واقعات میں قیادت کا خلا پر کر سکتی تھی۔ طبقاتی مصالحت کے حامل نظریے نے موقع پرستی کو فروغ دیا جس کا نتیجہ مہم جوئی اور الٹرا لیفٹ ازم کی صورت میں سامنے آیا۔ بے شمار بائیں بازو کے کارکنوں، نوجوانوں نے بے مثال اور قابل تحسین قربانیوں کی داستانیں رقم کیں اور بدترین ریاستی جبر کا کمال خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ بھی کیا۔ ان کی اس یادگار جدوجہد اور فقید المثال قربانیوں کا حتمی مقصد سوشلزم اور کمیونزم ہی تھا مگر المیہ اور حقیقت یہ تھی کہ ان کی قیادت بورژوا جمہوریت کی حاشیہ بردار بنی ہوئی تھی۔ جوں جوں ان کارکنوں کو اس کیفیت کا ادراک ہوتا گیا توں توں وہ تذلیل کے احساس میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ کئی ایک تو سیاسی تیاگ میں چلے گئے جبکہ کئی دوسرے جرائم اور بدعنوانی کی لپیٹ میں آ گئے۔ آخر کار انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کے نظریے نے ان کے ساتھ غداری کی ہے۔ المیہ یہ تھا کہ انقلابی سوشلزم کو دو مرحلوں کی نظریاتی غلطی اور بددیانتی کا رنگ روپ دے دیا گیا تھا جو درحقیقت اپنی ہیئت اور نوعیت میں

منشوازم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

سیاسی عدم تیاری کی اس کیفیت میں جب کوئی تنظیمی صلاحیت ہی موجود نہیں تھی اور جب کوئی مارکسی تناظر مفقود تھا اور پاکستان کے سبھی بائیں بازو کے دانشوروں کے مابین کوئی بھی نظریاتی تال میل نہیں تھا، ایسے ماحول میں 1968/69ء کے انقلابی واقعات نے بائیں بازو کے دانشوروں اور لیڈروں کو حواس باختہ کر دیا کہ کریں تو کیا کریں اور جائیں تو کہاں جائیں! سٹالنسٹوں کے کردار نے اس کیفیت میں جو خلا چھوڑا اسے پاکستان جیسے ملک میں پاپولزم نے پر کر دیا۔

پاپولزم اور بھٹو

پاپولزم دراصل اس تضاد کا شاخسانہ اور نتیجہ تھا جو سٹالنزم کی دو مرحلوں کے نظریے اور نوآبادیاتی ممالک میں پھوٹنے والی بڑی عوامی تحریکوں کی سوشلسٹ جستجو اور کردار کے مابین پیدا ہوا تھا۔ پاپولزم کا یہ مظہر زیادہ تر دوسری عالمی جنگ کے بعد ابھرا۔ اس کی بڑی مثالیں ارجنٹائن میں پیرون ازم، انڈونیشیا میں سوئیکارنو ازم، مصر میں ناصر ازم سمیت ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی اور ملکوں کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ پاپولزم کا یہ جدید مظہر ایسے انفرادی قائدین پر مبنی تھا جو تاریخی واقعات اور حادثات کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آتے چلے گئے اور جنہوں نے انقلابی نعرے بازی اور سوشلسٹ جوشیلے پن کو بروئے کار لاتے ہوئے مقبولیت اور اقتدار حاصل کر لیا۔ یہ مظہر اپنی سرشت میں ایک قدیم سیاسی ثقافت کا بھی نتیجہ تھا جس میں ایک فرد کو عوام کے ہیرو اور نجات دہندہ کے طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرنا معمول چلا آ رہا تھا کہ بس وہی ہوگا' وہی آئے گا جو عام لوگوں کو ان کو درپیش ذلتوں' محرومیوں اور اذیتوں سے نجات دلائے گا۔ اس قدر غیر معمولی مقبولیت اور انحصار کی بدولت ایک بے پناہ طاقت ایسے افراد کے پلڑے میں آ گری۔ مگر اپنی بے پناہ مقبولیت کو مستحکم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کیلئے یہ افراد محض چند ایک انقلابی اصلاحات ہی کر سکتے تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام جو ایسے رہنماؤں سے وابستہ ہو چکے عوام کی ذلتوں' محرومیوں اور اذیتوں کا ذمہ دار تھا، کو ختم کرنے کیلئے درکار انقلابی مارکسزم کی نہ ان میں سمجھ بوجھ تھی نہ ہی انہوں نے انقلابی نظریات کی حامل پارٹیاں بنائی ہوئی تھیں جن کے ایسے تنظیمی ڈھانچے موجود ہوتے جو پرانے استحصالی نظام کو اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت اور جرات سے مالا مال ہوتے۔

لیکن پھر جیسا کہ بونا پارٹسٹ ریاستوں میں ہو رہا تھا، ان پاپولسٹ قیادتوں نے دو مرحلوں کے

نظریے کی نفی کرتے ہوئے ایک بگڑی ہوئی یا نامکمل شکل میں ہی سہی، ٹراٹسکی کے نظریہ مسلسل انقلاب پر عمل کرنے کی کوشش کی، ہر چند یہ کوشش بھونڈے انداز میں تھی۔ مگر اس کیلئے درکار روایتی کارکنوں، سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹیوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے یہ پاپولسٹ قیادتیں عوامی اظہار کی سیاسی روایت بن گئیں۔ تاہم ان کا کرداران کے ملکوں میں اپنے اپنے وقتوں میں چلنے والی مزدوروں اور محروم عوام کی تحریکوں کی حالت اور کیفیت کی ہی غمازی کرتا تھا اور کرتا ہے۔ روایتی بائیں بازو کی پارٹیوں کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل اور بھی تیز تر ہوتا چلا گیا۔ کچھ ماسکو نواز عناصر جو قوم پرست، جمہوریت پسند اور ترقی پسند پارٹیوں میں کام کر رہے تھے ''جمہوری اتحاد'' میں شامل ہو گئے۔ یہ مختلف النوع بورژوا، دائیں بازو کی پارٹیوں کا اتحاد تھا۔ اس عظیم اتحاد کا ایک سرخیل نوابزادہ نصر اللہ خان تھا جو کہ ایک انتہائی رجعتی قدامت پرست سیاستدان اور جنوبی پنجاب کا ایک کوتاہ نظر جاگیردار تھا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ اس اتحاد میں انتہائی رجعتی جماعتیں بھی شامل تھیں جن میں اسلامی بنیاد پرست بھی تھے۔ اس وقت امریکی سامراج کی رکھیل اور مذہبی جماعتوں کی سرخیل جماعت اسلامی بھی دائیں بازو کے اس اتحاد کا حصہ تھی۔

عظیم جرمن فلسفی ہیگل نے کیا شاندار کہا تھا کہ وہ جو تاریخ سے نہیں سیکھتے، آخر کار اسے دہرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بائیں بازو کے قائدین ابھی تک بورژوا اتحادوں کا حصہ بن کر جمہوریت کی تگ ودو میں مصروف تھے۔ اسی دوران ہی یہ قائدین پارٹی پارٹی کا کھیل بھی کھیل رہے تھے اور جمہوریت جمہوریت کا راگ بھی الاپتے جا رہے تھے، وہ بھی اس کیفیت میں کہ ان کے اردگرد آس پاس ایک انقلابی تحریک زور وشور سے جاری تھی مگر جو ان سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتی جا رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو حالات واقعات کی نزاکت کو سمجھتے اور بھانپتے ہوئے ''سوشلزم آوے ای آوے'' سمیت کئی انقلابی نعروں کے ساتھ تحریک کا شریک سفر بن چکا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے پروگرام نے عوام کے جذبوں امنگوں اور ضرورتوں کو اپنا حصہ بنا لیا تھا اور یوں راتوں رات ہی پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی عوامی پارٹی بن گئی۔ پارٹی کے ابتدائی کیڈروں اور سرگرم کارکنوں میں ماؤاسٹ دھڑے اور بکھرے ہوئے سوشلسٹ شامل تھے جو روایتی سٹالنسٹ بائیں بازو کی قیادت سے برگشتہ ونالاں تھے۔ پارٹی کا پہلا تاسیسی کنونشن مین بلیوارڈ گلبرگ لاہور میں واقع ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر پر 30 نومبر اور یکم دسمبر 1967ء کی درمیانی شب کو ہوا تھا۔ پارٹی کی بنیادی دستاویزات بھٹو اور جے اے رحیم نے 1966ء میں پیرس، فرانس میں تحریر اور مرتب کر لی تھیں، انہیں ڈاکٹر مبشر حسن، جو کہ ''پرنسپلز کمیٹی'' کا بھی

ممبر تھا، کے ساتھ طویل بحث مباحثوں کے بعد حتمی شکل دے کر اس کنونشن میں منظوری کیلئے پیش کر دیا گیا۔ان انتہائی انقلابی دستاویزات میں نئی پارٹی کے قیام کا مقصد اور ہدف سماج کی سوشلسٹ تبدیلی قرار دیا گیا تھا۔اس کنونشن میں شریک افراد کی اکثریت اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ ایک نئی تاریخ رقم کرنے جا رہے ہیں۔

پیپلز پارٹی کی تاسیسی دستاویز میں قرار دیا گیا ''پارٹی پالیسی کا حتمی مقصد طبقات سے پاک معاشرے کا قیام ہے جو ہمارے وقتوں میں صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔(13)

اور پھر جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی، بھٹو کی اس کنونشن میں تقریر نے سب کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا، یہ جوش، جذبے، ولولے سے بھرپور تھی۔بھٹو نے اپنی تقریر کو ان کلمات پر ختم کیا ''ہمارے سامنے بڑا مقصد ہے جس کیلئے ہمیں ہر مشکل، ہر رکاوٹ سے گزرنا ہے اور اس نظام کو ختم کرنا ہے، استحصال کو ختم کرنا ہے اور یہ صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ سوشلزم ہی ہماری پارٹی کا نصب العین ہے''۔(14)

اس تاسیسی کنونشن کے فوری بعد بھٹو ایک بھرپور سیاسی عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک کے دورے پر نکل پڑا۔اسے اچھی طرح احساس تھا کہ عوام ایک انقلابی تبدیلی کی جستجو میں تڑپ رہے ہیں۔عوام کی ناآسودہ اور تڑپتی ہوئی آرزوؤں کو وہ اپنے اس دورے میں ایک سوشلسٹ انقلابی کے طور پر پیش اور بیان کرتا گیا۔وہ سوشلسٹ تبدیلی کے ذریعے سماج کی حالت بدلنے کا اعلان کر رہا تھا۔انہی دنوں کی انقلابی تقریروں میں سے ایک میں 1968ء میں بھٹو نے کہا ''میرے دوستو! میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں ایک دولتمند انسان، ایک جاگیردار ہوں۔کہا جاتا ہے کہ مجھے اپنی دولت تقسیم کرنے سے پہلے سوشلزم کیلئے جدوجہد کرنے کا کوئی حق نہیں۔مگر سوشلزم کا قیام اور حصول اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب تمام ذرائع پیداوار ریاست کے کنٹرول میں آ جائیں۔مگر اس کے باوجود بھی اگر میری جائیداد قوم کے کسی کام آتی ہے تو مجھے اس پر ایک لمحے کی بھی جھجھک اور ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔لیکن میں اس نظام کے ہوتے ہوئے کسی طور بھی یہ بیوقوفی نہیں کروں گا کہ میری جائیداد سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مصرف میں آ جائے تاکہ وہ مزید منافعوں، مزید لوٹ مار کے ذریعے اپنی عیاشیوں میں اضافہ کر لیں''۔

''مگر اس قسم کے فضول دلائل سے لوگوں کو بھی بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔میں سوشلزم پر یقین رکھتا ہوں، اسی یقین کی وجہ سے میں اپنا طبقہ چھوڑ کر اس سے الگ ہو چکا ہوں اور آپ مزدوروں، کسانوں اور غریب طالب علموں کے ساتھ آ شامل ہوا ہوں۔میں آپ سب سے محبت کرتا ہوں اور مجھے آپ سے اور

کچھ نہیں چاہیے سوائے محبت احترام اور بھرپور ساتھ کے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت سوشلزم کو نہیں روک سکتی۔ یہی انصاف کی برابری کی اور عظمت آدم کی علامت ہے۔ اسی کو پاکستان میں متعارف کرنا اور لاگو کرنا ہے۔ یہ وقت اور تاریخ کا تقاضا ہے۔ اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسی نعرے اسی آواز کو میں جگہ جگہ لوگوں میں پھیلا رہا ہوں۔ میں ایک سوشلسٹ ہوں' ایک دیانتدار سوشلسٹ جو اپنی آخری سانس تک غریبوں کیلئے لڑتا رہے گا۔ کچھ لوگ میرے سوشلسٹ ہونے پر میرا مذاق اڑاتے ہیں مگر مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں''۔(15)

پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام

جو خواتین وحضرات پیپلز پارٹی کے اس تاسیسی کنونشن میں شریک ہوئے تھے، وہ اپنی اپنی سماجی شناخت، اپنی پچھلی سیاسی وابستگی اور عمومی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مختلف النوع قسم کے اجتماع کا حصہ تھے۔ پیپلز پارٹی کے اہداف ومقاصد اور خود بھٹو کے حوالے سے ان کے مختلف نقطہ ہائے نظر اور تحفظات تھے۔ ان میں سے کچھ اچھے دنوں کے متلاشی تھے اور مستقبل میں اپنے لیے محفوظ ومناسب مواقع کے آرزومند تھے اور اس مقصد کیلئے بھٹو کے قریب تر ہونے کی جستجو دل میں لیے ہوئے تھے۔ کچھ بھٹو کو ایوب کا مضبوط مدمقابل ہی سمجھ رہے تھے جو فوجی وسول افسر شاہی کی آمریت کے خلاف صف آرا تھا اور جو مختلف سیاسی رجحانات کو ساتھ ملاتے ہوئے ملک کو حقیقی جمہوریت سے روشناس کرا سکتا تھا۔ انہی میں ایسے بھی کچھ طلبہ اور جاگیرداری کے مخالفین تھے جو بھٹو کو ایک حقیقی ترقی پسند جمہوری سوشلسٹ سمجھ رہے تھے جو ایک بہت بڑی منظم سیاسی پارٹی کے ساتھ سماج اور معیشت کو سوشلسٹ بنیادوں پر چلانے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ بھٹو کا اپنا ارادہ یا خیال ایک پارٹی کا نہیں تھا بلکہ ایک سیاسی تحریک کا تھا۔ جہاں مختلف دھاروں اور دھڑوں کے پرجوش اور باہمت لوگ مل بیٹھ کر اسے اپنے چیئرمین کی اتھارٹی سے سرفراز کرتے۔ بلاشبہ اس کا مقصد یہی تھا اسی لیے نہ تو نظریات اور نہ ہی تنظیم کے طریقہ کار کو ٹھوس انداز میں مرتب اور تشکیل دیا گیا۔ پارٹی کا تاسیسی کنونشن میں پارٹی کیلئے نظریات اور تنظیم کی ضرورت پر قرار واقعی بحث نہیں ہو سکی' یہ دونوں پہلو بعد میں پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے زیرغور اور عمل میں لائے گئے تھے۔

بھٹو ایک مارکسسٹ نہیں تھا۔ وہ تو 1968/69ء کے انقلاب کے تندوتیز اور زندہ و پائندہ

واقعات کے دھارے کا شریک سفر ہونے اور لوگوں کی رہنمائی کا مقصد پورا کرنے کی خواہش رکھنے والا ایک لیڈر تھا۔ وہ صحیح وقت صحیح موقع پر واقعات وحالات کے ساتھ ہم رکاب اور ہم آہنگ ہوا جس نے خودکوعوام کے تبدیلی کے بپھرتے ہوئے جوش وجذبے کی رہنمائی کیلئے پیش کردیا۔ بھٹوایک وسیع المطالعہ انسان تھاوہ کئی ملکوں' کئی سماجوں اور کئی تحریکوں کو دیکھ چکا تھااور دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ امریکہ اور برطانیہ کی کئی اعلیٰ درسگاہوں کا فارغ التحصیل تھا۔ اس کی سیاسی سمجھ بوجھ بڑی حد تک غیر معمولی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ دنیا کس رخ پر جارہی تھی۔ خاص طور پر 1940/50ء کی دہائیوں میں ہونے واقعات نے اس کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ اس کا موازنہ کسی طور بھی چواین لائی سے تو نہیں کیا جاسکتا مگر اس عہد میں نوآبادیاتی ممالک میں مراعات یافتہ طبقے سے ایسے کئی رہنما ابھر کر سامنے آئے جو عالمی جنگ کے بعد سے ان ملکوں میں پھٹنے والی عوامی تحریکوں سے شدید متاثر ہوئے تھے۔ نوآبادیاتی انقلابات میں ہم اس قسم کی کئی مخصوص کیفیات دیکھ سکتے ہیں کہ جن میں بالادست طبقے کے کئی افراد سوشلسٹ نظریات کی طرف مائل ہوگئے تھے مگر بھٹو اس قدر آگے نہیں بڑھا تھا۔ بیرون ملک سے واپسی کے بعد 1956ء میں اسے صدر سکندر مرزا کی کابینہ میں شامل کرلیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد اسے 1960ء کے اوائل میں ایوب خان کی کابینہ میں وزیر خارجہ بنادیا گیا تھا۔

سوبھوگیان چندانی نیوز لائن کو دیئے گئے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں بھٹو کی اس عبوری کیفیت بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہتا ہے ''بھٹو عوامی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنا چاہتا تھا۔ جی ایم سید نے اس حوالے سے مجھے ایک لطیفہ سنایا کہ بھٹو ایک دن میرے گھر آیا اور کہنے لگا کہ شاہ صاحب! میں آپ کی پارٹی میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے بھٹو سے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ ہماری پارٹی تو باغیوں کی پارٹی ہے۔ بھٹو نے کہا جی میں جانتا ہوں۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی جو اس وقت وہاں موجود تھے' نے اس دوران ٹوکتے ہوئے کہا کہ کیا تم اپنے والد سے پوچھ کر آئے ہو؟ ایک خان بہادر کا بیٹا ایک باغی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ جس پر بھٹو نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا کہ انقلاب حیدر بخش جتوئی کی ہی اجارہ داری نہیں' میں بھی ایک انقلابی ہوں۔ مگر حیدر بخش اپنی بات پر ڈٹا رہا جس پر بھٹو نے اپنے والد سے فون پر بات کی۔ اس کے بعد سکندر مرزا نے شاہنواز بھٹو سے بات کی اور کہا کہ میرے پاس تمہارے بیٹے کیلئے ایک شاندار کیریئر ہے اور آپ اپنے بیٹے کو باغیوں کی پارٹی میں شامل ہونے سے روک لو۔ اگلے دن بھٹو آیا اور اس نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا جس پر حیدر بخش جتوئی نے بھٹو سے کہا دیکھا'

میں نہ کہتا تھا''۔(16)

1965ء کی جنگ کے بعد بھٹو اور ایوب کے مابین علیحدگی ناگزیر ہوگئی تھی کیونکہ حکمران طبقات کے مابین تنازعات اور تصادم کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ جنگ کے بعد جو صورتحال جنم لے رہی تھی اس میں ایسا ہونا ہی تھا۔ جنگ نے معاشی اور سماجی بے چینی میں شدید اضافہ کر دیا تھا۔ اگرچہ فوری طور پر یہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے تاہم اس سے حکمران دھڑے کا اتحاد بکھر گیا اور ان میں تصادم پیدا ہو گیا تھا۔ جب ایوب خان نے بھٹو کو کابینہ سے نکال دیا تو اس کی انا سخت مجروح ہوئی۔ بھٹو نے اس فوجی آمر سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا جسے وہ سیاسی طور پر اور دانش کے اعتبار سے خود سے کمتر سمجھتا تھا اور شاید ٹھیک ہی سمجھتا تھا۔ مگر اس سارے عمل میں، بھٹو کو حاصل ہونے والی ڈرامائی شہرت نے اسے عوام کے نزدیک مظلوم بنا دیا۔ برصغیر کی ثقافت میں ظلم یا ناانصافی کا شکار ہونے والے کو غیر معمولی حمایت میسر آ جاتی ہے اور لوگ اس کے ساتھ انتہائی ہمدردی جتاتے ہوئے اپنے ساتھ پیش آنے والی زیادتیوں کو اس طریقے سے بھلانے یا مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمدردی کی اس بے حد و حساب لہر نے بھٹو کو ایک شخصی اثر و رسوخ سے نواز دیا جس کی وجہ سے اسے عوام کے مزاج اور سیاسی دھارے کی قیادت کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن یہ اس ساری مساوات (Equation) کا ایک ہی رخ ہے۔ معروضی صورتحال بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ بھٹو کو عوام کی مزاج شناسی کا فن حاصل تھا، اسے پتہ چل جاتا تھا کہ عوام کے ذہنوں میں کیا تبدیلیاں پنپ رہی ہیں اور ان کی جستجو کیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے بھٹو اور عوام کے مابین موضوعی اور معروضی اعتبار سے ایک تعلق اور تال میل پیدا ہو رہا تھا۔ بھٹو عوام کی حالت بدلنے کیلئے، جس کیلئے وہ ترستے آ رہے تھے، ایک انقلابی تبدیلی اور سوشلسٹ پروگرام کی ضرورت کو سمجھ چکا تھا۔ دوسری طرف عوامی تحریک کی طوفان کی سی تیزی بھٹو کو مزید ابھارتی اور جلا بخشتی جا رہی تھی۔ اس کی تقریروں' اس کی سرگرمیوں اور اس کے انداز نے صورتحال اور واقعات کو آسمانی بجلی کی تیزی کے ساتھ آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ پہلی بار یہ ہو رہا تھا کہ پاکستان کے عوام اتنے زور و شور' اتنی شدت اور اتنے جوش و جذبے کے ساتھ سوشلسٹ انقلاب کے نام اور نعرے کو سن رہے تھے جسے بھٹو ہر طرف' ہر جگہ پھیلاتا جا رہا تھا۔

اپریل 1968ء میں ''پاکستان کی سیاسی صورتحال'' کے عنوان سے چھپنے والے ایک پمفلٹ میں بھٹو نے لکھا ''اضطراب اور تذبذب کی صورتحال میں سے یقین و اعتماد کی ایک کیفیت برآمد ہو رہی ہے۔ لوگ بیدار ہو رہے ہیں، نئی نسل اپنے سر اٹھانا شروع ہو گئی ہے۔ وہ اس یقین سے سرشار ہو چکے ہیں کہ اب

پاکستان کے لوگوں کے عرصے سے چلے آرہے برے دن ختم ہونے والے ہیں۔ ہر عہد کی اپنی ہی ایک سیاسی اہمیت اور مخصوص کیفیت ہوا کرتی ہے۔ ہمارا عہد بھی جوش جذبے سے بھرپور ہے جس میں ہر طرف چیلنج ہمارے سامنے ہیں۔ جو پاکستان کے عوام سے نئے خواب نئی امنگیں اور نئے حوصلے چاہتے ہیں۔ ہم کسی طور ماضی کی طرف پیچھے جانے کو تیار نہیں ہیں اور نہ ہی عوام اس زبوں حالی کو زیادہ دیر تک برداشت کر سکتے ہیں۔ اس لیے پاکستان پیپلز پارٹی اعلان کرتی ہے کہ ''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں''۔(17)

جمہوریت کے بارے میں بھٹو کا فہم و ادراک جامع اور بالکل درست تھا۔ بورژوا جمہوریت کی وضاحت کرتے وقت وہ لینن کے اس نقطہ نظر کے قریب قریب ہوتا تھا جو اس نے ''پرولتاری انقلاب اور بھگوڑا کاؤتسکی'' میں بیان کی تھی۔ بھٹو نے اپنے مذکورہ بالا پمفلٹ میں لکھا کہ:

''جمہوریت بلاشبہ ایک لازمی ضرورت ہے مگر پھر یہ ہر مسئلے کا حل نہیں۔ جمہوریت کو فروغ دینے کے عمل میں ہم کسی طور معیشت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ معاشی ترقی کے بغیر کوئی قوم بھی جمہوریت سے اطمینان اور آسودگی حاصل نہیں کر سکتی۔ جمہوری آزادی لازمی ہے مگر معاشی برابری اور انصاف اس سے بھی بالا آدرش اور حق ہے۔ معاشرے میں کامل تبدیلیاں معاشی تبدیلیوں کے بغیر ناممکن و محال ہوتی ہیں۔ معاشی مسائل ہمیشہ اہمیت اور توجہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر لوگوں کی محرومیوں کا خاتمہ کرنا ہے تو جمہوریت کو بہر حال روشن خیال سوشلزم کے ساتھ شانہ بشانہ چلنا ہوگا۔ اس وسیع آبادی کے حامل ملک کے وسائل ضائع ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ عالمی منڈی میں اجناس کی قیمتیں گرتی چلی جا رہی ہیں جس کی وجہ سے ہم باہر کے ملکوں سے کچھ منگوانے کی حیثیت نہیں رکھے۔ صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ہم استحصال کا خاتمہ اور اتحاد و یگانگت کا حصول ممکن بنا سکتے ہیں۔ استحصال کی موجودگی میں اتحاد محض ایک نعرہ اور دھوکہ ہی رہے گا''۔

''ہم معاشی تباہی کے دہانے پر پہنچے ہوئے ہیں، ایک نیا طبقہ جو تعداد میں انتہائی قلیل ہے جو بیشتر وسائل پر قابض ہو چکا ہے اور قومی دولت کو لوٹتا چلا جا رہا ہے۔ امارت اور غربت میں فاصلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ پاکستان میں اس وقت صرف لوٹ مار کا دور دورہ ہے۔ نجی سرمائے کو فروغ دینے کے نام پر بے پناہ اور بے حد و حساب لوٹ مار کے رستے ہموار کیے جا رہے ہیں''۔(18)

بھٹو ایک بار پھر سوشلزم کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''صرف اور صرف سوشلزم ہی سب کیلئے برابری کے مواقع مہیا کر سکتا ہے، ہر قسم کے استحصال

کا خاتمہ کرسکتا ہے، طبقاتی امتیاز کو ختم کرسکتا ہے اور سماجی انصاف ومعاشی برابری کو ممکن بنا سکتا ہے۔ سوشلزم ہی جمہوریت کی اعلیٰ ترین کیفیت پیدا کرسکتا ہے اور اسے منطقی اطمینان سے سرشار کرسکتا ہے۔ سوشلسٹ نظریات کی عالمگیریت کی دو بڑی وجوہات ہیں؛ پہلی تو یہ کہ جدید سوشلزم کی بنیاد ہمہ گیر ہے، دوسرا سوشلسٹ نظریہ ان سبھی ملکوں کیلئے کارآمد اور کارگر ہے جنہیں حقیقی معنوں میں اپنی سیاسی و معاشی حالت سدھارنی ہے۔ اس لیے سوشلزم کا نفاذ پاکستان کے براہ راست مفاد میں ہے جو کہ ایک ترقی پذیر ملک بھی ہے اور جسے اندرونی وبیرونی استحصال کا بھی سامنا ہے۔ ہمارا خطہ پاکستان بدترین غربت کی زد میں ہے اس بدقسمت المیے کو صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا فوری اور حتمی ہدف خونخوار سرمایہ دارانہ نظام کا جڑ سے خاتمہ کرنا اور اس کی جگہ سوشلزم کی آبیاری کرنا ہے۔ ذرائع پیداوار جو صنعتی ترقی کا وسیلہ ہوتے ہیں ان کو کسی طور نجی ہاتھوں میں نہیں دیا جانا چاہیے۔ سبھی ادارے جو قومی معیشت کے انفراسٹرکچر کو ترتیب دیتے ہیں انہیں عوام کی ملکیت میں ہونا چاہیے''۔(19)

26 جون 1969ء کو حیدرآباد بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے واضح اعلان کیا کہ ''پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کے عوام کی پارٹی ہے میں یہ واضح اعلان کرتا ہوں کہ یہ مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کی پارٹی ہے، یہ ایک انقلابی پارٹی ہے''۔(20)

نظریاتی ابہام

یہ شاید پاکستان پیپلز پارٹی کی سب سے زیادہ انقلابی تشریح تھی۔ لیکن یہیں پر پیپلز پارٹی کی کہانی مکمل نہیں ہوجاتی۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بھٹو اور پیپلز پارٹی کے دوسرے قائدین اپنے تمام سوشلسٹ اور انقلابی نعروں، تقریروں اور جذبوں کے باوجود نظریاتی ابہام اور ادھورے پن کا شکار تھے۔ اسی کمزوری کی وجہ سے وہ ایک حقیقی انقلابی پارٹی کی بنیادیں رکھنے میں ناکام رہے۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ کر پھینکنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کا ہدف حاصل کرلیتی۔ اور یہ صرف بھٹو ہی کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ سبھی دوسرے ماؤاسٹ اور دیگر سوشلسٹ پس منظر رکھنے والے لیڈروں جو مختلف النوع نظریات سے لیس تھے، کا مسئلہ تھا اور یوں ایک کھچڑی سی پکی ہوئی تھی جس میں سوشلزم، قوم پرستی یہاں تک کہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ دیوانہ وار لگانے والے اسلامی ملت پرست لوگ بھی شریک ومتحرک تھے۔

نظریاتی ابہام، ادھورے پن اور خلط ملط تصورات کے ملغوبے نے اتنے عظیم انقلاب اور تحریک کو ناکامی کے تپتے سلگتے صحرا کی جانب دھکیل دیا۔ نظریاتی ابہام اور ایک واضح مارکسی موقف کا نہ ہونا خود بھٹو کی اپنی کچھ تقاریر سے واضح تھا۔ مثال کے طور پر مانسہرہ میں اپنی ایک تقریر کے دوران بھٹو نے پسماندہ اور رجعتی پرتوں کی ہمدردیاں جیتنے کیلئے پاکستانی اور اسلامی تعصب کا آسرا لینے کی بھی کوشش کی۔ اس نے طبقاتی امتیاز واستحصال، سوشلسٹ نظریات کو کمتر کرنے کی بھی کوشش کی جو اس وقت سارے ملک میں موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ بھٹو نے کہا:

''مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین جھگڑا ایک ہزار سال پرانا چلا آرہا ہے۔ یہ آگے کیوں نہیں چل سکتا؟ اگر ایک قوم ہزار سال تک پہلے لڑسکتی ہے تو یہ آئندہ بھی لڑسکتی ہے''۔(21) 3 نومبر 1969ء کو سرحد (پشتونخواہ) میں شیر پاؤ کے ہاں ہونے والے پارٹی کنونشن میں بھٹو نے ایک بار پھر اسلام اور سوشلزم کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی اور کہا ''سوشلسٹ پارٹیاں بھارت میں کیوں کامیاب نہیں ہوسکیں! اس لیے کہ ہندوازم سوشلزم کا دشمن ہے اور یہ اسلام کا بھی دشمن ہے۔ ہندوازم کبھی سوشلزم کو برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ذات پات اور طبقات کا حامل ہے۔ سوشلزم بھارت میں اپنی جڑیں مستحکم نہیں کرسکا مگر یہ پاکستان کے اندر شاندار نتائج کا حامل ہوسکتا ہے کیونکہ اسلام اور سوشلزم میں بہت ہی کم فرق ہے۔ میں یہ واضح طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ سماجی اور معاشی شعبوں میں اسلام اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ان دونوں میں کوئی فرق ثابت کردیا جائے تو میں سوشلزم کا ذکر تک ہی ترک کردوں گا''۔(22)

اپنی اصل میں یہ ایک واضح تضاد تھا۔ ایک معیشت وہ ہے جو سراسر خیرات کی حامل ہے جس میں امیر طبقہ غریبوں کو دیتا رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں امیر اور غریب طبقات معمول کا حصہ قرار پاتے ہیں۔ جبکہ سوشلزم کے اندر طبقات کی تفریق اور امتیاز کا خاتمہ بنیادی شرط ہوتی ہے اور یہ طبقات سے پاک سماج کا علمبردار نظریہ ہے۔ انہی دنوں میں اتحادِ عالم اسلام اور پھر بعد میں بیشتر سٹالنسٹ لیڈروں کی طرف سے ''تیسری دنیا'' کا نظریہ بھی زور وشور کے ساتھ پھیلایا جانے لگا۔

5 جنوری 1968ء کو پشاور میں ایک بڑے عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے کہا:

''اگر عرب اسرائیل جنگ کے دوران پیپلز پارٹی موجود ہوتی تو ہم اسرائیلی وزیر دفاع کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ کے رکھ دیتے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست اپنا وہ کردار ادا نہیں کرسکی جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ کشمیر بھارت کے اور یروشلم اسرائیل کے قبضے

میں ہے۔اور پھر ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم نے بہت ترقی کر لی ہے۔اگر پاکستان پیپلز پارٹی اقتدار میں آ گئی اور انشاءاللہ یہ آئے گی تو تب آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف مزدوروں اور کسانوں کی تقدیر بدل جائے گی بلکہ کشمیر میں کوئی بھارتی اور یروشلم میں کوئی اسرائیلی نظر نہیں آئے گا''۔(23) 26 جون 1968ء کو ڈسٹرکٹ بار حیدرآباد میں تقریر کرتے ہوئے بھٹو نے برصغیر کی تقسیم کی نظریاتی بنیادوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''پاکستان محض اس لیے وجود میں آیا کہ ہم مسلمان تھے۔ہم اسلام کیلئے سب کچھ قربان کر دیں گے۔اسلام کا مطلب سبھی مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ کرنا ہے''۔(24)

سارا مسئلہ یہ ہے کہ ریاست کے مروجہ نظریاتی اور ادارہ جاتی ڈھانچوں کی کیفیت میں رہتے ہوئے قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے پورے ہی نہیں کیے جا سکتے۔اس کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر کے ایک سیکولر ریاست قائم کی جائے۔قومی جمہوری فرائض کی تکمیل کر کے بھی سوشلسٹ تبدیلی ممکن نہیں، ہاں البتہ سوشلسٹ تبدیلی کر کے قومی جمہوری انقلاب کے سبھی تقاضے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ایک سوشلسٹ انقلاب محض منڈی کی معیشت کو منصوبہ بند معیشت میں ہی نہیں بدلتا بلکہ یہ اپنے انقلابی اقدامات کے ذریعے سرمایہ داری کی سماجی، ثقافتی، اخلاقی اقدار کو بھی بدل کر بہتر کر دیتا ہے۔پاکستان بھر کے روشن خیال محمد علی جناح کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا اٹھتے بیٹھتے حوالہ دیتے ہیں تا کہ یہ دلیل دی جا سکے کہ پاکستان کو ایک مذہبی نہیں بلکہ سیکولر ریاست کے طور پر تشکیل دیا جانا تھا۔یہ تقریر بغیر نوٹس کے کی گئی تھی اور جناح نے کہا تھا کہ ''میں ذاتی طور پر یہی سمجھتا ہوں''۔ پاکستانی روشن خیالوں کی طرف سے پیش کیا جانے والا یہ غیر معمولی حوالہ ان کی تسلی و تشفی کیلئے تو کافی ہے مگر جناح کی اکثر دوسری تقریریں اور خیالات اس نقطہء نظر کی تائید نہیں کرتے۔مثال کے طور پر 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا ''اس قسم کا الجھاؤ مجھے تو سمجھ نہیں آتا کیوں پیدا کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا آئین شرعی قوانین سے متصادم ہوگا۔اسلامی اصول ویسے ہی آج قابل عمل ہیں جیسے یہ تیرہ سو سال پہلے تھے۔اسلام صرف عادات و اطوار کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ہر مسلمان کی زندگی کا بنیادی ضابطہ ہے جو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے یہاں تک کہ سیاست اور معیشت کا بھی''۔(25)

تحریک کے قائدین کی طرف سے سوشلزم کو پاکستانیت اور اسلام کا لبادہ پہنانا اس وقت سماج کے

مختلف حصوں کے متضاد دباؤ کا آئینہ دار تھا جن کی حمایت اس وقت ایک مقبول عام مظہر بن کر سامنے آئی۔ یہ توازن قائم کرنے کی کوشش ایک پاپولر بونا پارٹزم کی ہی ایک قسم تھی، جس کی بنیادیں کمزور بھی تھیں اور جو زیادہ عرصہ بھی نہیں چل سکتی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خود اس عظیم الشان انقلابی تحریک کے بعد اگلے چالیس سالوں میں پیش آنے والے واقعات وحالات ہیں۔

تاریخی طور پر غیر معمولی اس وقت اور اس عہد کا سب سے نمایاں اور برتر پہلو یہ تھا کہ عوام کا شعور انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کے چند ایک پسماندہ علاقوں میں بھٹو کی قوم پرستانہ اور مذہبی جوش وجذبے سے کی جانے والی تقریروں کے باوجود بھی، ملک کے دوسرے اکثریتی علاقوں میں جو نسبتاً جدید اور صنعت سے وابستہ تھے، وہاں انقلاب کی پکار اور تڑپ اتنی شدید اور زیادہ تھی کہ بھٹو کو انقلابی سوشلزم کے نعرے کو اپنانا اور لگانا پڑا۔

بونا پارٹزم کی دیگر شکلوں کی طرح پاپولزم کی طرف سے بھی مقبول تحریکوں میں متحارب ومتصادم طبقات کے مابین توازن پیدا کرنے کی کوشش کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ ایسی ہر کوشش اپنی بنیاد میں ہی کھوکھلی اور غیر موثر ہوتی ہے۔ ایسی ہر کوشش میں سماج اور سیاست کے متحارب اور ناقابل مصالحت مفادات کے حامل طبقات کی طرف سے ہمیشہ ہر قسم کے دباؤ موجود ہوتے ہیں۔ پاپولزم کی جبلتی کمزوری اسے ہر متضاد مفاد اور اس کے دباؤ کے آگے جھکنے اور اس کی ہمدردی وحمایت حاصل کرنے کی طرف مجبور کیے رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس نوعیت اور کیفیت کی سبھی حکومتوں کی تعمیر میں ہی خرابی کی کئی صورتیں مضمر ہوتی ہیں جو انہیں انجام کار ایک المیے سے دوچار کر دیتی ہیں۔ یہ بحرانوں اور مشکلات سے نبرد آزما رہتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کا ملٹی کلاس پارٹی کا مفروضہ اور تعریف بھی دراصل پاپولزم کے اندرونی تضادات کے گہرے تناؤ کی ہی عکاسی کرتا ہے۔ نہ تو کبھی کوئی پارٹی ''ملٹی کلاس'' موجود رہی ہے اور نہ ہی کبھی اس نوعیت کی پارٹی ہو سکتی ہے۔ آخری تجزیے میں ہر پارٹی یا ایک طبقے کی یا پھر دوسرے متحارب طبقے کی نمائندہ پارٹی ہی ہوا کرتی ہے۔ کسی پارٹی کو ملٹی کلاس قرار دینا محض نعرہ بازی یا ڈھکوسلے کے سوا کچھ نہیں۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اس نے ابتدا تو ایک پارٹی سے کی مگر بعد میں یہ ایک روایت، شاید ایک امید، ایک تحریک یا پھر ایک پلیٹ فارم بن کے رہ گئی۔ جہاں لوگ جب بھی کبھی وہ سیاسی طور پر متحرک ہونا چاہتے ہیں، جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں رہ کر وہ صرف اپنی کسی تحریک کی ابتدا تو کر سکتے ہیں، مگر ایسی جدوجہد یہاں رک کر کبھی اپنے مقاصد، اپنی منزل حاصل نہیں کر سکتی، اور نہ ہی کبھی

اس سیاسی عمل پر تکیہ کر کے ہونے والی کوئی سیاسی سرگرمی عوام کیلئے درکار تبدیلی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکتی ہے۔ جب پیپلز پارٹی پر سے حکمران طبقات اور سامراج کی گرفت ٹوٹے گی تو یہ پیپلز پارٹی موجودہ پیپلز پارٹی نہیں رہے گی۔ اس کی شکل اس کی ہئیت ہی کچھ اور ہوگی۔ ایک سراسر مختلف سیاسی ثقافت اور انقلاب کیلئے جدوجہد سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دے گی۔ وہ تو ایک شاندار تحریک تھی، تاریخ کی بڑی بڑی ریلیاں جلسے اور جلوس تھے، کھیتوں کھلیانوں اور کارخانوں پر قبضے اور محنت کش طبقے کا جوش جذبہ اور ولولہ تھا، جو بھٹو کو دن بدن لحہ بہ لحہ بائیں بازو کی سیاست کی طرف مائل کرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بھٹو نہیں تھا جو لوگوں کو آواز دے رہا تھا بلکہ یہ لوگوں کا انقلاب سے معمور جذبہ اور ولولہ ہی تھا جس نے حقیقت میں بھٹو کو وہ حوصلہ، وہ جرات عطا کی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک سوشلسٹ تبدیلی کا نعرہ زن بن کر ابھرتا چلا گیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ لکھنے والے (جو ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوا ہے)، مصنف و محقق فلپ ای جونز نے پارٹی کی نوع اور بھٹو کے کردار پر لکھا ہے:

''یہ بات کسی بھی مبالغہ آرائی کے بغیر کی جا سکتی ہے کہ اس ایک فرد کا غلبہ اتنا گہرا ہے کہ یہی اس پاپولسٹ پارٹی کے سبھی تنظیمی اور سیاسی خطوط کو مرتب کرتا ہے۔ یہاں شاید یہ کہنا بہت مناسب ہوگا کہ اگر ''تنظیمی بنیاد'' کا ذکر اور موازنہ کیا جائے، تو جیسا کہ بالشویک قسم کی پارٹی کے ساتھ معاملہ رہتا ہے، جو نظم وضبط، نظریات اور تنظیمی اہداف کی بہت پابند ہوا کرتی ہے، اور ایک فرد واحد کو اپنا قائد بنائے رکھتی ہے، یا پھر شخصیت پرست قسم کی پارٹیاں جن میں تنظیم اور نظریہ مخصوص سرگرمیوں کی حامل ایک اعلیٰ ترین قیادت کے ماتحت ہوتی ہیں۔ ہر چند یہ دونوں مظاہر عوامی ہوتے ہیں مگر ایک بالشویک پارٹی اپنے اہداف کی بدولت زیادہ انقلابی ہوتی ہے جو نیچے بنیادوں سے اوپر تک ایک نیا ریاستی ڈھانچہ تعمیر کرتی ہے۔ مگر دوسری قسم کی پارٹیوں کا مقصد اور ہدف یہ ہوتا ہے کہ وہ پچھلی حکومتوں سے اقتدار لے کر اپنی طرز اور منشا کے مطابق حکومت چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ پارٹیاں اپنی تنظیموں کو اپنے تلے دبائے رکھتی ہیں تا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ریاستی ڈھانچے کا حصہ بن سکیں۔ پارٹی اور ریاست کے مابین تعلق یا رشتے کی نوعیت سے قطع نظر ان دونوں قسموں کی پارٹیوں کے ماڈل اپنے نتائج، اپنی قیادت کے اطوار، اپنی تنظیمی حکمت عملیوں، بھرتی کے طریق کار اور نظریات کے اعتبار سے قطعی مختلف اور منفرد ہوا کرتے ہیں''۔

''اپنے ابتدائی ایام میں اپنے نظریاتی کارکنوں کی شاندار کارکردگی کی بدولت پیپلز پارٹی نے اپنے شروع کے سالوں میں چیئرمین کے عہدے اور ایک مرکزی کمیٹی کی شکل میں اور نیچے تک اپنی تنظیمی

بڑھوتری کے حوالے سے خودکوایک بالشویک پارٹی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔تاہم پاکستان میں موجود اور مروجہ مخصوص سیاسی وثقافتی رجحانات کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو ایک بالشویک پارٹی سے ایک شخصیت پرست قسم کی پارٹی بننے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔اگرچہ یہ عمل 1970ء کے الیکشن سے پہلے ہی پنپنا شروع ہو چکا تھا مگر اقتدار میں آجانے کے بعد تو یہ عمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔''نظریہ دانوں'' اور ''سیاستدانوں'' کے درمیان لمبے عرصے تک چلنے والی اندرونی کشمکش نے پیپلز پارٹی کو ایک ایسے عبوری ڈھانچے میں بدل کر رکھ دیا جو بیک وقت ایک طرف بالادست تو دوسری طرف زیردست طبقات کی نمائندگی کر رہا تھا''۔(26)

بھٹو نے جے اے رحیم کے ساتھ مل کر 16 ستمبر 1967ء کو حیدرآباد میں میر رسول بخش تالپور کے گھر پر نئی پارٹی کے قیام کا اعلان کیا جو ایک قومی سطح کی ترقی پسند تنظیم کے طور پر مشرقی ومغربی پاکستان میں اپنی عوامی جڑیں رکھتی ہو۔پارٹی کا تاسیسی کنونشن جیسا کہ بھٹو نے خود تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا،اتنی ''بڑی شاندار کامیابی'' ثابت نہیں کر سکا تھا۔پارٹی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ ایوب حکومت بھی چاہتی تھی کہ یہ اتنا کامیاب نہ ہونے پائے۔ڈاکٹر مبشر حسن کے گلبرگ کے پوش مضافات میں واقع گھر میں جو اندرون شہر اور تعلیمی اداروں کے گڑھ گول باغ سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا،ہونے والے اس کنونشن سے ایک روز قبل ڈھاکہ سے لاہور آنے والی ہر پرواز کی ہر سیٹ پہلے سے ہی خرید لی گئی تھی۔انگریزی روزنامے ''ڈان'' کے مطابق اس کنونشن میں تین سو کے لگ بھگ مندوبین شریک ہوئے تھے،جبکہ پارٹی کے انتہائی خوش گمان حلقوں کے مطابق یہ تعداد پانچ ساڑھے پانچ سو کے قریب تھی۔(27) کنونشن میں مشرقی پاکستان سے کوئی مندوب شریک نہیں ہوا تھا جسے بعد میں قومی پریس ٹرسٹ نے خوب اچھالا اور بھٹو کے ایک قومی سطح کے لیڈر ہونے کے دعوے کو رد کر دیا۔اس کمی اور کمزوری نے بعدازاں آگے چل کر اپنے اثرات بھی مرتب کیے۔

پاکستان ٹائمز نے اسے بے چہرہ رومانویت پسندوں،کھلنڈرے طالب علموں اور نظریاتی فکموں کا اجتماع قرار دیا۔اس کے علاوہ غیر معروف وکلا اور پرانے کمیونسٹوں کا ذکر بھی کیا جو کنونشن میں شریک ہوئے۔(28) ڈان کے الفاظ میں یہ کسی سیاسی اجتماع سے زیادہ،میلے میں آئے ہوئے نوجوانوں کا ایک کٹھ تھا۔اس نے اس بات پر یقین کا اظہار کیا کہ وطن عزیز میں پہلے ہی سیاسی پارٹیوں کی بھرمار ہے،چنانچہ یہ نئی پارٹی عوام پر اپنا رنگ کسی طرح نہیں جما سکے گی۔(29) ضلعی انتظامیہ مکمل طور پر ہوشیار

باش اور آنکھ رکھے ہوئے تھی، اگرچہ اعلان نہیں کیا گیا مگر دفعہ 144 نافذ کردی گئی۔ پارٹی کو پروگرام منعقد کرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا گیا جو 3 دسمبر کو موچی دروازے پر ہونا تھا۔ اس جگہ کے بارے میں روایت ہے کہ یہ لاہور کی سیاست کا رخ اور لاہور پنجاب کی سیاست کا رخ طے کرتا ہے۔ دہائیوں سے سیاستدان یہاں اپنی عوامی مقبولیت کا مظاہرہ کرتے چلے آرہے تھے۔ ان میں میاں محمد شفیع، فضل حسین، مولانا ظفر علی خان، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، محمد علی جناح، لیاقت علی خان، نواب آف ممدوٹ، ممتاز دولتانہ یہاں تک کہ خود ایوب خان تک اس موچی دروازے پر اپنے اپنے جلسے کر چکے تھے۔ عرصہ دراز تک یہ دروازہ قدیم شہر میں داخل ہونے کیلئے استعمال ہوتا رہا۔ ایک گول سڑک کی حامل یہ ایک ایسی کھلی جگہ ہے جس کے ہر طرف گنجان آبادی کے حامل محلے ہیں۔ جس کے شمال اور مغرب میں تنگ و تاریک گلیوں سے اٹا پرانا شہر ہے تو اس کے مشرق اور جنوب میں گوالمنڈی، رام گلی اور قلعہ گوجر سنگھ کے علاقے ہیں۔ یہاں پر ہونے والے اجتماع اپنی کم سیاسی وقعت و اہمیت کے باوجود کافی پرہجوم ہو جایا کرتے ہیں۔

اپنی توقع سے بہت کم تعداد میں ہونے کے باوجود پیپلز پارٹی کے اس کنونشن نے بہت کچھ بدل کے رکھ دیا۔ بھٹو جسے پہلے دن پارٹی کا چیئرمین منتخب کرلیا گیا تھا، نے محسوس کیا کہ ابتدا اتنی مضبوط اور توانا نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے تھی۔ دو دنوں میں چار اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس میں بھٹو نے ایک طویل تقریر کی۔ جبکہ دوسرا سیشن ایسے مقررین پر مشتمل تھا جو اپنے تئیں خود کو کسانوں، وکلا، تاجروں، انجینئروں اور طلبہ کے قائدین شمار کرتے تھے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ پارٹی نے کن کن اور کیسے کیسے باشعور سیاسی لوگوں کو کنونشن میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ تیسرے سیشن کے دوران مندوبین نے پارٹی کی بنیادی دستاویزات پر بحث کی اور پھر راتوں رات ''کنونشن قرارداد کمیٹی'' کی جانب سے قراردادیں ترتیب دی گئیں۔ چوتھے اجلاس میں نئی پارٹی تشکیل دے دی گئی۔ تاسیسی دستاویز اور قراردادوں کی منظوری دی گئی۔ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ اس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی ہوگا۔ مندوبین نے پارٹی کیلئے تین رنگوں کے پرچم کی بھی منظوری دی۔ کنونشن میں سب سے زیادہ بحث مباحثہ اسی پرچم پر ہوا تھا۔

یقینی طور پر بھٹو اور اس کے ساتھیوں کو آنے والے سالوں میں بہت سخت، بہت تیز، بہت طوفانی واقعات و حالات سے گزرنا تھا۔ اپنی ابتدا سے ہی تحریک پھوٹی نہیں تھی بلکہ ''پھٹ'' پڑی تھی۔ راولپنڈی

میں 7 سے 9 نومبر 1968ء کے دوران ہونے والے طلبہ واقعات پر بھٹو اور خورشید حسن میر نے طلبہ کے رہنماؤں سے مذاکرات کیے۔ پارٹی کے چیئرمین نے طلبہ کے ایک جلوس کی بھی قیادت کی اور اس کے ساتھ پنڈی گھیب تک کا سفر کیا جو ان واقعات میں شہید ہونے والے عبدالحمید کے جنازے کیلئے روانہ ہو رہا تھا، جبکہ پارٹی کے دیگر قائدین نے انٹرکانٹینینٹل ہوٹل کے اردگرد جمع ہونے والے اجتماع سے خطاب کیا۔ 10 نومبر کو بھٹو ریل پر لاہور کیلئے روانہ ہوا جہاں اس کی آمد کا سن کر لوگوں نے راستے میں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو کر اس کا خیر مقدم کیا۔ لاہور پہنچنے پر ایک فقید المثال مجمع بھٹو کے استقبال کیلئے موجود تھا جہاں ایک گاڑی اس کے کمپارٹمنٹ سے نکلنے سے پہلے اسے پلیٹ فارم سے لینے کیلئے آئی ہوئی تھی۔ اگلے دن بھٹو نے ایک پرجوش ماحول میں ڈسٹرکٹ بار لاہور سے خطاب کیا۔ اس نے تہذیب و ترتیب سے بیٹھے وکیلوں کو بتایا کہ اس نے حکومت کی اس تجویز کو دھتکار دیا ہے کہ وہ مشتعل ہو چکے طلبہ کو سمجھائے۔ میں نے حکومت سے کہہ دیا ہے کہ میں انہیں ہرگز نہیں روکوں گا بلکہ ان کی لڑائی میں ان کے ساتھ ہوں۔

بھٹو کی گرفتاری اور بائیں / دائیں بازو کی جدوجہد

13 نومبر کو بھٹو نے ریل کے ذریعے ملتان کی طرف سفر پر روانہ ہونا تھا مگر اسے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ڈاکٹر مبشر حسن کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے استقبال کیلئے جمع ہونے والا بڑا مجمع اس کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی بھڑک اٹھا اور اس نے ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ بھٹو کی گرفتاری نے پارٹی کے عہدیداروں کو کسی حد تک بوکھلا دیا، کچھ بحث و تکرار کے بعد جے اے رحیم کو قائم مقام چیئرمین بنا دیا گیا۔ یوں اس واقعے اور پھر نومبر میں ہونے والے واقعات نے ثانوی اور بڑی حد تک نظریے سے وابستہ قیادت کو پارٹی میں ابھرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ چھ ماہ تک تعطل کی حالت میں رہنے والا پارٹی کا ترجمان جریدہ ہفت روزہ ''نصرت'' پھر سے شائع ہونا شروع ہو گیا جو رابطے کا اہم ذریعہ بن گیا۔ اس کی وساطت سے سارے مغربی پاکستان کے اندر پارٹی پالیسی، رابطوں اور پروپیگنڈے کو منظم کیا جانے لگا۔ 25 نومبر وہ پہلا دن تھا جب بائیں اور دائیں بازو نے تحریک کی قیادت کو اپنے اپنے کنٹرول میں لینے کی تگ و دو شروع کر دی تاکہ اس کے نتیجے میں اقتدار کا حصول ممکن کیا جا سکے۔ بائیں اور دائیں بازو کی اس کشمکش میں پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی نے سر دھڑ کی بازی لگانی شروع کر دی۔ جنوری تک

''نصرت'' کی اشاعت باقاعدہ ہو چکی تھی اور اس میں مودودی (جماعت اسلامی کے بانی) اور مودودیت پر لگاتار مضامین شائع ہونے لگے جس میں اس جماعت کے فلسفے اور اس کے بانی کے سابقہ سیاسی کردار کو موضوع بحث بنایا جانے لگا۔ جنوری کے شروع میں یورپ سے اپنا ''علاج'' کروا کے واپس آنے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سوشلزم کے خلاف بیانات جاری کرنے شروع کر دیئے اور اعلان کیا کہ'' پاکستان میں سوشلزم مومنوں کی لاشوں پر سے ہی گزر کر آ سکے گا''۔(30)

مارچ میں جماعت کے بانی امیر نے گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد اپنی جماعت کے عہدیداروں اور کارکنوں کو حکم دیا کہ وہ ملک بھر میں پھیل جائیں اور'' محلے کی سطح پر کمیٹیاں قائم کر کے سوشلزم کے خلاف ہر ممکن پروپیگنڈہ کریں اور جو زبان سوشلزم کا لفظ پکارے اسے کھینچ لیں۔(31)

10 فروری 1969ء کو ہائیکورٹ نے بھٹو کی گرفتاری کی شکل تبدیل کرتے ہوئے اس کو لاڑکانہ میں اس کے گھر میں نظر بند کرنے کا حکم سنا دیا۔ 11 فروری کو بھٹو نے اپنے لیے آنے والے طیارے میں سفر کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اس میں اسے مارنے کیلئے بم نصب ہے۔ جس پر بھٹو کو ریل کے ذریعے لاڑکانہ روانہ کیا گیا۔ جہاں راستے میں ملتان، رحیم یار خان، روہڑی اور سکھر کے سٹیشنوں پر عوام کی بھاری تعداد اس کے استقبال کیلئے پہنچ گئی۔ 14 فروری سے بھٹو نے اپنے چار ساتھیوں اور مغربی پاکستان سے دیگر گرفتار شدگان کے ساتھ مل کر ایوب حکومت کی طرف سے مسلط کردہ ''ایمرجنسی رول لاز'' کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تادم مرگ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ اسی دن جب بھٹو اور اس کے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال شروع ہوئی، حکومت نے اعلان کر دیا کہ وہ 17 فروری کو یہ قانون واپس کر لے گی۔ اس کے ساتھ ہی بھٹو کو ذاتی طور پر یہ خبر فراہم کر دی گئی کہ وہ اب قید میں نہیں رہا ہے اور وہ خود کو آزاد سمجھے مگر بھٹو آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا اس نے قانون کی واپسی کی تاریخ تک اپنی بھوک ہڑتال جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔ جس پر وزیر قانون نے اعلان کیا کہ یہ واپس لے لیا گیا ہے۔ بھٹو نے کہا اگر یہ دھوکہ نہیں تو وہ اپنی بھوک ہڑتال ختم کرتا ہے۔(32) 17 فروری کو بھٹو ایک فاتح کی حیثیت سے کراچی پہنچا۔ وہ دو دن پہلے ہی لاڑکانہ میں صحافیوں کو بتا چکا تھا کہ وہ کراچی سے جدوجہد کے دوسرے مرحلے کا آغاز کرے گا۔ یہ پاکستان کا وہ پرولتاریہ شہر تھا جو ایوب خان کے خلاف ووٹ دینے کے جرم کی سزا بھگت رہا تھا۔(33) بھٹو نے اپنی پارٹی قیادت اور دوستوں سے طویل صلاح مشورے کے بعد کراچی پریس کلب میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوگا۔ اس نے کہا کہ لوگ

تبدیلی چاہ رہے ہیں، مراعات نہیں۔(34)

یہ واضح تھا کہ پارٹی کے بائیں بازو کے رہنما اپنے چیئرمین کو اس پر قائل کرنے میں کامیاب رہے تھے کہ تحریک بہت آگے جا چکی ہے اور ایسے موقع پر حکومت سے کسی قسم کی مصالحت کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ صرف ایک وجہ ایسی تھی جس کی بدولت بھٹو اس کانفرنس میں جانا لازمی سمجھتا تھا اور یہ وجہ اس نے اپنے انتہائی قریبی لوگوں کو بتائی بھی تھی۔ بھٹو کی خواہش تھی کہ کانفرنس میں اگر شیخ مجیب کے ساتھ مل بیٹھ کر باہمی تعاون کا کوئی امکان پیدا ہو جس سے وہ دونوں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کا اتحاد بنا لیں۔ اپنی رہائی کے بعد سے اپنے پہلے انٹرویو میں ہی پارٹی چیئرمین اعلان کرتا آ رہا تھا کہ اس کی اور شیخ مجیب کی شرکت کے بغیر کوئی سمجھوتہ یا مصالحت ناممکن ہوگی۔

بھٹو مجیب کی مشرقی پاکستان میں پیدا ہو جانے والی بے پناہ مقبولیت سے بخوبی آگاہ تھا مگر پھر بھی اسے یہ امید تھی کہ شاید وہ چھ نکات پر مصالحت کرنے کو تیار ہو جائے۔ بھٹو 23 فروری کو ڈھاکہ پہنچا جہاں اس نے مجیب کی حمایت میں بیانات دینے شروع کر دیئے تاکہ اس کا ساتھ حاصل کر سکے۔ اس نے کہا کہ وہ چھ نکات سے مکمل اتفاق نہیں کرتا۔ وہ مشرقی پاکستان سے کوئی متفقہ امیدوار سامنے آنے کی صورت میں صدارت کے لیے اپنے امیدوار ہونے سے دستبردار ہونے کو تیار ہے، اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ مجیب کے خلاف قائم اگرتلہ سازش کیس فوری طور پر ختم کیا جائے۔(35)

بھٹو نے ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے رہنما مجیب سے ملاقات بھی کی اور وہ اس کے ساتھ 24 فروری کو ایک ہی طیارے میں واپس بھی آیا، مگر وہ لاہور کیلئے روانہ ہو گیا جبکہ مجیب گول میز کانفرنس کیلئے آیا تھا۔ جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ مجیب نے اپنی مقبولیت میں اضافہ ہو جانے کے بعد چھ نکات پر اپنا موقف بدلنے کی بجائے اور بھی سخت موقف اپنا لیا ہے، چنانچہ صاف نظر آ رہا تھا کہ گول میز کانفرنس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ نہ ہی عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں اتحاد کا کوئی امکان تھا۔ لاہور میں نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ صرف اسی صورت میں گول میز کانفرنس میں شریک ہوگا اگر براہ راست منتخب شدہ ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام پر اتفاق رائے ہوتا ہے ورنہ نہیں، یہ غیر متوقع اعلان تھا، کیونکہ جماعت اسلامی 1956ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کر چکی تھی، بھٹو نے جماعت کے اس موقف کو سراسر رد کر دیا تھا۔ 2 مارچ کو بھٹو نے اپنا موقف مزید واضح کرتے ہوئے کہا کہ وہ کانفرنس میں شریک ہوگا' بشرطیکہ ایوب خان استعفیٰ دے کر اقتدار چھوڑ دے' ایسی صورت میں سپیکر قومی

اسمبلی عبوری حکومت سنبھال لے اور پھر ایک آئین ساز اسمبلی کیلئے براہ راست الیکشن کرائے جائیں۔ (36) اپوزیشن لیڈروں نے بھٹو پر کانفرنس میں شریک نہ ہونے اور پیشگی شرائط عائد کرنے پر سخت نکتہ چینی کی جس کا جواب دیتے ہوئے بھٹو نے کہا کہ اس نے شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کر کے اپوزیشن پر دباؤ بڑھا دیا ہے کہ وہ دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کانفرنس میں شریک ہوں گے اور عوام کو جوابدہی کیلئے تیار رہیں گے۔ بھٹو نے اس دوران تحریک کی قیادت، مزدور رہنماؤں، سماجی گروپوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور یہاں تک کہ مستقبل کی پیپلز پارٹی کی حکومت کے حوالے سے بیان بھی دینے شروع کر دیئے تاکہ اپنے لیے حمایت حاصل کر سکے۔ بھٹو کو ایوب کے کانفرنس میں کیے گئے اعلان میں کچھ نیا نہیں لگا۔ ایوب نے اس کانفرنس میں اپوزیشن کے دو مطالبات تسلیم کر لیے تھے۔ بھٹو نے الزام عائد کیا کہ دائیں بازو کے ساتھ مل کر حکومت ایک سویلین بغاوت کا رستہ ہموار کرنے کی سازش کر رہی ہے۔ اس خدشے نے بھٹو اور بھاشانی کو ایک اتحاد کرنے پر مجبور کر دیا۔

بھٹو جو پہلے ہی کیے گئے وعدے نہ نبھانے اور مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکنے پر مایوس ہو چکا تھا، اور جس کا سوشلزم کا تصور بھاشانی کے سوشلزم کے تصور سے قطعی مختلف تھا، الیکشن کے ذریعے اقتدار میں آنا چاہ رہا تھا۔ جبکہ بھاشانی مزدوروں اور کسانوں کی ایک انقلابی تحریک اور وہ بھی گوریلا جدوجہد کی شکل میں اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ بھاشانی نے الیکشن کے تصور کو مسترد کر دیا اور اس نے کراچی میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جو بھی الیکشن کے عمل میں شریک ہونے کی کوشش کرے گا وہ اپنی جان مال کی حفاظت کا خود ہی ذمہ دار ہوگا اور ہم اس کا گھر بار جلا کر اسے تباہ کر دیں گے۔ (37)

جب گول میز کانفرنس کا اتفاق رائے مجیب کے چھ نکات پر ضد کر جانے کی وجہ سے بکھر گیا تو سارے ملک میں ایک افراتفری پھیلتی چلی گئی۔ ایسے میں ایوب کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچ گیا تھا کہ وہ مارشل لا بحال کر دیتا، پیلو مودی مطابق بھٹو کو کراچی سے لاڑکانہ لے جانے والا طیارہ اچانک فنی خرابی کے باعث راولپنڈی کی طرف موڑ دیا گیا۔ طیارے کے پنڈی پہنچتے ہی بھٹو کو سیدھا کمانڈر انچیف کے پاس لے جایا گیا۔ جنرل یحییٰ نے بھٹو کو بتایا کہ فوج کے پاس اور کوئی رستہ نہیں بچا، سوائے اس کے کہ وہ معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لے، اس نے بھٹو سے کہا کہ وہ اس کی حمایت کیلئے اپنی شرائط بتائے۔ بھٹو نے تین شرائط بتائیں؛ ایک آزاد خارجہ پالیسی؛ ون یونٹ کا خاتمہ؛ ایک سال کے اندر اندر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن۔ یحییٰ نے فوری طور پر تینوں شرائط مان لیں۔

26 مارچ 1969ء کو ایوب رخصت ہو گیا اور بھٹو نے تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

وسیع تر سٹریٹجک اہداف کے حوالے سے پارٹی کے تنظیمی معاملات شروع دن سے ہی اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ ہر حال میں الیکشن جیتنے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ پارٹی کی بے پناہ بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ساتھ ہی پنجاب اور سندھ میں خاص طور پر نچلی سطح تک بڑی تعداد میں پارٹی کے یونٹ قائم ہونے کے بعد، اور ایک عبوری آئین کی ضرورت کی کیفیت میں نیچے تشکیل پائے جانے والے تنظیمی ڈھانچوں پر پارٹی چیئرمین کی گرفت بہت کمزور تھی۔ پنجاب کی حد تک تو یہ کمزوری نمایاں تھی۔

''پیپلز پارٹی کے مرکزی سرگرم حلقوں کے قریبی ذرائع کے مطابق پارٹی کی تنظیم سازی سے چیئرمین کو اس قدر دلچسپی نہیں تھی اور وہ اسے اتنی ترجیح نہیں دیتا تھا خاص طور پر تاسیسی کنونشن کے بعد اس کام کو تو جیسے نظر انداز ہی کر دیا گیا''۔(38)

کنونشن کے فوری بعد سنٹرل آرگنائزنگ کمیٹی اور پرنسپلز کمیٹی تشکیل دی گئی تھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی باقاعدہ میٹنگیں کرنا گوارا نہیں کیا تاوقتیکہ چیئرمین ہدایت جاری نہیں کرتا تھا۔ 24 جنوری 1971ء تک تو مرکزی کمیٹی بھی قائم نہیں کی جا سکی تھی مگر یہ بھی اپنی تشکیل کے بعد تبھی میٹنگ کرتی تھی جب چیئرمین کی طرف سے خصوصی ہدایت آتی تھی۔ ہاں البتہ ایک خود ساختہ مرکزی کمیٹی اس سے قبل کام کرتی محسوس ہوتی تھی جو کہ آرگنائزنگ اور پرنسپل کمیٹی کے ممبروں پر ہی مبنی تھی۔ ان کے علاوہ جن افراد کو چیئرمین اپنے ساتھ لا کر شریک کر دیتا۔ اس کی سب سے اہم ترین اور واحد میٹنگ جس کا ریکارڈ مرتب کیا گیا، 23 مارچ 1969ء کو کراچی میں منعقد ہوئی تھی جس میں ون یونٹ سکیم کے خاتمے کی پارٹی پالیسی پر مضبوطی سے عملدرآمد کرنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا تھا۔(39) اس کے بعد سے بھٹو کی بنائی گئی پرنسپلز کمیٹی، جس میں جے اے رحیم، ڈاکٹر مبشر حسن، حنیف رامے (جسے 1968ء میں ممبر لیا گیا) اور حفیظ پیرزادہ (جسے 1969ء میں شامل کیا گیا تھا) شامل تھے، کو ختم کر کے اسے ایڈہاک مرکزی کمیٹی بنا دیا گیا۔ تاکہ پارٹی ڈسپلن اور پالیسی معاملات کی دیکھ بھال کی جا سکے۔ 1970ء کے آغاز میں جے اے رحیم کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔(40) 1970ء کے بعد سے اس قومی پارٹی کیلئے جن دیگر مرکزی عہدیداروں کا اعلان کیا گیا ان میں سے کوئی ایک بھی پارٹی کے بانی ارکان میں سے نہیں تھا۔ ان میں مخدوم طالب المولیٰ (پیر جھنڈے وارو شریف آف ہالہ) کو نائب چیئرمین، میاں محمود علی قصوری کو بھی وائس چیئرمین اور مولانا کوثر نیازی کو پروپیگنڈہ سیکرٹری بنا دیا گیا۔ 4 مارچ 1969ء کو مشرقی پاکستان

کی پیپلز پارٹی کو تحلیل کر دیا گیا۔اے قسیم چوہدری نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر وہاں پیپلز پارٹی کو جوڑنے کی کوشش کی مگر مشرقی پاکستان میں پارٹی اس قدر کمزور تھی کہ یہ وہاں پنپ ہی نہیں سکی۔مغربی پاکستان کی دوسری بڑی پارٹیوں کے برعکس مشرقی پاکستان میں پیپلز پارٹی 1970ء کے الیکشن میں ایک بھی امیدوار کھڑا نہیں کر سکی تھی۔23مارچ 1969ء کے پارٹی ترجمان ''نصرت'' میں اعلان شائع کیا گیا کہ پارٹی کی پہلی قومی سطح کی کانفرنس 4 تا 6اپریل 1969ء کو لاہور میں منعقد ہوگی۔(41)

یہ ایک کوشش تھی کہ نومبر کی تحریک سے پارٹی کو ہونے والی حاصلات کو یکجا کیا جائے۔اس کانفرنس کیلئے طلبہ، وکلا، خواتین، صحافی، مزدوروں اور کسانوں کے نمائندہ مندوبین کی فہرستیں مرتب کر لی گئی تھیں۔جبکہ پیپلز پارٹی کی نمائندہ کمیٹیوں نے بھی شرکت کرنا تھی۔25مارچ 1969ء کو لگنے والے مارشل لا نے ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی جس کی وجہ سے یہ کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔اس کے بعد پہلی قومی کانفرنس یکم سے تین جولائی 1970ء تک ہالہ شریف (سندھ) میں منعقد کرائی گئی۔جبکہ دوسری اور شاید آخری کانفرنس 30 نومبر اور یکم دسمبر 1972ء کو راولپنڈی میں منعقد ہوئی تب پارٹی اقتدار میں تھی۔

نچلی سطح پر تنظیم بنانے کی کوششیں

پنجاب میں پیپلز پارٹی اوپر کی نسبت نیچے زیادہ پھیلتی گئی۔ہمیں کئی ادوار ملتے ہیں جب یہاں پارٹی میں تیز ترین تنظیم سازی ہوئی۔سب سے پہلا دور تو پارٹی کے تاسیسی کنونشن کے فوری بعد کا ہے۔جب کنونشن سے واپس جانے والوں نے نچلی سطح پر یونٹس تشکیل دیے اور پھر تنظیم سازی کا ایک خودرو سلسلہ ہی چل پڑا۔یہ تنظیمیں مقامی سطح پر لوگوں نے خود ہی اپنی مرضی ومنشا سے تشکیل دی تھیں اور اس میں بالائی قیادت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔کئی ایک جگہوں پر تو بالائی یونٹ نہیں بھی ہوتے تھے مگر پھر بھی نچلی سطح کے یونٹ موجود ہوتے تھے۔بیشتر حقیقی یونٹوں کو ضلعی تنظیموں کی منظوری کی ضرورت ہوتی تھی یا پھر انہیں از سر نو تشکیل دیا جاتا کیونکہ ان میں سے کچھ باہمی مخالفت پر بھی مبنی ہوتے تھے۔دسمبر 1967ء سے لے کر دسمبر 1970ء تک کل تشکیل پانے والے یونٹوں کے تقریباً آٹھ سے دس فیصد ابتدائی یونٹس تاسیسی کنونشن کے بعد کے پہلے تین ماہ میں قائم ہوئے تھے۔ابتدائی یونٹوں کی تیزی سے تشکیل کا دوسرا اہم مرحلہ 1969ء کے آخر اور 1970ء کے شروع میں شہری علاقوں میں انجام پایا۔اس کا مقصد انتخابی مہم کی

تیاری کے ساتھ ساتھ مزدوروں، طالب علموں اور صحافیوں میں روز افزوں بڑھتی ہوئی بے چینی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا تھا۔ اس عرصے کے دوران ہی خصوصی نوعیت کے یونٹس بھی تشکیل دیئے گئے جن میں خواتین کی بھی تنظیمیں قائم کی گئیں۔ اس کے سبب پارٹی کے اندر بائیں بازو رجحانات بھی تیزی کے ساتھ اُبھر کر آئے۔ تیسرا اہم مگر نسبتاً کم تر عرصہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں 22/23 مارچ 1970ء کو ہونے والی طلبہ، کسانوں اور مزدوروں کی کانفرنس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان دنوں چونکہ الیکشن کا بھی زور تھا اس لیے پارٹی کے امیدواروں کی کوششوں اور پارٹی کی اپنے عوامی انداز، زوردار انقلابی مہم کے باعث پرانی طرز کے کئی سیاستدان پارٹی کی طرف کھنچتے چلے آئے۔

اپنی ابتدا سے ہی پیپلز پارٹی کی بالا پرت چیئرمین بھٹو کے وفاداروں پر ہی مبنی چلی آتی رہی۔ فلپ ای جونز لکھتا ہے:

''مجموعی طور پر بھٹو کی شخصیت ہی اس کی سب سے بڑی معاون و مددگار تھی۔ وہ اپنی ذات میں ہی انجمن تھا۔ اس کا ظاہری رعب دبدبہ اور اس کی ذہین و فطین طبع اہل فکر و دانش، ماہر صحافیوں، محققین اور غیر ملکی سفارتکاروں کو بھی متاثر کر دیا کرتی تھی۔ عام لوگوں، پارٹی کے ساتھ مخلص کارکنوں کیلئے اس کا شخصی مزاج، ولولہ اور حسن مزاح اس کیلئے مضبوط و موثر رغبت اور تعلق کے حصول کا وسیلہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی لوگوں کے نام، ان کے چہرے، بچوں اور کارکنوں کے نام یاد رکھنے کی صلاحیت بھی کمال تھی اور جب کوئی چیئرمین بھٹو سے ملتا تو وہ اس کی گرمجوشی سے حیران رہ جاتا۔ اس سب کچھ کے باوصف بھٹو اپنے برتاؤ میں ایک پیچیدہ اور بڑی حد تک خطرناک انسان بھی تھا۔ وہ اپنے ساتھ سماجی برابری رکھنے والوں سے غیر مبہم اطاعت اور اپنے سے کم حیثیت والوں سے نیازمندی کا طلبگار تھا۔ اسے جب بھی غصہ آتا تو وہ کوئی لحاظ نہیں رکھتا تھا اور جو من میں آتا کہتا اور کر جاتا''۔ (42)

''یہ امر قطعی حیران کن نہیں کہ بھٹو نے اپنی پارٹی کی اعلیٰ انسانی صلاحیتوں سے قیادت کی۔ چیئرمین تک رسائی کیلئے ایک مشکل مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ بھٹو کے اردگرد موجود حلقہ جو پارٹی کی تشکیل سے بھی پہلے اس کے ساتھ منسلک چلا آ رہا تھا اور جسے پارٹی کے وفادار ''مرکزی حلقہ'' قرار دیا کرتے تھے، ایسے معدودے مخصوص افراد پر مشتمل تھا جن کو بھٹو تک براہ راست رسائی میسر تھی''۔ (43)

صرف ایک جے اے رحیم ہی ایسا فرد تھا جو براہ راست بھٹو کے ساتھ اس کے مدمقابل کسی بھی متنازعہ یا لازمی ایشو پر بات چیت کرتا تھا۔ اس کی شخصیت، اس کی سینیارٹی، اس کا پارٹی تشکیل میں بنیادی

مرکزی کرداراور کارکردگی،اس کی خوداعتمادی'ان سب نے مل کراسے ایک اثر ورسوخ عطا کیا تھا جس کے آگے بھٹو اپنے آپ کو بھی بے بس پاتا تھا۔رحیم کو 1970ء کے الیکشن میں مشکوک عناصر، بڑے جاگیرداروں، ملاؤں کی شمولیت پر سخت تحفظات تھے اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ پارٹی کے سوشلسٹ عزائم کیلئے مخلص نہیں ہیں اور مضررساں ثابت ہوں گے ۔بلکہ یہ لوگ پارٹی میں چیئرمین کے مدمقابل اور مخالف ماحول قائم کرلیں گے۔ایک ناخوشگوار قسم کے اثر ورسوخ کے تانے بانے نے جو عمومی طور پر تنظیمی ڈھانچوں پر بھی حاوی رہتا تھا،ایک ایسی کیفیت پیدا کردی جس سے پارٹی کے اندر ایک سلطنت سی قائم ہوگئی تھی اور یہ سلطنت چیئرمین کے گرد حلقہ زن افراد پر مشتمل تھی۔

پیپلز پارٹی کے اندر موجود بایاں بازو بھی کئی گروپوں کا مجموعہ ہی تھا جو اپنے حجم،اپنی تنظیمی وحدت، نظریاتی افق اور پارٹی سیل کی قربت کے حوالے سے مختلف الخیال تھے۔ان میں شیخ رشید کے ساتھ منسلک بڑے حصے سے ہٹ کر جو پاکستان کسان کمیٹی پر مشتمل تھا،باقیوں کی اکثریت نومبر کی تحریک میں متحرک انقلابی یونین کی سیاست سے تعلق رکھنے والوں پر مبنی تھی۔ان میں مزدور مجلس عمل ملتان،ترقی پسند مزدور محاذ لائل پور،پیپلز لیبر فرنٹ (رفعت حسین) راولپنڈی،اور متحدہ مزدور محاذ لاہور شامل تھے۔تھل محنت کش محاذ،دانشوروں پر مشتمل چنگاری گروپ،ڈاکٹر عزیز الحق اور''لاڈو صاحب'' کے گرد کام کرنے والے کیڈروں کا تشخص مختلف نوعیت کا تھا۔ان میں سے اول الذکر کا تعلق مزدوروں کسانوں کے ایک مشترکہ گروپ سے تھا جس کی بنیاد نیپ(NAP) بھاشانی کے کیڈروں نے میانوالی اور مظفرگڑھ ضلعوں میں رکھی تھی۔اس نے مارچ 1969ء میں پیپلز پارٹی کے ساتھ خود کو منسلک کیا تھا اور لیہ اور بھکر کی تحصیلوں میں پارٹی کے ڈھانچے تعمیر کیے تھے۔لیکن بعدازاں یہ لوگ مصطفیٰ کھر کے دباؤ کی وجہ سے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں یعنی طبقاتی دشمنوں کو الیکشن ٹکٹ ملنے پر الگ ہوگئے تھے۔چنگاری گروپ جو بعد میں ینگ پیپلز فرنٹ کہلوانے لگا تھا،بنیادی طور پر نکسلائٹ جریدے چنگاری سے متاثر تھا جو کینیڈا سے شائع ہوتا تھا اور جن کے کسی حد تک مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ لیننسٹ) سے روابط بھی تھے۔ان بائیں بازو کے گروپوں نے بڑی حد تک اپنی تنظیمی حدود برقرار رکھی ہوئی تھیں اور یہ پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنا تعلق ایک ایسوسی ایشن کے انداز میں رکھنا چاہتے تھے۔شیخ رشید کے ساتھ جڑا ہوا سوشلسٹ گروپ پیپلز پارٹی سے جڑا ہوا تھا مگر اس کا پس منظر ماؤاسٹ تھا۔1969ء اور 1970ء کی پیپلز پارٹی کے اندر مزدوروں اور طلبہ کی سیاست پر سب سے بڑی اور سرگرم بحث ہوا کرتی تھی مگر

1971/72ء تک یہ فیصلہ کن ایشو نہیں بن سکے تھے جب ان کی بنیاد پر پارٹی میں سے سوشلسٹ کیڈروں کو نکالنا شروع کر دیا گیا تھا۔ یکم اگست 1969ء کو شیخ محمد رشید، جو بہت بعد میں بابائے سوشلزم کے نام سے مشہور ہوئے، نے پیپلز پارٹی کی پنجاب اور بہاول پور کونسل کی میٹنگ کی صدارت کی تھی (پہلی میٹنگ جس کا ریکارڈ مرتب کیا گیا) اور یہ وہ میٹنگ تھی جس میں ان ایشوز پر اکثریت رائے سے قراردادیں منظور کی گئی تھیں۔

پیپلز پارٹی کے اپنے عہدیدار اور کارکن کنونشن مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کے پیپلز پارٹی میں جوق در جوق شامل ہونے پر سخت برہم اور نالاں تھے۔ ان کی شمولیت پر تحفظات ظاہر کیے گئے کہ اس قسم کی نئی بھرتی کو روکا جائے ورنہ یہ ناپسندیدہ عناصر آگے چل کر پارٹی کا بیڑہ غرق کر دیں گے۔ کونسل نے اس دباؤ کے پیش نظر فوری طور پر پارٹی کنونشن بلانے کا مطالبہ کر دیا تا کہ پارٹی کا تنظیمی ڈھانچہ مرتب کیا جا سکے اور اسے جمہوری بنایا جا سکے۔ یہ قرارداد واضح کرتی تھی کہ پارٹی ممبران اپنی آواز کو زیادہ شدت سے اوپر اور آگے پہنچانا چاہ رہے تھے۔ اس سے یہ بھی عیاں ہوتا تھا کہ وہ بھٹو کی طرف سے اشرافیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کی کوششوں سے ناخوش اور ان کے خلاف تھے اور یہ بھی کہ وہ پارٹی کے تنظیمی ڈھانچوں کو منظم و مستحکم کر کے بالائی قیادت کے تسلط میں توازن پیدا کرنا چاہتے تھے۔ پارٹی ممبران بھٹو کی طرف سے بڑے زمینداروں کے ساتھ ملنے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی اس کیفیت میں بھی اصل ایشوز سے جڑے ہوئے تھے۔

انتخابات سے پہلے زرعی مسئلے کی طرف رویہ زیادہ پر جوش نہیں تھا اس میں بھی وہی عدم دلچسپی نظر آتی تھی جو دوسرے اہم مسائل پر بھٹو کا خاصہ تھی کیونکہ وہ کسی خاص موقف سے جڑا رہنا نہیں چاہتا تھا۔

موچی دروازے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والے دونوں اجتماعات سے پنجاب کے سوشلسٹوں کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ پیپلز پارٹی کی نیچے عوام کی مقبولیت خالص اور حقیقی ہے اور یہ لازمی الیکشن میں بڑی تعداد میں سیٹیں جیتنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ جس خطرے اور خدشے کو وہ ہوتا دیکھ رہے تھے وہ یہ تھا کہ پیشہ ور سیاستدان، سرمایہ دار اور زمیندار اشرافیہ پارٹی میں شامل ہو کر ٹکٹ حاصل کر لیں گے، جس کے بعد پارٹی کا سوشلسٹ کردار اگر تباہ نہ ہوا تو شدید متاثر ضرور ہو جائے گا۔ 29 مارچ 1970ء کو 4-A مزنگ لاہور میں ہونے والے پنجاب-بہاول پور کونسل کے اجلاس میں (جس میں صوبائی، ضلعی اور شہری عہدیداروں نے شرکت کی تھی) کچھ قراردادیں پیش کی گئیں جنہیں منظور ہونے کی صورت میں

مرکزی قیادت کو بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ قراردادیں حسب ذیل تھیں۔

* ایسے سبھی افراد جن کے طبقاتی مفاد پارٹی منشور سے متضاد ہیں، کو پارٹی رکنیت نہ دی جائے۔
* مقامی پارٹی کی منظوری اور رضامندی کے بغیر کسی کو بھی کسی بھی حالت میں رکنیت، عہدہ یا پارٹی ٹکٹ نہ دیا جائے۔
* مرکزی کمیٹی کے اراکین سمیت سبھی پارٹی عہدے چناؤ کے ذریعے منتخب کیے جائیں۔
* پارٹی لٹریچر پارٹی کے ہی کنٹرول میں رہنا اور پارٹی ہی کے توسط سے تقسیم ہونا چاہیے۔
* پارٹی کا اپنی مالیاتی نظم ونسق چلانے کا ونگ قائم کیا جائے تاکہ پارٹی فنڈز منظم کیے جاسکیں۔
* پارٹی زرعی زمین پر پچاس ایکڑ تک حد ملکیت مقرر کرنے کی پالیسی اپنائے اور اسے نافذ کرے۔
* سبھی بڑے ذرائع پیداوار، سبھی بڑی صنعتوں پٹ سن اور ٹیکسٹائل سمیت کسی معاوضے کے بغیر قومی تحویل میں لے لیے جائیں۔
* کچھ بھی ہو جائے، پارٹی کی ترقی پسندانہ خارجہ پالیسی کو امریکی مفادات یا دباؤ کے تحت کسی بھی حالت میں تبدیل نہ کیا جائے۔(44)

فلپ جونز تفصیل کے ساتھ نیچے پارٹی کی طرف سے بڑھتے ہوئے طبقاتی تضاد کے دباؤ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ سلسلہ 70ء کے الیکشن سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

''اس قسم کی قراردادوں نے پارٹی میں کھر اور حنیف رامے (سنٹرل سیل) کے گروپوں کو ناراض کر دیا، انہوں نے چیئرمین بھٹو کو بھڑکانا اور اس کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ ان قراردادوں کو پارٹی کی الیکشن حکمت عملی کے خلاف قرار دینے لگے۔ حساس طبیعت کے مالک بھٹو نے اس تنازعے کو ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر زیر بحث لانے کی بجائے لاہور انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں میٹنگ رکھ لی۔ یہ میٹنگ ایک انتہائی تلخ، ترش، سنگین اور طویل مباحثے کی شکل میں تبدیل ہوگئی جس میں چیئرمین نے سوشلسٹوں کو سخت توہین آمیز لہجے میں جھاڑ پلا دی''۔(45)

اس واقعے نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ امان اللہ خان کی پارٹی رکنیت معطل کر دی گئی۔ اس کے بعد پنجاب کے سوشلسٹوں کو کبھی توفیق اور جرات نہیں ہوسکی کہ وہ پارٹی میں کبھی اپنا موقف دوبارہ بیان کر سکیں نہ ہی اس کے بعد کبھی پھر پنجاب کونسل کی کوئی میٹنگ ہوسکی۔ بلاشبہ چیئرمین ''نظم وضبط کے

تقاضوں'' کے تحت اپنے تسلط کو قائم رکھنا چاہتا تھا مگر وہ پارٹی کے سوشلسٹوں کی طاقت اور اہمیت دونوں کو تسلیم بھی کرتا تھا۔''امان اللہ خان کی معطّلی پر ہر طرف سے احتجاج شروع ہو گیا، طلبہ پارٹی سے استعفیٰ دینے لگے، اور پنجاب پارٹی کے کئی یونٹوں کی طرف سے اس کے خلاف قراردادیں آنی شروع ہو گئیں جس میں مرکزی قیادت کے غیر جمہوری رویے کی مذمت کی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں 25 اگست کو امان اللہ خان کی رکنیت بحال کر دی گئی''۔(46)

بائیں بازو کی کمزوری

ماضی کے جھروکوں میں جھانکا جائے تو 29 مارچ کی میٹنگ پیپلز پارٹی کے پنجاب کے بائیں بازو کی سب سے بڑی کاوش تھی۔ اگرچہ اس کے بعد اس کا انحطاط کسی طور غیر متوقع نہیں تھا اور یہ ہونا نظر آ رہا تھا۔ ہالہ کانفرنس کے بعد جونہی پارٹی کی الیکشن مہم نے زور پکڑا بائیں بازو کی اکثریت نے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بھٹو نے پارٹی تنظیموں کی طرف سے آنے والی قراردادوں پر کسی قسم کے غور یا بات چیت سے انکار کر دیا۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر بائیں بازو نے پارٹی اور پارلیمانی عہدے الگ الگ کرنے کا مطالبہ اور دباؤ برقرار رکھا تو وہ پارٹی سربراہی چھوڑ دے گا۔ دوسری طرف بائیں بازو کے اپنے داخلی مسائل اور کمزوریاں تھیں۔''پرانا بایاں بازو'' جو زیادہ تر لیبر آرگنائزیشنوں اور ڈرائنگ روم سوشلسٹوں پر مبنی و مشتمل تھا، ذاتی و شخصی اختلافات اور فلسفیانہ موشگافیوں کا شکار تھا۔ وہ اس سارے کھیل میں پیپلز پارٹی سے باہر اور دور رہا اور خاموش تماشائی بنا رہا۔ مگر اس نے زیادہ تر خود کو شہروں میں مرتکز کیے رکھا۔ اس کی حقیقی حمایت کا مرکز دیہات تھا جہاں اس کی تنظیمی بنیادیں کم یا کمزور تھیں۔ جہاں جہاں اس نے اپنی کسان کمیٹیاں یا کسان تنظیمیں بنا رکھی تھیں وہاں اس کی تعمیر کردہ قوتیں ردانقلابی قوتوں کو توڑنے کے قابل نہیں تھیں جو الیکشن کے بعد سے دیہی اشرافیہ، ضلعی انتظامیہ اور مقامی تھانیداروں (ایس ایچ اوز) کی طرف سے مسلط کی جانے لگی تھیں۔

اقتدار کی منتقلی کے بعد تو بایاں بازو بھٹو پر اس مطالبے کے لیے دباؤ ڈالنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا کہ پیپلز پارٹی کی طرف سے زرعی اصلاحات کے اعلان پر عملدرآمد شروع کیا جائے۔ شہروں میں بائیں بازو کی بنیادیں طلبہ اور نئی مزدور تنظیموں تک محدود تھیں جن کی قیادت بھٹو حکومت کے ہاتھوں سختی کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ وہ پیپلز پارٹی کے پروگرام پر عملدرآمد چاہتے تھے اور انہوں نے سوشلسٹ تبدیلی کی

خاطر ووٹ دیا تھا تا کہ کسی طرح سے پیپلز پارٹی اشرافیہ کے سیاسی تسلط اور معاشی جبر واستحصال سے ان کو نجات دلا دے۔ جبکہ دوسری طرف پارٹی سے وابستہ عام لوگوں کی اکثریت کے لیے یہ کوئی نظریاتی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس سے الگ صرف بھٹو کی ''عظیم شخصیت'' تھی جس نے پارٹی پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دیا تھا۔ اس لیے بڑے بڑے سوشلسٹ بھی براہ راست بھٹو کی بجائے اس کے اردگرد کے لیڈروں پر ہی تنقید کرتے تھے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ اپنی کوتاہی اور کمزوری کے باوجود بائیں بازو کو بھٹو نے اپنی چیئرمین شپ اور واحد شخصی برتری کے زیر اثر اپنی پالیسیوں اور کاروائیوں کے ذریعے مزید کمزور اور نڈھال کر دیا۔ بار بار ان کے مطالبات کو بھٹو مسترد کرتا چلا گیا کہ پارٹی تنظیموں کو مضبوط بنایا جائے۔ اس بات کو پارٹی کے اقتدار میں آنے سے پہلے والے عرصے میں سوچا ہی نہیں گیا تھا کہ آگے چل کے یہ معاملہ اتنا پیچیدہ اور ٹیڑھا ہو جائے گا۔ یہ دن بھٹو کے ہی دن تھے۔ پنجاب میں اس کی کرشماتی شخصیت اور اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور شاید یہ بات بھٹو کے بھی دل و دماغ میں سرایت کر چکی تھی کہ ایسا ہمیشہ ہی رہے گا۔ عوام کی طرف سے ملنے والی اسی سرشاری کی وجہ سے بھٹو طاقت کے منظم، مربوط اور مستحکم ذرائع سے اپنی ہر بات منوانے کی حیثیت میں بھی تھا اور بیک وقت پارٹی کی داخلی تنظیم سے بھی اس کا ''داخلی یونائٹڈ فرنٹ'' قائم و دائم رہا۔

اس قسم کی کیفیت کا برقرار رہنا اور رکھنا کئی وجوہات کی بنا پر بھٹو اپنے لیے ضروری بھی سمجھتا تھا کیونکہ،

1۔ انتخابات سے پہلے اسے پیپلز پارٹی کی فتح پر یقین نہیں تھا۔

2۔ اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ کامیابی کے بعد اسے اقتدار فوجی جنتا کی رضامندی اور مرضی سے ملنا ہے۔

3 ۔ وہ اقتدار کے بعد خانہ جنگی سے سہما ہوا تھا جسے وہ سیاسی اور عسکری حوالوں سے اپنے لیے درست نہیں سمجھتا تھا، اسی لیے وہ خود کو حاصل ہونے والی بھرپور اور تاریخی حمایت کے باوجود لوگوں کی امنگوں کی تکمیل کی خاطر زیادہ بائیں طرف کے اقدامات سے گریز کر رہا تھا۔

مراعات یافتہ سرمایہ داروں کا کنٹرول

پریشان حال اور مضطرب بائیں بازو کی حالت پہلے ہی کم خراب نہیں تھی کہ اوپر سے اشرافیہ طبقے

کے لوگوں کی پارٹی میں شمولیت نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ دیہی علاقوں سے یہ شرکت وشمولیت بہت زیادہ ہورہی تھی جہاں سے زمیندار طبقہ جوق در جوق پارٹی میں شامل ہوتا جارہا تھا۔ 1974ء تک پنجاب میں سے طاقت کے اس کھیل میں شامل ہونے والوں میں ڈیرہ غازی خان سے کھوسہ، لغاری، دریشک، مزاری' سرگودھا سے پراچہ، ٹوانہ، بندیال، قریشی؛ پیرمحل، کورنگہ اور شاہ جیونہ کے سید بخاری، ملتان سے دولتانہ، خاکوانی اور گیلانی' لائل پور کے راوی علاقے سے کھرل' مکھڈ' مانکی شریف اور تونسہ شریف کے پیر' لیاقت پور اور رحیم یار خان سے کوریجہ' کیمبل پور (جواب اٹک کہلاتا ہے) سے جودھرا اور ٹمن شامل تھے۔ جبکہ ملک خدا بخش بچہ اور عزیز احمد جیسے سول سروسز کے نامی گرامی لوگ بھی اس میں شریک تھے۔ بالادست طبقات، درمیانے طبقے کی بالائی پرت، تاجروں کے نمائندوں کی شمولیت یہاں تک کہ بدمعاشوں جنہیں عرف عام میں رسہ گیر کہا جاتا ہے، کے سرپرستوں کی پارٹی میں شمولیت بلاشبہ ایک موقع پرستانہ ردعمل تھا جو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ کر زمین اور دولت کے مزید حصول کیلئے تھا، جس کی یہ نظام ہمیشہ حوصلہ افزائی ہی نہیں دادرسی بھی کرتا چلا آرہا ہے۔

پارٹی منشور کے ساتھ زبانی کلامی حمایت کے دعووں اور بھٹو کے ساتھ وفاداری کا اظہار کر کے پارٹی میں ایسے عناصر کا شامل ہونا بہت آسان کام تھا۔ ہر چند 70ء کے الیکشن کے بعد اپنے اپنے علاقوں کے اندر ان کا مقامی روایتی اثر ورسوخ ختم ہو چکا تھا تاہم اشرافیہ طبقے کے ان افراد نے بہت جلد ہی اپنی صلاحیت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنا کھویا ہوا مقام ومرتبہ حاصل کرلیا۔ ان کے افسر شاہی میں اپنے روابط اور اثر ورسوخ کے ذریعے پارٹی کے ضلعی اور صوبائی عہدیداروں کے ساتھ بہترین تعلق اور مراسم استوار ہوگئے۔ ویسے بھی انہیں ''دلالی'' کا فن خوب آتا تھا جس سے پارٹی کے عہدیدار اور کارکن اتنے واقف نہیں تھے اور نہ ہی ان کو پہلے کبھی اقتدار کے ایوانوں سے اس طرح پالا پڑا تھا۔

اپنے ان تعلقات کو اشرافیہ نے بہت خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ بروئے کار لاتے ہوئے اپنی طاقت کو پھر سے تعمیر کرنا شروع کردیا۔ انہوں نے مقامی سطح پر اپنے پیاروں کے لیے ملازمتیں حاصل کر لیں اور ان کے تبادلے اور ترقیاں کرائے گئے۔ زیادہ نہری پانی، زرعی قرضوں' کھادوں' ٹیوب ویلوں وغیرہ کا حصول ان کی دسترس میں آتا چلا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ خاندانی اور ذات برادری کے عناصر پارٹی اور اس کی سیاست میں حاوی ہونے لگے، یہاں تک کہ کابینہ سازی اور ضمنی الیکشن تک کیلئے بھی یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔

ایک بار جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر یہ جڑ پکڑتا ہی چلا گیا۔زمیندار گھرانوں کو ویسے بھی ذات برادری کی سازشی سیاست کا تاریخی تجربہ اور ملکہ حاصل تھا جس کی مدد سے وہ اپنا حلقہ اثر پیدا کرنے اور اسے مستحکم کرنے میں کامیاب ہوتے چلے گئے۔1974ء تک جاگیردار گھرانوں کے چشم و چراغ نہ صرف پارٹی کے ضلعی عہدوں بلکہ پیپلز ورکس پروگرام کی باڈیوں میں بھی سامنے آنے شروع ہو گئے۔جبکہ رورل ورکس پروگرام سمیت مقامی ترقی کے ہر پروگرام میں ان کا وسیع عمل دخل تھا۔

1975ء کے وسط تک اشرافیہ خاندان کا ایک فرد سید ناصر علی شاہ پنجاب پیپلز پارٹی کا جنرل سیکرٹری بن چکا تھا جبکہ پنجاب کا وزیر اعلیٰ بھی نواب صادق قریشی کو بنا دیا گیا جبکہ پنجاب کی گورنری نواب صادق محمد خان امیر بہاولپور کو مل چکی تھی۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ 1976ء تک یہ طبقہ پارٹی پر حاوی و مسلط ہو چکا تھا اور اسی نے ہی 1977ء کے عام الیکشن کیلئے امیدواروں کی ٹکٹوں کی سیاست بھی سنبھال لی تھی۔اس الیکشن کیلئے جن کو ٹکٹیں دی گئیں ان کے ناموں کی فہرست سے ہی صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں کیسے کیسے گھرانوں کے لوگ تھے۔ان کی اکثریت کا تعلق انہی خاندانوں سے ہی تھا جو 1920ء سے 1958ء تک مسلسل پنجاب کی انتخابی سیاست پر حاوی اور مسلط چلے آ رہے تھے۔یہ سارے اقدامات اور پھر اس پر اس عرصے میں جنم لینے والا افراط زر جو بھٹو کی مختلف حلقوں کو بیک وقت مطمئن کرنے کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور جن کی وجہ سے خاندانی، تعلیمی، اخلاقی اور ادارہ جاتی انحطاط زور پکڑتا چلا گیا، لاء اینڈ آرڈر اور عمومی معیار زندگی میں گراوٹ آتی چلی گئی جو شہری علاقوں میں پارٹی کی مقبولیت کو کافی حد تک کھاتی چلی جا رہی تھی۔

بلوچستان

بھٹو نے فوج کے ادارے کو اس سوچ کے ساتھ بحال کیا تھا کہ وہ اس طرح اپنی حکمرانی کو تقویت اور فروغ دے سکے گا۔جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ 1971ء کی جنگ میں شکست کے بعد کی کیفیت میں سرمایہ دارانہ ریاست کو آسانی سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا تھا اور اس کی جگہ ایک مزدور ریاست قائم کی جا سکتی تھی۔مگر اس کیلئے نہ تو کہیں کوئی نیت تھی نہ پروگرام اور نہ ہی کوئی تیاری تھی۔چنانچہ تباہ و برباد ہو جانے کے باوجود بھی پرانے ریاستی ڈھانچے نے پھر سے زندہ ہونا، پاؤں جمانا اور طاقت پکڑنا شروع کر دی۔اپنی سماجی ساکھ کی بحالی اور بقا حاصل کر لینے کے بعد بھٹو کو احساس ہونا شروع ہو گیا کہ افسر

شاہی کے اپنے ہی عزائم، ترجیحات اور مجبوریاں ہیں مگر تب بھٹو کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ اب فوج تھی جو فیصلوں پر حاوی ہوچکی تھی اور عسکری کاروائی کے ذریعے اپنا آپ منوانا شروع کرچکی تھی۔

پاکستان جیسے ملکوں کے اندر اکثر و بیشتر ایسے حالات و مقامات موجود ہوتے اور رہتے ہیں کہ جن کیلئے فوجی کاروائی کسی بھی وقت شروع کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ بہت سے معاملات و مسائل ہیں جو فوج کو سنبھالنے پڑ جاتے ہیں۔ اس بار جو مسئلہ پیش آیا وہ بلوچستان میں شروع ہونے والی پرانی سرکشی تھی جو عرصے سے دبی ہوئی تھی۔ جہاں ایک سلگتا ہوا قومی مسئلہ کب سے موجود چلا آرہا تھا۔ بلوچستان میں منظم گوریلا سرگرمیوں کی پرانی روایت چلی آرہی تھی۔ بلوچ نوجوان چین، کیوبا اور چی گویرا کی بولیویا اور لاطینی امریکہ میں ہونے والی جدوجہد سے متاثر ہورہے تھے۔

پیپلز پارٹی 70ء کے الیکشن میں بلوچستان اور سرحد میں حکومت بنانے میں ناکام رہی تھی اور وہاں این اے پی اور جمعیت علمائے اسلام نے الیکشن میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ وہاں ان دونوں نے مخلوط حکومتیں بنالیں۔ ریاست کی مرکزیت کی بحالی اور برتری نے جلد ہی اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کردیئے۔ جن کے نتیجے میں مسائل اور تنازعات نے جنم لیا اور ریاست ان مظلوم قومیتوں کے حامل صوبوں پر چڑھ دوڑی اور وہاں فوجی آپریشن کرنے کی منصوبہ بندی شروع کردی گئی۔

فروری 1973ء میں عراقی سفارتخانے سے سفارتی ترسیل کے ذریعے سے آنے والے اسلحے کی برآمدگی پر پاکستانی حکومت نے الزم عائد کردیا کہ یہ بلوچستان میں تقسیم ہونے کیلئے آیا تھا۔ اس واقعہ سے بھٹو کے پاس عذر آگیا اور اس نے 13 فروری 1973ء کو بلوچستان میں قائم مخلوط حکومت کو یہ الزام لگا کر برخاست کردیا کہ یہ حکومت پاکستان سے علیحدہ ہونے کی سازش کررہی ہے۔ اس پر سرحد میں قائم مخلوط حکومت نے احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ تمام صوبوں میں برتری کی خواہش میں بھٹو کی این اے پی (NAP) کی قیادت، خاص طور پر بلوچوں کے ساتھ مسلسل تصادم کی کیفیت چلی آرہی تھی۔ NAP قیادت کی کوششوں میں مشرقی پاکستان کا تاثر محسوس کررہا تھا۔ یہ ایک خوف تھا جو اس کے دل ودماغ میں بیٹھ چکا تھا اسے اچھی طرح یاد تھا کہ نیپ (NAP) نے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی حمایت کی تھی، جبکہ اب نیپ کے حامی پٹ فیڈر ضلع سبی کے علاقے میں زرعی زمینوں پر قبضے کے لیے پاک فوج کے ساتھ لڑائی میں ملوث ہوچکے تھے۔ جس پر بھٹو نے اعلان کردیا کہ ''بلوچ قیادت صوبے بھر میں پھیلی وسیع بے چینی کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہوچکی ہے جس کی وجہ سے

وہاں کے رہائشیوں کیلئے بلکہ صوبے کے امن وامان کیلئے بھی شدید مشکلات پیدا ہو چکی ہیں''۔(47)

چنانچہ بھٹو نے نیپ (NAP) کی حکومت ختم کرتے ہوئے فوج کو بلوچستان بھیج دیا جس کا مقصد یہی ظاہر کیا گیا کہ یہ وہاں سڑکیں تعمیر کرے گی اور غریب بلوچوں کیلئے بجلی اور پانی کی فراہمی کا بندوبست کرے گی۔

یوں ایک بار پھر پاکستان کی فوج سیاست میں داخل ہو چکی تھی جس نے آگے چل کر خود بھٹو کا بھی فیصلہ کرنا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بلوچ رہنما اپنے ساتھیوں سمیت صرف پہاڑوں کی چوٹیوں تک ہی رسائی رکھتے تھے۔ جبکہ بڑے سردار اور قبائلی سربراہ اور نیپ (NAP) کے قائدین جن میں سردار خیر بخش مری بھی شامل تھا، کو سازش اور غداری کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا اور انہیں مقدمے کیلئے حیدرآباد لے جایا گیا۔

''خیر بخش مری کے ایک نائب میر ہزار خان نے 1976ء تک مری قبائل کے علاقے میں سرکشی جاری رکھی اور اس کے بعد وہ افغانستان چلا گیا اور وہاں سے ہدایات کے ذریعے سرکشی کو جاری رکھا۔ اس دوران ہی پاک فوج کو ایران کی طرف سے تیس ہیوئے کوبرا ہیلی کاپٹر گن شپس کا تحفہ مل چکا تھا۔ ایران کو خود بھی پاکستانی بلوچستان کے علاقے میں ہونے والی سرکشی کے اپنے ملحقہ علاقوں میں در آنے کے خطرات لاحق تھے۔ فوج نے 3 ستمبر 1974ء کو ان گن شپس کو وادی چمالنگ کے علاقے میں پناہ گزین مری قبائل کے خلاف استعمال کیا (جس کی زد میں عورتیں اور بچے بھی آ گئے)۔ اس واقعے سے برگشتہ ہو کر مری قبائل چوٹیوں سے اتر آئے اور تین دن تک فوج کے ساتھ شدید جنگ شروع کر دی جس میں مری قبائل کو بہت بھاری نقصان سے دوچار ہونا پڑ گیا''۔(48)

اس کے بعد بلوچستان کے دور دراز کے علاقوں میں لڑائی چلتی رہی' قبائلیوں نے فوج کی عددی وعسکری برتری کے باوجود مقابلہ جاری رکھا۔ بھٹو حکومت نے بالآخر دسمبر 74ء میں بلوچستان پر ایک وائٹ پیپر شائع کیا۔ جس میں پاک فوج کی شاندار فتح کا اعلان بھی شامل تھا اور یہ بھی کہ اسے جلد ہی واپس بلا لیا جائے گا۔ فوج کی تو خیر واپسی نہیں ہو سکی ہاں البتہ خود بھٹو کی ضرور واپسی کر دی گئی۔

اس لڑائی میں دونوں طرف سے بھاری نقصان ہوا۔ بلوچ نوجوانوں نے انتہائی دلیری سے مقابلہ کیا تھا اور اس وقت اس مسلح جدوجہد کے پیچھے ایک بائیں بازو کا عنصر موجود تھا۔ اگرچہ اس کا طریق کار اور نظریاتی بنیادیں کلاسیکل مارکسسٹ لیننسٹ حکمت عملی کی حامل نہیں تھیں۔ فوج نے وحشیانہ طریقے

سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی بلکہ کسی حد تک اس نے وہی کردار ادا کیا جو 71ء میں بنگال میں کر چکی تھی۔ بلوچ جدوجہد حکومت کے 74ء میں کیے گئے دعوے کے باوجود ختم نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس نے ہتھیار نہیں پھینکے اور کسی نہ کسی شکل میں چلتی رہی۔ المیہ یہ ہے کہ فوج کے ہاتھوں بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد ضیائی حکومت کی طرف سے ایک سازش کی گئی جو کہ بلوچستان میں ہونے والی جابرانہ فوج کشی کے مرکزی کرداروں میں سے ایک تھا۔ ضیاء نے انتہائی منافقانہ انداز اپنایا اور چال چلی اور حیدرآباد سازش کیس کو ختم کرتے ہوئے بلوچ رہنماؤں کو رہا کر دیا۔ یہاں تک کہ افغانستان میں جلاوطنی اختیار کرنے والے بعض بلوچ رہنماؤں کو فوجی C13O طیارے میں واپس لایا گیا جن کا ضیاء نے اپنی منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال بھی کیا تھا۔

ریاست کے ساتھ جاری رہنے والی اس طویل مزاحمت کے بہت ہی غیر معمولی نتائج نکلے اور پھر یہ جدوجہد صوبے اور ملک کے عوام سے مکمل طور پر الگ تھلگ اور تنہا رہی۔ مگر اس کی وجہ سے بعد کے کئی سالوں تک قومی مسئلہ بلوچستان میں سر اٹھائے رہا۔ یہ مسئلہ ابھی تک بھی حل طلب ہی ہے اور جب تک یہ سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے یہ حل ہو بھی نہیں سکتا۔ پاکستان میں جاری بحران کی شدت میں اضافے سے اس کی پیچیدگی اور نوعیت بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ قومی مسئلہ اور بھی متشدد ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک لینسٹ طریق کار کے بغیر مظلوم قومیتوں کے دکھوں اور محرومیوں کا مداوا ناممکن ہے۔ اس کے بغیر یہ طبقاتی وحدت اور جدوجہد کو بھی مزید نقصان پہنچاتا رہے گا۔ قومی آزادی کا حصول صرف اس نظام کو اکھاڑ کر پھینکنے سے ہی ممکن ہو سکے گا جو ان سب ذلتوں، محرومیوں اور دکھوں کو جنم دیتا اور ان کی مسلسل پرورش کرتا رہتا ہے۔ سرمایہ داری کو ختم کرتے ہوئے، اس کی جگہ مزدوروں کی انقلابی ریاست کے قیام سے سبھی جمہوری حقوق بشمول قومی اور لسانی آزادی کے حقوق کی ضمانت ممکن ہو سکتی ہے اور ایسا صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔

بھٹو حکومت کے درمیانی عرصے میں ہی اس بات کے اشارے ملنے شروع ہو گئے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ افسر شاہی دھیرے دھیرے اپنا اثر و رسوخ بحال اور مستحکم کر رہی ہے۔ اس کا آغاز اس نے پیپلز ورکس پروگرام سے کیا جس میں تحصیل اور ضلع کی سطح کی افسر شاہی پیپلز پارٹی کے قومی و صوبائی ارکان اسمبلی کی معاونت سے اس پروگرام میں سے پارٹی عہدیداروں کو باہر نکالنے اور دور رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر افسر شاہی خود پارٹی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے بھٹو کے

مقامی دوروں اوراس دوران بھٹو کی عوامی کچہریوں کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ پارٹی کے عہدیداروں کو صرف عوام کو اطلاع دینے اور اکٹھا کرنے کی ہی ذمہ داری سونپی جاتی تھی۔ یہ پروگرام اپنی نوعیت میں شاہانہ طرز سے ایک دربار کی طرح سے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ 1974ء میں ہی دو اور اہم واقعات ایسے ہوئے جو قابل توجہ اور اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر مبشر حسن کی وزیر خزانہ جیسے مضبوط عہدے سے برخاستگی تھی۔ صنعتکاروں کیلئے تو یہ ایک خوشخبری سے کم واقعہ نہیں تھا مگر اسی سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ تیسری دنیا کی قیادت کا نعرہ لگانے والی پیپلز پارٹی کی قیادت کس طرح قدیم ریاستی ڈھانچے کے دباؤ کا شکار ہو چکی تھی۔ دوسرا اہم ترین واقعہ جولائی میں جے اے رحیم کی کابینہ اور پارٹی عہدے، دونوں سے برخاستگی تھی۔ رحیم کی رخصتی پیپلز پارٹی کیلئے اندھی کھائی ثابت ہوئی، وہی ایک لیڈر تھا جو نہ تو بھٹو کے رعب دبدبے سے دبتا تھا نہ ہی اقتدار کی چکا چوند اس کے دامن پر کوئی داغ دھبہ رقم کر سکی تھی۔ وہ کبھی بھی خوشامدی نہ بن سکا اور پارٹی میں سوشلزم کے نظریات کا مسلسل علمبردار بھی رہا اور پارٹی کو تنظیمی طور پر ایک وحدت میں جوڑ کر رکھنے والا لیڈر بھی تھا۔ جو اس امید پر لگا رہا کہ ایک دن آئے گا جب پارٹی اپنی حکومتی پالیسیوں پر آخر کار نظر ثانی کرے گی۔

نتیجہ

پیپلز پارٹی میں شامل اور اس کا شریک سفر بننے والے بائیں بازو کے لیڈروں، دانشوروں اور ٹریڈ یونینسٹوں سے کچھ انتہائی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں۔ جن کا نتیجہ ایک تو خود پارٹی کی حکومت کے خاتمے کی اور ضیائی آمریت کی شکل میں سامنے آیا دوسرا سماج میں خود بائیں بازو کی تحریک کی اپنی رہی سہی ساکھ بھی داؤ پر لگ گئی اور ان کے قائم کردہ کئی ادارے سوویت یونین کے زوال اور دیوار برلن کے گرنے سے بھی بہت پہلے زوال کا شکار ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پارٹی میں داخل ہونے والا بایاں بازو نظریاتی طور پر اتنا پختہ و مضبوط نہیں تھا اور نہ ہی یہ تنظیمی طور پر خود کو منظم کر پایا تھا کہ جو پیپلز پارٹی کی عبوری تحریک میں کوئی انقلابی کردار ادا کر سکتا۔

سوشلزم کے بارے میں باتیں کرنا' اس پر بحث مباحثے کرنا ایک بات ہے جبکہ ایک انقلابی تبدیلی کیلئے نظریاتی پختگی کی سمجھ بوجھ رکھنا دوسری بات ہوتی ہے۔ بھٹو عام طور پر سوشلزم کی کئی اقسام کی تشریح کرتا رہتا تھا ان میں اصلاح پسندی بھی شامل ہوتی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر سویڈن اور سکینڈے نیویا کی مثالیں

بھی دیا کرتا تھا۔اور کچھ سیانے تو ابھی تک بھی ایسی ہی مثالوں سے اپنی دانش چمکاتے ہوئے مل جاتے ہیں۔دوسری انٹرنیشنل کے رجعتی کردار سے لے کر مرکزیت پسندی اور بائیں بازو کی اصلاح پسندی سمیت سٹالنزم کی کئی متروک قسمیں اب بھی سوشلزم کے نام پر پیش کی جاتی ہیں۔مگر اپنی ہئیت اور نوعیت میں یہ سب اصلاح پسندی کی ہی شکلیں ہیں جو آخری تجزیے میں سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک کر سربسجود ہو جاتی ہیں اور یوں ایک بھیانک ردانقلابی کردار ادا کرتی ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ مختلف النوع نظریات سے لیس تھے جو نہ تو کبھی نظریاتی طور پر منظم و متحد ہو سکتے تھے اور نہ ہی یہ ایک خالص مارکسی نظریاتی بنیادیں تعمیر کر سکتے تھے جو سماج کو درپیش بڑے چیلنجز کا سامنا اور مقابلہ کرنے کی اہلیت کی حامل ہوتیں۔دوسرا یہ بایاں بازو خود بھٹو کی ذاتی و شخصی مقبولیت کے حصار و سحر سے متاثر ہو چکا تھا۔پارٹی کے یہ بائیں بازو کے سیاستدان اگر کم سے کم بھی کہا جائے تو اتنے نادان اور بھولے بادشاہ تھے کہ انہوں نے اس سماجی یلغار کو مضبوط کرنے کی بجائے جو تحریک کی حقیقی طاقت تھا اور عوام کی سماج کو تبدیل کر دینے کی خواہش کا براہِ راست عکاس بھی تھا' بھٹو کی شخصیت کا طلسم ابھارنے پر زیادہ زور دیا۔عوام سماج کو بدلنا چاہتے تھے اور اس نظام کو تہس نہس کرنا چاہتے تھے جس نے ان کی زندگیوں کو تہس نہس کر رکھا تھا۔بھٹو ہی ان کی تبدیلی کی اس جستجو کا تشخص بن گیا۔

یہ تشخص دن بدن مضبوط سے مضبوط ہوتا گیا کیونکہ بھٹو اپنی ہر جوشیلی تقریر میں ان کے مسائل اور دکھوں کو بیان کرتا اور سوشلزم کے نعرے لگاتا اور لگواتا چلا جا رہا تھا۔جس کا پرجوش جواب اسے مزید بائیں بازو کی طرف دھکیلتا چلا گیا۔مگر جب حکمران طبقات نے تحریک پر پہلے جنگ اور پھر اصلاح پسندی کے ذریعے ردانقلابی حملہ کیا تو ان بائیں بازو والوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ اب عوام کو کیسے اور کس طرح منظم و متحرک کیا جائے اور ریاست کے ان حملوں کا جواب کس طرح دے کر اسے شکست دی جائے۔پیپلز پارٹی کی حکومت کی موجودگی میں ایک سرمایہ دارانہ ریاست کا اصلاحات کرنا ایک ناگزیر عمل تھا۔ایک بورژوا ریاست کے ہوتے ہوئے' اس کے ڈھانچوں کے اندر رہتے ہوئے حکومت کر کے انقلابی نتائج کا حصول وہ یوٹوپیا ہے جس کے خلاف مارکسزم کے سبھی عظیم استاد 1848ء سے اب تک تاریخ کے ہر نازک مرحلے پر مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں۔

سب سے بڑی کمزوری اور خامی ان بائیں بازو کے لیڈروں کی جو تھی وہ بین الاقوامیت کے احساس سے محرومی تھی۔مارکسزم یا تو بین الاقوامیت ہے یا پھر یہ کچھ بھی نہیں۔پہلی سے چوتھی انٹرنیشنل تک

نظریاتی اور تنظیمی اعتبار سے مارکسزم اپنے آغاز سے انجام تک صرف اور صرف بین الاقوامیت ہی ہے۔ سٹالنزم کا پیدا کردہ قومی سوشلزم پہلے حب الوطنی، پھر پاکستانیت سمیت ہمہ قسم کے قومی شاونزم کی بنیاد بنتا چلا گیا۔قومی خودمختاری،قومی مفادات،اورقومی دفاع وغیرہ جیسے تصورات اسی کا ہی شاخسانہ اور نتیجہ ہیں۔اس قسم کے پیٹی بورژوا تصورات اوران کی طرف سوشلسٹوں کے معذرت خواہانہ رویوں نے ہی دائیں بازو کی قوتوں اور ریاست کو وہ طاقت فراہم کردی جس سے انہوں نے مل کر انقلابی قوتوں کو پیپلز پارٹی کے اندراور باہر شکست سے دوچار کردیا۔ 71ء کی جنگ نے بھی سوشلسٹوں کو گمراہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا جس کی وجہ سے وہ بین الاقوامیت کے اصول کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوتے چلے گئے۔

پیپلز پارٹی کا بایاں بازو اپنی متضاد و متذبذب نظریاتی بنیادوں کی وجہ سے کبھی بھی خود کو ایک انقلابی وحدت و اکائی کے طور پر منظم نہیں کر پایا نہ تو پارٹی کے اندر نہ ہی اس سے باہر۔وہ پارٹی میں کہیں گہری مداخلت(Deep entryism) کررہے تھے اور وہ بھی اس وقت کی کیفیت میں ایک بھدے انداز میں کیا گیا۔بائیں بازو نے دائیں بازو کے خلاف کوئی کمزور سا بھی یونائیٹڈ فرنٹ بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ اقتدار ملتے ہی پیپلز پارٹی کی قیادت نے آسانی کے ساتھ معاملات کو چلایا اور موقع ملتے ہی بائیں بازو کو بے وقعت کر کے رکھ دیا کچھ تو ان میں سے پارٹی سے باہر نکل گئے اور کچھ وہیں رہ کر اپنی حقیقی پالیسیوں پر مصالحت کرتے رہے جبکہ اس دوران وہ سوشلزم کے نام کی مالا جپنا ہرگز نہیں بھولے۔

اگر ہم پیپلز پارٹی کے جنم،ڈھانچوں اوراس کی نشوونما کا جائزہ لیں تو یہ دوسری سوشلسٹ انٹرنیشنل کے ساتھ منسلک مزدور طبقے کی پارٹیوں کے عمومی تنظیمی معیار پر بھی پوری نہیں اترتی تھی۔تاہم اس کے باوجود بھی پیپلز پارٹی اس انٹرنیشنل کا حصہ بن ہی گئی (جسے روزالکسمبرگ متعفن مردہ خانہ قرار دیتی تھی) جو تیزی کے ساتھ دائیں بازو کی طرف لڑھکتی چلی گئی۔تبدیلی کے اس عمل کے دوران یہ سوشل ڈیموکریسی کی ان پالیسیوں کو بھی منظور و مقبول کرتی چلی گئی جنہیں یورپ کی قدامت پسند پارٹیاں بھی اپنانا پسند نہ کرتیں۔

لیکن پیپلز پارٹی چونکہ 1968/69ء کے انقلاب کی پیداوار تھی جس سے سٹالنزم غداری کر چکا تھا جس کے باعث خلا پیدا ہوا جسے بھٹو نے پر کیا اور اس نے اس میں پہل قدمی کر کے موقع سے فائدہ

اٹھایا۔اس نے انقلابی زبان اور سوشلسٹ نعرے لگاتے ہوئے اس عظیم انقلابی تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔پیپلز پارٹی پاکستان کے محنت کشوں اور محروم عوام کے سیاسی اظہار کی وہ روایت بن گئی کہ آج تک کوئی اس کا متبادل نہیں بن سکا۔مسئلہ یہ ہے کہ قومی قیادت حکمران طبقات کی پالیسیوں کے شدید دباؤ میں آجاتی ہے جس سے ان کا محنت کشوں اور عوام کی امنگوں کے ساتھ ایک تضاد ابھرنا شروع ہوجاتا ہے۔یہ کیفیت ناگزیر طور پر پارٹی کے اندر ایک ''لیفٹ اپوزیشن'' کو ابھار دے گی جبکہ محنت کش طبقے کا دباؤ پارٹی کو طبقاتی جدوجہد کی طرف دھکیلنے کی کوشش میں سرگرم عمل رہے۔مارکسسٹوں نے خود کو اس تناظر سے جوڑے رکھنا ہے اور اس دوران وہ پارٹی کے اندر ایک مارکسی رجحان تعمیر کررہے ہیں جو آنے والے وقتوں میں محنت کشوں کی تحریک کیلئے متبادل قیادت فراہم کرے گا۔

اگر صرف بھٹو پر ہی یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اس نے سوشلزم کو اپنے اقتدار کیلئے استعمال کیا تو پھر بائیں بازو کو بھی کسی طور اس سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔اگر بھٹو نے سوشلزم کے ساتھ قوم پرستی اور مذہب کو خلط ملط کرنے کا ارتکاب کیا تو بائیں بازو کی بڑی تعداد بھی ماؤاسٹ اور سٹالنسٹ پس منظر کے ساتھ اسی قوم پرستی میں لپٹی رہی' مذہب نہ ہی سہی۔انہوں نے بھی طبقاتی جدوجہد کو حب الوطنی اور قوم پرستی کے غلاف پہنائے رکھے۔سچ تو یہ ہے کہ یہ سب تو ان کی ہی نظریاتی وسیاسی تعلیم وتربیت وآگہی سے بالکل ہم آہنگ نقطہء نظر اور کوشش تھی۔یہ بھی تو انہی پیشین گوئیوں اور آدرشوں کا ہی مجموعہ تھی جسے وہ سوشلزم قرار دیتے چلے آرہے تھے۔دو مرحلوں کی نفسیات اور نصاب کے باعث ہی انہوں نے بھٹو کو ایک ترقی پسند بورژوا، امید کا مینارہ قرار دیا تھا جو قومی جمہوری انقلاب کا فریضہ مکمل کرسکتا تھا اور جس کے بعد انہوں نے مستقبل بعید کے کسی مرحلے پر سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کردینی تھی۔کئی ''عظیم انقلابیوں'' نے تو برصغیر کی تقسیم اور پاکستانی قوم پرستی کی بھی حمایت کردی تھی۔ایک بار پھر قیادت کے مسئلے پر وہ بھی سٹالن اور ماؤ کی تقلید کے انداز میں بائیں بازو قیادت ایک فرد کی قیادت، ایک مسیحا اور ایک عوامی رہنما کے عقیدے کے تحت بھٹو کو بت بنا کے غیر بالشویک رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ایک اجتماعیت کی حامل سوچ اور رویہ اپنانے کی بجائے جس کے ذریعے بنیادی مسائل پر بحث مباحثے کرتے ہوئے قیادت کی تعمیر وتشکیل کی جاتی، بھٹو کی ذات اور صفات کو ہی مرکز ومحور بنالیا گیا۔بطور فرد بھٹو کا کردار ماضی کی کابینہ کے اہم وزیر کی حیثیت کی وجہ سے ابھرا جسے پہلے حکمران طبقات کے ذرائع ابلاغ اور بعدازاں عوام نے اپنے کاندھوں پر بٹھالیا۔اس کی ذات اس کی شخصیت پر عوام کا بے پناہ بھروسہ اور اعتماد ایک اجتماعی بالشویک

قیادت کی غیر موجودگی اور ایک جمہوری مرکزیت کی حامل پارٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے تعمیر ہوتا گیا کیونکہ ان کے پاس کوئی اور انقلابی متبادل ہی نہیں تھا۔ ہر چند تاریخ میں فرد کے کردار کو کبھی بھی مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مگر کسی انقلاب کا مقدر اور منزل کبھی بھی، کہیں بھی ایک فرد واحد کے پابند نہیں رہتے، نہ ہی رہے ہیں۔ مارکس کبھی مارکس نہیں ہوسکتا تھا اگر پہلی انٹرنیشنل کی کمیونسٹ لیگ نہ ہوتی۔ اسی طرح لینن بھی کبھی لینن نہیں ہوتا اگر بالشویک پارٹی نہ ہوتی۔ ادھر ادھر بھٹکنے والی بائیں بازو کی قیادت کو مجبوری کے عالم میں سیاست کے مرکزی دھارے میں شریک ہونے کیلئے شارٹ کٹ استعمال کرنا پڑ گیا انہوں نے بھٹو کو اس کام کیلئے استعمال کرنے کی کوشش کرنے کی ٹھان لی اور ان کو یہاں مطلوبہ جگہ مل بھی گئی۔ مگر اس کیلئے انہیں بھٹو کو قائد عوام کے طور پر تعمیر کرنے کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ بجائے ایک انقلابی سوشلسٹ پارٹی کو تعمیر کرنے کے جو انقلابی تحریک کو انقلاب سے ہمکنار کرتی، انہوں نے ایک تشخص کو تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ لینن اکثر اوقات ایک بات کہا کرتا تھا کہ انقلاب کیلئے کوئی چور راستہ نہیں ہوا کرتا اور ٹیڈ گرانٹ کے بقول تو بہت سے چور رستے صرف اندھی کھائی میں ہی دھکیل دیا کرتے ہیں۔

1967ء میں پیپلز پارٹی کے قیام سے لے کر اب تک پارٹی کے بائیں بازو کے پاس بے شمار مواقع آئے کہ جب آگے پیش قدمی کرتے ہوئے ایک حقیقی سوشلسٹ پروگرام کی طرف بڑھا جاسکتا تھا مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔ اس وجہ سے پارٹی کے اندر مارکسسٹوں کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ زندگی ہی زندگی کے بارے میں سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر سکھایا کرتی ہے اور پیپلز پارٹی سے امیدیں لگائے عوام بھی بہت جلد بہت بڑے واقعات سے بہت کچھ سیکھ لیں گے۔ اگر ایسے موقع پر مارکسسٹ موجود رہتے ہوئے، انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ اپنے پروگرام کو عوام میں پیش کرتے رہے، تو وہ پارٹی کے اندر ایک انقلابی مارکسی رجحان تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ناقابل مصالحت نظریاتی موقف اور اصولوں پر استوار رہتے ہوئے، طریق کار میں انتہائی لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے، یہ رجحان پہلے تو پارٹی کے اندر ''لیفٹ اپوزیشن'' کی حیثیت اختیار کرے گا اور پھر اس کے بعد یہ آنے والے وقت میں ایک سوشلسٹ فتح کی رہنمائی کرتے ہوئے اس کو یقینی بنائے گا۔ 1968/69ء کے اسباق، اس کے تجربات، اس میں کی جانے والی پارٹی کے بائیں بازو کی غلطیاں، یہ سب پاکستان میں انقلاب کیلئے ناگزیر داخلی قوت کی تعمیر اور اس کی نظریاتی تربیت اور تنظیمی بڑھوتری کے عمل میں معاون و رہنما ثابت ہوں گے۔

جنگیں اور انقلابات تاریخ کے غیر معمولی واقعات ہوا کرتے ہیں؛ یہ نہ تو ہر آئے دن ہوتے ہیں نہ ہی یہ غیر معینہ طویل مدت تک جاری وساری رہا کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی موجودگی میں مروجہ نظام اور اس کے سبھی معمولات درہم برہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔اس سے سماج میں ایک مبہم و مشتعل کیفیت حاوی ہو جایا کرتی ہے جو زیادہ عرصہ نہیں قائم رہ پاتی۔ایسی کیفیت میں ریاستی طاقت کا محنت کش طبقے کے ساتھ کھلا تصادم ہوتا ہے۔یا تو ایک انقلابی پارٹی اقتدار پر کنٹرول حاصل کر کے مزدور ریاست قائم کر لیتی ہے یا پھر حکمران طبقات خانہ جنگیوں اور بدترین تشدد پر اتر آتے ہیں۔کسی بھی انقلابی تحریک کی شکست بدترین عواقب ونتائج کا باعث بن جایا کرتی ہے۔1968/69ء کی انقلابی تحریک کا پہلا مرحلہ 138 دن تک چلتا رہا تھا۔

ایک انقلابی پارٹی کو ہر صورت میں سیاسی اور تنظیمی ڈھانچوں پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ایسی پارٹی ریاستی طاقت کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد ایک مزدور ریاست قائم کرتی ہے اور ایک نیا سیاسی وسماجی نظام رائج کرتی ہے۔لیکن اگر کوئی انقلابی پارٹی انقلاب کیلئے تیار نہیں ہوتی اور نئے سماجی نظام کا فریضہ سرانجام نہیں دیتی تو یہ لامحالہ پرانے ریاستی ڈھانچے کو ہی کام میں لانے پر مجبور ہو جاتی ہے اور یوں اس کی انقلابی پالیسیوں اور پروگرام کے باوجود بھی انقلاب مکمل نہیں ہو پاتا۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پرانے سماجی نظام اور اس کے ڈھانچوں کو قائم رکھنے سے ریاست اس کے ہاتھوں استعمال ہونے کی بجائے اسے استعمال کرتی ہے، اسے عوام کی حمایت سے محروم کر کے اسے نشان عبرت بنا دیتی ہے۔پیپلز پارٹی بارہا اس انجام سے دوچار ہو چکی ہے۔راولپنڈی کی جیل میں لکھی جانے والی اپنی آخری کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں بھٹو نے لکھا:

''میں اس آزمائش میں اس لیے مبتلا ہوں کہ میں نے ملک کے شکستہ ڈھانچے کو پھر سے جوڑنے اور متضاد و متحارب طبقات کے مابین ایک آبرومندانہ اور منصفانہ مصالحت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فوجی بغاوت کا سبق یہ ہے کہ ایسی ہر مصالحت محض ایک یوٹوپیا' ایک دھوکہ ہے۔فوجی بغاوت ثابت کرتی ہے کہ طبقاتی کشمکش ناقابل مصالحت ہوا کرتی ہے۔اس میں ایک طبقے کی جیت دوسرے طبقے کی مات بن جایا کرتی ہے، یہی نوشتہ دیوار ہے''۔(2)

ذوالفقار علی بھٹو کا یہ آخری اعتراف سچا بھی تھا اور دیانت پر مبنی بھی۔مگر پھر اس کے بعد کی پارٹی قیادت اپنے بانی چیئرمین کے اس تاریخی سبق کو بھی کچرے دان میں پھینکتی چلی آ رہی ہے۔پارٹی قیادت

بھٹو کی موت کی کال کوٹھڑی میں لکھے گئے اس تاریخی پیغام سے سیکھنے میں نااہل ثابت ہوئی ہے۔انہیں سرمایہ دارانہ نظام سے ہٹ کر کچھ نہ سمجھ آرہا ہے نہ نظر' لیکن ان کی بدقسمتی کہ عوام ابھی تک پارٹی سے بندھے ہوئے ہیں اور جب یہ عوام تاریخی عمل میں قدم رکھتے ہیں' خواہ وہ الیکشن ہوں یا کوئی انقلابی تحریک،تو یہ پیپلز پارٹی کا ہی رخ کرتے ہیں محض اس کے پروگرام اور خاص طور پر 1968/69ء کے انقلاب کی وجہ سے کہ جس نے پارٹی کو عوام کی روایتی پارٹی کے تاریخی کردار سے نوازا تھا۔

مسئلہ اور معاملہ یہ ہے کہ عوام اس قیادت سے محروم ہیں جس کے وہ مستحق ہیں جس کی ان کو تلاش اور جستجو ہے۔تین دہائیوں میں پارٹی تین بار اقتدار میں آئی اور تینوں دفعہ ہی اس نے عوام کی امنگوں کو مایوسیوں میں بدل ڈالا۔پارٹی حکومت کا ہر تجربہ عوام کیلئے ایک ہی سبق کا حامل رہا ہے۔پارٹی اقتدار کا موجودہ تجربہ بھی کوئی نیا سبق نہیں دے گا مگر پھر تاریخ میں کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا۔اس بار لاکھوں مزدور' کسان اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کوئی سنجیدہ تبدیلی ضروری ہو چکی ہے۔موجودہ مخلوط حکومت کا انجام واضح ہے۔زرداری الیکشن میں پارٹی کی حاصلات کو ضائع کرتا جا رہا ہے۔مارکسسٹوں نے بار بار پارٹی قیادت کو خبردار کیا ہے کہ ایک حقیقی انقلابی پروگرام کو اپنائے اور لاگو کیے بغیر' سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا قلع قمع کیے بغیر حکمران طبقات پھر سے وہ حالات پیدا کر دیں گے جو کہ ان کیلئے پہلے سے بھی بھیانک نتائج کے حامل ہوں گے۔مگر شاید واقعات ہی ان تجزیوں کو سچ ثابت کریں گے مگر پھر یہ کوئی حتمی کہانی نہیں ہوگی۔پارٹی قیادت نظریات سے بے نیازی برت رہی ہے اور عوام ذلتوں کو بھگت رہی ہے۔عوام سبق سیکھ رہے ہیں' وہ جلد ہی جان جائیں گے کہ صرف مارکسسٹ ہی تھے جو انہیں آگاہ اور خبردار کرتے آرہے تھے۔ان حالات میں پارٹی کے اندر ایک وسیع مارکسی بایاں بازو تشکیل دیا جا سکتا ہے۔بڑھتی ہوئی طبقاتی تفریق اور جلد ابھرنے والی عوامی تحریک پارٹی پر بے پناہ دباؤ ڈالے گی جس کے نتیجے میں پرولتاری دھڑا اصلاح پسند دھڑے سے الگ ہو جائے گا۔آنے والے وقت میں ایک اور 1968/69ء ناگزیر ہو چکا ہے مگر اس بار یہ بلند و برتر سطح پر اپنا اظہار کرے گا،جس قسم کے حالات اور کیفیت میں تحریک نے پیپلز پارٹی کو انقلاب کی روایت بنایا تھا ویسے ہی پیپلز پارٹی کے اندر موجود مارکسی رجحان ایک عوامی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آجائے گا۔اگر ایک مضبوط و مستحکم بالشویک طاقت اس دوران قائم کر لی جاتی ہے تو یہ آنے والے تاریخی لمحات اور واقعات میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہوئے پاکستان میں انقلابی سوشلزم کی فتح کی ضامن قرار پائے گی۔

نوٹس

1۔انقلاب فرانس کا راہنما،نیشنل کنونشن کا صدر بنااور رابس پئیر کے اقتدار کے خاتمے کے بعد پھانسی پر چڑھادیا گیا۔

2۔ذوالفقارعلی بھٹو،اگر مجھے قتل کیا گیا،(وکاس پبلشرز،دہلی،1979ء)،صفحہ 55

3۔ٹیڈ گرانٹ،نوآبادیاتی انقلاب اور روس چین تنازعہ، اگست 1964ء،ان ٹوٹ دھارا،صفحہ 308, 309 ,310

4۔ایلن وڈز،بالشوازم راہ انقلاب،صفحہ 310

5۔لینن،مجموعہ تصانیف جلد 9،جمہوری انقلاب میں سوشل ڈیموکریسی کے دوطریقہ کار،صفحہ 98

6۔ایلن وڈز،بالشوازم راہ انقلاب،صفحہ 312-311

7۔لیون ٹراٹسکی،1905ء میں ہمارے اختلافات،صفحہ 332اوراسی صفحے پرحاشیہ

8۔ایضاً

9۔ ٹیڈ گرانٹ،نوآبادیاتی انقلاب اور روس چین تنازعہ،اگست 1964ء،ان ٹوٹ دھارا،صفحہ 309

10۔ پاکستان ٹائمز،لاہور،30مارچ 1966ء

11۔ایضاً29اکتوبر 1967ء

12۔آؤٹ لک،25اپریل 1964ء

13۔پاکستان پیپلز پارٹی،بنیادی دستاویز،صفحہ 5

14۔بھٹو،ایک شفاف آغاز(انگریزی)،صفحہ 45

15۔سٹینلے وولپرٹ،زلفی بھٹوآف پاکستان،(آکسفورڈ)،صفحہ 124

16۔سوبھوگیان چندانی،نیوز لائن میں انٹرویو،اکتوبر 2008ء

17۔بھٹو،جاگتے ہوئے عوام(انگریزی)،ذوالفقارعلی بھٹو کے بیانات،مضامین،تقاریر،صفحہ 90

18۔ایضاً صفحہ 93

19۔ایضاً صفحہ 94,95

20۔ایضاً صفحہ 233

21۔ایضاً صفحہ 169

22۔ایضاً صفحہ 179

23۔ایضاً صفحہ 197

24۔ایضاً صفحہ 240

25۔دی نیوز اسلام آباد، 28 ستمبر 2008ء

26۔فلپ ای جونز، پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان، صفحہ 98,99

27۔ڈان یکم دسمبر 1967ء

28۔پولیٹیکل کارسپانڈنٹ، نظریاتی مخالفین کا اتحاد (انگریزی)، پاکستان ٹائمز، 2 دسمبر 1967ء

29۔A Damp Squib، ڈان اداریہ، 4 دسمبر 1967ء

30۔نصرت، نمبر 16، 21 جنوری 1968ء صفحہ 15

31۔پاکستان ٹائمز، 15 مارچ 1969ء

32۔پاکستان ٹائمز، 18 فروری 1969ء

33۔ڈان 16 فروری 1969ء

34۔پاکستان آبزرور، ڈھاکہ، 19 فروری 1969ء

35۔ڈان 24 فروری 1969ء

36۔مارننگ نیوز، 3 مارچ 1969ء

37۔پاکستان ٹائمز، 2 اگست 1969ء

38۔جے اے رحیم، انٹرویو، ویو پوائنٹ، 12 اکتوبر 1973ء

39۔نصرت، نمبر 27، 30 مارچ 1969ء، صفحہ 8-7

40۔مارننگ نیوز، 17 جنوری 1970ء

41۔نصرت، نمبر 26، 23 مارچ 1969ء، صفحہ 4

42۔فلپ ای جونز، پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان، صفحہ 217

43۔ایضاً صفحہ 217

44۔ پاکستان ٹائمز 31 مارچ 1970ء

45۔فلپ ای جونز، پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان، صفحہ 245

46۔مساوات، 31 اگست 1970ء

47۔شجاع نواز، کراسڈ سورڈز، (آکسفورڈ)، صفحہ 333

48۔ایضاً صفحہ 335-334

آمریت اور جمہوریت

اقتدار بدلتے ہیں، محنت کشوں کے حالات نہیں

''انسانی سماج کی تاریخ میں طبقاتی حکمرانی کے مختلف طریقے ملتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ سماج میں تو خاص طور پر یہ درست ہے جہاں آپ کو ریپبلک، بادشاہت، فاشزم، جمہوریت، آمریت، بونا پارٹسٹ، وفاقی اور مرتکز ہر قسم کے نمونے مل سکتے ہیں''۔

(ٹیڈ گرانٹ)(1)

''اگر ہم عام سوچ اور تاریخ کا مذاق نہیں اڑا رہے تو یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ہمیں طبقات کی موجودگی میں ''خالص جمہوریت'' کا کہیں بھی نام ونشان نہیں ملے گا۔ ہاں البتہ ہم طبقاتی جمہوریت کی بات ضرور کر سکتے ہیں۔ ''خالص جمہوریت'' محنت کشوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کسی لبرل کا کاذب اور مکارانہ فقرہ ہے۔ بلاشبہ سرمایہ دارانہ جمہوریت قرون وسطیٰ کے مقابلے میں ایک جدید تصور ہے مگر یہ سرمایہ داری کے زیر اثر ہمیشہ محدود، اپاہج، تنگ نظر، جھوٹی اور منافقانہ ہے۔ گو یہ امیروں کیلئے تو ایک جنت سے کم نہیں ہے مگر یہ محروموں اور غریبوں کیلئے ایک پھندہ، ایک لعنت اور ایک دھوکہ ہوتی ہے''۔

(ولادیمیر لینن)(1924-1970ء)(2)

اپنی آزادی کے اکسٹھ سال بعد پاکستان ایک ''قوم'' جو ملک ڈھونڈ رہی تھی سے تبدیل ہو کر ایک ملک بن گیا ہے جسے ''قوم'' کی تلاش ہو۔ 1968/69ء کے انقلاب کے چالیس سالوں بعد بھی عوام ابھی تک نجات کی جستجو میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ شاید جتنی نجات کی تڑپ آج ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ ذلت ہے کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ سماجی و معاشی محرومی کا زخم دن بدن بلکہ لحہ بہ لحہ گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ محروم محنت کش طبقے کے کرب کی شدت کا کوئی حساب نہیں ہے۔ غصہ اور اضطراب عمومی رویہ بن چکا ہے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ جریدے ''اکانومسٹ'' نے اپنی جنوری 2008ء کی اشاعت میں پاکستان کو کرہ ارض کی سب سے خطرناک جگہ قرار دے دیا۔ 1991ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''اللہ کا انتظار'' میں فنانشل ٹائمز کی نمائندہ کرسٹینا لیمب نے پاکستان کی صورتحال کے بارے میں لکھا تھا:

''آج کے دن پاکستان میں مزید 12000 انسان جنم لیں گے۔ ان میں سے 2000 پہلے ہی سال میں مر جائیں گے۔ ان میں سے بیشتر اپنی مادری زبان سیکھنے سے پہلے بندوق چلانا سیکھیں گے۔ ان میں سے صرف ایک تہائی کو ہی پینے کا صاف پانی نصیب ہو سکے گا۔ جبکہ صرف 15% سیوریج کی سہولت سے مستفید ہو سکیں گے۔ ایک چوتھائی سکول جا پائیں گے جبکہ کئی ہیروئن کا نشہ کریں گے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جو اپنے ہی مستقبل کا قتل کر رہا ہے''۔

''اس وقت تک اس دن کا تعین نہیں کیا جا سکا ہے کہ کب اس ملک میں انسانوں کو انسان سمجھا جائے گا۔ ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ لگا کر برصغیر کی وحدت سے علیحدگی کا جواز گھڑ لیا گیا۔ آج اسی مسلمان ملک میں مسلمان سے مسلمان محفوظ نہیں اور ایک کو دوسرے سے تحفظ اور پناہ کی تلاش ہے''۔

''عوام کی ضروریات اسی طرح سے نظرانداز ہوتی رہیں گی کیونکہ دو طبقوں کے مابین تفاوت انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ طاقت کے منبع کو پاش پاش کرنے کیلئے کسی انقلابی کی ضرورت ہوگی۔ ورنہ ان کے پاس اب واحد رستہ یہی رہ گیا ہے کہ ملک کو ہی توڑ دیا جائے''۔(3)

ان الفاظ کے لکھے جانے کے وقت کے بعد سے تو پاکستان کی صورتحال اور بھی زیادہ بگڑ چکی ہے۔ کئی علاقوں میں جنگ، خانہ جنگی جاری ہے تو کہیں سرکشیاں معمول بن چکی ہیں۔ امریکی سامراج کی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' پاکستان کے لیے لعنت اور ملامت کا ایک طوق بن چکی ہے۔ عراق اور افغانستان پر جارحیت کے بعد سامراجی اب پاکستان کے شمال مغرب اور دوسرے علاقوں کو اپنی خونریزی

کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔خودکش بم دھماکے، بنیاد پرستانہ جنونیت، قتل وغارتگری اور تباہی و بربادی نے پاکستان کو دنیا بھر کے لوگوں کی نظر میں وحشت و بربریت کا مرکز بنا کے رکھ دیا ہے۔عوام کیلئے نہ کہیں سکون میسر ہے نہ ہی راہ نجات۔اپنے اقتدار کے پہلے چھ ماہ میں اس جمہوری حکومت نے ،جس کی سربراہی پاکستان پیپلز پارٹی کے پاس ہے، پہلے سے اذیتوں اور محرومیوں کا شکار چلے آرہے عوام کے معیار زندگی پر تابڑتوڑ حملے کئے ہیں۔بنیادی اشیائے ضرورت کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔پاکستان کی ساری المناک تاریخ میں اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اتنا تیز تر اضافہ کسی اور دور میں کبھی بھی نہیں ہوا تھا جتنا اس دور اور اس وقت میں ہوا۔ بے روزگاری اور غربت کو آج سے پہلے کبھی اتنا عروج نصیب نہیں ہوسکا تھا۔صحت ،تعلیم، پانی، انفراسٹرکچر،ٹرانسپورٹ اور دیگر بنیادی سہولتیں کبھی بھی اتنی دگرگوں حالت میں نہیں تھیں۔اور یہ زبوں حالی بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی ہے۔

1968/69ء کے انقلاب، پاک بھارت جنگ اور ملک کے دولخت ہوجانے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے بے شمار اصلاحات کیں۔یہ اصلاحات کئی شعبوں میں کی گئیں جن میں لیبر قوانین، زمین، تعلیم اور صحت وغیرہ شامل تھے۔یہ اصلاحات پاکستان کی تاریخ کی سب سے زیادہ عوام دوست اصلاحات تھیں۔ایک طرف جہاں یہ 1968/69ء کے انقلاب کے دباؤ کی پیداوار تھیں تو دوسری طرف ان کی وجہ سے پیپلز پارٹی اور بھٹو کو وسیع عوامی حمایت اور بنیادیں میسر آگئیں۔تاہم پاکستان جیسے ملک میں موجود سرمایہ دارانہ نظام میں ان اصلاحات پر عملدرآمد کا عوام کو خاطرخواہ فائدہ نہیں پہنچ سکا۔پارٹی کے اس اولین اقتدار میں کی جانے والی وسیع نیشنلائزیشن بھی اتنے موثر نتائج پیدا نہیں کرسکی کیونکہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اس نیشنلائزیشن سے باہر رکھا گیا۔پھر ان اداروں کو مزدوروں کے جمہوری کنٹرول میں بھی نہیں دیا گیا۔ان کو چلانے کیلئے سول افسر شاہی کو مسلط کردیا گیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نیشنلائزیشن نے پاکستانی سرمایہ داروں کو سخت تکلیف میں مبتلا کردیا تھا جس میں کئی بینک،انشورنس کمپنیاں اور دیگر ادارے شامل تھے۔تاہم ان اقدامات سے سرمایہ دارانہ نظام کو کوئی فرق نہیں پڑا اور یہ قائم ودائم رہا۔

یہاں تک کہ نئی حکومت کی انقلابی زرعی اصلاحات کے بھی اتنے مفید وموثر اثرات مرتب نہیں ہو سکے۔جاگیردار اشرافیہ نے افسر شاہی اور کاغذات کا پیٹ بھر کے اور دیگر بدعنوانیوں کے ذریعے اپنی زمینیں بچالیں۔کسی نہ کسی شکل میں فوج اور ریاست کا سرمایہ دارانہ ڈھانچہ برقرار رہا۔پیپلز پارٹی حکومت

سے اپنا انتقام لینے کیلئے سرمایہ داروں نے معیشت کے شعبے میں افراط زر کو بڑھانا شرع کر دیا جس کی وجہ سے پسماندہ و درماندہ عوام کیلئے حکومتی اصلاحات کے فوائد میں اور بھی کمی ہوتی چلی گئی۔ 1974ء کے تیل کے بحران اور عالمی سرمایہ داری میں ہونے والی گراوٹ نے پاکستان کی معاشی حالت کو اور بھی دگرگوں کر کے رکھ دیا۔ اصلاحات کی حاصلات میں ناکامی، افراط زر میں اضافے اور بحران کی شدت نے پارٹی حکومت کے ساتھ عوام کے تعلق اور وابستگی کو بے دلی اور شکستگی سے دوچار کر دیا۔ فوج کو جونہی اپنے پاؤں سنبھالنے کا موقع ملا اس نے 1973/74ء میں بلوچستان میں جارحیت کرتے ہوئے چڑھائی کر دی۔ جس نے قومی مسئلے کے زخم کو گہرا کرتے ہوئے سیاسی بحران کی شدت اور عدم استحکام میں اضافہ کر دیا۔ امریکی بھی بھٹو سے سخت نالاں تھے کیونکہ عوام کی تائید و حمایت سے اس نے کچھ ایسے اقدامات کر لیے تھے جو امریکیوں کی طبیعت پہ سخت گراں گزرے۔ امریکی سی آئی اے (CIA) کی معاونت سے ایک رجعتی سیاسی اتحاد پاکستان قومی اتحاد (PNA) کے نام سے تشکیل دیا گیا۔ مارچ 1977ء کے عام الیکشن میں دھاندلی کا شور مچا کر نظام مصطفیٰ کے نعرے کے تحت ایک تحریک شروع کر دی گئی۔ 5 جولائی 1977ء کو آرمی چیف جنرل ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ الٹتے ہوئے آمریت مسلط کر دی۔ بھٹو کی مقبولیت ایک بار پھر سے ابھرنا شروع ہو گئی جس نے آمریت کو خوفزدہ کر دیا۔ بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا اور پھر اسے ایک جھوٹے مقدمے میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔

ضیاء آمریت کے ہاتھوں بھٹو کا عدالتی قتل دراصل پاکستان کے حکمران طبقات کی طرف سے ایک انتقام تھا جو انہوں نے بھٹو سے لیا کیونکہ اس کی 1972/74ء کے دوران کی جانے والی نیشنلائزیشن کی اصلاحات نے ان کے مفادات پر شدید کاری ضرب لگائی تھی۔

ضیائی آمریت

جنرل ضیا کا گیارہ سالہ خونی اور وحشی دور شاید پاکستان کے عوام کیلئے بدترین دور تھا۔ اس نے تبدیلی کے خواہاں پیپلز پارٹی کے کارکنوں، بائیں بازو والوں، ٹریڈ یونینسٹوں، طالب علموں اور کسانوں کو کچلنے کیلئے اسلام کا بے رحمی سے اور بے دریغ استعمال کیا۔ اس خون سے لتھڑے دور کا سب سے بھیانک سفاک واقعہ جنوری 1978ء میں کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے مزدوروں کا وحشیانہ قتل عام تھا۔ راقم بھی اس جدوجہد میں شریک تھا۔ میرا قریبی دوست اور ملتان کے مزدوروں کے انتہائی پرجوش قائدین میں

سے ایک محمد شفیع بھی اس بربریت کی بھینٹ چڑھنے والوں میں شامل تھا۔اس مل میں 13000 مزدور کام کرتے تھے۔ یہ شاید پاکستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منافع کمانے والی ٹیکسٹائل مل تھی۔ 1969ء اور پھر 1972ء کی اصلاحات کے بعد مزدوروں کو ہر سال نومبر یا دسمبر میں اپنی اجرتوں پر بونس بھی دیا جاتا تھا۔ مزدوروں کو علم تھا کہ سال 1977ء میں فیکٹری نے بہت زیادہ پیداوار کی ہے اور منافع بھی بہت زیادہ کمایا ہے چنانچہ وہ بجا طور پر توقع کر رہے تھے کہ وہ اچھے بونس سے مستفید ہوں گے۔ مگر جولائی میں بھٹو کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور ضیاء آمریت مسلط ہو چکی تھی۔ مالکان نے مزدوروں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کیلئے مارشل لا کا سہارا لیا۔ فوجی حکومت کے خوف سے کئی روایتی ٹریڈ یونین رہنماؤں اور سی بی اے (CBA) کے قائدین نے مالکان کے ساتھ میل ملاپ کر لینا مناسب سمجھا۔ وہ یہاں تک بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو گئے کہ ہمیں پہلے سے بھی کم بونس دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ نومبر گزر گیا اور دسمبر بھی گزرا چلا جا رہا تھا مگر کسی بونس کا نام ونشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ مزدوروں میں بیتابی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سارا سال اس بونس کا انتظار کرتے تھے اور اس سے اپنے معاملات زندگی ترتیب دیا کرتے تھے۔ مالکان کو اس کی کوئی پرواہ تک نہیں ہو رہی تھی جبکہ مزدوروں کا اضطراب بڑھ رہا تھا اور یہ غصے میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ فیکٹری میں مزدوروں نے اس حوالے سے کوئی کاروائی کرنے کی گفتگو شروع کر دی۔ 29 دسمبر 1977ء کو مزدوروں کی پہلی شفٹ کام کیلئے فیکٹری پہنچی مگر انہوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا جبکہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والوں نے بھی فلور چھوڑنے سے انکار کر دیا اور وہ مل کے احاطے میں دھرنا مار کے بیٹھ گئے۔ ایک ''کام چھوڑ'' ہڑتال کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہ ایک مکمل ہڑتال تھی مگر اس میں کسی قسم کا اشتعال تھا نہ غم وغصہ۔ مالکان نے اپنے غنڈوں اور پولیس کو بھیجا تا کہ اسے توڑا جا سکے۔ مزدوروں نے انکار کر دیا حتیٰ کہ مزدور قیادت کی منت سماجت بھی بے کار گئی اور مزدور کام پر جانے کیلئے راضی نہیں ہوئے۔ مزدوروں کا دھرنا اگلے تین دن تک جاری رہا۔ 2 جنوری کو مل مالک مغیث اے شیخ کی بیٹی کی شادی تھی۔ مغیث جنرل ضیاء کا قریبی دوست تھا اور وہ اس کی بیٹی کی شادی میں شرکت کیلئے ملتان آیا اس وجہ سے صورتحال مزید تلخ ہو گئی۔ مزدوروں کو یہ بات پتہ چلی کہ مل مالک اپنی بیٹی کو جو جہیز دے رہا تھا وہ 13000 مزدوروں کو ملنے والے بونس کی مجموعی رقم سے دس گنا زیادہ مالیت کا تھا۔ دن کے وسط میں کام چھوڑ مزدور فیکٹری گیٹ کی طرف جانے لگے جہاں وہ اپنی گیٹ میٹنگ کیا کرتے تھے۔ اسی دوران ضیاء کے کانوں تک افواہ پہنچا دی گئی کہ مل مزدور شادی کی

تقریب پر ہلہ بولنے آرہے ہیں۔جس پر غصے اور حقارت سے بھرا جرنیل کھڑا ہو گیا اور اس نے حکم جاری کر دیا کہ مزدوروں کو سبق سکھا دیا جائے۔ مالکان کے پالتو غنڈے تو اسی حکم کے منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔ پولیس نے پہلے ہی تین دنوں سے مل کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ پیرا ملٹری فورسز بھی وہاں پہنچ گئیں اور پوزیشنیں سنبھال لی گئیں اور اس کے بعد قیامت ڈھا دی گئی۔

فورسز نے براہ راست گیٹ میٹنگ کرتے مزدوروں پر فائر کھول دیئے۔مزدوروں میں کھلبلی مچ گئی ۔گولیاں کھاتے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے' زخمی ہوتے' چیختے چلاتے ہوئے مزدوروں نے ادھر ادھر بھاگ کر پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ہر طرف سے تو گولیوں کی برسات کی جا رہی تھی۔خون ہی خون، چیخیں ہی چیخیں، وہ بھی محض اس جرم کی پاداش میں کہ یہ اپنا حق مانگ رہے تھے۔فائرنگ لگا تار کسی وقفے کے بغیر تین گھنٹوں تک کی جاتی رہی۔ چھ بجے شام جب دن ڈھل چکا تو ریاستی فورسز ایک مل کے نہتے مزدوروں پر فتح حاصل کر چکی تھیں۔ فیکٹری احاطے میں پڑے زخمیوں کو فورسز نے ہسپتال بھیجنے سے روک دیا۔ کسی نے کوئی کوشش کرنے کی ہمت کی تو پولیس نے اسے دھر لیا۔ درجنوں مزدور موقع پر جاں بحق ہو چکے تھے جبکہ ان گنت خون بہہ جانے سے مر گئے کیونکہ انہیں ہسپتال تک جانے سے روک دیا گیا تھا۔رات کی تاریکی میں فورسز کے ٹرکوں کو لایا گیا اور زخمی یا مردہ کی تمیز کیے بغیر جسموں کو ان میں ڈال دیا گیا۔ان میں سے کچھ کو فیکٹری کے بڑے اور وسیع و عریض گٹر میں ڈال دیا گیا جبکہ باقیوں کو قریبی دیہات بگا شیر میں کسی کفن دفن کے بغیر دفنا دیا گیا۔اس بے رحمانہ جبر و بربریت کے باوجود سینکڑوں مزدور اور طالب علم (راقم الحروف بھی ان میں شریک تھا) وہاں پہنچ گئے اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے یا ان کی زندگیاں بچانے کی ہر وہ کوشش کی جو ممکن ہو سکتی تھی۔ بعد میں کوشش کی گئی کہ گٹر میں سے لاشیں نکال کر کسی جگہ منتقل کر دی جائیں تا کہ ان کے عزیز و اقارب انہیں دفنا سکیں۔

اس بربریت کا شکار ہونے والوں کے بارے میں مختلف اندازے ہیں۔سائیکل سٹینڈ پر 80 سائیکلیں جن پر مزدور سوار ہو کر آتے جاتے تھے، سبھی اپنے سواروں کی دوبارہ سواری نہ بن سکیں۔مارشل لاء کے تلے دبے پریس نے 18 ہلاکتوں اور 25 زخمیوں کی خبر شائع کی جبکہ مزدوروں کا کہنا تھا کہ دو سو کے قریب مزدور جاں بحق ہوئے۔جبکہ ورکرز ایکشن کمیٹی جو اس ہڑتال کے دوران تشکیل پائی تھی، نے قرار دیا کہ فوجی آمریت کے اس قتل عام کے نتیجے میں 133 مزدور ہلاک جبکہ 400 مزدور زخمی ہوئے۔قاتلوں کے خلاف کسی قسم کا مقدمہ تک درج نہیں کیا گیا۔نہ تو مل مالک مغیث نہ ہی اس کے کسی

منیجر اور نہ ہی ان کے کسی پالتو غنڈے کے خلاف جنہوں نے ریاستی اداروں کے ساتھ مل کر یہ خونی کھیل کھیلا تھا۔اس کے بالکل برعکس ریاست نے ایکشن کمیٹی کے ارکان کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی اور الٹا ان کے خلاف مقدمہ درج کر دیا گیا یہاں تک کہ ان کے خلاف بھی جو اس بربریت کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ بچنے والے مزدور تفتیش کی زد میں آ گئے۔گرفتار کیے جانے والوں میں امیر علی،نور دین،مختار شاہ،محمد یوسف،محمد شریف اور محمد رمضان بھی شامل تھے۔اس بدترین وحشیانہ قتل عام کے باوجود مزدوروں نے جرات کے ساتھ احتجاج اور مظاہرے شروع کر دیئے،جس پر انتظامیہ کو گرفتار شدہ ایکشن کمیٹی کے مزدور وں کو رہا کرنا پڑ گیا۔ جبکہ 4 جنوری 1978ء کو ملتان کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے واقعے کی انکوائری کا اعلان کر دیا۔مزدور رہنماؤں نے مقامی مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں انکوائری سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہی انکوائری حقیقی ہو سکتی ہے جو مارشل لا سے ہٹ کر ہو گی انہوں نے فوجی حکومت کو قانونی ماننے سے انکار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ انکوائری فیکٹری گیٹ پر کی جائے اور وہ بھی مزدوروں کی طرف سے تجویز کردہ وکلا اور ججوں کے ذریعے کرائی جائے۔

اس اندوہناک واقعے کے علاوہ جن دیگر ملوں میں اس قسم کے واقعات رونما ہوئے ان میں پریمیر ٹیکسٹائل ملز لائل پور،ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ،رستم سہراب سائیکل فیکٹری شاہدرہ لاہور اور اے ڈی سی ورکشاپ کوئٹہ شامل ہیں۔اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اس سارے دور بربریت میں ہمیں مزدوروں کے ساتھ مسلسل بدترین واقعات ہوتے نظر آتے ہیں۔ضیائی بربریت نے جتنے شہید اور جتنے بہادر جنگجو پیدا کیے وہ کسی اور پاکستانی حکومت کو نصیب نہیں ہوئے۔اس بدترین عہد کے خلاف سب سے زندہ وتابندہ مزاحمت ہمیں 1983ء کی ایم آر ڈی کی تحریک کی شکل میں ملتی ہے جس کا زیادہ تر زور سندھ میں رہا۔

ایم آر ڈی اور سندھ

ضیاء کے خلاف بڑی اپوزیشن جماعتوں نے ایم آر ڈی،تحریک بحالی جمہوریت کے نام سے ایک اتحاد تشکیل دیا۔یہ اتحاد کئی چھوٹی دائیں اور بائیں بازو کی پارٹیوں،قوم پرستوں،یہاں تک کچھ چھوٹی اسلامی پارٹیوں کا ملغوبہ تھا۔پاکستان پیپلز پارٹی ہی اس اتحاد کی بڑی پارٹی تھی۔اس کا بڑا اور مرکزی مطالبہ و پروگرام ایک ہی تھا' سول حکمرانی اور آئین کی بحالی۔تاہم یہ تحریک الذوالفقار کی طرف سے طیارہ ہائی جیک کر لیے جانے کی وجہ سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔الذوالفقار ایک مسلح

تنظیم تھی جو مسلح جدوجہد کے ذریعے فوجی حکومت کا تختہ الٹنے کی آرزومند تھی (اس کی طیارہ اغوا کی کوشش بہرحال کامیاب ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں وہ پاکستان کی جیلوں میں قید 40 پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کے کارکنوں کو آزاد کرانے میں کامیاب رہی)۔ کابل ائیر پورٹ پر انہوں نے ایک فوجی افسر کو بھی مار ڈالا تاکہ اپنے مطالبات منوا سکیں۔ اس کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کا بڑا بیٹا اور ایک بائیں بازو کا لیڈر میر مرتضیٰ بھٹو کر رہا تھا۔ ان کی یہ خواہش اور کوشش تھی کہ مسلح جدوجہد کے ذریعے ایک بڑی عوامی تحریک کو ابھارا جائے جو انجام کار اس حکومت کا دھڑن تختہ کر دے۔ تاہم اس کامیاب ہائی جیکنگ کے اثرات کے نتیجے میں کوئی تحریک جنم نہ لے پائی۔

ضیاء نے اس کے بعد اپنے جبر واستبداد میں اور اضافہ کر دیا۔ 1983ء میں تحریک پھوٹ پڑی۔ یہ ایک بڑی اور وسیع تحریک تھی مگر اتحاد میں شامل دائین بازو کے لیڈروں کی غداری کی وجہ سے اسے زیادہ تر سندھ کے اندرون تک ہی محدود رکھ دیا گیا۔ اگر شہروں کو بھی اسی جوش وجذبے کے ساتھ اس تحریک کے ساتھ شامل اور شریک کیا جاتا تو ضیا آمریت کا بھی خاتمہ ممکن ہو جاتا اور وہ بھی انقلابی انجام کے ساتھ ہوتا۔ سندھ میں تنہا رہ جانے کی وجہ سے آمریت کو اسے بے رحمی سے کچلنے کا موقع میسر آ گیا۔ لیکن اپنی تنہائی اور شکست کے باوجود سندھ کے نوجوانوں، مزدوروں اور ہاریوں کی طرف سے آمریت کے خلاف چلائی جانے والی یہ انتہائی جراتمند اور مثالی تحریک بن کر ابھری۔ سندھ میں فوج کی طرف سے کیے جانے والے بے رحمانہ قتل عام کے باوجود سندھ میں چلنے والی یہ تحریک ضیائی آمریت کے گیارہ سالہ وحشیانہ اقتدار کے خلاف سب سے بڑی اور شدید ترین مزاحمت تھی۔ اس تحریک کے دوران 1200 افراد ہلاک جبکہ ہزاروں زخمی ہوئے تھے۔ انتہائی دور دراز چھوٹے اور پسماندہ ترین دیہی علاقوں میں تحریک کو کچلنے کیلئے فوجی گن شپ ہیلی کاپٹر استعمال کیے گئے۔ 20000 سے زیادہ افراد کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا جن میں سے کئی تو بے نظیر بھٹو کے پہلے اقتدار کے دنوں میں بھی جیلوں میں قید تھے۔ اگرچہ سندھ کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں چلنے والی یہ تحریک ضیا کا تختہ تو نہیں الٹ سکی مگر اس نے ریاست کو اس کی بنیادوں تک ہلا کے رکھ دیا۔ اس کے عالمی سطح پر اثرات مرتب ہوئے اور اس نے ضیائی آمریت کے ظلم واستبداد کو دنیا بھر میں عیاں کر دیا۔ یہ اسی تحریک کے بے پناہ دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ جنرل ضیا کو 1985ء میں عام الیکشن کرانے کا اعلان کرنا پڑ گیا۔ نیچے سے ابھرنے والی اس مزاحمت کی شدت نے حکومتی بالائی ڈھانچے کو شکستہ کر ڈالا تھا۔

ضیاء آمریت نے قرون وسطیٰ کے اسلامی قوانین مسلط کر کے انہیں اپنے جبر واستبداد کے لیے استعمال کیا اور انہیں سماج میں یوں نافذ کیا کہ ان کی وجہ سے عام انسانوں کی نجی زندگیوں سے وابستہ معاملات تہہ وبالا کر دیئے گئے۔ 80000 انسانوں کو سر عام کوڑے مارے گئے تا کہ عام لوگ خوف اور دہشت کا شکار ہو جائیں۔ عورتوں کے خلاف ظالمانہ امتیازی قوانین مسلط اور رائج کر دیئے گئے۔ ان میں بدنام زمانہ حدود آرڈیننس بھی شامل تھا۔ جس کے ذریعے متاثرہ عورت کو اپنے ساتھ زنا بالجبر کرنے والوں کو شناخت کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ ان قوانین کی روشنی میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں ''آدھا گواہ'' بنا دیا گیا۔ یہاں تک کہ عورتوں کو سنگسار کر دیئے جانے کا قانون بھی اسی آمریت نے نافذ کیا۔

طلبہ اور مزدور یونینوں پر پابندی لگا دی گئی۔ کسی بھی سیاسی سرگرمی یا مزاحمت کو ریاستی جبر کے ذریعے بے رحمی سے کچل دیا جاتا تھا۔ اس حکومت نے سب سے پہلا کام ان سب ملکیتوں کو بحال کرنے کا کیا جنہیں 1972/74ء کی بھٹو کی اصلاحات کے ذریعے قومی تحویل میں لے لیا گیا تھا۔ اس ضیائی عہد میں سرمایہ دار اور جاگیردار ایک دفعہ پھر اپنی پوری رعونت اور شان وشوکت کے ساتھ ابھرے۔ اپنی ساخت اور نوعیت میں ضیائی اقتدار دراصل رد انقلاب تھا جو 1968/69ء کے عوامی انقلاب کی حاصلات کو کچلنے اور انہیں ختم کرنے کیلئے سامنے آیا تھا۔ مگر اس بربریت کا سب سے اہم 'سب سے بڑا ہدیت کار و مددگار امریکی سامراج تھا۔ دسمبر 1979ء میں افغانستان پر روسی جارحیت کے بعد دنیا کے اس خطے میں پیدا ہو جانے والی جغرافیائی اور سیاسی صورتحال نے ضیاء کو سب سے زیادہ تقویت دی۔

جنرل ضیاء فوجی افسروں کی اس کور میں سے ایک تھا جس نے امریکہ کے اعلیٰ ترین عسکری ادارے فورٹ بریگ سے تربیت حاصل کی ہوئی تھی۔ وہ سجدے تو اپنے خدا کو کیا کرتا تھا مگر اس کا حقیقی آقا امریکہ ہی تھا جس کی غلامی واطاعت اس کا شعار بنی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ عمان (اردن) میں 1970ء میں 18000 فلسطینیوں کے قتل عام سے ہو جاتا ہے جس کی منصوبہ بندی خون کے پیاسے اسرائیلی اور امریکی ماہرین نے کی تھی۔ اس مشن کا مقصد امریکی ایجنٹ اردن کے شاہ حسین کے تحفظ کو یقینی بنانا تھا جسے عمان میں فلسطینیوں کی جدوجہد سے خطرات لاحق ہو چکے تھے۔ لیکن فلسطینیوں کے وحشیانہ قتل عام کا یہ مشن کسی اسرائیلی یا امریکی نے نہیں بلکہ ضیاء الحق نے کیا تھا جو ان دنوں بریگیڈیر کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ فلسطینی مسلمانوں کا یہ قتل عام ضیا کے اسلام کا نہیں بلکہ اس کی سامراج کی غلامی کا آئینہ دار تھا جو اس کے مذہبی عقیدے سے اتنی بلند و برتر تھی کہ اس نے فلسطینی مسلمانوں کو بے رحمی سے اور

بے دریغ قتل کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ''احیائے اسلام'' کی بیشتر تنظیمیں امریکہ کے ساتھ وابستہ تھیں۔

اپنی آمریت کیلئے درکار حکمرانی کے تقاضے پورے کرنے کیلئے ضیا نے اپنے ہم خیال اور قابل بھروسہ افسروں کو ''ضروری'' عہدوں پر متعین کر دیا۔ اگر کسی نے اس ہم خیالی سے گریز کیا تو اسے نکال دیا گیا۔ اپنے ہم خیال افسروں کو اس نے تحائف اور مراعات سے نوازنا شروع کر دیا اور یوں کروڑ پتی جرنیلوں کی ایک کھیپ پیدا کر دی جو ملک پر ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک حکمرانی کرتے رہے۔ ''ضیاء نے اسلام کو اپنے مذموم مقاصد کیلئے بری طرح استعمال کیا۔ ملکی دولت سے ٹیکسوں کی مد میں حاصل ہونے والی آمدنی کو زکوٰۃ کے نام پر، سیاسی مقاصد کیلئے بروئے کار لایا گیا۔ ان سبھی اقدامات کے ذریعے ملاؤں اور مذہبی جماعتوں کو خوش کیا گیا اور انہیں نوازا گیا۔ خاص طور پر جماعت اسلامی پر خصوصی کرم فرمائی کی گئی''۔(4) ضیاء نے اپنے ماتحت مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ اپنے اپنے متعلقہ علاقوں کے اندر ناظمین منتخب کرائیں جو لوگوں میں زکوٰۃ تقسیم کریں گے اور انہیں پنج وقتہ نمازیں بھی پڑھائیں گے۔

افغانستان

فوج کی ہائی کمان اور انٹیلی جنس ایجنسیوں خاص طور پر آئی ایس آئی (ISI) کی افغان جنگ میں سرگرم مداخلت نے انہیں امریکی سی آئی اے (CIA) کی طرف سے ملنے والی غیر ملکی امداد کے ساتھ نجی اور سرکاری سطح پر سعودی عرب سے ملنے والی رقوم کے ساتھ براہ راست اور بلاشرکت غیرے منسلک کر دیا۔ اس امداد کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک کے اندر پارٹیوں اور اتحادوں میں پھوٹ اور توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر دیا گیا جبکہ اپنی مرضی کے اتحاد اور قیادتیں بھی تشکیل دی گئیں۔ آئی ایس آئی (ISI) تب سے خارجہ پالیسی کا مستقل اور مسلسل حصہ بن گئی۔

''افغان جہاد کو فروغ دینے کی غرض سے اسلحہ اور سرمایہ ایک وبا کی طرح آیا جس نے اپنے ہی تباہ کن اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے۔ اس کی وجہ سے پاکستان میں منشیات کا استعمال انتہاؤں کو پہنچ گیا۔ منشیات کی سمگلنگ ایک بہت بڑی تجارتی سرگرمی بن گئی۔ یہاں تک کہ فوج بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکی اور اس کے نیشنل لاجسٹک سیل NLC کی گاڑیاں جب کراچی پورٹ سے اسلحہ لے کر شمال میں افغان

سرحد کی طرف روانہ ہوتیں تو بعض اوقات کچھ بدعنوان افسر وہاں سے ہیروئن بھی ساتھ لے آتے جسے بندرگاہ اور ائیر پورٹ تک پہنچا دیا جاتا تھا''۔(5)

افغانستان کے اندر روس کے ساتھ جنگ میں شدت آتے ہی مغرب، مشرق وسطی یہاں تک کہ چین سے اسلحے کی فراہمی شروع کر دی گئی جس سے ملک میں ایک نیا کلاشنکوف کلچر پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ خود آئی ایس آئی (ISI) بھی اسلحے کی اس تجارت کے ناجائز استعمال کے ذریعے بڑی رقم بنانے سے باز نہ رہی۔ مالیاتی اور سپلائی نیٹ ورک جب ایک بار قائم ہو گیا تو پاکستانی فوج کی بجائے آئی ایس آئی (ISI) نے اصولی طور پر افغان جنگ میں مداخلت کے امور سنبھال لیے۔ اس دوران سی آئی اے (CIA) اور آئی ایس آئی (ISI) کے مابین براہ راست تعاون اور خاص طور پر ڈائریکٹر سی آئی اے (CIA) ولیم کیسی اور آئی ایس آئی (CIA) کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمان کے درمیان تعلق بھی استوار ہو گیا۔ سی آئی اے (ISI) نے اس دوران اپنے پسندیدہ کمانڈروں کی خدمات بھی پیش کیں، اس میں عبدالحق شامل تھا جبکہ سعودیوں نے بھی ایسا کیا۔ اس کیلئے معاونت سعودی خیراتی اداروں سے لی گئی جن میں سے کئی ایک اداروں کو نوجوان اسامہ بن لادن چلا رہا تھا۔ سی آئی اے (CIA) نے خود بھی براہ راست عطیات دیئے خواہ رشوت کی شکل میں یا دوسرے طریقوں سے۔ برطانیہ اور فرانس بھی رشوت اور عطیات کے اس کھیل میں شریک ہوتے رہے اور تاجک کمانڈر احمد شاہ مسعود کی آشیرباد حاصل کرنے میں لگے رہے جو پشاور میں موجود ربانی کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔

جنوری 1981ء میں صدر ریگن کے چارج سنبھالتے ہی امریکہ نے پاکستان کیلئے امداد متعین کر دی۔ اگلے پانچ سالوں کیلئے 3.2 ارب ڈالرز مختص کر دیئے گئے۔

''ضیاء کی اچانک ہی کیفیت بدل گئی' اس کا لہجہ ہی بدل گیا۔ وہ ہوائی گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا اور کئی معاملات میں احکامات جاری کر رہا تھا۔ وہ جمہوریت کی بحالی جیسے الفاظ بھی ادا کرنے لگا''۔(6) سی آئی اے (CIA) کی معرفت در پردہ مالی مدد جاری وساری رہی۔ ضیاء کو خیال سوجھا کہ ایک ریفرنڈم کرا لیا جائے اور یوں اپنی حکومت کو قانونی بہروپ فراہم کر کے اقتدار کو طول دیا جا سکے۔'' ضیا کے اس خیال پر خود اس کے اپنے فوج کے ساتھی کمانڈروں نے اعتراض کیے۔ فارمیشن کمانڈروں کی ایک میٹنگ میں اسے کئی کمانڈروں نے بتایا کہ کئی افسروں کو عوامی حلقوں میں وردی میں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کیونکہ عوام فوجی آمریت اور اس کی طرف سے مسلط کردہ سخت اسلامی قوانین سے نالاں و

بیزار ہو چکے ہیں۔ایسے افسران میں سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر شامل ہیں جو مارشل لا کی طرف سے سرعام دی جانے والی سزاؤں پر عملدرآمد کراتے ہیں' جن میں عوام کے سامنے کوڑے مارنا بھی شامل ہے۔''۔(7) یکم دسمبر 1984ء کو ضیاء نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب میں اپنے ریفرنڈم منصوبے کا اعلان کیا اور بتایا کہ ''ہاں'' میں ووٹ کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اگلے پانچ سال کیلئے ملک کا صدر رہے گا۔لیکن ریفرنڈم میں جو سوال عوام کے سامنے لایا گیا وہ یہ نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا۔19 دسمبر کو پاکستان کے لوگوں کے سامنے مہارت مگر محتاط طریقے سے تیار کردہ ایک سوال پیش کیا گیا جس کا جواب ملنے پر مطلوبہ امیدوار کی کامیابی یقینی ہو جانی تھی۔سوال یوں تھا ''کیا آپ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی جانب سے کیے گئے اقدامات کی تائید کرتے ہیں جن کے ذریعے اس نے ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالتے ہوئے انہیں قرآن وسنت کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے؟''۔(8)

اس ریفرنڈم کیلئے ٹرن آؤٹ سرکاری اعداد وشمار کی کرشمہ سازی تھی۔مگر اس کے نتیجے میں ضیا ایک ایسا سویلین صدر منتخب ہو گیا جس نے اپنی فوجی وردی بھی نہیں اتاری۔ضیاء نے فوج کے عمومی روایتی فلاسفے کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مذہبی رجحانات وتعلیمات کو اس کی روزمرہ سرگرمیوں کا مرکز ومحور بنا دیا۔1976ء میں چیف آف آرمی سٹاف کا حلف اٹھانے کے فوری بعد ہی اس نے جناح کے مرتب کردہ فوج کے نعرے ''ایمان' اتحاد اور تنظیم'' کو بھی بدلتے ہوئے اسے ''ایمان' تقویٰ' جہاد فی سبیل اللہ'' کر دیا تھا۔

''رجمنٹوں کے مذہبی اساتذہ کے سٹیٹس میں اضافے کرنے کے علاوہ ضیا نے تبلیغی جماعت کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں تبلیغ کی اجازت دے دی۔1984ء تک تبلیغی جماعت والے باقاعدگی سے جمعہ کی نماز کا خطبہ دینے پی ایم اے (PMA) کاکول پہنچ جاتے تھے۔بعدازاں اس کے نئے کمانڈنٹ میجر جنرل آصف نواز نے تبلیغیوں کے اکیڈمی داخلے پر پابندی عائد کر دی اور کہا کہ یہ ملٹری اکیڈمی ہے کوئی مدرسہ نہیں۔میں بھی اس وقت اکیڈمی میں موجود تھا جب یہ سب ہوا''۔(9)

جماعت اسلامی نے فوج کے رنگ روپ کی بدلتی ہوئی صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھانے کا تہیہ کر لیا اور اپنے ارکان کو ہدایات جاری کر دیں کہ آئی ایس ایس بی (ISSB) کے امتحان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فوج میں شامل ہوا جائے۔

بے نظیر بھٹو

17 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء الحق اپنے سپیشل سکیورٹی طیارے سی 130 میں ہی بہاولپور میں مارا گیا اس سفر میں اس کے ساتھ اس کے کئی سینئر فوجی افسران بھی تھے۔ CJCS جنرل عبدالرحمان سمیت امریکی سفیر آرنلڈ رافیل اور امریکی دفاعی اتاشی بریگیڈیر ہربرٹ واٹسن بھی اس حادثے میں ہلاک ہونے والے 32 افراد میں شامل تھے۔ اس حادثے کی خبر ملتے ہی پاکستان بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کے جبر واستبداد کے مارے عوام نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے جشن منایا کیونکہ ان کی زندگی اور پاکستان کی تاریخ کا ایک بدترین سیاہ دور ختم ہوا تھا۔ اپنی طاقت کے عروج کے نشے میں بدمست ضیاء شاید پاگل پن کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ زمینی حقائق سے بے نیاز خود کو خدا کا کوئی خاص الخاص برگزیدہ بندہ سمجھنے لگا تھا۔ وہ اپنے آقا امریکیوں کو بھی چبھنے لگ گیا تھا اور پھر ضیا امریکیوں کے معاہدوں کو بھی تسلیم کرنے میں نخرہ کرنے لگا تھا ان میں افغان تنازعے سے متعلق جنیوا معاہدہ اور پاکستان کا نیوکلیر انرچمنٹ پروگرام شامل تھے۔ ضیاء ایک ایسا بوجھ بن چکا تھا جسے اب امریکی سر سے اتار پھینکنا چاہ رہے تھے۔ عوام اس سے نفرت کرتے تھے۔ سماج کی پسماندہ پرتوں میں اس کی اپنے لیے سماجی بنیادیں قائم کرنے کی کوشش بھی رائیگاں چلی گئی تھی۔ معیشت لرز رہی تھی جبکہ ملک فرقہ وارانہ خونریز فسادات، منشیات اور سماجی بے چینی کے ہاتھوں زبوں حال ہو چکا تھا۔

1968/69ء کے انقلاب میں سے ابھرنے والے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو کے استقبال کیلئے دس لاکھ سے زیادہ افراد لاہور کی سڑکوں پر امڈ آئے تھے۔ پھانسی پر جھول جانے کے بعد سے بھٹو ملک کے محروم لوگوں کی امیدوں کی علامت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ جدوجہد کا استعارہ بن گیا۔ پاکستان کی ریاست اور فوج نیچے سے عوام کی اس حمایت کا رستہ روکنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں بچا تھا کہ بے نظیر بھٹو کو اقتدار میں لایا جائے اور عوامی بے چینی کو سنبھالا دیا جائے۔

امریکیوں اور ان کے اسلام آباد میں براجمان ''دیسی'' ماہرین اس سلسلے میں اپنا ہوم ورک پہلے ہی مکمل کر چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو کو 1984ء میں رہا کر کے بیرون ملک روانہ کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں لندن اور واشنگٹن کا بھی ہاتھ تھا۔ لندن پہنچنے کے دو ہی دن بعد وہ واشنگٹن چلی گئی۔ وہاں اس کی امریکی کانگریس اور سینیٹ کے اراکین کے علاوہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے عہدیداروں کے ساتھ ملاقاتیں

ہوئیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں بے نظیر کا قریبی دوست مائیکل گلبرتھ بے نظیر کے اس سامراجی طاقت کے ساتھ سمجھوتہ کرانے کا ذریعہ بنا جو بھٹو کی پھانسی میں ملوث تھی اور جس کی بیٹی اب اس کی جانشین بننے جا رہی تھی وہ بھی ایسے ماحول میں جب عوام ایک بار پھر لاکھوں کی تعداد میں نظام بدلنے کی جستجو لیے سڑکوں پر امڈ آئے تھے۔ پارٹی قیادت اس حد تک آگے چلی گئی کہ 10 اپریل 1986ء کو استقبال کیلئے آنے والے جن کارکنوں نے امریکی جھنڈے جلائے تھے، انہیں ضیاء کا ایجنٹ قرار دے دیا گیا۔ یہ بات کوئی راز نہیں تھی کہ اسے کس کے حکم اور دباؤ پر واپس آنے دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ بڑی بڑی عوامی ریلیاں بھی نکالنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ضیا آمریت اندر سے گل سڑ چکی تھی۔ یہاں تک کہ بے نظیر کی واپسی سے بھی پہلے جنرل ضیا نے سونگھ لیا تھا کہ امریکی اس سے جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔ بے نظیر واشنگٹن میں موثر لابنگ کر رہی تھی اور اس نے ایک مضبوط اور طاقتور پشت پناہی بھی حاصل کر لی تھی۔ مغربی میڈیا میں اسے کافی پذیرائی میسر آ رہی تھی۔

طیارے کی تباہی اور اس میں اعلیٰ فوجی قیادت کی ہلاکت نے ریاست اور فوج دونوں کے اعتماد کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس کے بعد کسی حد تک طے شدہ الیکشن کے بعد بے نظیر پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم بن گئی۔ اس کے حامیوں نے سارے ملک میں خوشیاں منائیں اور سڑکوں پر گلیوں محلوں میں رقص کیے گئے۔ مگر خوشیاں منانے والوں کی اکثریت اس بات سے بے خبر تھی کہ صرف بیس مہینوں کے بعد ان کی یہ خوشیاں ماند پڑ جائیں گی اور غصے میں تبدیل ہو جائیں گی۔

حلف کی تاریخی تقریب کے موقع پر طویل القامت، بے نیاز آنکھوں والا امریکی سفیر شیشوں سے مزین لکڑی کے فرش کے ایک کمرے میں بیٹھا استقبال کی ساری کاروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے ہی وائسرائے پاکستان کے لقب سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے بے نظیر بھٹو کو چائے کی دعوت دی اور اسے آگاہ کیا کہ وہ وزیراعظم بنائی جا رہی ہے۔ کیا بے نظیر بھٹو اس سپر پاور پر اعتماد کر سکتی تھی جس کی مدد ضروری تھی تو مگر وہ ایک ایسی طاقت جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس کے باپ کی حکومت کی رخصتی یہاں تک کہ زندگی سے رخصتی کی بھی ذمہ دار تھی! جو بھی ہو اس نے اپنے حمایتیوں کو الیکشن مہم کے دوران امریکی جھنڈے جلانے سے بمشکل روکا۔

آئی ایس آئی (ISI) کا سربراہ حمید گل، بے نظیر کے خلاف چلائے جانے والی دائیں بازو کی پروپیگنڈہ مہم کا پس پردہ روح رواں تھا جس کے ذریعے بے نظیر کو مغرب کا دلدادہ ظاہر کرنے کیلئے پیرس

کے ایک نائٹ کلب کی اور اس کی والدہ کو شام کے لباس میں امریکہ کے صدر فورڈ کے ساتھ چہل قدمی کرتے وقت کی تصاویر جہازوں کے ذریعے پھینکوائی گئیں تا کہ انہیں اسلام دشمن ثابت کیا جا سکے۔

بے نظیر یہ اعلان کر رہی تھی کہ انتقام نہیں لیا جائے گا مگر اس کی یہ بات اس کی پارٹی کی اکثریت کی سوچ کے منافی تھی۔ ان میں سے کئی تو بدترین، ناقابل تلافی اور ناقابل یقین تشدد کا شکار ہوئے تھے۔ کئی ایسے تھے جنہیں سرعام کوڑے مارے گئے تھے۔ کئی وہ تھے جنہیں بجلی کے جھٹکے لگا لگا کر ناقابل علاج امراض کا شکار کر دیا گیا تھا۔ کئی وہ بھی تھے جو لاہور کے شاہی قلعے سمیت دوسرے ریاستی تعفن زدہ عقوبت خانوں میں سب کچھ گنوا آئے تھے۔

صرف چھ ماہ پہلے ہی فوجی افسروں کے ایک گروپ کو دن دہاڑے پنڈی کے گیریژن بازار میں پیٹا گیا جس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ فوجی وردی کس قدر ناپسند اور بے وقعت ہو چکی ہے۔

بے نظیر اس وقت کے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور صدر غلام اسحاق کی طرف سے پیش کیے جانے والے ایک وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے تصور کو قبول کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ پارٹی کے کچھ رہنماؤں نے اپوزیشن میں بیٹھنے کا مشورہ دیا لیکن پاکستان کی فوجی سرکشیوں کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ یہ لوگ نئے الیکشن بھی نہیں کرائیں گے۔ اس نے اسلم بیگ کے ساتھ ڈنر کیا، پھر حمید گل کے ساتھ مذاکرات کیے اور بعد میں امریکی سفیر کے ساتھ چائے پی۔ مغرب نے اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ بے نظیر کی تصویر ٹائمز جریدے کے سرورق پر شائع کی گئی اور معروف بورژوا جریدوں نے خبردار کرتے ہوئے اس کو اقتدار دینے کے حق میں اداریے تحریر کیے۔ بالآخر سندھ سے نئے غم و غصے کے ابھرنے اور اس کے نتیجے میں ملک ٹوٹنے کے اندیشے کو سامنے رکھتے ہوئے فوج بے نظیر کو اقتدار دینے پر تیار ہو گئی۔ لیکن ریاستی اداروں کو سب سے زیادہ خطرہ ایک بڑی عوامی تحریک کے پھوٹنے کا تھا۔ اسے اقتدار دینے میں تاخیر، اس سے مطلوبہ وعدوں کے حصول کی کوشش نے عوام پر یہ راز عیاں کر دیا کہ پاکستان میں حکمرانی مقبول عام ذرائع کی بدولت نہیں بلکہ ان طاقتور اداروں کے بل بوتے سے ہی ملتی ہے جو اس کیلئے فیصلہ کرتے ہیں۔

مگر بے نظیر کو اس کے والد کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹ دی گئی۔ اس نے امریکہ کو دوبارہ یقین دہانی کرائی کہ خارجہ پالیسی تبدیل نہیں کی جائے گی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگلے تین سال تک جنرل بیگ ہی فوج کا سربراہ رہے گا، حمید گل آئی ایس آئی (ISI) کا چیف جبکہ صاحبزادہ یعقوب وزیر خارجہ رہے

گا۔وزیر دفاع کا انتخاب فوج کی صوابدید پر چھوڑا گیا جسے اس نے خالی چھوڑے رکھا۔جبکہ دفاعی بجٹ کیلئے من مانگی رقم کی فراہمی کا بھی وعدہ کیا گیا۔تمام تر دعووں کے باوجود اس نے فوجیوں کو زمینیں اور وظائف دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا جبکہ ریٹائرمنٹ کے بعد پبلک سیکٹر کارپوریشنوں میں ان کو اعلیٰ ملازمتوں کی فراہمی بھی جاری رہی۔

ہر کوئی چاہ رہا تھا کہ کچھ کر دکھایا جائے، کچھ ہو۔ہر روز اسے ملازمتوں کیلئے 60000 درخواستیں مل رہی تھیں۔سیاسی جلاوطنی کر لینے والے واپس لوٹ رہے تھے۔نصرت بھٹو اس کی والدہ، اس کے بھائی میر مرتضیٰ کی واپسی کی آرزومند تھی جو ان دنوں مصر میں تھا مگر وہ یہاں حکومت کو مقدمات میں مطلوب تھا۔الیکشن میں صوبائی نتائج تباہ کن تھے۔سب سے بڑے صوبے پنجاب میں بے نظیر حکومت نہیں بنا سکی تھی۔اس میں نواز شریف کی حکومت بن چکی تھی جو ضیاء کا پالتو پیدا کردہ تھا اور جس نے اس حیثیت کیلئے کوئی جدوجہد نہیں کی تھی۔

''1988ء الیکشن کے مشکوک نتائج، جن میں کوئی بڑی پارٹی اکثریت نہیں لے سکی تھی، سے واضح ہو گیا کہ آزاد منتخب ہونے والوں کی لاٹری نکل آئی ہے اور ان کی قیمت بازار میں بڑھ چکی ہے۔جن کے الیکشن لڑنے پر ویسے بھی 100000 پونڈ خرچ آ چکا تھا''۔(10) بے نظیر نے طبقاتی مصالحت کی پالیسیاں اپناتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کی جو وہ سوشل ڈیموکریسی کے دائیں بازو کے مکتب سے، برطانیہ کے ڈیوڈ اوون وغیرہ اور امریکہ کے ڈیموکریٹک سینیٹروں سے اپنی جلاوطنی کے دوران سیکھ کر آئی تھی جبکہ وائٹ ہال لندن اور امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ اس کی بحثیں بھی ہو چکی تھیں۔اپنے پارٹی رہنماؤں کی میٹنگ میں اس نے زور دے کر کہا کہ ''ہمیں جیتنے والے گھوڑے چاہییں، ہمیں جیت کو یقینی بنانا ہے''۔گیارہ سال سے زیادہ جمہوریت کیلئے شاندار جدوجہد کرنے والوں سے کہا گیا کہ وہ پارٹی میں نئے شامل ہونے والے بڑے نام و مرتبے والوں کیلئے قربانی دیں تاکہ ٹکٹ ان کو دیئے جا سکیں۔ان بڑے نام و مرتبے والوں میں وہ بھی تھے جو ضیا حکومت میں شامل رہے تھے۔''یوسف رضا گیلانی جو آج وزیراعظم ہے، بھی انہی میں سے ایک تھا جو ضیا کا وزیر رہا تھا۔ماضی کو یکسر فراموش کر دیا گیا تاکہ اقتدار کا حصول یقینی بنایا جا سکے۔ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب کمیٹی نے رجعتی جماعت اسلامی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی، یعنی اس جماعت کے ساتھ جس نے پارٹی کے ساتھ ہمیشہ بدترین دشمنی کی اور جس نے بھٹو کی پھانسی پر مٹھائیاں تقسیم کی تھیں''۔(11) پارٹی کی سینئر قیادت اس پر نالاں ہوئی مگر یہ خفگی کچھ دیر تک

قائم رہی۔ جہانگیر بدر نے لاہور میں ایک شام یہ بات کہی کہ ''میرا نہیں خیال کہ اس قیمت پر حکومت کی کیا اہمیت اور قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم ہم کس کی نمائندگی کر رہے ہیں''۔ اور بات بھی درست تھی وہ بھٹو کے نام پر ووٹ دینے والوں کو کس منہ سے جواب دے سکتے تھے کہ یہ وہی پارٹی ہے جو غریب اور محروم طبقات کی نمائندگی کی دعویدار ہے۔

''یہ صرف پارٹی کے پرانے وفادار ہی نہیں تھے جو نظر انداز کیے جا رہے تھے بلکہ پالیسیاں بھی تبدیل کی جا رہی تھیں۔ مارکسی اصولوں کی بنیادوں پر قائم ہونے والی پارٹی نے گلی کے سوشلزم کو ایک طرف رکھتے ہوئے آزاد منڈی کی معیشت اور تھیچر کی نجکاری کی پالیسی کو اختیار کر لیا۔ بھٹو زندہ ہوتا تو وہ پہچان بھی نہ پاتا کہ کیا یہ اسی کی ہی پارٹی ہے''۔(12) کچھ ہی دنوں پہلے ریلیوں اور مظاہروں میں امریکی جھنڈے جلانے والے پارٹی کارکنوں کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ ملک کے سب سے بڑے خیر خواہ کے طور پر اس کی تعریف و توصیف سنیں۔ ایک طرف لوگوں کو تبدیلی کی امید دلائی جا رہی تھی تو دوسری طرف فوج، سول سروسز، تاجر برادری اور اہم مغربی اتحادیوں کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ اگر پارٹی جیت گئی تو صورتحال کو جوں کا توں رکھا جائے گا۔

بے نظیر بھٹو کی رخصتی

بے نظیر جب وزیر اعظم بن گئی تو وہ جہاں بھی جاتی اسے عوام گھیر لیتے اور اس سے اپنے مسائل، اپنے دکھڑے بیان کرتے اور مطالبہ کرتے تھے کہ ان کی محرومیوں کا ازالہ کیا جائے، وہ اسے مارشل لا کے جبر و استبداد میں خود پر بیتے جگر سوز واقعات کا واسطہ دے کر اپنے لیے کچھ مانگنا شروع کر دیتے تھے۔ اسلام آباد سیکرٹریٹ کے باہر روزانہ سرخ، سیاہ اور سبز رنگ کے جھنڈے اٹھائے لوگوں کا ہجوم پہنچ جاتا اور وہ اپنے ''عوامی وزیروں'' سے ملنے کا مطالبہ کرتے۔ ایک طرف بالا طبقات کے ساتھ سماجی اخراجات میں کٹوتی کے وعدے اور دوسری طرف عوام کے ساتھ کیے گئے بہتری کے وعدوں کا دباؤ تھا۔ بے نظیر بھٹو نے پاکستان کی سب سے بڑی کابینہ تشکیل دی۔ جس میں 70 سے زیادہ وزیر مشیر شامل تھے۔

6 اگست 1990ء کو صدر اسحاق نے بدعنوانی اور بدانتظامی کے الزامات لگاتے ہوئے بے نظیر حکومت کو برطرف کر دیا۔ ریاست عوامی امنگوں کو کچلنے، تحریک کا گلہ گھونٹنے اور عوامی اضطراب کے

دھارے کوایک عوامی حکومت کے ذریعے کمزور کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ چنانچہ بے نظیر کو آرام سے فارغ کر دیا گیا۔

خاکی وردی والوں نے ایک نیا زندہ مظلوم پیدا کیا تھا، بے نظیر بھٹو اس کردار کو بہترین طریقے سے نبھا رہی تھی۔ پاکستان کے امریکی پشت پناہ ششدر ہو کر ایک طرف لگ کے بیٹھ گئے منصوبہ اس طرح نہیں سوچا اور طے کیا گیا تھا۔ بے نظیر حکومت کی کمر توڑ کے رکھ دی گئی تھی۔ اس نے امریکی سفارتکاروں اور اپوزیشن کے ساتھ دھڑا دھڑ میٹنگیں شروع کر دیں۔ 1989ء کے آخر میں بھارت کے ایک دورے کے دوران امریکی سفیر رابرٹ اوکلے نے اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کو بتا دیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت حکومت کی تبدیلی کی توقع رکھے۔

پاکستان میں بے نظیر حکومت قائم ہونے پر جو خوشی اور جشن منایا گیا وہ جلد ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ تاریخ میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حکمران اتنی جلدی اپنی حمایت کھو دے اور عوام کی خوشی کو ایک المیے میں بدل کے رکھ دے۔ مگر اپنے پیشروؤں کی مانند بے نظیر بھی میکاؤلی کے اس اصول پر چل نکلی کہ ''سیاست کا پہلا اصول اقتدار میں رہنا ہے''۔

بدعنوانی جو ہمیشہ سے ہی پاکستان کی سیاست کا نمایاں حاوی عنصر چلی آ رہی ہے، جمہوریت کی بحالی کے بعد اس کی شدت اور وسعت میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اقتدار سے اتنا لمبا عرصہ دور رہنے کے بعد بے نظیر کے کئی ساتھیوں نے سوچا کہ موقع میسر آ گیا ہے کہ کچھ دولت ہی کما لی جائے۔ چنانچہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کیلئے ٹھیکوں کی مد میں بڑی بھاری رقمیں وصول کی گئیں۔ ضیا دور میں نافذ کیے گئے ظالمانہ حدود قوانین کے خاتمے کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا جن کے تحت زنا کا شکار ہونے والی خواتین جیلوں میں ڈال دی جاتی تھیں اور اس وقت بھی تین ہزار کے قریب عورتیں ''حدود'' کے جرم میں اپنے معصوم بچوں سمیت جیلوں میں قید تھیں۔ اسی طرح حکومت قرون وسطیٰ سے چلے آ رہے ''جبری مزدوری'' کے کالے قانون کے خلاف بھی کوئی قانونی دستاویز تیار کرنے میں ناکام رہی۔ عوام جنہوں نے بے نظیر اقتدار کو ممکن بنایا تھا، کے مفادات کو توہین آمیز انداز میں نظر انداز کر دیا گیا تھا تاکہ پارٹی کے ارکان اسمبلی ملا، جاگیردار، سرمایہ دار اور سامراجیوں کی خوشنودی کو برقرار رکھا جائے۔

اشرافیہ

نواز شریف جنرل ضیاء کے متعین کردہ گورنر پنجاب سابق آئی ایس آئی (ISI) چیف جنرل غلام جیلانی کا حسن انتخاب اور نور نظر تھا۔ پہلے اسے پنجاب کا وزیر خزانہ اور بعد میں وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ نواز شریف کا باپ میاں شریف ایک اوسط درجے کے تاجر گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس نے بعد میں، پاکستان کے قیام کے فوراً بعد رائج ہو جانے والی مخصوص تاجرانہ حکمت عملی کے ذریعے، سول اور فوجی افسر شاہی کی ملی بھگت اور آشیر باد سے ترقی کرتے ہوئے اپنی ایک صنعتی سلطنت قائم کر لی تھی۔ بھٹو سے جان چھڑا لینے کے بعد ضیاء نے ایسے ہی چھوٹے تاجروں اور صنعتکاروں کے ساتھ اپنی سماجی بنیادیں استوار کی تھیں اور ان کو بھٹو دور میں قومیائی کی جانے والی ہر چیز واپس کر دی تھی۔ پیٹی بورژوازی کو نواز نے اور اس سے سماجی بندھن جوڑنے کی یہ ضیائی پالیسی اسکی طرف سے کی جانے والی اسلامائزیشن کیلئے بھی مددگار ثابت ہوئی اور سرمایہ داری کے فروغ کیلئے بھی۔ ضیاء آمریت کے مسلط ہونے کے فوری بعد، میاں شریف ان پہلے خوش نصیبوں میں سے ایک تھا جنہیں قومیائے گئے اثاثے واپس کیے گئے۔ چنانچہ ضیاء کا ممنون احسان، میاں شریف اس کا دل و جان سے حمایتی بھی بن گیا اور اس نے کوشش کی کہ اس کے کاروبار کو مزید ترقی کے مواقع بھی فراہم کیے جائیں۔ میاں شریف نے پنجاب کے نئے گورنر جنرل جیلانی کو اپنے کاروبار میں حصہ دار بننے کی پیشکش کی۔ فوج کے دیگر سینئر افسروں کی طرح کاروباری امور میں ملوث ہونے کا شوق جنرل جیلانی کو بھی تھا۔ ضیا دور میں فوجی افسروں کی سرمائے میں دلچسپی اور مداخلت بہت بڑھ چکی تھی۔ جنرل جیلانی کو جس طرح سے اور جیسی پیشکش کی گئی وہ تو اس کی توقعات سے بھی بہت بڑھ کر تھی۔ چنانچہ اس نے بھی بزرگ میاں شریف کو جواب میں خیر سگالی کے جذبے کے تحت نوازتے ہوئے اس کے ایک بیٹے کو سیاست اور اقتدار میں لانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ یہ کہانی آگے بڑھی اور میاں شریف کا وہ بیٹا جو کسی بڑی کاروباری سرگرمی کا حصہ نہیں تھا اور سیاست کرنے کے لیے فارغ بھی تھا، اسے سیاست میں لے آیا گیا، یہ نواز شریف تھا۔

جنرل جیلانی کو یہ انتخاب پسند آیا کیونکہ وہ ابھی نوخیز اور خام تھا جسے جو بھی سیاسی نظریہ دیا جاتا یہ اس کیلئے مناسب و موزوں تھا اور مارشلائی سیاست کے لیے بھی بہتر تھا جس کیلئے کسی قسم کی ذہنی مستعدی، چستی چالاکی کا یا تخلیقی ہونا ضروری نہیں تھا۔ نواز شریف میں یہ خوبی تھی کہ وہ ان سب خوبیوں

سے پاک تھا۔ سرمایہ، میڈیا، ریاستی سرپرستی یہ سب اسے ضیا کا جانشین بنانے کیلئے کافی بھی تھا اور حاضر بھی۔ انٹیلی جنس اور دیگر اداروں کو چلانے والے فوجی دماغوں کے تانے بانے اس طرح سے تشکیل دیئے جاتے ہیں کہ انہیں باشعور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل انسان کا چناؤ کسی طور وارے نہیں کھاتا۔ انہیں ایک مخصوص اور محدود ذہنوں کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ ان اداروں کی پالیسیاں ترتیب دینے والے اہل دانش اور ماہرین خود ایسے دماغوں کے حامل ہیں جو منطقی اثباتیت (Logical Positivism) اور عملیت پسندی کے فلسفے کے پیروکار ہوتے ہیں۔ یہ فوجی ذہنیت کو عاجزی وانکساری کا مرقع بنایا جاتا ہے۔ ڈسپلن کے خوف اور عاجزی کے ذریعے ان کی نفسیات مرتب کر کے انہیں زیر اثر رکھا جاتا ہے۔ فوج کے سارے اندرونی ڈھانچے انہی خطوط پر ترتیب اور تشکیل دیئے جاتے ہیں۔

بہر صورت فوج کوئی جمہوری ادارہ تو نہیں ہوتی۔ ایک بورژوا فوجی ڈھانچے میں کسی سطح پر بھی معمولی نوعیت کی جمہوریت کا تصور بھی ممکن نہیں ہوسکتا۔ سینئر کمانڈر کسی طور کسی بھی حالت میں اپنے جونیئر کمانڈروں سے صلاح مشورہ نہیں کیا کرتا۔ فوجی آپریشنوں میں حکم حتمی ہوتا ہے اور کسی صورت اسکی جوابدہی نہیں ہوا کرتی۔ سبھی عسکری ادارے، جن میں برطانیہ کا سینڈ ہرسٹ اور امریکہ کا فورٹ بریگ بھی شامل ہے، اپنے اپنے نصابوں میں اسی فلسفے کے تحت دنیا بھر سے آئے اپنے ''شاگردوں'' کی تعلیم وتربیت کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی اسی بنیادی تعلیم وتربیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اسی نوع کے سیاستدان اپنے اغراض ومقاصد کیلئے پسند کرتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کی بے نظیر حکومت کو کنٹرول کرنے کی غرض سے فوج کی ہائی کمان اور آئی ایس آئی نے حمید گل کو ملک کے سب سے بڑے اور معاشی طور پر مستحکم صوبے پنجاب کی ذمہ دار سونپی۔ حمید گل لاہور پہنچا جہاں اس نے اسلامی جمہوری اتحاد کو تشکیل دیا۔ جس کی سرکردہ قیادت میں جنرل ضیاء کا لاڈلا نوجوان نواز شریف بھی تھا۔ رپورٹوں کے مطابق اس سارے سلسلے کو خفیہ رکھنے کیلئے جو طریقہ استعمال کیا گیا اس کے تحت حمید گل اور حسین حقانی کی ملاقاتیں کرائی گئیں جو اس وقت ''فار ایسٹ اکنامک ریویو'' کا سابق نمائندہ تھا اور جو بعد میں نواز شریف کا مشیر اور پھر اس کا سرکاری میڈیا ایڈوائزر بن گیا۔ جس نے بے نظیر بھٹو کے خلاف کردار کشی کی غلیظ پروپیگنڈہ مہم بھی منظم کی تھی۔ بعد میں یہی حسین حقانی بے نظیر کا خیر خواہ بن گیا اور اسے سری لنکا میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔ کچھ مبصرین کے مطابق آئی جے آئی کی تشکیل اور بعد میں نواز شریف کی سرگرمیوں کا ذمہ دار حسین حقانی ہی تھا جو ان دنوں پیپلز پارٹی حکومت کی طرف سے امریکہ میں

سفیر بنادیا گیا ہے۔ اسلامی جمہوری اتحاد کی مجوزہ سربراہی پیپلز پارٹی سے گئے ہوئے مصطفیٰ جتوئی کے حصے میں آئی، جو بے نظیر کے انکلو (Uncles) میں سے ایک تھا اور جو اس کے والد بھٹو کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ آئی ایس آئی کی اس کاوش کا مقصد بے نظیر بھٹو کو اس کی جلاوطنی سے واپسی پر پیپلز پارٹی کو پنجاب میں جو اس کا مضبوط گڑھ تھا، سخت وقت دینا تھا۔'' آئی ایس آئی چیف اور اس کے ڈپٹی میجر امتیاز احمد نے مبینہ طور پر آئی جے آئی کو ان سخت خطرات سے متنبہ کیا اور ڈرایا کہ بے نظیر بھٹو ایٹمی پروگرام کو رول بیک کردے گی یہی نہیں بلکہ کشمیر میں جاری جہاد کے منصوبے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی''۔(13)

حقانی حمید گل کے امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد کے ساتھ مذاکرات کا تو ذکر کرتا ہے کہ جس میں اس نے قاضی کو پیپلز پارٹی کے خلاف اتحاد میں شامل ہونے کا کہا مگر وہ اس عرصے میں اپنے کردار کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔ 16 نومبر 1988ء کو ہونے والے الیکشن میں ان سازشوں اور خود اپنی سیاسی و نظریاتی مصالحت و مفاہمت کی وجہ سے بے نظیر کو فتح تو مل گئی مگر حقیقی مینڈیٹ نہیں مل سکا۔ لیکن 1990ء کے الیکشن میں، بے نظیر کے نکال دیئے جانے کے بعد حکمرانوں اور ریاستی انتظامیہ کے پاس ایک متبادل موجود تھا۔ یہ دائیں بازو کا اسلامی جمہوری اتحاد تھا جس کی قیادت نواز شریف بلکہ خود ریاست کر رہی تھی۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی کہ اتحاد کے ہمدرد نگران وزیراعظم اور کئی وزیروں کی موجودگی میں یہ اتحاد قومی اسمبلی کی 216 میں سے 105 سیٹوں سمیت چاروں صوبائی اسمبلیوں میں اپنی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جبکہ پاکستان ڈیموکریٹک الائنس جس کا پیپلز پارٹی حصہ تھی صرف 45 سیٹیں لے سکا اور اسمبلی میں دوسرا بڑا گروپ بن کر سامنے آیا۔ بے نظیر اپوزیشن لیڈر منتخب ہوگئی۔ بے نظیر کے الیکشن کے بارے میں بے قاعدگیوں کے الزامات کے باوجود امریکی کانگریس کے فنڈز سے قائم ہونے والے ڈیموکریٹک انسٹیٹیوٹ فار انٹرنیشنل افیرز نے ان انتخابات کے شفاف ہونے پر مہر ثبت کردی۔

جتوئی سے جو کام لیا جانا تھا وہ لے لیا گیا تھا اور اب وہ مستقل وزیراعظم بننے سے قاصر تھا۔ ویسے بھی ایڈمرل سروہی کے بقول ''جے سی ایس سی (پاک فوج کے سربراہ) کا جہاں تک تعلق تھا وہ تو پہلے ہی نواز شریف کو وزیراعظم کیلئے پسند کر چکا تھا۔ یہ ملک کیلئے انتہائی خوش کن اور خوش قسمتی کی بات تھی کہ صدر، وزیراعظم اور مسلح افواج کے مابین اس قدر ہم آہنگی تھی''۔(14) مگر آنے والے ڈھائی سال یہ بتاتے ہیں

کہ ایڈمرل سروہی کی سیاسی بصیرت کس قدر معمولی نوعیت کی تھی۔

نواز شریف اپنی فتح کے نشے میں سرشار اسلام آباد براجمان ہوگیا، پنجاب کی ذمہ داری اس کے چھوٹے سرگرم بھائی شہباز کے پاس تھی جبکہ پیپلز پارٹی بھی کچھ وقت کیلئے کھڈے لائن لگ چکی تھی۔ وہ پہلا تاجر پیشہ چیف ایگزیکٹو تھا۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ یہ سب عوام کے ووٹوں کی مرضی سے ہوا ہے اور انہوں نے ہی اس مینڈیٹ سے اسے نوازا ہے چنانچہ اسے اس بات کی اجازت مل گئی ہے کہ وہ پاکستان کی معیشت اور سیاست کو بدل کے رکھ دے۔ جلد ہی اس نے نجکاری کی ایک مہم شروع کر دی اور یوں وہ تاجروں کی توجہ اور ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا خاندان بھٹو کی نیشنلائزیشن کا ڈسا ہوا تھا چنانچہ اس نے تہیہ کر لیا ہوا تھا کہ وہ اپنے اثاثوں کو نہ صرف ترقی دے گا بلکہ پاکستان کی اس پٹی بورژوا کلاس کو بھی نوازے گا جس نے 1990ء کے الیکشن میں اس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اقتدار میں رہتے ہوئے وہ پاکستان کی غریب عوام کیلئے کچھ نہیں کر سکتا۔ سرمایہ دارانہ طرز معیشت میں محروم اور کچلے ہوئے طبقات کی فلاح و بہبود کیلئے سماجی و معاشی اصلاحات ناممکن العمل ہوتی ہیں۔ مالیاتی بحران اور معاشی ابتری کسی طور اس کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ اس نے ان سوشل ڈیموکریٹ اور آزاد خیال لیڈروں کی طرح مغربی طرز کی نقالی کرنے کی بجائے جو ایسا کرتے ہوئے عوام کا اور بھی ستیاناس کر دیا کرتے ہیں، مغل شہنشاہی انداز میں خاص طور پر شاہجہان کی طرز پر بڑے عظیم و ضخیم منصوبوں پر عملدرآمد کی ٹھان لی۔

اس نے لاہور اسلام آباد کے درمیان ہائی وے، کراچی اور لاہور کے عظیم الشان ہوائی اڈوں کی تعمیر سمیت کئی بڑے منصوبوں کا اعلان کر دیا وہ بھی ایک ایسے ملک میں جہاں کے لوگوں کی بھاری اکثریت غذا، علاج، تعلیم، پینے کے صاف پانی اور نکاسی آب کی بنیادی ضرورتوں کو ترستی چلی آ رہی ہے۔ وہ ایشیائی ٹائیگروں سے شدید متاثر تھا اور اکثر وہ پاکستان کو سنگاپور، تائیوان یا جنوبی کوریا بنانے کے اعلان کیا کرتا تھا۔ اس نے ڈائیو سمیت کئی مشرقی ایشیائی ملٹی نیشنلز اور خلیجی ملکوں کے شیخوں کی کمپنیوں کے ساتھ معاہدے کیے اور انہیں ان منصوبوں کے ٹھیکوں سے نوازا۔ مگر یہ سب کرتے وقت وہ ایک چیز کبھی نہیں بھولا کہ ان سبھی منصوبوں سے اسے اپنے خاندان کی قسمت اور دولت دونوں کو فروغ دینا ہے۔ اس کے ایک انتہائی قریبی دوست نے اپنا نام نہ ظاہر کرنے کی درخواست کرتے ہوئے مصنف کو ایک واقعے کے بارے میں بتایا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اثاثوں میں اضافے کیلئے نواز شریف دولت اور

منافعوں کیلئے کتنا بے چین و بیتاب ہوتا تھا۔موٹروے منصوبہ 1992ء میں شروع ہوا تھا جبکہ 1993ء میں اس کی حکومت ہی ختم کر دی گئی تھی۔26 نومبر 1997ء کونواز شریف نے لاہوراسلام آباد موٹروے منصوبے کا افتتاح کیا جو جنوبی ایشیا میں تکنیکی اعتبار سے ایک جدید ترین منصوبہ ہے۔افتتاح کے بعد وہ لاہور کیلئے روانہ ہوا، جہاں اس نے اپنے رائیونڈ فارم میں خاص مہمانوں کیلئے انتہائی پرتکلف ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔اس محفل میں ایک مسلم لیگی رہنما نے مے نوشی کے بعد جرات کرتے ہوئے نواز شریف کے قریب ہوکر اسے بتایا کہ اس نے تو صرف 300 میل لمبی سڑک تعمیر کی ہے جس کا اتنا جشن منایا جارہا ہے جبکہ آج سے ایک ہزار سال پہلے شیر شاہ سوری نے 2000 میل لمبی جی ٹی روڈ تعمیر کرائی تھی۔لہٰذا جشن کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔نواز شریف نے اس کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا ''اچھا اس نے اتنی بڑی سڑک بنوائی۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس نے مال بھی اتنا ہی بڑا بنایا ہوگا''۔

نواز شریف کے اقتدار میں بدعنوانی کو پہلے سے بھی کہیں بڑھ کر مزید فروغ ملا جبکہ معیشت کا بحران بھی شدید تر ہو چکا تھا جس کی وجہ سے حکمران طبقات صدر، فوج اور وزیر اعظم ہاؤس آپس میں تقسیم اور باہم دست وگریباں ہو چکے تھے۔دائیں بازو کے سابقہ بیوروکریٹ صدر اسحاق خان جس نے بیشتر فوجی وغیر فوجی حکومتوں کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا ہوا تھا، نے نواز شریف کو چلتا کر دیا۔مگر جاتے وقت بھی نواز شریف اپنے ابا کا سبق نہیں بھولا تھا کہ کسی بھی بیوروکریٹ یا جج کو اس وقت تک رخصت نہ کرو جب تک کہ اس کی جیب بھری ہوئی نہ ہو۔

نواز شریف نے بزرگوں کی اس نصیحت کو عدلیہ پر آزمایا۔سپریم کورٹ کے سینئر ججوں کے ایک پینل نے 26 مئی 1993ء کو اس کی حکومت بحال کر دی۔مگر ریاست کے ستونوں کا باہمی جھگڑا ختم نہیں ہوسکا جسے ختم کرنے کیلئے آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ نے صدر اسحاق اور وزیر اعظم نواز شریف دونوں سے 18 جولائی 1993ء کو استعفیٰ دلوا دیا۔

بے نظیر کی واپسی

ایک عبوری نگران حکومت تشکیل دی گئی۔24 اور 27 اکتوبر کو نئے الیکشن کرائے گئے جس میں بے نظیر کو معمولی اکثریت کے ساتھ کامیابی ہوئی جبکہ نواز شریف نے نگرانوں پر بے نظیر کی حمایت کا الزام عائد کیا کہ سرکاری قرضوں کے نادہندگان کی فہرستیں شائع کر کے بے نظیر کو حمایت دی گئی۔ریاست کی

اندرونی کمزوری اور خوف نے ایک بار پھر واشنگٹن اور اسلام آباد کے حکمران طبقات کو مجبور کر دیا کہ دوبارہ بے نظیر کو لا کر عوام کے کسی ممکنہ ابھار کے خطرے سے نمٹا اور نظام کو بچایا جا سکے۔ اس بار وزیر اعظم بے نظیر اپنے دیرینہ و معتبر ساتھی فاروق لغاری کو صدر پاکستان کے طور پر سامنے لے آئی۔

وہ جنوبی پنجاب کا ایک مکروہ جاگیردار تھا جس کے اپنے عقوبت خانے تھے اور جہاں کوئی بھی ان کی خدائی کو چیلنج کرنے کی جرات کرتا تو اس پر صعوبتوں کے پہاڑ توڑ دیئے جاتے تھے۔ اس کے ریاست اور فوج کے اندر مراسم کی وجہ سے اس کے علاقے میں ریاست کی عملداری نہ ہونے کے برابر تھی۔ لغاری ذوالفقار علی بھٹو کا بھی وزیر رہا تھا۔ جب 1977ء میں بھٹو کا فوج نے تختہ الٹا تھا تو اس کے بعد لغاری پہلا جاگیردار تھا جس نے بھٹو دور کی زرعی اصلاحات کے خلاف درخواست دائر کر کے عدالتی حکم سے اپنی زمینوں کا بڑا حصہ ضیا دور میں واپس لے لیا تھا۔ فاروق لغاری کے صدر بننے پر بے نظیر خوشی میں جیسے چاند پر پہنچ گئی تھی۔ اس وقت مارکسسٹوں نے اپنے رسالے ''طبقاتی جدوجہد'' میں واضح تناظر لکھا تھا کہ یہی فاروق لغاری ہی پارٹی کی حکومت کو چلتا کرے گا اور وہ بھی بدترین انداز میں اور یہ بہت جلد درست ثابت ہو گیا۔

فاروق لغاری کے علاقے میں نہ صرف الیکشنوں بلکہ اس علاقے میں جاگیردارانہ طبقاتی جبر کے خلاف کھلی جدوجہد کی واحد مضبوط اور دلیرانہ آواز کامریڈ رؤف خان لُنڈ کی ہے۔ لغاری کے خلاف الیکشن میں مقابلہ کرنے کے علاوہ بھی کامریڈ رؤف سندھ و بلوچستان کی سرحدی پٹی پر واقع اس علاقے میں جاگیردار اشرافیہ اور ان کی سرپرست ریاست کے استحصال و استبداد کے خلاف ریلیوں، احتجاجی مظاہروں کو منظم کرنے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں، مزدوروں اور کسانوں کو انقلابی جذبوں سے ہم آہنگ کرنے میں بھی بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔

اپنے اس دوسرے دور میں بے نظیر بھٹو نے فوج، آئی ایس آئی اور حکمران اشرافیہ کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ امریکہ کے ساتھ قربت کی پالیسی کو بھی مزید فوقیت دی گئی۔ معاشی حوالے سے نیولبرل ازم کی پالیسیاں ہی جاری رکھی گئیں جو نواز شریف اپنائے ہوئے تھا۔ 1995ء میں اپنے امریکہ کے دورے کے موقع پر اس نے امریکہ اور فوج دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ دفاعی خراجات جو پہلے ہی بہت زیادہ تھے ان میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا۔ فوج میں ''اورین اینٹی سب میرین ائیر کرافٹ'' کا اضافہ کیا گیا۔ ''فضا سے فضا'' اور ''زمین سے زمین پر مار کرنے والے''

میزائلوں کے اضافے سمیت راڈار آلات اور کوبرا ہیلی کاپٹروں کے پرزہ جات بھی اس امریکی دورے کے نتیجے میں فوج کو فراہم کیے گئے مگر عوام کے نہ تو حالات بدلے گئے نہ اس بارے میں سوچا گیا بلکہ ان کے حالات پہلے سے بھی بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ نجکاری کا سلسلہ بے نظیر کے پہلے دور میں ہی شروع کیا گیا تھا جب مسلم کمرشل بینک کو بیچ دیا گیا تھا مگر اب کے سامراجی اداروں کے ایجنڈے کو حکمران طبقات اور ریاستی انتظامیہ کچھ زیادہ تندہی سے سرانجام دینا چاہ رہے تھے۔ نواز شریف بھی اپنے اقتدار میں نجکاری سمیت کئی دیگر مزدور دشمن اقدامات کر چکا تھا جس کے خلاف کئی مزاحمتیں بھی ہوئیں۔

طلبہ سمیت معیشت کے مختلف شعبوں میں بے چینی بڑھ چکی تھی اور ہڑتالیں، مظاہرے شروع ہو گئے تھے۔ اس جمہوری دور میں ہی مالکان نے بھی ریاست کی آشیرباد اور تعاون سے اپنے حملے شدید کر دیئے تھے۔ سب سے زیادہ شدید اور گھناؤنا حملہ کامریڈ عارف شاہ پر کیا گیا جو پنجاب لیبر فیڈریشن کا لیڈر تھا جس کی ممبر شپ 65000 مزدوروں پر مبنی تھی۔ یہ حملہ لاہور کے نزدیک شیخوپورہ روڈ پر واقع فیکٹریوں کے مالکان کی ملی بھگت سے کیا گیا تھا۔ کامریڈ عارف شاہ کو ان نیک و پارسا مالکان کے پالتو غنڈوں نے کلاشنکوفوں کے بے دریغ فائر کر کے قتل کیا تھا اس کے جسم پر 33 گولیاں ماری گئی تھیں۔ اس قتل کے خلاف سارے علاقے میں شدید غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ احتجاج اور روڈ بلاک شروع کر دیئے گئے۔ یہ وحشیانہ قتل 20 جنوری 1995ء کو ہوا تھا مگر پیپلز پارٹی کی جمہوری حکومت اس بہیمانہ قتل کے ذمہ داروں کو گرفتار تک نہیں کر سکی۔ پارٹی اس کے بعد عارف شاہ کے حلقے سے کبھی الیکشن نہیں جیت سکی۔ یہ قتل پنجاب کی سب سے سرگرم ٹریڈ یونین پنجاب لیبر فیڈریشن کے خاتمے کا بھی باعث بن گیا۔ اس قتل سے انقلابی مارکسی قوتوں کو بھی شدید جھٹکا لگا لیکن پھر اس قتل کا انتقام تبھی ممکن ہو گا جب مالکان کے اس جابرانہ استحصالی نظام کو اکھاڑ پھینکا جائے گا۔

میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل

اسی دوران بے نظیر کا سرکش بھائی مرتضیٰ بھٹو بھی پاکستان واپس آ چکا تھا۔ وہ کہیں زیادہ انقلابی تھا اور پیپلز پارٹی کو اس کے اصلی حقیقی سوشلسٹ رنگ روپ میں دیکھنا اور ڈھالنا چاہتا تھا۔ مگر میڈیا انتہائی بیہودہ اور بے جا معاملات کو زیادہ اچھالنے لگا۔ ذاتی معاملات، خاندانی تنازعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جانے لگا۔ اس کی بنیادی وجہ ریاست کا وہ خوف تھا کہ مرتضیٰ کا انقلابی رجحان اور اس رجحان کے ساتھ اس کی

موجودگی پیپلز پارٹی کو کہیں متاثر نہ کرنا شروع کر دے۔ مرتضیٰ نے اس وقت کی پارٹی قیادت کی غدارانہ پالیسیوں سے خفا ہو کر پارٹی کا اپنا الگ دھڑا بناتے ہوئے اپنی پارٹی بنالی۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد مرتضیٰ کی انقلابی فکر سے متاثر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد بھی کر چکا تھا۔ 20 ستمبر 1996ء کو کراچی میں اپنے گھر کلفٹن واپس آتے ہوئے اس کے قافلے کو روک لیا گیا اور اس پر پولیس کی طرف سے براہ راست فائرنگ کر دی گئی۔ اس کا سارا جسم چھلنی ہو چکا تھا اور وہ کچھ دیر سڑک پر پڑا تڑپتا رہا۔ ہسپتال لے جاتے ہوئے اس نے اپنی آخری سانس لی۔

تب سے اب تک کئی مختلف باتیں بنائی اور بیان کی جا رہی ہیں کہ یہ کیا' کیوں اور کیسے ہوا' کس نے کیا؟ انکوائری کمیشن نے ابھی تک حتمی رپورٹ دینی ہے۔ اقتدار کے ایوانوں میں ہونے والی پے در پے تبدیلیوں تلے یہ قتل بھی دب چکا ہے۔ اپنی بنیاد میں یہ قتل اس جنگجو انقلابی سے لیا جانے والا خونریز انتقام تھا' جس نے ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی جرات کرنے کی گستاخی کی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس واردات میں کئی اور افراد بھی شامل ہوں' انقلاب سے پہلے شاید اس قتل کی حقیقت کبھی بھی سامنے نہ آسکے۔ اس منصوبہ بند بہیمانہ واردات میں مرتضیٰ کے کئی قریبی دوست اور ساتھی بھی قتل کر دیئے گئے۔ اس اچانک موت نے سارے ملک کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر گھر میں کوئی موت واقع ہو چکی ہے، ہر طرف ایک صف ماتم بچھی معلوم ہوتی تھی۔ کیا شہر' کیا قصبے اور کیا دیہات' لوگ گلیوں' محلوں سڑکوں' چوکوں' چوراہوں پر دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔

میر مرتضیٰ مصنف کا دوست اور کامریڈ تھا۔ ہماری مارکسی فلسفے، سیاسی حکمت عملی اور تنظیمی طریقہ ہائے کار پر بہت لمبی اور سیر حاصل بحثیں ہوا کرتی تھیں جن کے ذریعے پاکستان میں ایک سوشلسٹ انقلاب ممکن ہو سکتا۔ ہماری زیادہ تر ملاقاتیں اور بحثیں کراچی اور لاہور میں ہوئیں۔ ہمارا کئی نظریاتی اور سیاسی امور پر اتفاق تھا۔ میر کا اس بات پر کامل یقین تھا کہ پاکستان کے عوام جن محرومیوں کا شکار ہیں، سوائے انقلاب کے ان کا نہ کوئی حل ہے نہ مداوا۔ مرتضیٰ کے قتل کا دہرا تہرا المیہ یہ تھا کہ اسے ریاستی اداروں نے قتل کیا اور اس وقت قتل کیا جب اس کی بہن ملک کی چیف ایگزیکٹو یعنی وزیر اعظم پاکستان تھی۔ ابھی بے نظیر اپنے بھائی کے اچانک اور بہیمانہ قتل کے صدمے ہی سے نہیں نکل پائی تھی کہ فاروق لغاری نے اس کی حکومت برطرف کر ڈالی۔ اسی فاروق لغاری نے جو اس کا سب سے وفادار' سب سے فرمانبردار ساتھی تھا اور جسے اس نے صدر پاکستان بنایا تھا۔ معیشت کی زبوں حالی، بے انت بدعنوانی

اور سماجی بے چینی نے حکمران تکون صدر، وزیر اعظم اور آرمی چیف کو پھر آپس میں لڑا دیا تھا۔ صدر لغاری نے بالآخر 5 نومبر 1996ء کو بے نظیر کی حکومت کو ختم کر دیا یوں جمہوریت کا یہ تماشا چلتا رہا۔ پاکستان کے حکمران اپنے عوام کی بدتر سے بدترین ہوتی حالت سے قطعی بے نیاز، بے پرواہ ہو کر اقتدار کا بے رحمانہ کھیل کھیلتے رہے۔

نواز شریف

3 فروری 1997ء کا الیکشن نواز شریف کو ایک بار پھر اقتدار میں لے آیا۔ قدامت پرست ریاست نے بے نظیر کی تمام تر نیازمندی اور معاونت کو رد کرتے ہوئے اسے دھتکار دیا تھا اور اس کی جگہ اپنے چہیتے، سرمائے کے من پسند نمائندے نواز شریف کو مسند اقتدار پر بٹھا دیا گیا۔ اس بار اسے 217 کے ایوان میں 137 سیٹیں دلوا کر بھاری مینڈیٹ سے نوازا گیا پیپلز پارٹی کو محض 18 سیٹیں ملیں جن میں سے پنجاب میں سے کچھ بھی نہیں تھا مگر نواز شریف کو بھی یہ بھاری مینڈیٹ انتہائی بھاری پڑا۔

اس مینڈیٹ کو بروئے کار لاتے ہوئے نواز شریف نے بہت کچھ کر دکھانے کی کوشش شروع کر دی۔ اسے اسلامی بنیاد پرستی کی بھرپور مدد میسر تھی، اس کے ساتھ ہی پس پردہ ڈیلوں سمیت جرنیلوں کے ساتھ بھی اس کی رسم و راہ بہتر تھی اور سب سے بڑھ کر دکھاوے کی حد تک سہی وہ امریکیوں کیلئے زیادہ عاجز و منکسر مزاج تھا۔ بے نظیر کی پیپلز پارٹی اپنی طبقاتی مصالحانہ پالیسی کے باعث بری طرح بدنام و ناکام ہو چکی تھی۔ عوام حد درجہ بے بس و بیزار ہو چکے تھے کیونکہ پارٹی کی حکومت نے ان کیلئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ نواز شریف اس ساری کیفیت میں خود کو بہت بہتر پوزیشن میں سمجھ رہا تھا کہ سارے پتے اب اس کے ہاتھ میں ہیں مگر جب برا وقت آتا ہے تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

11 مئی 1998ء کو بھارت نے پوکھران میں نیوکلیائی ہتھیاروں کے تین تجربے کیے جبکہ دو دن بعد پھر دو تجربے کر ڈالے۔ اس کیفیت کو سارے بھارت میں عوامی خوشی کا باعث قرار دیا گیا۔ جبکہ بھارت سے باہر اسے چین اور پاکستان کی جارحانہ کاوشوں کا توڑ قرار دیا گیا۔ امریکی انٹیلی جنس ایک بار پھر اس کا وقت سے پہلے سراغ لگانے اور خبر رکھنے میں ناکام ثابت ہو چکی تھی۔ اب یہ پاکستانی حکمرانوں پر تھا کہ وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ بھارتی حکمرانوں کی سکیم یہ تھی کہ یا تو پاکستان کو اس کمتری کا احساس دلائے کہ وہ اپنے نیوکلیئر پروگرام کے ذریعے ہتھیار بنانے کی اہلیت سے محروم ہے۔ یا پھر پاکستان ضد میں آ کر

ہتھیار بناڈالے اور پھر اس کے نتائج وعواقب بھگتے۔ ہر دو صورتوں میں پاکستان کا ہی خسارہ تھا۔

وزارت خزانہ کے سیکرٹری معین افضل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے نوز شریف کے ایٹمی دھماکہ کرنے کے فیصلے کی مخالفت کی اور کہا کہ معیشت اس کا بوجھ نہیں سہار پائے گی۔ اس نے زور دیتے ہوئے کہا کہ نواز شریف کے علم میں یہ بات لازمی ہوگی کہ پاکستانی معیشت سخت مالیاتی بحران کی زد میں ہے جبکہ اس کے محفوظ ذخائر بھی ختم ہونے کے قریب ہیں۔ پھر اس کی وجہ سے ہمیں غیر ملکی قرضوں کے مقابلے میں دیوالیے کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اور پاکستان پر پابندیاں بھی لگ سکتی ہیں۔ اس دوران پاکستان میں انتہائی صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا گیا اور یہ تاثر دیا گیا کہ وزیر اعظم جو اہم اور سخت فیصلے کرنے میں جلد بازی نہ کرنے کیلئے مشہور ہے، نے اس بار بھی بردباری اور دانشمندی سے کام لیتے ہوئے پاکستان کو دھماکے کے بعد میں ہونے والے اثرات سے بچالیا ہے۔ مگر اس کے بعد 28 مئی 1998ء کو پاکستان نے چاغی کے مقام پر پانچ دھماکے کر کے بھارت کو جواب دے دیا۔ تیس سیکنڈوں کے اندر چاغی کے راس کوہ کا سیاہ گرینائٹ دھماکے کی شدت کے باعث سفید ہوگیا پاکستان نے بھارت کے پانچ کے مقابلے میں پانچ دھماکے کر کے دکھائے۔ فخریہ اعلان کیا گیا ''آج ہم نے حساب برابر کر دیا ہے''۔(15)

نواز شریف نے یہ سوچ لیا کہ وہ اب ہیرو بن چکا ہے، جسے کوئی فتح نہیں کر سکتا تھا اور جو سب پہ بھاری پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے کوشش شروع کر دی کہ حکومت اور ریاست دونوں وہی کریں جو وہ کہے۔ اسے محسوس ہوا کہ آرمی چیف کرامت اس کے پیمانے پر پورا نہیں اتر رہا اور اس میں وہ جوش وجذبہ نہیں ہے جو اس کے عظیم مقاصد کی تکمیل کیلئے درکار تھا۔ اس کے دیگر اقدامات میں سے ایک پندرہویں ترمیم بھی تھی جس کے ذریعے سارے ملک میں اسلامی قانون نافذ کر دیا گیا جس کے تحت حکومتی اقدامات کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حسن عباس سابق پولیس چیف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ نواز شریف نے خود کو خلیفۃ المسلمین تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سول بیوروکریسی کو چلانے کے لئے فوج کو استعمال کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی قربت حاصل کر سکے مگر وہ یہ ترمیم نہیں کرا سکا۔ جنرل کرامت نے تفصیل سے لکھا ہے کہ کیسے ہر ملاقات میں نواز شریف اس کے ساتھ فوج کی سویلین امور میں مداخلت کے بارے میں نت نئی تجاویز پیش کرتا تھا۔ ان میں سے جو تجاویز نواز شریف کی طرف سے دی گئیں ان میں جی ٹی روڈ پر فوج کا تواتر کے ساتھ گشت، سکولوں کا سروے کیا جانا، بجلی کے میٹروں کو چیک کرنے کیلئے واپڈا کے ساتھ کام کرنا تاکہ ان میٹروں کی درستگی ممکن بنائی جائے اور غلط استعمال کو روکا

جائے۔نوازشریف نے چیف جسٹس اورصدر پاکستان کے بعد آرمی چیف کو بھی برخاست کردیا۔سینئر جرنیلوں کے باہمی قبائلی اورنسلی بنیادوں پرتنازعات کے ماحول میں پرویزمشرف کو نیا فوجی سربراہ بنادیا گیا۔

مگراس دوران بحران زدہ پاکستانی معیشت پابندیاں لگنے کے بعدانتہائی مشکلات میں دھنستی چلی جارہی تھی۔نوازشریف نے سرمایہ داروں' جاگیرداروں اور پیٹی بورژوا طبقے کوقومی غیرت کے تعصب کے نام پراستعمال کرنا شروع کردیا۔اس کے ساتھ ساتھ اس نے دائیں بازواوراسلامی بنیاد پرستی میں اپنی حمایت کوبھی بروئے کارلانا شروع کردیا۔دانشور،فوجی اشرافیہ اورسویلین افسرشاہی سب نوازشریف کی شان میں رطب اللسان ہوچکے تھے۔یہاں تک کہ سابقہ بائیں بازو کے سٹالنسٹ بھی اس کے قصیدہ گو بن گئے اوراسے عظیم ترقی پسند بورژوالیڈر قرار دینے لگے جس کا پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ انتظار کررہی تھی۔ان میں سے تو کچھ بائیں بازو کے دانشوراس کے مشیر بھی بن گئے تاکہ پاکستان میں قومی جمہوری انقلاب کا مرحلہ طے کرانے میں اس کی معاونت کی جائے۔کئی دیگر سابقہ بائیں بازولیڈرنوازشریف کو 1911ء کے چینی بورژواانقلاب کے لیڈرسین یات سن سے مشابہہ قرار دے رہے تھے۔

کارگل جنگ

مگرتعریف وثناخوانی کے اس ماحول میں سماجی و معاشی بحران اپنے ہی تماشے مرتب کررہاتھا۔عدم استحکام اورانتشاراپنے جوبن پرپہنچ چکے تھے۔فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد کرنے کے ساتھ ساتھ اوربھی کئی اقدامات کیے گئے۔پاکستانی قوم کوایک بارپھرنوازشریف کی قوم پرستی کے شغل کی قیمت بھگتنی پڑرہی تھی۔معیارزندگی پاتال کودھکیل دیا گیا،معاشی انتشارنے سماجی بربادیوں کی نئی داستانیں رقم کرنا شروع کردیں۔میکرولیول معیشت پرملک دیوالیہ ہونے کوپہنچ گیا تھا،عالمی معاشی ومالیاتی ریٹنگ ادارے پاکستان کوایک ناکام ریاست قرار دے رہے تھے۔معاشی انحطاط واضح کرتا ہے کہ کیوں اورکس طرح سے گلوبلائزیشن کے عہداورملٹی نیشنل کمپنیوں کے اس تسلط کی کیفیت میں نئی بورژوازی کسی بھی حالت میں سرمایہ دارانہ بنیادوں پرقومی جمہوری انقلاب کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتی۔

نوازشریف کے دھماکوں کا پاگل پن ہی کچھ کم نہیں تھا کہ اوپر سے جرنیلوں نے کشمیر میں کارگل کا

محاذ کھول دیا۔ پاکستانی جرنیلوں کی اس لڑائی کا مقصد لائن آف کنٹرول کو سیدھا کرنا، بھارت سے بلند چوٹیوں پر اپنا قبضہ جمانا تھا اور بھارت پر سٹریٹجک برتری حاصل کرنا تھا۔ کارگل کی ان بلند و بالا چوٹیوں پر قبضے کا ایک اور مقصد دراس، سرینگر اور لیح کے بھارتی راستوں کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ یہ آپریشن فروری 1999ء میں شروع کیا گیا، جس کی نواز شریف کو بھی بریفنگ دی گئی تھی مگر اس کا سارا کنٹرول جنرل پرویز مشرف کے پاس تھا۔ صرف بھارت نے ہی ناکوں چنے نہیں چبوائے بلکہ دیگر محاذوں پر سے سخت مزاحمت سامنے آئی۔ اس لڑائی سے امریکیوں کی امن کے قیام کی نام نہاد سامراجی کوششیں شدید متاثر ہوئیں۔ شکست کی ذلت اور مزید نقصان سے بچنے کیلئے نواز شریف نے امریکی صدر کلنٹن سے رابطہ کیا کہ وہ اس بحران سے نکلنے میں مدد کرے۔ امریکہ ایٹمی دھماکوں سے پہلے ہی خفا تھے، انہوں نے پاکستانی حکمرانوں کے ساتھ انتہائی توہین آمیز سلوک کیا۔ اس جنگ نے پاکستانی حکمران طبقات کے سویلین اور فوجی دھڑوں کے مابین باہمی تضادات کو شدید کر دیا۔

ریاست اور حکومت کے مختلف دھڑوں کے درمیان شروع سے چلا آنے والا تضاد اور تصادم کی وجہ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی استحکام پیدا کرنے' سیاسی بالائی ڈھانچے کی تشکیل اور سماج کو چلانے کی اہلیت سے محرومی تھی۔ جبکہ سبھی حکمران اس نااہل، متروک نظام میں رہتے ہوئے حکمرانی اور سماج کو چلانے کی کوششوں میں مصروف چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سب کے سب بدعنوانی، نااہلی اور بدنامی کا طوق گلے میں ڈال کر اقتدار سے رخصت ہوتے آ رہے ہیں۔ بدعنوانی جیسے جرائم اس نظام کا ناگزیر حصہ ہیں، یہ بدعنوانی نہیں جس کی وجہ سے نظام بدنام یا ناکام ہے بلکہ یہ نظام کا استرداد ہے جو بدعنوانی کے علاوہ کچھ پیدا ہی نہیں کر سکتا۔ سماجی رتبوں کے مارے ہوئے یہ حکمران ناگزیر طور پر خود کو بدعنوانی میں مبتلا اور ملوث کرنا شروع کر دیتے ہیں جس سے بحران مزید گہرا اور شدید ہوتا چلا جاتا ہے جو بالآخر ان کے اقتدار کو کھا جاتا ہے۔

اپنے اقتدار کے عروج پر نواز شریف اپنی کمتر ذہنی استعداد کی وجہ سے ان سب معاملات کو سمجھنے سے قطعی طور پر قاصر تھا۔ اس کی کند ذہنی پر اس عروج کے عالم میں اور بھی نکھار آ گیا۔ وہ خود کو عقل کل اور ناقابل شکست حکمران سمجھنے لگا تھا اپنی اسی نادان طبیعت کے پیش نظر اس نے جنرل پرویز مشرف کو ہٹانے کا فیصلہ کر لیا مگر یہ نادانی اس کے اپنے گلے پڑ گئی۔

پرویز مشرف

ستمبر 1999ء میں نواز کا بھائی شہباز شریف واشنگٹن پہنچا۔وہ اپنے بھائی کی طرف سے ایک درخواست لے کر گیا تھا کہ فوجی بغاوت کے راستے مسدود کر دیئے جائیں ۔یہ ایک ایسی بات تھی جسے امریکی سمجھنے اور ماننے سے قاصر تھے لیکن انہوں نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے مروتاً ایک ہمدردانہ بیان جاری کر ہی دیا۔مگراس بیان سے کوئی معجزہ رونما نہ ہو سکا اور ہونی ہو کر ہی رہی۔''ڈان'' کے الفاظ میں''چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے حکومت کے ساتھ اپنے کسی بھی تنازعے کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط افواہ قرار دیا ہے۔یہ بات اس نے اعلیٰ فوجی کمان کی میٹنگ کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کی''۔(16) مشرف نے شہباز کی وساطت سے پیغام بھیجا کہ وہ چیئرمین بننے کا خواہشمند نہیں ہے بشرطیکہ اسے آرمی چیف رہنے دیا جائے گا۔اگلے روز مشرف نے رائیونڈ میں میاں شریف کے ساتھ کھانا کھایا۔مشرف ایک ڈرامے کو یاد کرتے ہوئے لکھتا ہے جو جنرل آصف نواز اور دیگر سربراہوں کے ساتھ پہلے بھی پیش آ چکا تھا۔''یہ بہت ہی خوشگوار ماحول تھا،بڑے میاں صاحب (نواز اور شہباز کے اباجی) کمال شفقت سے مجھے کہہ رہے تھے کہ تم میرے بیٹے ہو۔ان کی کیا جرات کہ یہ تمہارے خلاف کچھ سوچیں یا بات بھی کریں۔اگر تمہیں ان سے کوئی شکایت ہو تو مجھے بتانا۔اس پر نواز شریف نے کہا بھلا ہم ایسا کیوں کریں گے ؛پرویز تو ہمارے بھائیوں جیسا ہے''۔(17)اس کے بعد دونوں خاندانوں کے بیچ تحائف کا تبادلہ کیا گیا اور پھر دونوں خاندان سرکاری خرچے پر عمرے کی سعادت حاصل کرنے روانہ ہو گئے۔

صرف ایک ہی مہینے کے اندر نواز شریف کو اس وقت اپنے منہ بولے بھائی کے خلاف کاروائی کرنا پڑ گئی جب وہ سرکاری دورے پر سری لنکا گیا ہوا تھا۔مشرف کو 12 اکتوبر کو وطن واپس پہنچنا تھا مگر جب اس کا طیارہ پاکستان پہنچا تو اس کے پائلٹ کو بتایا گیا کہ وہ پاکستان میں لینڈ نہیں کر سکتا،مناسب ہوگا کہ وہ دبئی یا کسی اور نزدیکی ملک چلا جائے۔فیول کی کمی کی وجہ سے طیارے کو نوابشاہ ائیر پورٹ کی طرف لے جایا گیا۔مگر پھر فضاؤں میں جاری یہ تنازعہ زمین پر اتر آیا اور مشرف کے حامی جرنیلوں نے نواز شریف کی چھٹی کرانے سمیت تمام معاملات سنبھال لیے اور طیارہ کراچی ائیر پورٹ پر اتر گیا۔یہ ہالی وڈ کی فلموں کی طرح کا ایک ڈرامہ تھا جس میں خوفزدہ مشرف پہلے فضاؤں میں پھنسا ہوا تھا اور پھر اچانک وہ کچھ دیر بعد

اپنی سرزمین پر حکمرانی کر رہا تھا۔فوجی وردی میں سجے دھجے مشرف نے ٹیلی ویژن پر قوم کو آگاہ کیا کہ اس نے ملک وقوم کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔اس نے اپنے آپ کو غیر جانبدار ظاہر کرنے کیلئے ایک نئی اصطلاح ''چیف ایگزیکٹو'' سے نوازتے ہوئے قوم کو ان ناگزیر وجوہات اور سلسلہ ہائے واقعات کے بارے میں بتایا جو اس فوجی بغاوت کے ممکن ہونے کا باعث بنے۔ایسی وجوہات پاکستانی قوم نجانے کب سے سنتی چلی آرہی تھی۔

جنرل پرویز مشرف کی طرف سے ''پرامن اور بغیر کوئی خون کا ایک قطرہ بہانے والی'' پاکستان کے پچاس سالوں میں یہ چوتھی فوجی بغاوت تھی۔اس نے کہا کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہتا تھا۔وہ ایسا چاہتا تھا یا نہیں مگر ریاست اور فوج اس بغاوت کو ہوتا نہیں دیکھنا چاہ رہے تھے۔ایسا بھی نہیں تھا کہ اعلیٰ جرنیلوں کے پیٹ میں جمہوریت کے مروڑ اٹھ رہے تھے اور ان کے دماغوں سے حکمرانی کی ہوس ختم ہو چکی تھی یا پھر ان کے دلوں میں سے اور زیادہ کمانے کا ارادہ کوچ کر چکا تھا۔ملکی معیشت میں ان کے حصے اور اثاثے، ہر پچھلی جمہوری حکومت کے دوران مسلسل فروغ پاتے رہے تھے۔یہی جرنیل ہی خارجہ پالیسی کو متعین اور چلاتے بلکہ جمہوری حکومتوں کے طور طریقے اور چال چلن بھی انہی کی مرضی سے بنتے بگڑتے چلے آرہے تھے۔ بے نظیر اور نواز شریف دونوں کی دونوں حکومتیں انہی جرنیلوں کی تائید وتقلید کی نذر ہوتی رہی تھیں۔حقیقت یہ تھی کہ آپس میں تال میل کی کمی، باہمی کمزوری اور اندرونی تضادات کی وجہ سے ہی فوج کو اتنی جرات ہوتی تھی کہ وہ ان پر قابو پاتی اور قوم پر حاوی ہوتی رہی۔پچھلی آمریتوں کے برعکس مشرف نے خود کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی بجائے چیف ایگزیکٹو کہلوانے کا طریقہ اپنایا۔مشرف حکومت اپنی ابتدا میں ایک مجروح اور لاغر آمریت تھی۔ہر چند یہ آمریت اپنا رنگ روپ اور سلیقہ وطریقہ بدلے ہوئے تھی۔اس آمریت نے شروع سے ہی سویلین افراد کو حکومت میں لانا جبکہ دوسری طرف فوج کو انتظامیہ کا حصہ بنانا شروع کر دیا تاکہ مارشل لا ایڈمنسٹریشن کے تحت جو کچھ وہ کما سکتے تھے وہ اب یہاں سے کمایا جائے۔ اس کے دہرے مقاصد تھے؛ایک فوج کو مختلف ذرائع سے مالا مال کرنا تو دوسرا سیاستدانوں کو استعمال کرتے ہوئے آمریت کے لیبل سے بچنا اور اسے جمہوریت کا نقاب پہنانا تھا۔جیسا کہ ماضی میں ہر فوجی آمر کرتا تھا کہ وہ جمہوریت کی تعریف وتوصیف کرنا شروع کرتا اور پھر اس کے بعد جمہوریت کی اپنی ہی بیہودہ اور جعلی تعریف مرتب کرتے ہوئے اس کے عین مطابق اسے نافذ بھی کر دیتا تھا۔کئی خوشامدی حضرات اس قسم کے خیالات سے لطف اندوز ہونے اور ان کی مدح سرائی کیلئے پہلے سے ہی کمربستہ ہو کر

تیار بیٹھے تھے،ان میں پیٹی بورژوادانشوروں کی معقول تعداد شامل تھی۔آمریت کے نفاذ کے ساتھ ہی ان لوگوں نے اپنا دھندہ شروع کر دیا اور خاص طور پر اس کے روشن خیال اسلوب نے تو ان حضرات پر جیسے وجد طاری کر دیا۔

نواز شریف سے تنگ آئے بیشتر سیاستدانوں نے مشرف کی آمد پر شادیانے بجائے اور نئی حکومت میں اپنی خدمات کیلئے تیار ہو گئے۔یہاں تک کہ بے نظیر بھٹو نے بھی تبدیلی کو خوش آمدید کہہ دیا۔ہر چند کہ دوبئی سے جاری ہونے والا یہ بیان خیر سگالی کے جذبے سے جاری نہیں کیا گیا تھا مگر اس سب کچھ سے الگ کارکن اور محرومیوں کے بوجھ تلے پستے عوام قطعی بے نیاز تھے۔وہ دہائیوں تک جمہوریت کو دیکھ پرکھ چکے تھے کہ جن کے ہوتے ہوئے ان کے معیار زندگی میں گراوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوا تھا،ان کی غربت پہلے سے بڑھ چکی تھی، بیروزگاری میں اضافہ ہو گیا تھا۔چنانچہ مشرف کی واردات کو کسی قسم کی مزاحمت درپیش نہیں آئی۔

تاجر، دکاندار اور سماج کی دوسری پرتیں جو نواز شریف کی حامی تھیں،اگرچہ ان کے منہ لٹک گئے مگر ان کو چوں چرا کی بھی توفیق نہ ہو سکی۔بڑے تاجر اور سرمایہ دار جو اس کے ساتھ ہمرکاب چلے آ رہے تھے انہوں نے چور رستے تلاش کرنا شروع کر دیئے تاکہ نئی حکومت کے ساتھ راہ ورسم نکل سکے۔دائیں بازو کو ویسے بھی اپنے اثاثے اور بینک اکاؤنٹ زیادہ عزیز ہوا کرتے ہیں۔انہیں اس بات سے زیادہ دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہوتی کہ اقتدار میں کون ہے کون نہیں۔اسلامی بنیاد پرستوں کو یوں بھی کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ ان کی نواز شریف کے ساتھ ساتھ فوج سے بھی رسم وراہ پہلے سے ہی مضبوط چلی آ رہی تھی۔ان کیلئے یہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر موقع آ گیا تھا۔منشیات وغیرہ کی تجارت کے حوالے سے ان کو ویسے بھی تحفظ کی سخت ضرورت رہتی تھی۔دوسری طرف یہ بنیاد پرست،فوج کے شاہینوں کو کشمیر اور افغانستان میں جہادی حکمت عملی کے حوالے سے بھرپور امداد وتعاون پیش کیے چلے آ رہے تھے۔سٹریٹجک اتحاد ویگانگت کا یہ کھیل آئی ایس آئی کی ہدایات میں ہر جمہوری وآمرانہ دور میں بغیر کسی روک ٹوک اور وقفے کے مسلسل جاری وساری چلا آ رہا تھا۔

عوام کے نام پر حکمرانی رچانے والے ان جمہوری حکمرانوں نے کبھی بھی نہ عوام پر اعتماد کیا نہ ان کا خیال رکھا تاکہ ذلتوں، اذیتوں اور محرومیوں کا نسلوں سے شکار چلے آ رہے ان عوام کے بارے میں کچھ سوچا اور کچھ کیا جا سکے۔عوام کے ان نمائندوں کے ''طبقاتی مفادات'' انہیں فوج اور امریکہ کی غلامی کرنے پر

مائل ومجبور کیے رکھتے ہیں۔ان کیلئے دنیا جہان کی ساری حکمت اور قوت کا مرکز فوج اور امریکی سامراج ہی ہیں کیونکہ یہی وہ دوسرچشمے ہیں جوان کو اقتدار تک لانے کا وسیلہ بنتے ہیں۔''سٹریٹجک مضبوطی'' کی پالیسی کشمیر میں ایک نیم محاذ کھولنے کیلئے اپنائی گئی تھی جو کہ پاکستانی حکمران طبقات کی وسعت پذیری کی خواہش کا آئینہ دار تھی اور جو لامحالہ فوج کا مطمع نظر بھی تھی۔افغانستان میں یہ اس بات کے امکان مسدود ہو چکے تھے کہ اسے پاکستان کی گماشتہ ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔مگر بھارت جو ایک بڑی سامراجی طاقت تھا، نے اس جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا، جس کی وجہ سے خطے میں حالات انتہائی کشیدہ ہو گئے۔یہ پالیسی مشرف کی مہم جوئی کے بعد بھی جاری رہی۔جنگی سردار، ڈرگ مافیا اور طالبان سمیت دیگر بنیاد پرست اس کیفیت کو ہوا دینے کا ایک اور عنصر تھا۔پھر اب تو عالمی مہاراج، امریکی سامراج کی اپنی تیل اور سٹریٹجک ضرورتوں نے بھی اس میں اپنا عمل دخل شروع کر دیا۔

مشرف نے ترکی کے کمال اتاترک کی طرز پر خود کو ایک لبرل، ایک انقلابی بورژوا اصلاح پسند کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔اس کی جو پہلی تصویر میڈیا کی طرف سے جاری کی گئی اس میں وہ دو ٹیریر کتوں اور اپنی بیٹی کے ساتھ جلوہ افروز ہوا جس نے بغیر بازوؤں والی سرٹ پہنی ہوئی تھی۔مگر اس کی جدیدیت ویسے ہی جعلی وجھوٹی تھی جیسی ضیاء کی بنیاد پرستی۔

امریکی سامراجی ملٹی نیشنل کمپنیوں خاص طور پر یونوکال کے ساتھ افغانی جنگی سرداروں اور طالبان کے مابین ہونے والے سمجھوتے اور معاہدے بار بار بنتے اور ٹوٹتے رہے۔اور یہ معاہدے' یہ سمجھوتے آج سے نہیں پچھلی دو صدیوں سے بنتے ٹوٹتے چلے آ رہے تھے۔افغانستان سے روس کے چلے جانے کے بعد امریکیوں نے بنیاد پرستوں سے منہ موڑ لیا تھا۔اپنے پیچھے ایک ایسا ویران وسنسان افغانستان چھوڑ گئے جو مختلف اسلامی دھڑوں کی باہمی خونریز جنگ وجدل کی زد میں آ گیا اور جس خونریزی کو نہ صرف سامراجی خود ہوا دے رہے تھے بلکہ دیگر علاقائی طاقتیں اپنے مقامی و مالیاتی مفادات کیلئے اور اسلامی بنیاد پرست کالے دھن کی نقل وحرکت کیلئے استعمال کر رہے تھے۔امریکی امداد پر گزارہ اور تکیہ کرنے والے مفاد پرستوں نے مذہبی درسگاہوں میں تعصب ومنافرت کے زہر سے ذہنوں کو آلودہ کرنا شروع کر دیا۔انہوں نے کمیونزم کے بعد اپنا کاروبار چمکانے کیلئے ایک نیا شیطان گھڑ لیا' امریکی سامراج ان کی منافرت اور دشمنی کا نیا مرکز ومحور بن گیا۔

یہ سارا کھیل اسلامی رہنماؤں اور ان کے مقامی پشت پناہوں کی معاشی فلاح وبہبود کی نیت سے

کیا جارہا تھا جو اسلحے اور منشیات کی سمگلنگ کے دھندے سے منسلک تھی۔امریکی سامراج نے بھی اسی شدومد اسی منافرت وتعصب کے ساتھ ان کا مقابلہ شروع کر دیا۔امریکہ اور مغرب دونوں کو اپنے محنت کشوں کے ساتھ روا رکھے اندرونی استحصال کو پوشیدہ رکھنے کیلئے ایک خارجی محاذ آرائی درکار تھی۔اسلامی بنیاد پرستی کی شکل میں، سٹالنزم کے خاتمے کے بعد، انہیں ایک نیا پراسرار دشمن میسر آ گیا۔اگر نائن الیون (9/11) کا واقعہ نہ بھی ہوا ہوتا تو کوئی اور حیلہ' بہانہ' کوئی اور واقعہ' سانحہ ترتیب وتشکیل دیا جاتا۔ ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریے کو اس قسم کے انسانی المیے کی سخت ضرورت تھی جس کے تباہ کن اثرات ساری دنیا کو کچھ اس طرح سے اپنی لپیٹ میں لے لیتے کہ اس نظریے اور اس کے وحشی تقاضوں کو مسلسل تقویت ملتی رہتی۔

امریکہ نے افغانستان میں جو قیامت برپا کی تھی اس نے لامحالہ پھیلنا تھا اور سامراج کے حکمت سازوں نے اسے اپنے مذموم مقاصد، علاقے میں امریکی تسلط اور سرمایہ دارانہ نظام کے بہیمانہ استحصال کو جاری رکھنے کیلئے جاری وساری رکھنا تھا۔یہ تاثر انتہائی غلط ہے کہ پاکستانی ریاست کے حکمران دھڑے امریکی مفادات کے خلاف طالبان کی حمایت کر رہے تھے۔ہاں اس وقت جب امریکہ کچھ وقت کیلئے افغانستان سے بے نیاز ہوا تھا اس وقت ضرور آئی ایس آئی نے اپنی حدود سے تجاوز کیا جب پینٹا گان اور سی آئی اے نے کچھ دنوں کیلئے افغانستان سے اپنی توجہ ہٹالی تھی۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکہ کے منظر سے ہٹنے کے بعد، آئی ایس آئی اور نام نہاد بدقماش ریاستی عناصر نے اس باہمی جنگ وجدل میں پے در پے بدلتی وفاداریوں' سازشوں اور دھوکہ دہیوں کے اس ماحول میں اپنا نیٹ ورک اور انفراسٹرکچر نہ صرف قائم بلکہ مستحکم بھی کر لیا۔

جب امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج کی طرف سے پتھر کے دور میں لے جانے کی دھمکی سے ڈر کر (جو درحقیقت گیدڑ بھبھکی ہی تھی) مشرف نے یوٹرن لیا وہ حماقت سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ پاکستانی ریاست اور سرمایہ داری کی تاریخ سے آشنا کسی بھی فرد کیلئے یہ کوئی حیران کن امر نہیں ہے کہ یہ کسی بھی طور امریکہ کا مقابلہ تو کجا سامنا کرنے کے بھی قابل نہیں ہیں۔جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں اور جب بھٹو کے خاتمے کا فیصلہ کیا گیا اور امریکہ نے اس کی تیاری مکمل کر لی اس وقت حکومت نے سامراج کی مخالفت میں کچھ کہنے کی جسارت کی تھی۔مشرف اپنی یادداشتوں میں جنرل عزیز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے جب وہ نائن الیون واقعے کے وقت امریکی دورے پر تھا تو آرمیٹج نے کہا تھا

''کہ ہمیں صرف یہ ہی نہیں چننا کہ ہم امریکہ کے ساتھ ہیں یا دہشت گردوں کے! ہاں اگر ہم دہشت گردوں کا ساتھ دیں گے تو ہمیں پتھر کے زمانے میں پہنچا دیا جائے گا''۔(18) مشرف کے امریکہ دورے کے دوران آرمیٹج میڈیا کے سامنے مکر گیا کہ اس نے ایسی کوئی بات کی تھی۔ حقیقت اس سے زیادہ قریب تھی جو نائن الیون کے بارے میں کین اہملٹن کمیشن رپورٹ میں بیان کی گئی۔

امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین نے مشرف کو ان سات سرکاری مطالبات کی فہرست فراہم کی جو امریکہ پاکستان سے طلب کر رہا تھا۔

1۔ سرحدوں پر سے القاعدہ کی سرگرمیوں کو روکا جائے اور اسامہ بن لادن کی لاجسٹک حمایت بند کی جائے۔

2۔ امریکہ کو دوستانہ طور پر فضائی و زمینی رستے استعمال کرنے کا حق دیا جائے تا کہ وہ موقع کی مناسبت سے اپنی عسکری و انٹیلی جنس سرگرمیاں کر سکے۔

3۔ امریکہ اور اس کے اتحادی فوجیوں کو علاقے میں القاعدہ کے خلاف عسکری و خفیہ کاروائی کرنے دی جائے۔

4۔ امریکہ کو ہر قسم کی خفیہ معلومات فراہم کی جائیں۔

5۔ دہشت گردانہ کاروائیوں کی کھلے بندوں مذمت کی جائے۔

6۔ طالبان کو ایندھن وغیرہ کی فراہمی کو روکا جائے اور ان کیلئے ریکروٹ ہونے والوں کو افغانستان نہ جانے دیا جائے۔

7۔ اگر کوئی ایسا ثبوت میسر آتا ہے کہ جس سے طالبان یا القاعدہ کو مدد فراہم ہو رہی ہے تو حکومت کو طالبان سے تعلق ختم کرنا ہوگا۔(19)

درحقیقت امریکہ بلا روک ٹوک سب کچھ کرنے کا کہہ رہا تھا تا کہ اسے جہاں جو کرنا پڑے، جس پر حملہ کرنا پڑے وہ کر سکے اور اسے دیگر لوازمات سمیت ہر جگہ آنے جانے کا استحقاق درکار تھا۔ مشرف کشمیر پر ایک کے بعد دوسرا حل تجویز کیے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ بورژوا نقطہء نظر سے بھی بیہودہ محسوس ہو رہا تھا اور یہ سب ایسے ہوائی قلعے ہوتے تھے جو کوئی شرابی رات کے کسی پہر میں بوتل کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے تعمیر کیا کرتا ہے۔ بھارت کے ساتھ امن کے قیام کا عمل اسی قسم کی لایعنی گفتگو کی بھینٹ چڑھتا رہا۔ بھارتی مشاہیر کا رویہ اور طرز عمل بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ بھارتی سیاست میں ''چالاک لومڑی'' کے نام

سے مشہور اٹل بہاری واجپائی جو ہر طرف' ہر جگہ چھایا رہتا تھا اور پیار امن ومحبت کے پیغام پھیلاتا رہتا تھا، اس کی منافقت دیدنی تھی۔ نہ تو واجپائی اور نہ ہی مشرف بھارت اور پاکستان کی ریاستی طاقت کے اصلی مراکز کو سنبھالنے کی حیثیت میں تھے۔

پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کے مابین تضادات اور تنازعات شاید دنیا بھر میں فوج اور اسلحے کی سرگرمی اور ان پر اٹھنے والے اخراجات کیلئے سب سے بڑی بنیاد چلے آرہے ہیں۔ اس حوالے سے ان ملکوں کے معاشی اور مالیاتی ڈھانچوں میں کمیشن (Kick Backs) کی مداخلت نے ان دونوں ریاستوں کے ارتقاء کے حوالے سے انتہائی گہرے مخصوص مفادات وابستہ کر دیئے ہیں۔ اسی لیے مشرف کی اس مہم جوئی کو بھی ایسے ہی عناصر کی طرف سے خوب ڈھارس بندھائی گئی اور شاباش دی جانے لگی جبکہ سرحد کے اس پار سے بھی یہی کیفیت رہی۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ دونوں ملک ایٹمی ہتھیار بنا چکے تھے اور جنگ میں کون سے لمحہ کون سا ہتھیار استعمال کرنا پڑ جائے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ایسا ہو جاتا تو نتیجہ دونوں ملکوں میں بھیانک تباہی کی شکل میں سامنے آجاتا تھا۔ اس سے بالادست طبقے کی جائیدادیں اور اثاثے بھی تباہ و برباد ہو سکتے تھے یہاں تک کہ خود یہ طبقہ بھی روز قیامت کی طرح نیست و نابود ہو جاتا۔ سامراجیوں کے جنگ اور امن کے اس کھیل میں دو متضاد مفاد ملوث تھے' ایک طرف تو بھارت میں بہت بھاری سامراجی سرمایہ کاری تھی، جسے وہ بہر حال ہر بحران' ہر جنگ کی تباہی سے بچانا چاہتے تھے اور اسی لیے وہ دونوں ملکوں کو ایک مکمل جنگ سے روک رہے تھے۔ اس کا اظہار بھارتی پارلیمنٹ پر ہونے والے مبینہ دہشت گرد حملے کے بعد کی کوششوں میں سامنے آیا۔ جیسا کہ سٹیوکول نے ''نیویارکر'' میں بھی لکھا ''حملہ آوروں کے بارے میں کوئی اتنا نہیں جانتا تھا مگر بھارتی حکومت نے پاکستان اور اس کی ایجنسی آئی ایس آئی پر الزام لگا دیا کہ وہ اس حملے کی ذمہ دار ہے۔ 1980ء کے آخر سے آئی ایس آئی کشمیر میں اسلامی گروپوں کی پس پردہ اسلحے اور سرمائے کی مدد فراہم کرتی آرہی ہے۔ 2001ء تک دو بڑے جہادی گروپوں لشکر طیبہ اور جیش محمد کے القاعدہ کے ساتھ رابطے بڑھ چکے تھے۔ 2001ء کے حملوں کے بعد واجپائی نے فوج کو جنگ کیلئے تیار ہونے کا حکم جاری کر دیا۔ بھارت اور پاکستان کا تنازعہ اکیسویں صدی کا واحد جوہری بحران ہے جو غیر ریاستی شدت پسند نظریات کے حامل مذہبی تنظیموں کے وسیع ڈھانچوں کی شکل میں ایک جدید مسئلہ بن چکا ہے''۔(20)

بھارتی فوجی افسروں نے پاکستان کی پشت پناہی کا سوچتے ہوئے تہیہ کر لیا تھا کہ اس حملے کا جواب

دیا جائے گا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں سات لاکھ بھارتی فوج بھی اس کیلئے متعین کر دی گئی تھی جبکہ بھارتی فضائیہ نے بھی پاکستانی سرحدوں کی طرف رخ کر لیا تھا۔ بھارتی بحریہ کو بھی بحیرہ عرب میں متحرک کر دیا گیا۔ بھارت میں اچانک جنگ کا جنون بیدار ہو چکا تھا۔ دونوں طرف فوج کو تیار کر دیا گیا تھا۔ بھارت کے ذرائع ابلاغ نے سماج میں ہندو شاونزم اور بھارتی قوم پرستی کو ابھارنا شروع کر دیا۔ پاکستان کے حکمران طبقات اور ریاست کو چاروناچار جواب دینے کیلئے تیار ہونا پڑ گیا تھا جو اپنے ہی سکینڈلوں اور بحرانوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی مگر ان کے پاس کوئی اور رستہ بھی نہیں تھا۔ پاکستان کی فوج کو بھی اسلحے سمیت سرحدوں پر چوکس کر دیا گیا۔ جنگ کسی طور رکتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پاکستانی میڈیا اور دانشور بھی حب الوطنی کے جذبے کو ابھارنا شروع ہو گئے۔ پاکستانی قوم پرستی اور مذہبی بنیاد پرستی کو ہوا دی جانے لگی۔ بدلے اور انتقام کے نعرے شروع ہو گئے۔ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور برطانوی وائٹ ہال کی سبھی کوششیں بیکار جاتی نظر آ رہی تھیں۔ سفارتکاری اس تصادم کو روکنے میں ناکام محسوس ہو رہی تھی۔ سامراجیوں کو دوڑیں لگ گئیں مگر آخر کار اس تباہی کو روکنے کیلئے سب سے فیصلہ کن مداخلت سامنے آئی۔ یہ بھارت میں بہت بڑی سرمایہ کاری کرنے والی ملٹی نیشنل کمپنی آئی بی ایم IBM کے مالکان میں سے ایک کی فون کال تھی۔ سخت گیر متعصب بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کے سربراہ وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو کمپنی کی طرف سے اپنا سارا سرمایہ نکالنے کی دھمکی کی اس کال پر اپنی ساری تیاریاں واپس کرنی پڑ گئیں۔

دوسری طرف سامراجیوں کو دونوں ملکوں کے مابین دشمنی اور تنازعے کی کیفیت سے بھی دلچسپی تھی، مگر ایک کنٹرول کی جا سکنے والی کیفیت کے ساتھ۔ برطانیہ جاتے ہوئے ویسے بھی کشمیر، پانی کی تقسیم، سرحدوں کے تعین سمیت کئی مسائل چھوڑ کر گیا تھا۔ تقسیم کرو اور حکمرانی کرو کی پالیسی کو وہ طویل عرصے تک کارآمد رہنے کیلئے بروئے کار لانا چاہ رہے تھے۔ اس حکمت نے انہیں اپنے معاشی استحصال اور مستقبل کے سٹریٹجک اہداف کیلئے بہت فائدہ پہنچایا جبکہ امریکہ کو اس خطے میں سٹریٹجک مفادات کے علاوہ بھی یہاں کی لیبر، معدنی وسائل اور دونوں ملکوں میں براہ راست مالیاتی لوٹ کھسوٹ کرنا تھی۔ اس لوٹ کھسوٹ کا سب سے بڑا ذریعہ ان ملکوں کو اسلحے کی فروخت اور فراہمی ہے۔ ریاست، حکمران طبقات اور دلالوں کے اسلحے کے اس کاروبار میں اپنے اپنے مفادات ملوث ہیں۔ تباہی و بربادی کے ان آلات کی قیمتیں بھی ان دونوں ملکوں میں تیار ہونے اور خریدی جانے والی اشیا کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ چکی ہیں۔

چنانچہ دونوں ملکوں کے مابین تنازعہ و تصادم کا،ایک کنٹرول کیفیت میں سہی مگر، ہرحال میں جاری رہنا ضروری ہے۔ جھگڑے ہوتے رہیں مگر یہ ایک مکمل جنگ میں تبدیل نہ ہونے دیئے جائیں۔ یہی مفادات سامراج اور دونوں ملکوں کی قومی بورژوازی کے مابین ایک مشترکہ ہم آہنگی پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ان کی اس پالیسی کو ان الفاظ میں سمیٹ کر بیان کیا جاسکتا ہے' یہ دونوں ایک مکمل جنگ کرنے کے متحمل نہیں اور یہ دونوں پائیدار امن قائم نہیں رکھنا چاہ رہے۔ جنگ اور امن کا یہ پنڈولم یونہی چلتا اور چلایا جاتا رہے گا۔ جبکہ اس دوران برصغیر کے ڈیڑھ ارب سے زائد انسان بھوک' غربت' بیماری کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ کئی نسلوں سے زندگی اسی طرح سے بھیانک بنی ہوئی ہے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں کہ جنوبی ایشیا کا یہ خطہ دنیا کی 22% آبادی کا حامل ہے اور دنیا کی 40% غربت بھی اسی خطے کا مقدر ہے۔ ان المناک حالات و کیفیات میں ان سماجوں میں پائے جانے والا توازن اتنا نازک ہو چکا ہے کہ کوئی معمولی جھگڑا بھی ایک بڑی بھیانک جنگ میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ جوہری ہتھیاروں کے حامل ان ملکوں کے جنونی حکمرانوں کی موجودگی میں جو تباہی اور بربادی پھیل سکتی ہے اس کی ساری انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی مثال ملے۔

داخلی طور پر میکرو اکنامکس کے سبھی دلخوش کن اعداد و شمار کے باوجود مشرف حکومت کے دوران عوام الناس کی حالت زار بدتر ہوتی چلی گئی۔ عالمی بینک اور دوسرے عالمی ادارے اس حکومت کو بھرپور مدد مہیا کرتے رہے۔ ان اداروں کی روایت چلی آرہی ہے کہ یہ یا تو اپنے ملازمین یا پھر اپنے نامزد کیے گئے نمائندوں کو ایسے ملکوں میں مالیاتی و معاشی معاملات کی نگرانی کیلئے بھیجتے چلے آرہے ہیں۔ مملکت خداداد میں سوائے ایک ڈاکٹر مبشر حسن کے ہر وزیر خزانہ یا تو عالمی بینک و آئی ایم ایف کا ملازم تھا یا ان کا بھیجا ہوا نمائندہ۔ یہ سلسلہ ملک بننے سے ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ مشرف کے آتے ہی شوکت عزیز کو بھیج دیا گیا۔ وہ عالمی ادارے سٹی کارپوریشن کے بینکنگ سیکٹر میں کام کرتا تھا جسے آئی ایم ایف نے پاکستان کیلئے تجویز کیا تھا۔ وزیر خزانہ بنائے جانے کے ساتھ ساتھ اسے وزارت عظمیٰ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ مگر عوام کی غربت و بدحالی میں اضافہ ہوتا رہا۔ بیروزگاری، بیماری اور انفراسٹرکچر کی تباہ حالی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے باوجود کہ کامیابیاں ایک دہائی تک مشرف / شوکت حکمرانی پر برستی رہیں مگر صرف حکمرانوں پر ہی۔

آئی ایم ایف و عالمی بینک کی جانب سے ان کامیابیوں پر تعریف و توصیف اپنی جگہ تھی تو مقامی

ماہرین معیشت نے بھی آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔اس حکومت کی معاشی ترقی کا ایک اور پاکستانی معاشی ماہر شجاع نواز نے جو عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے ''فنانشل ڈیولپمنٹ'' کا ایڈیٹر ہے، تجزیہ کیا ہے۔اس نے اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''کھنچی ہوئی تلواریں''(Crossed Swords) میں لکھا ہے:

''مشرف بجا طور پر معاشی ترقی کا دعویٰ کرسکتا تھا۔اس سے پہلے نواز شریف نجکاری کے ذریعے سرمایہ داروں کی بڑی خدمت کر چکا تھا۔جس کی وجہ سے حکومتی کنٹرول کے تحت ایک اچھی معاشی بنیاد قائم ہوچکی تھی مگر یہ سب بدعنوان عناصر کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا۔مشرف حکومت نے بھی اپنے وزیر خزانہ اور بعد میں وزیر اعظم بننے والے شوکت عزیز کے ساتھ مل کر تاجر پرور پالیسی جاری رکھی۔پاکستان کی جی ڈی پی تیزی سے بڑھتے ہوئے 7% کو پہنچ گئی جس کی مدد سے پاکستان آئی ایم ایف کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب رہا اور ساتھ ہی مشرق وسطی سے پاکستانی سرمایہ کاروں کو پاکستان لے آیا گیا۔پھر دہشت گردی کے خلاف جنگ کے تحت القاعدہ اور اسامہ کیخلاف کاروائیوں کیلئے امریکی امداد کی فراہمی بھی شروع ہوگئی''۔(21)

بلاشبہ مشرف کے پچھلی شریف حکومت پر بدعنوانی کے الزامات غلط نہیں تھے تاہم خود اس کی حکومت بھی بدعنوانی کی دلدل میں دھنسی رہی۔''ڈان''میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں غلط طور پر لیے گئے قرضوں اور معاف کرائے جانے والے قرضوں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کے مطابق''پاکستان نے پچھلے چار سالوں کے دوران بیرونی ذرائع سے 15ارب ڈالر کے قرضے حاصل کیے۔جبکہ چار سالوں کے دوران ملکی بینکوں اور مالیاتی ایجنسیوں نے 33ارب روپے کے قرضے معاف کیے۔2003ء میں 5.6 ارب ،2004ء میں 10.42ارب اور اگلے سال 19.338ارب کے قرضے معاف کیے گئے۔یہ اعداد وشمار سینٹ میں سٹیٹ فنانس منسٹر عمر ایوب نے پیش کیے تھے۔صنعتی شعبہ اس معافی میں سب سے زیادہ 25.82ارب سے مستفید ہوا۔تجارتی شعبے کو 3.21ارب جبکہ زرعی شعبے کو 2.83ارب کی معافی دی گئی۔وزیر مملکت کے بقول 2003ء میں 11220،اگلے سال 17869،2005ء میں 45249 جبکہ اس سے اگلے سال 19378افراد قرضوں کی معافی سے مستفید ہوئے۔صرف صنعتی شعبے کے محض گیارہ افراد کو 2003ء میں 12.37ارب روپے معاف کیے گئے''۔''معاملہ صرف 33ارب روپے کے قرضے معاف کرانے تک ہی محدود نہیں تھا ،انہی لوگوں

نے 24ارب روپے کی سبسڈی بھی حاصل کی یوں یہ رقم 57ارب روپے جا بنتی ہے''۔پاکستان میں تجارت کو منافع بخش سمجھا جاتا ہے خاص طور پر اگر درآمدی اشیاء کی تجارت ہو۔یہی وجہ ہے کہ صنعتی اداروں کی اکثریت نے غیرملکی اشیاء کے اپنے اپنے دفاتر قائم کر رکھے ہیں۔اس کے باوجود بھی انہوں نے 21 ارب روپے کے قرضے معاف کرالیے۔اسی طرح زرعی فارموں کے کئی مالکوں نے واپس نہ کرنے کی نیت سے قرضے لیے اور معاف کرالیے''۔ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تین سالوں میں 33 ارب روپے معاف کرائے گئے اور دوسری طرف 24ارب روپے مزید حاصل کر لیے گئے۔اور یوں خسارے سے دہرا منافع حاصل کرلیا گیا۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نظام حکومت جیسا بھی ہو پبلک فنڈز کی لوٹ کھسوٹ میں کوئی فرق پڑتا ہے نہ اس میں کوئی کمی آتی ہے۔

یہ قرضے حکومتی بینکوں اور مالیاتی اداروں نے حکومتی دباؤ پر چند سیاستدانوں کو نوازنے کیلئے دیئے گئے۔اور جو بعدازاں انہی سیاستدانوں کے ایسے ہی دباؤ کے باعث معاف بھی کردیئے گئے۔''آج اسمبلی میں براجمان کئی ارکان ان معافیوں سے مستفید ہونے والوں میں سے ہیں۔اس میں چوہدری شجاعت اور اس کا خاندان قابل ذکر ہے۔اسی طرح اسلام آباد میں مقیم و متعین بینکوں کو کنٹرول کرنے والے سینئر افسروں کے عزیز و اقارب کو بھی قرضے جاری کیے اور معاف کردیئے گئے''۔''250ارب روپے کے قرضے ایسے تھے جو نان پرفارمنگ تھے۔جن کو لینے والی بڑی کمپنیوں کا ارادہ ہی یہی تھا کہ یہ واپس ہی نہ ہوں یا پھر ایک دو قسطیں دینے کے بعد خود کو دیوالیہ قرار دلوالیا گیا۔''صنعتکاروں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ اپنی بھاری رقوم بینکوں میں جمع کرائے رکھتے اور وہاں سے منافع لیتے ہیں جبکہ وہ کام چلانے کیلئے بینکوں سے قرضے لینا پسند کرتے ہیں۔2004ء میں پاکستان کا بیرونی قرضہ 35.47ارب ڈالر تھا جو اب بڑھ کر 40.172ارب ڈالر ہو چکا ہے۔2006ء میں پاکستان نے 3.014ارب ڈالر کا قرض لیا۔یہ بیرون ملک میں کام کرنے والے پاکستانیوں کی طرف سے 6.5 ارب ڈالر کی خطیر رقم ملک میں آنے اور سمندر پار سے 6.4ارب ڈالر کی براہ راست سرمایہ کاری کیے جانے کے باوجود کیا گیا۔3.56 ارب ڈالر کا اس کے باوجود پچھلے سال مزید قرض لے لیا گیا''۔(22)

ہم پہلے اس کیفیت کا ذکر کر چکے ہیں کہ 1960ء کی دہائی میں جب عالمی سرمایہ داری عروج پر تھی اور ایوب دور میں بے پناہ ترقی ہو رہی تھی، تب وہ بے مثال ترقی بھی عوام اور سماج کی حالت اور حالات کو نہیں بدل سکی تھی۔معاشی ترقی سماج کو ترقی دینے سے قاصر رہی تھی۔سو مشرف / شوکت حکومت سے سماج

کی ترقی کی توقع رکھنا ہی وقت اور سوچ کا ضیاع ہے۔شجاع نواز جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے،مشرف شوکت حکومت کی معاشی نگرانی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مشرف نے جب اقتدار سنبھالا تو سب سے بڑا چیلنج معیشت کی تشویشناک حالت تھی۔پاکستان کے پاس غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر 300 ملین ڈالر رہ گئے تھے۔جبکہ براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری کا حجم بھی اتنا ہی تھا۔نسبتاً سیاسی استحکام،نائن الیون کے بعد بیرون ملک سے آنے والا زرمبادلہ،معیشت کا غیر ملکی سرمائے کیلئے کھول دیا جانا،ان سب نے مل کر ایک صحتمند معیشت کو جنم دیا جس کے نتیجے میں زرمبادلہ کے ذخائر 13 ارب ڈالر تک پہنچ گئے۔بیرون ملک پاکستانی محنت کشوں کی رقوم جو 2001ء میں 1.1 ارب تک تھیں وہ بڑھ کر 2005ء میں 4.3 ارب تک پہنچ گئیں۔کھلے وسیلوں کے ذریعے 10 ارب ڈالر پاکستان آئے''۔(23)

امریکہ کی طرف سے دی گئی امداد دہشت گردی کے خلاف جنگ کیلئے فراہم کی گئی مگر اس سے کچھ بھی نہ روکا جاسکا ہاں البتہ اس کی شدت' وحشت اور بربریت میں اضافہ ضرور ہوا۔اس بہیمانہ مہم جوئی کے نتائج واثرات نے لوگوں کے دکھوں اور اذیتوں میں خاص طور پر قبائلی علاقہ جات کے علاقے میں ایک نہ ختم ہونے والا نیا سلسلہ شروع کر دیا۔پھر بھی اس خونریز ایذا رسانی کے باوجود اس امداد نے میکرو اکنامکس اعداد وشمار کے چہرے کو منور کر دیا۔اسی طرح براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری پر بھروسہ کیا گیا جو ساری دنیا میں نیولبرل معاشی ترقی کا واحد قابل تقلید رواں دواں ماڈل قرار پا چکا ہے،ریکنامکس یا مانیٹرازم کی اس طرز ترقی نے محروم ومقہور عوام الناس کے دامن کو خالی ہی نہیں رکھا بلکہ اس کو تار تار بھی کر ڈالا۔

نجکاری،ڈاؤن سائزنگ،ڈی ریگولیشن اور لبرلائزیشن کی پالیسیاں جو 1980ء کے بعد کی حکومتوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی غلامی کرتے ہوئے اپنائیں اور مسلط کیں ان کی وجہ سے عوام کی غربت میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور یہ سب اہتمام محض ایک مقصد کیلئے کیا گیا کہ براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری کو کسی نہ کسی طرح ملک میں لایا جاسکے۔مشرف اور شوکت دونوں شدومد سے ان وحشیانہ پالیسیوں پر عملدرآمد کرتے رہے۔اس اعتبار سے ان کی دلچسپی اور شدت شاید ان کے پچھلے حکمرانوں سے بھی کہیں بڑھ کر تھی۔مگر جیسا کہ ہر جگہ ہوا،پاکستان میں بھی ان پالیسیوں نے معیشت کو بوجھل کرتے ہوئے ریاستی اور پبلک اخراجات میں شدید اضافہ کر دیا۔اس کی وجہ سے جائیداد سمیت چند ایک شعبوں میں صارفیت کو تو عروج ملا مگر یہ عروج محض درمیانے طبقے کی کچھ پرتوں تک ہی محدود رہا۔آبادی کی اکثریت اس سے

باہر اور محروم رہی۔ ٹریکل ڈاؤن معیشت کا ایک قطرہ بھی عوام تک نہیں پہنچا البتہ اس نے عوام کا خون ضرور نچوڑ لیا۔ اس طرز معیشت اور طرز ترقی نے الٹا انفراسٹرکچر کو ہی تہس نہس کر کے رکھ دیا جو پہلے ہی کمزور اور خستہ ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں صارفیت اور انفراسٹرکچرل سہولتوں کے مابین ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ غربت شدید ترین اور امارت مزید ترین ہوتی چلی گئی۔ بینکوں نے اس کیفیت سے خوب اور بھرپور منافع کمایا جبکہ کارپوریٹ سیکٹر نے ان اصلاحات سے تجوریاں بھریں۔ جواریوں اور سٹہ بازوں نے بھی اس بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ انڈیکس ممکنہ بلندیوں کو چھونے لگا اور سٹاک مارکیٹ خوش بختی کا مرکز و محور بن گئی۔

مگر سماجی اور معاشی ابتری نے اپنا اظہار ہڑتالوں اور مظاہروں کے علاوہ دہشت گردی اور جرائم میں بے انت اضافے کی شکل میں کرنا شروع کر دیا۔ درمیانہ طبقہ سخت بیتاب و بے چین ہو چکا تھا۔ مشرف کی سامراج دوست پالیسیوں کی شدت اور طبقاتی بنیادوں پر کسی انقلابی مزاحمت کی غیر موجودگی نے اسلامی بنیاد پرستی کو خالی جگہ پر کرنے کا موقع اور رستہ فراہم کر دیا۔ 2002ء کے الیکشن میں متحدہ مجلس عمل MMA پر مبنی اسلامی اتحاد نے کسی بھی الیکشن میں سب سے زیادہ سیٹیں جیت لیں۔ اگرچہ ان کو ملنے والے ووٹ انتہائی کم تھے مگر جتنی سیٹیں ملیں اتنی یہ کبھی پہلے حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اسی سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سماج کتنا اور کس قدر معطل ہو گیا تھا۔

اسلامی بنیاد پرستوں نے سامراج مخالف پروپیگنڈے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا بلکہ یہ امریکہ دشمنی کے چیمپین بن گئے۔ عراق و افغانستان پر سامراجی جارحیت کے بعد پاکستان میں امریکہ مخالف جذبات میں شدت آ چکی تھی۔ پیپلز پارٹی اور دیگر قوم پرست سیکولر پارٹیاں کھل کر اس سامراجی جارحیت کے خلاف سامنے آنے سے گریز کرتی رہیں۔ چنانچہ ملاؤں کیلئے میدان صاف ہوتا گیا مگر اس کے باوجود بھی یہ اپنی سماجی بنیادیں استوار نہیں کر سکے۔ عوام سامراج اور بنیاد پرستوں کے منافقانہ جھگڑے کی حقیقت کو سمجھ رہے تھے۔ ایم ایم اے کی قیادت کی طرف سے بار بار کے ملین مارچ کے کھوکھلے دعوے عیاں ہوئے جب یہ محض چند ہزار لوگ ہی جمع کر سکے۔ مشرف کو کسی قسم کا نہ خطرہ تھا نہ مزاحمت۔ ریاستی ایجنسیاں سرگرمی سے خواہشمند اور ضرورتمند سیاستدانوں کے ساتھ سمجھوتے اور مصالحتیں ترتیب و تشکیل دے رہی تھیں۔ ان سیاستدانوں کی بے کسی اور بے بسی کی اس سے بڑی کیا مثال ہو گی کہ ان میں سے کوئی بھی مزاحمت یا مذمت تک کیلئے بھی تیار نہیں تھا۔ احتجاج یا جدوجہد کی جیسے ان میں کبھی کوئی حس ہی نہیں تھی کہ عوام کے

مسائل پر بات کرتے ہوئے ان کو منظم اور متحرک کر کے ایک انتہائی کمزور اور جعلی آمریت کا مقابلہ کیا جاتا۔ حالت یہ تھی کہ مشرف اور نواز شریف کے مابین چور دروازوں سے گفت وشنید شروع ہو گئی۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان کی پالیسیاں ہی مشرف کی پالیسیوں سے کسی طور مختلف نہیں تھیں۔ دوسری بات یہ کہ سیاستدان جدوجہد کا رستہ اختیار کرنے کی بجائے چور رستوں کی طرف زیادہ مائل تھے۔

پیپلز پارٹی بہت عرصے سے اقتدار سے باہر چلی آ رہی تھی چنانچہ اس کے دائیں بازو کے لیڈر آرزومند تھے کہ کسی طرح سے اقتدار مل جائے' ان کی رال ٹپک رہی تھی۔ ان کو اپنا اپنا حصہ بٹورنے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ سبھی سیاسی پارٹیاں مشرف آمریت کی طرف سے ہر جمہوری ڈرامے میں بھرپور حصہ لیتی رہیں۔ بلدیاتی انتخابات سے لے کر عام انتخابات تک یہ آئینی تقاضوں کو پورا کرنے میں پیش پیش رہیں جو یہ آمریت اپنے لیے درکار قانونی حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے کراتی رہی۔ ان کی شراکت مشرف کو قانونی و جمہوری بہروپ فراہم کرتی رہی۔ یہ محض امریکی پشت پناہی اور خیر خواہی نہیں تھی جس نے مشرف کو تقویت دیئے رکھی۔ اگر ہلکی سی بھی عوامی مزاحمت سامنے آ جاتی تو یہ بھک سے اڑ بھی سکتی تھی۔ بورژوا سیاستدانوں کا طبقاتی کردار اور سانجھ وہ بنیادی ہتھیار تھا جو مشرف کی طاقت اور اقتدار کا اہم ترین سبب بنا رہا۔ مگر سماجی تضادات، نیچے سے شدید ہوتے معاشی بحران اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کو مزید شدید کرنے کے دباؤ نے اپنے اثرات مرتب اور ظاہر کرنا شروع کر دیئے۔ مشرف حکومت کا لاغر پن ایک بوجھ بن کر اس کے اوپر ہی گرنا شروع ہو گیا۔ پاؤں پھسلنے لگے تو سرپرستوں نے بھی ہمیشہ کی طرح اپنا دست شفقت پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔

2005ء میں ٹیلی کمیونیکیشن (PTCL) کے محنت کشوں کی شاندار ہڑتال، پی آئی اے کی ہڑتال اور پھر دوسرے شعبوں کی ہڑتالوں نے حکمران طبقات کے آنگن میں خطرے کی گھنٹیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ 2006ء کے آخر میں امریکہ اور برطانیہ نے مشرف اور بے نظیر بھٹو کے مابین معاملات سلجھانے کی کوشش شروع کر دی۔ عوام کے ساتھ رابطے' ان کو منظم و متحرک کرنے کی بجائے پارٹی قیادت ایک آمر کے ساتھ مذاکرات، سمجھوتوں اور مصالحتوں کے راستے پر چل پڑی۔ لندن میں بے نظیر اور نواز شریف کے مابین نام نہاد چارٹر آف ڈیموکریسی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ جمہوریت کے تقدس کے نام پر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مگر ایک دوسرے کے خلاف کھیل رہے تھے۔ یہ سب کچھ جمہوریت کے تقدس کی بحالی کے نام پر ہو رہا تھا جس میں جمہور کے خوابوں اور عذابوں کا کوئی عمل دخل تھا نہ نام و نشان۔ اس

کیفیت میں سامراج کے ایک معتبر اور بڑے دلال نے معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے مشرف کے ساتھ ان کے وسیع اور جامع اتحاد کا رستہ ہموار کر دیا تا کہ تبدیلی کے نیچے سے پھٹنے سے پہلے اوپر سے لے آئی جا سکے۔

وکلاء تحریک

تحریکیں جو اس دوران چلائی گئیں وہ بڑے اور بنیادی مطالبات پر نہیں چلائی گئی تھیں اور وہ جو زیادہ تر سیاسی بالائی ڈھانچے، صنفی امتیاز اور اسی قسم کے درمیانے طبقے کے مسائل کے گرد تھیں۔ ان تحریکوں کو کھمبیوں کی طرح اگنے والے ٹی وی چینلوں کی بھرپور نشریاتی مہم نے زیادہ اچھالے رکھا۔ ان کے پیچھے چھوٹی موٹی معمولی پارٹیاں یا پھر این جی اوز کا عمل دخل زیادہ تھا۔ میڈیا انہیں بجا طور پر ''سول سوسائٹی'' کے معاملات ظاہر کر رہا تھا، ویسے بھی ان میں بائیں اور دائیں بازو کی کوئی پہچان نہیں رہی تھی نہ یہ ان کا مسئلہ تھا۔ پیٹی بورژوا طبقاتی مصالحت کے علمبردار یہ حلقے درمیانے طبقے کے حلقوں میں نمایاں نظر آ رہے تھے۔ غیر مہذب' گنوار عوام ان سب معاملات سے الگ تھلگ اور بے نیاز ہی رہے۔

ان تحریکوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور موثر وکلا کی تحریک تھی جو چیف جسٹس افتخار چوہدری سمیت دوسرے 60 ججوں کی بحالی کیلئے چلائی گئی جنہیں مشرف نے برطرف کیا تھا۔ اس تحریک کے مطالبے میڈیا کے ناخداؤں اور سول سوسائٹی کے علاوہ کسی کے بھی وارے میں نہیں تھے اور اس کی قیادت ایک ایسے ملک میں آزاد عدلیہ کے مطالبے کی بات کر رہی تھی جس میں بسنے والوں کی اکثریت کو روٹی تک بھی رسائی میسر نہیں وہ بھلا سپریم کورٹ سمیت اعلیٰ عدالتوں میں کسی معاملے یا مقدمے کی فیس کی ادائیگی کا تصور بھی کیسے کر سکتی ہے!

مشرف ان تحریکوں سے زیادہ میڈیا کی اپنے خلاف یلغار سے پریشان تھا لیکن یہ درحقیقت اس کی حکومت کی داخلی کمزوری ہی تھی کہ وہ میڈیا کے پروپیگنڈے کی وجہ سے ہچکولے لینے لگی تھی۔ چند ہزار افراد کے قافلے اور جلوس، بائیں اور دائیں بازو کی تخصیص کے بغیر ''سول سوسائٹی'' میں ڈھل چکے تھے۔ اس دوران پیپلز پارٹی کے کئی وکلا بھی اس تحریک کی فرنٹ لائن میں آ گئے۔ لیکن ان کا سارا زور اور اسرار اس تحریک کے ''غیر سیاسی'' کردار پر تھا۔ یہ عمل اپنی سرشت میں ہی انتہائی مبہم تھا۔ ایک غیر سیاسی تحریک ایک آمریت کے خلاف جدوجہد کر کے ایک سیاسی خلا کو پر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کئی بائیں بازو کے

گروپ، این جی اوز اور کچھ فرقہ پرست اس تحریک میں شامل ہو کر بورژوا مطالبات کیلئے سرگرم ہو چکے تھے۔ مشرف کو سب سے زیادہ حمایت نسل پرست نیو فاشسٹ ایم کیو ایم کی طرف سے فراہم کی جاتی رہی جنہوں نے وکلا تحریک کے خلاف دہشت پھیلائی اور تشدد بھی کیا۔

عدلیہ اور فوج کے مابین تصادم ریاست کے دوستونوں کے مابین لڑائی تھی۔ ان دونوں اداروں کی تخلیق کا بنیادی مقصد ہی سرمائے کی حکمرانی کو قائم اور عوام کی سرکشی اور بغاوت سے محفوظ رکھنا تھا۔ بحران کی شدت اور گہرائی میں اضافہ ہوتے ہی مشرف حواس باختہ ہوتا چلا گیا اور وہ اپنے تئیں متشدد ہو کر نظام کو بچانے کی کوششیں بھی کرنے لگا۔ دوسری طرف عدلیہ نے سوؤ موٹو ایکشن اور کچھ دیگر اقدامات لینے شروع کر دیئے جن کا مقصد نیچے سے عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو کسی حد تک کم اور مطمئن کرنا تھا۔ عدلیہ اور فوج کا یہ تصادم اور تنازعہ درحقیقت ریاست کے دو اداروں کے اندرونی اور باہمی بحران کی واضح عکاسی کرتا ہے۔

اس قسم کی تحریکوں میں انقلابی پروگرام کی بہت کم گنجائش ہوا کرتی ہے۔ تاہم دائیں بازو کے لوگ، روشن خیال قوتیں اور پیپلز پارٹی کے کچھ حصے مشرف کے اقدامات کی حمایت کر کے اس کی آمریت کی حمایت کر رہے تھے۔ وہ آمریت کی حمایت کے گناہ بے لذت کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اس کے بعد کس طرح وہ مشرف کے خلاف مزاحمت کرنے کا حوصلہ اور عوام کو متحرک کرنے کی اخلاقی جرات کر سکتے تھے؟ وکلا کی تحریک کسی چھوٹے تالاب میں پھنسی ہوئی ایک بڑی مچھلی کی مانند تھی۔ ایک وسیع اور گہرے سیاسی خلا کی موجودگی میں یہ وکلا تحریک اپنے محدود چھوٹے مقاصد کے باوجود اپنے قد و قامت سے کہیں بڑی محسوس ہونی شروع ہو گئی تھی۔ عوام نے ابھی سیاست کے خارزار میں قدم رکھنا تھا اور وہ بھی لاکھوں کی تعداد میں۔ اور جب یہ ہوا تو سبھی تحریکیں ششدر رہ گئیں، یہ اپنی مقدار اور معیار میں اتنی بڑی اور طاقتور تحریک تھی کہ اس نے سارے سیاسی اور سماجی منظر نامے کو ہی بدل کے رکھ دیا۔

بحران کی شدت اور عدم استحکام کی روز افزوں بڑھتی ہوئی کیفیت میں سامراجیوں نے اپنی کوششیں تیز کر دیں کہ ایک ایسا سیٹ اپ قائم کر دیا جائے جس سے نظام کو درپیش خدشات اور خطرات ٹل جائیں۔ امریکہ و برطانیہ کی یہ سرتوڑ کوششیں بالآخر بے نظیر بھٹو اور پرویز مشرف کی بالمشافہ ملاقات کرانے میں کامیاب ہو گئیں۔ یہ ملاقات جولائی یا اگست میں ابوظہبی کے کسی شاہی محل میں ہوئی۔ اگرچہ دونوں طرف سے اس ملاقات کی تردید بھی کی جاتی رہی۔ ''ڈیل'' کیلئے سب سے زیادہ بیتاب مشرف تھا، جس

کی ساکھ اور حیثیت اس کی امریکی غلامی اور کاسہ لیسی کی بدولت دن بدن کمزور ہوتی چلی جارہی تھی، اسے ایک قابل اعتماد دوست کی ضرورت تھی جو اس کا ساتھ دے اور عوام کی خواہشات اور مطالبات کو سنبھالنے میں کردار ادا کر سکے۔

بے نظیر بھٹو کا قتل

عوام کی امنگوں اور مطالبات سے نمٹنے کا کردار بے نظیر بھٹو سے زیادہ بہتر کون کر سکتا تھا۔ بے نظیر کی آمد، الیکشن کا انعقاد اور حکومت سازی کے سبھی مراحل کی انتہائی احتیاط سے منصوبہ سازی کی گئی تھی۔ بے نظیر کے پارٹی لیڈروں کو ایک بڑے مگر قابو میں رہنے والے استقبالی ماحول کا کہہ دیا گیا۔ نسل پرست فاشسٹ ایم کیو ایم کو جو مشرف کی پرانی اتحادی چلی آرہی تھی اور جو کراچی میں مبینہ عوامی حمایت کی دعویدار ہے' کو حکومتی حلقوں کی طرف سے ہدایت کر دی گئی کہ وہ اس معاملے میں بھرپور تعاون کرے۔ سول بیوروکریسی کو بھی متحرک کر دیا گیا تھا۔ یہ سب طے شدہ تھا اور امریکی مطمئن ہو چکے تھے کہ سب ان کی منشا اور منصوبے کے مطابق آرام سے ہو جائے گا۔

اور پھر 18 اکتوبر 2007ء کا دن آ گیا جس دن بے نظیر بھٹو نے ایک اور جلاوطنی ختم کر کے واپس آنا تھا۔ پارٹی لیڈر بسوں میں عوام کو بھر بھر کے لا رہے تھے۔ وہ اس ہدف کو ممکن بنانے میں اس لیے متحرک تھے کہ اسی کی بنیاد پر ان کی الیکشن ٹکٹوں کے فیصلے ہونے تھے۔ امریکہ کے سامنے لوگوں کی ایک بڑی معقول تعداد پیش کی جانی تھی تاکہ اسے پارٹی کی عوام میں مقبولیت کا ثبوت دکھایا جا سکے۔ بیشتر سیاسی پنڈت، جید ٹی وی مبصرین، دانشور اور اخباروں کے کالم نگار سب اس بات پر متفق علیہ تھے کہ عوام اب کسی تحریک میں نہیں آئیں گے۔ ان کا یہ یقین کامل تھا کہ اب محنت کش طبقہ کبھی بھی اپنے حقیقی مسائل کیلئے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ اب ماضی کے قصے بن چکے ہیں۔

مگر ان سب تصورات، خیالات کے بالکل برعکس ''غیر سول سوسائٹی'' اچانک باہر نکل آئی۔ کچلے ہوئے۔ نظر انداز ہوتے ہوئے، نسلوں کا استحصال سہنے والے، محرومیوں کو بھگتتے لاکھوں انسان اچانک امڈ آئے۔ جن کے جسموں پر میلے کچیلے پھٹے پرانے لباس تھے، جن کے پاؤں میں ٹوٹے ہوئے سلیپر اور اکھڑی ہوئی چپلیں تھیں۔ خاک میں لتھڑے اور تھکے بجھے چہرے لیے ہوئے یہ عام لوگ جن کی آنکھیں ایک امید سے بھری تھیں اور امید بھی ایسی جو اس ظالمانہ نظام کے خلاف غم و غصے اور بغاوت سے

لبریز تھی۔ غیر سول سوسائٹی کے یہ عام لوگ بے نظیر بھٹو کی ایک جھلک دیکھنے آئے تھے' ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو کی جھلک جس نے ایک دفعہ پھر زبانی طور پر ہی سماج اور زندگی کو بدلنے کا نعرہ بلند کیا تھا۔ چالیس سالوں کی روایت اور امید نئی نسلوں میں چھلک پڑی تھی۔

بے نظیر جب ائیر پورٹ سے باہر آئی تو عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس جم غفیر نے نہ صرف ڈیل کو پھاڑ کر پھینک دیا تھا بلکہ سامراج کے سبھی منصوبے خاک میں ملا دیئے تھے۔ دراصل یہ لاکھوں درماندہ انسان بے نظیر کو اپنے وہ چہرے دکھانے آئے تھے جن پر بھوک، بیماریوں، دکھوں اور محرومیوں نے اپنے نقش مرتب کر رکھے تھے۔ استقبال کے لیے آئے ہوئے بے کسوں کے اس بیکراں ہجوم نے ریاست کے مصالحت کرنے پر مجبور ہونے والے دھڑوں کو دہلا کے رکھ دیا۔ اس دن کا ایک غیر معمولی واقعہ بے نظیر کے ٹرک کے عین آگے، جب وہ شاہراہ فیصل پہنچا، امریکی جھنڈوں کا نذر آتش کیا جانا تھا۔ یہ پیپلز پارٹی میں موجود مارکسیوں اور پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمپین اور عوامی امنگوں سے وابستہ دیگر انقلابی نوجوانوں کی تنظیموں کے سرگرم کارکن تھے جو سامراج کی علامت کو جلا رہے تھے۔ ہر آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر جلائے جانے والے امریکی جھنڈوں کے مناظر کو کچھ ٹی وی چینلوں پر دکھایا جاتا رہا جبکہ باقی اسے دکھانے سے احتراز کرتے رہے، شاید اس لیے کہ ڈیل اور منصوبے پر کوئی آنچ نہ آنے پائے مگر ریاست کے چند بدمعاش ادارے کچھ اور ہی سوچنے اور کرنے پر تل گئے۔ ان کی پہلی کاروائی شاہراہ فیصل کے کارساز چوک پر دھماکے کی شکل میں سامنے آئی۔ دوسو سے زائد انسان لقمہ اجل جبکہ ہزاروں زخمی ہو گئے۔ بے نظیر کو ٹرک سے نکال کر ریاستی تحویل میں بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔

مگر عوام اس سب سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔ الیکشن مہم شروع کر دی گئی اور اس میں جوش و جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ عوام کی امنگیں دن بدن انقلابی ہو کر سرگرم و سرکش ہوتی جا رہی تھیں۔ بے نظیر ڈیل اور امریکیوں کے ساتھ رابطوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مگر عوام نے جوق در جوق بے نظیر کے جلسے جلوسوں میں شریک ہو کر اسے بھی متاثر اور انقلابی کرنا شروع کر دیا۔ عوام کا بے نظیر کے ساتھ اس طرح جڑنا اور بے نظیر کا یوں عوامی ہوتے جانا ریاست کے قدامت پسند حلقوں کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ مسئلہ ان کیلئے یہ نہیں تھا کہ وہ ان اجتماعات میں کیا کہہ رہی تھی، مسئلہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کی امیدوں کا مرکز و محور بنتی چلی جا رہی تھی۔ اکیس سال پہلے جب اپریل 1986ء میں بے نظیر اپنی پہلی جلاوطنی کے بعد پاکستان آئی تھی تو تب دس لاکھ انسان لاہور ائیر پورٹ پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ تب بے نظیر کے پاس قوتیں جمع ہو چکی تھیں مگر وہ

عوام کی امنگوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی 1968/69ء کے انقلاب کی روایت ایک بار پھر زندہ ہو کر سامنے آنا شروع ہو گئی تھی جس سے گھبرا کر ریاست کے متحارب دھڑوں کے تضادات سرخ نشان تک آ گئے۔ ان تضادات کے تصادم کے نتیجے میں 27 دسمبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو ریاستی دھڑوں کی چوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ کر قتل ہو گئی۔

عوام کی سرکشی' امیدوں اور امنگوں کو ایک طرف رکھ کر بھڑکتے ہوئے انتقام میں بدل گئی۔ سرکاری دفاتر، دکانیں، بینک، ریلیں' پولیس سٹیشن اور سرمایہ دارانہ نظام کی سبھی علامتیں اس غم و غصے کے طوفان کی زد میں آ گئیں۔ بے نظیر کے قتل کر دیئے جانے کی خبر نے ریاست کو بھک سے اڑا کر رکھ دیا۔ پاکستان کے ہر شہر ہر قصبے میں یہی ہوا۔ سارا ملک جام ہو گیا اور کوئی ایک پہیہ بھی نہیں چل سکا۔ عوام کے اس غیض وغضب کے سامنے ریاست کو سرنگوں ہونا پڑ گیا۔ ایک دہکتے بہتے ہوئے لاوے کے آگے کوئی ٹھہر بھی کیسے سکتا ہے۔

مشرف حکومت نے تین دنوں کے سرکاری سوگ کا اعلان کر دیا۔ وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کچھ نہیں سکتا تھا۔ ہر شہر' ہر قصبے' ہر دیہات میں عوام سرکش و سرگرم باہر نکلے ہوئے تھے اور دہشت کی علامت قرار دیئے اور سمجھے جانے والے نام نہاد فاشسٹ اسلامی بنیاد پرستی اور ایم کیو ایم کے رعب و دبدبے کا نام ونشان بھی گم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ ایسے گم ہوئے جیسے ان کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ فوج' رینجرز اور پولیس کو کئی دنوں کے بعد معاملات کی دیکھ بھال کی جرات نصیب ہوئی۔ اور وہ اس وقت بھی عوام سے سہمے سہمے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عوامی ردعمل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سامنے آ گیا تھا۔

پیپلز پارٹی اور رجعتی دائیں بازو کا اختلاط

تحریک اپنے تمام تر جوش جذبے اور ولولے کے باوجود بے نتیجہ رہی۔ اگر پیپلز پارٹی کی قیادت ایک عام ہڑتال کی کال دیتے ہوئے 8 جنوری کو ہی الیکشن کرانے کا مطالبہ کرتی تو نتائج اور صورتحال ہی کچھ اور ہوتی۔ مگر قیادت ڈیل کو برقرار رکھنا چاہ رہی تھی۔ عوام کے دکھ اور غصے کو مایوسی اور سوگواری میں بدل کے رکھ دیا گیا۔ زرداری کو شریک چیئرمین بنا دیا گیا۔ جدوجہد کیلئے متحرک کرنے کی بجائے پارٹی کارکنوں اور عوام الناس کو بے نظیر بھٹو کی روح کے ایصال ثواب کے لیے دعاؤں میں مصروف کر دیا گیا۔ سامراجی اس سارے عمل کے دوران پارٹی لیڈروں سے رابطے میں تھے اور وہی تھے جو اس نازک موڑ پر بھی فیصلے

کر رہے تھے۔ پارٹی قیادت ہر قدم پر مشرف آمریت کے ساتھ سمجھوتے کرتی رہی۔ دونوں امریکیوں کے رحم و کرم پر تھے۔ ایک بار پھر پارٹی قیادت نے سوشلزم کو سرمایہ دارانہ جمہوریت تلے دفنا دیا۔ جمہوریت کو بہترین انتقام قرار دے دیا گیا۔ جبکہ عوام کی امیدوں' امنگوں اور ضرورتوں کا انتقام صرف ایک انقلاب کے ذریعے ہی ممکن تھا۔

الیکشن 18 فروری تک کیلئے منسوخ کر دیئے گئے۔ پیپلز پارٹی نے اس دوران روٹی' کپڑا اور مکان سمیت وہ سب نعرے بھی ترک کر دیئے جو اس سے پہلے جوش جذبے سے لگائے جاتے رہے۔ قیادت نے نام نہاد قومی مصالحت و ہم آہنگی کا جعلی ڈھونگ رچانا شروع کر دیا۔ اسلامی بنیاد پرستوں، قوم پرستوں، نسل پرست فاشسٹوں اور دائیں بازو کی رجعتی پارٹیوں کے ساتھ الحاق و اتحاد کو ایک ''عظیم قومی مصالحت'' کا بہروپ دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ طبقاتی جدوجہد کو روکا بھی کیسے جا سکتا تھا۔۔۔۔!

اس دوران امریکیوں اور ریاستی مشینری نے ملی بھگت سے پاکستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ دھاندلی زدہ الیکشن ممکن بنانے کی تیاری بھی مکمل کر لی۔ اگر ان اندوہناک واقعات کے بعد الیکشن 8 جنوری کو ہی ہو جاتے تو پیپلز پارٹی کو دو تہائی اکثریت مل جاتی۔ مگر 18 فروری کے الیکشن ایک اور ہی مختلف کہانی سامنے لے کر آئے۔ پیپلز پارٹی کے دائیں بازو کے لیڈروں کے جمہوری رد انقلاب کی وجہ سے لوگ بددل' مایوس اور بیزار ہو گئے۔ ان کی تحریک کو ان کی امیدوں اور جوش جذبے سمیت دھتکار دیا گیا اور یوں ایک بار پھر میدان سرمایہ داروں اور ان کے گماشتہ بدعنوان سیاستدانوں کے ہاتھ آ گیا۔ سب سے منافع بخش کاروبار کیلئے منڈی کھول دی گئی۔ اس الیکشن کے نتائج امریکی منشا اور مفادات کے عین مطابق تخلیق دیئے گئے۔ نواز شریف کا چھوٹا بھائی الیکشن سے کچھ دن پہلے ہی واشنگٹن یاترا کر کے آیا تھا۔ یہاں تک کہ بنیاد پرستوں نے بھی نواز شریف کی مسلم لیگ کے ذریعے امریکہ کو اپنے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرا دی۔ نواز لیگ کو اس نیازمندی کے صلے میں الیکشن نتائج میں قومی اسمبلی کی تقریباً پچاس اضافی سیٹیں تیار کر کے دے دی گئیں۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ ''عالمی برادری''، سامراجی اور ملکی میڈیا، یورپی یونین، مغربی مبصرین، این جی اوز یہاں تک کہ سول سوسائٹی تک نے بھی اس الیکشن کو صاف اور شفاف قرار دے دیا۔ الیکشن کے درست ہونے کو عالمگیر سند فراہم کر دی گئی۔

لیکن اگر کوئی الیکشن کے عمل کو ذرا سی باریک بینی سے پرکھے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ایک گلی سڑی انتخابی مشینری کا تباہ شدہ انفراسٹرکچر، ووٹوں کی فہرستیں، اور سب سے بڑھ کر خود پاکستان کا اپنا

ڈھانچہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہاں موجودہ و مروجہ سیٹ اپ میں شفاف الیکشن قطعی ناممکن العمل ہیں۔ بہر حال پیپلز پارٹی الیکشن کی فاتح اور پارلیمنٹ کی سب سے بڑی قوت قرار پائی مگر سچ تو یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کی یہ فتح، اس کی نئی حکومت کی پالیسیوں کی صورت میں عوام کی شکست بن گئی جنہوں نے اس کی مدد کی تھی اور اسے ووٹ دیئے تھے۔

پیپلز پارٹی کے دائیں بازو کے لیڈروں نے دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کی نسبت مخلوط حکومت بن جانے پر زیادہ خوش تھی۔ محض اس لیے کہ کسی طرح اس ظالمانہ مگر مرتے ہوئے نظام کو بچا لیا جائے جس نے عوام کی زندگیاں تلخ کر رکھی ہیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت عوام سے اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ ان حالات میں تنِ تنہا کوئی حکومت نہیں لینا چاہتی تھی، چنانچہ الیکشن سے پہلے ہی ایک مخلوط حکومت کیلئے سر تسلیم خم کر دیا گیا۔ مگر دائیں بازو کی پارٹیوں نے پیپلز پارٹی کو مخلوط حکومت کی قیادت کی طرف دھکیل دیا اور خود تماشا دیکھنے لگ گئیں۔ وہ سب پیپلز پارٹی کو ایک مایوسی، بیزاری اور بدنامی کی کیفیت میں دھکیلنے کے آرزومند تھے تاکہ حکومت اور طاقت ان کے قدموں میں آ گرے۔ عوام بھی تب تک مایوسی و بیزاری کی اتھاہ دلدل میں دھنس چکے ہوں گے اور یوں وہ حکمرانوں کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ 2007ء کے آخری دنوں میں عوام کے جوش اور جذبے کی شدت کا دباؤ اتنا زیادہ تھا اور یہ اسی کا ہی نتیجہ تھا کہ پیپلز پارٹی کے نامزد وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کو متفقہ و بلا مقابلہ منتخب کر لیا گیا۔ یہ شاید پہلا اور آخری اس حد تک منافقانہ اور بزدلانہ اتحاد و اتفاق تھا جو پاکستان کے حکمران طبقات نے پرولتاریہ اور محروم عوام کے خلاف کیا تھا۔

بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد اور باوجود بھی ریاست کی کمزور دراڑیں مستحکم نہیں کی جا سکیں بلکہ یہ اور بھی خستہ ہوتی گئیں۔ اس کے اندرونی تضادات کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ آپس میں دست و گریباں ریاستی دھڑے تو محض عوام کی سرگرم تحریک کے مدہم پڑنے کے منتظر تھے۔ مخلوط حکومت کے قیام کے صرف 41 دنوں بعد نواز لیگ کے پندرہ وزیر کابینہ سے مستعفی ہو گئے۔ یہ نئی نویلی حکومت اپنی ابتدا سے ہی عوام کیلئے تباہی کے نئے سامان لیے جلوہ افروز ہونے لگی۔ یہ مخلوط حکومت بنیاد پرست جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمان گروپ اور پشتون قوم پرست نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ مل کر بنائی گئی جبکہ فاشسٹ ایم کیو ایم اور کچھ آزاد ارکان بھی اس کا حصہ بن گئے۔ 10 مئی 2008ء کی اشاعت میں ''اکانومسٹ'' اس صورتحال پر ایک مایوس کن تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''پاکستان پھر سے مشکل صورتحال سے دوچار

ہو چکا ہے ۔غذائی بحران کی وجہ سے فسادات،صنعتوں سے ملازمین کی چھانٹیاں اور برطرفیاں، بارہ گھنٹوں سے زائد لوڈ شیڈنگ کے خلاف مظاہرے معمول بن چکے ہیں۔سرمائے کے انخلا نے روپے کی قدر میں 5% کمی کر دی ہے۔قبائلی علاقوں میں انتہا پسندوں کے خلاف جنگ کا کچھ نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ عدم استحکام نے دوبارہ سیاست کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا ہے''۔(24)

عوام پر کیے جانے والے شدید حملے جنہیں کمزور مشرف آمریت بھی عوام کے ردعمل کے ڈر سے کرنے سے گریز کرتی رہی وہ اس نئی عوامی حکومت نے بلا دھڑک کرنا شروع کر دیئے۔ابتدائی چھ ماہ کے دوران ہی افراط زر، کرنٹ اکاؤنٹ خسارے، بیرونی قرضوں پر سود کی ادائیگی بلند ترین سطح پر پہنچ گئی۔ میکرو اکنامکس کے سبھی اعداد و شمار جو دائیں بازو کی مشرف حکومت چالاکی اور عیاری کے ساتھ ہیر پھیر کرتے ہوئے بڑھا چڑھا کے پیش کرتی چلی آ رہی تھی، جلد ہی اپنی اصل حقیقی شکل میں سامنے آ کے پاکستان کی معیشت کی زبوں حالی کو ننگا کر گئے۔ بلاشبہ ایسی جارحانہ مزدور دشمن پالیسیاں ایک عوام کی وسیع تر پرتوں میں مقبول ترین عوامی حکومت کے ذریعے ہی لاگو کروائی جا سکتی تھیں جسے ہر شعبے اور ہر طبقے کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا ہو۔روپے کی شرح تبادلہ گرتی چلی گئی جس کی وجہ سے ادائیگیوں کے توازن کو شدید جھٹکا لگا اور درآمدی بل میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔نواز شریف کا معاشی گرو اسحاق ڈار جسے ساتھ ملا کر پیپلز پارٹی کی حکومت کوئی معاشی معجزہ کر دکھانے کی متمنی تھی، کو اچانک نواز لیگ کی طرف سے واپس بلا لیا گیا تا کہ پیپلز پارٹی کے مختلف النوع معیشت دانوں کی معاشی میدان میں انتظامی صلاحیتوں کو برہنہ کر دیا جائے۔مگر جو کچھ ہوا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔قیمتیں اچانک انتہاؤں کو پہنچ گئیں، بے روزگاری اور غربت میں یکدم اضافہ ہو گیا، بجلی کی بندش اور طویل لوڈ شیڈنگ، اور پہلے سے ہی پست معیار زندگی میں مزید گراوٹ آتی چلی گئی۔درماندہ عوام کیلئے یہ سب شاہ مدار کی مار جیسا تھا۔ان کی مایوسی گہری ہوتی چلی گئی۔نہ صرف یہ کہ پچھلی حکومت کی پالیسیاں جاری و ساری تھیں بلکہ اب ان کی شدت اور جارحیت میں اضافہ کیا جا رہا تھا جن کی وجہ سے کروڑوں انسانوں کی ذلتوں' اذیتوں میں بے رحمانہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ایک معمولی وقفے کے بعد خودکش بم دھماکے ایک بار پھر شدت اور زیادہ بربریت کے ساتھ وقوع پذیر ہونے لگے۔ یہ عراق سے بھی بڑھ گئے۔''دی نیوز'' کے مطابق ''دہشت گردی سے ہونے والی ہلاکتیں دس افراد روزانہ کو پہنچ گئی ہیں۔ذرا تصور کیجئے کہ 11129 معصوم انسان اس بربریت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔پچھلے چار مہینوں میں 4141 انسان مار دیئے گئے۔پچھلے سال مولانا فضل اللہ کی تحریک

نفاذ شریعت محمدی نے سوات میں 56 دیہاتوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔صوبہ سرحد کے 24 میں سے 20 اضلاع شدت پسندوں کے مضبوط گڑھ بن چکے ہیں۔حکومت ان دھماکوں میں ہلاک ہونے والوں کو 300000 روپے معاوضہ دے رہی ہے جبکہ شدت پسند خودکش بمبار جیکٹ پہننے والوں کو 1500000 دے رہے ہیں۔اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون زیادہ پرکشش معاوضہ دے رہا ہے!''۔(25)

افغانستان میں ہزیمت سے دوچار امریکی بدحواس ہو کر اب قبائلی علاقوں کو اپنا نشانہ بنانے پر تل گئے۔ڈرونز، فائٹر طیاروں اور وحشیانہ بمباری کے ذریعے سویلین افراد ہلاک ہونے لگے،جن میں بچوں اور خواتین کی بڑی تعداد شامل تھی۔مشرف کی رخصتی کے ساتھ ہی ان حملوں کی شدت بڑھتی چلی گئی جس سے ہلاکتیں بھی بڑھنے لگیں۔یہ ایک ایسی اشتعال انگیزی تھی جسے بے بسی کے ساتھ قبول کرنے کے سوا حکمرانوں کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔شمالی علاقہ جات میں فوجی کاروائی سے جو ہلاکتیں ہوئی ہیں وہ 1965ء جنگ کی ہلاکتوں سے بڑھ چکی ہیں۔تباہ کن واقعات کا تسلسل خود پاکستانی فوج کے اندرونی نظم وضبط کو کمزور کرتا جا رہا ہے۔درمیانے اور نچلے درجے کے سپاہیوں میں اضطراب اور تذبذب بڑھتا چلا گیا جس کی وجہ سے بھگوڑوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔امریکی زیادہ شدت کے ساتھ فوجی کاروائیوں کا مطالبہ کر رہے تھے مگر مشرف فوج کے حوصلوں کو بحال اور اندرونی اختلافات کو متوازن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔چنانچہ وہ امریکی دباؤ کو نظرانداز کرتا رہا جس کے باعث امریکی neo cons اس سے برہم ہو گئے۔مشرف نے امریکی کٹھ پتلی حامد کرزئی کے ساتھ تعاون اور اپنا مرتبہ اس کے برابر کرنے سے انکار کر دیا۔مشرف کے متبادل قوت کے طور پر بے نظیر بھٹو کو واپس بلا لینے کی امریکی پالیسی ناکام ہو چکی تھی۔مگر سامراجی شدت پسندوں کے پاس دوسرا رستہ ہی نہیں تھا وہ یہی کر سکتے تھے۔مشرف کی تیزی سے گرتی ساکھ اور اس نئے جمہوری کھیل سے انہیں نیا موقع میسر آ رہا تھا۔انتہا پسند دائیں بازو کے نمائندے زلمے خلیزاد، جو زرداری اور کرزئی دونوں کا قریبی دوست اور حصہ دار بھی ہے، نے زرداری کو پاکستان کا صدر بن جانے کے لیے ساز گار حالات اور مواقع مہیا کیے۔مشرف نے استعفٰی دیا اور پھر کوئی پتہ ہلے بغیر زرداری پاکستان کا سویلین صدر بن گیا۔

سیاسی اور معاشی بدعنوانی

نام نہاد صدارتی الیکشن کے نتائج' جو پہلے ہی بدعنوان سیاستدانوں کے مابین رشوتوں اور بلیک میلنگ کے ذریعے منڈی بن چکا تھا، ایک طے شدہ کاروائی تھی۔ فیصلہ واشنگٹن میں ہوا جس پر عملدرآمد پاکستان میں کیا گیا۔ پاکستان میں آئینی طور پر صدارتی الیکشن واحد ایسا مرحلہ ہے جس میں امیدوار کو اپنے اثاثے ظاہر نہیں کرنے پڑتے۔ نیوکون کی اس الیکشن میں کامیابی اس وقت ہوئی جب زرداری کی تقریب حلف برداری میں کرزئی نے بھی شرکت کی۔ ''زرداری اس وقت پاکستان کا دوسرا امیر ترین آدمی ہے''۔ (26) شریف خاندان بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں ہے نواز شریف پاکستان کا چوتھا امیر ترین آدمی ہے''۔ (27) نواز شریف کی شاید خواہش اور جستجو ہے کہ وہ اس دوڑ میں کسی طرح پہلے نمبر پر آنے کیلئے ایک بار پھر اقتدار میں آجائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے رونا روتے رہتے ہیں کہ ہم تو بھیانک ظلم وزیادتی کا شکار چلے آرہے ہیں۔ واہ کیا مظلومیت ہے اور کیسے کیسے مظلوم ہیں!

زرداری کا صدر بننا پاکستان کے سماج کو درپیش مسائل اور بحران کا حل نہیں۔ بلکہ اس سے نئے سماجی وسیاسی بحرانوں اور دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ موجودہ حکومت کا سامراج پر اتنا اور اس قدر انحصار اور اس کی اتنی بیہودہ غلامی نئی نہیں، یہ تقریباً ہر حکومت کا وطیرہ چلا آرہا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ پاکستانی سرمایہ داری کے بحران کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس بحران کی ایک بڑی وجہ سامراج کا بے رحمانہ استحصال ہے اور المیہ یہ ہے کہ پاکستانی سرمایہ داری کو اپنے آپ کو قائم رکھنے کیلئے مزید سامراجی انحصار درکار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جب تک سماجی ومعاشی نظام کے طور پر قائم ودائم ہے سامراج کی گرفت اور بھی سخت ہوتی رہے گی۔ اس سے بچا جاسکتا ہے مگر یہ حکمران طبقات کیلئے انتہائی سودمند ہے اور حکمران طبقہ اپنے مفادات اور مراعات کیلئے کروڑوں انسانوں کو غربت اور محرومیوں میں دھکیلتا چلا آرہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکے بغیر سامراجی جبر واستحصال سے نجات ممکن ہی نہیں۔

بورژوا معاشی معیار کے حوالے سے ستمبر 2008ء تک پاکستان معاشی دیوالیہ پن کو پہنچ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ 1998ء میں کیے جانے والے دھماکوں کے بعد دوسری بار ایسا ہونے جارہا تھا۔ معاشی معنوں میں پاکستان ایک ناکام ریاست بننے کے قریب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کو ایک بار پھر آئی ایم ایف کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے۔ امریکہ اپنے ہی اندرونی معاشی بحران کی شدت کی وجہ سے

اس بار کچھ دینے سے قاصر تھا۔ایشین ترقیاتی بینک نے فوری طور پر 500 ملین ڈالر کا قرضہ دیا ہے تا کہ اس کی معیشت کچھ سانسیں لے جائے۔جبکہ حکومت کو معاشی استحکام کو ممکن بنانے کیلئے 15 ارب ڈالر درکار ہیں۔پیپلز پارٹی کی حکومت غالباً پہلی حکومت ہے جس نے ایندھن، بجلی، غذائی اجناس، کھاد سمیت کئی بنیادی اشیا پر دسمبر 2008ء تک حکومتی سبسڈی ختم کر دینی ہے۔چنانچہ پہلی بار کسی حکومت نے آئی ایم ایف کی تمام تر شرائط تسلیم کر لیں اور باقی ماندہ اثاثوں کی نجکاری کا بھی فیصلہ کر لیا ہے۔

نجکاری کے خلاف پہلی مزاحمت قادر پور گیس فیلڈ کی طرف سے ایک ہڑتال کی شکل میں سامنے آئی۔فوریکس ریزروز 800 ملین ماہانہ کے حساب سے گرتے جا رہے تھے۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تجارتی خسارہ ان کو ہڑپ کر رہا تھا۔بیرون ملک پاکستانی محنت کشوں کی طرف سے بھیجی جانے والی 6.5 ارب ڈالر کی خطیر رقم غیر ملکی قرضوں اور ان پر سود کی مد میں خرچ ہو رہی تھیں جبکہ مختلف شعبوں میں ہونے والی غیر ملکی سرمایہ کاری ملک چھوڑ رہی تھی۔28-22 ستمبر 2008ء کے ''ڈان اکنامکس ریویو'' کے مطابق ''وفاقی حکومت کی طرف سے آئل کمپنیوں کو 100 ارب روپے کے بقایاجات کی ادائیگی کی وجہ سے حکومتی اخراجات جو مالی سال 2006ء میں 16.2 ارب روپے تھے بڑھ کر 63.10 ارب روپے ہو چکے ہیں۔جبکہ اندرونی اخراجات بھی 69.9 ارب سے بڑھ کر 156.2 ارب روپے تک پہنچ گئے ہیں۔پبلک ریلیشنز کے حوالے سے بجٹ ایک مذاق بن کے رہ گیا ہے۔سٹیٹ بینک آف پاکستان کے تخمینوں کا تجزیہ کیا جائے تو آمدنی زیادہ اور خرچہ کم دکھایا جاتا ہے۔کل اخراجات 1555 ارب دکھائے گئے جو بعد ازاں 25.3% اضافے کے بعد 1948 ارب روپے تک بڑھ گئے۔کرنٹ اخراجات کا تخمینہ 1056 ارب روپے لگایا گیا جو بعد میں 43.6% بڑھ کر 1516 ارب روپے ہو گیا''۔(28)

آئی پی پی (بجلی پیدا کرنے والے آزاد ادارے) جو بے نظیر بھٹو کی پچھلی حکومت کے دوران 1995ء میں ملٹی نیشنل کمپنیوں نے معاہدے کر کے قائم کیے تھے، پیچھے اپنے دفتروں کو سالانہ ایک ارب ڈالر منافع بھیجتے چلے آ رہے ہیں۔اگر ایک منصوبہ بند معیشت کی حامل مزدور حکومت ہوتی تو پاکستان ان اداروں کی اب تک کے منافعوں پر مبنی 15 ارب ڈالر کی رقم سے بجلی باہر کے ملکوں کو برآمد کر رہا ہوتا۔مگر ہماری حکومت نے ان اداروں کو اخراجات کی مد میں پیداوار دوبارہ شروع کرنے کیلئے 33 ملین ڈالر دیئے ہیں۔بجلی کے نرخوں میں 31 فیصد اضافہ 15 فیصد سیلز ٹیکس کے ساتھ اس رات کر دیا گیا جب زرداری صدارت کا حلف لے رہا تھا۔اتصالات، وہ عرب ملٹی نیشنل کمپنی ہے جس نے مشرف دور میں پی ٹی سی ایل

کو بھاری کمیشن دے دلا کر خریدا تھا، اتنی ہی رقم منافع کے طور پر کما چکی ہے جتنی اس نے اس کی خریداری پر خرچ کی تھی۔ باقی ماندہ اداروں کی نجکاری کے بعد کس طرح' کس طریقے سے ملکی معیشت چلائی اور سنبھالی جاسکے گی اور کب تک؟ سرمایہ دارانہ ماہرین کے پاس اس سوال کا کوئی درست جواب نہیں ہے۔

پاکستان کی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ خود اس کے اپنے معاشی ماہرین اس نظام میں سے کسی بھی قسم کی بہتری کے اعتماد سے محروم ہو چکے ہیں۔ معیشت تیزی سے نیچے کی طرف لڑھکتی چلی جارہی ہے۔ اگر ہم پاکستان کی معاشی ترقی کے سرکاری اعداد وشمار کو ہی مدنظر رکھیں تو بھی کیفیت انتہائی دلخراش نظر آتی ہے۔ اگرچہ خود سرکاری ماہرین ان سرکاری اعداد وشمار پر کم اعتبار کرتے ہیں۔ 2008/9ء کے مالی سال کا تخمینہ عالمی بینک کے ڈائریکٹر اور پاکستان کے ایک سابق وزیر خزانہ شاہد جاوید برکی نے تیار کیا ہے۔

پاکستان کے جی ڈی پی کی شرح ترقی: ماضی اور مستقبل(29)

	2004-05	2005-06	2006-07	2007-08	2008-09	جی ڈی پی کا فیصد
جی ڈی پی	9.0	5.8	6.8	5.8	4.2	100
اشیائے ضرورت پیدا کرنے والا شعبہ	9.5	5.1	6.0	3.2	4.2	44.9
☆زراعت	6.5	6.3	3.7	1.5	4.0	21.0
☆مینوفیکچرنگ	15.5	8.7	8.2	5.4	4.2	18.8
☆تعمیرات	18.6	10.2	17.9	15.2	10.0	3.6
☆بجلی اور گیس	-5.7	-26.6	2.5	-14.7	-8.0	1.5
خدمات کا شعبہ	8.5	6.5	7.6	8.2	8.0	55.1

(ذریعہ: پاکستان اکنامک سروے 08-2007ء، ڈان کے 09-2008ء کے تخمینے)

اگرچہ یہ اعداد وشمار بتدریج تنزلی کو آشکار کرتے ہیں تاہم مالیاتی بحران اور ادائیگیوں میں عدم توازن کہیں زیادہ ہے۔ خود برکی کے اپنے زراعت کے حوالے سے اندازے ایک خوش گمانی تو قرار دیئے

جاسکتے ہیں مگر تناظر نہیں۔معیشت کے سبھی شعبے بحران کی زد میں ہیں جن میں سے سب سے بدترین حالت زراعت کی ہے۔ 2000ء کی مردم شماری سے زراعت کے بارے میں جو اعداد وشمار سامنے آئے ہیں ان کے مطابق 37% دیہی آبادی زمین کی مالک ہے ان میں سے 61% کے پاس پانچ ایکڑ سے بھی کم زمین ہے۔کاشتہ اراضی سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ بڑے مالکان کو ہی نصیب ہوتا ہے۔یوں زرعی شعبے میں ہونے والی ترقی سے دیہاتوں میں امارت وغربت کا فرق بڑھتا جاتا ہے۔ زرعی شعبے میں ترقی کی نفی ڈان میں شائع ہونے والی ایک اور رپورٹ میں کی گئی ہے جو پاکستان کی سب سے بڑی نقد آور فصل کپاس کے متعلق ہے۔''یہ خبر آرہی ہے کہ ہم سال 2008/9ء کیلئے طے کیا گیا 14.11 ملین گانٹھوں کا ہدف پورا نہیں کرسکیں گے۔بہتر کاشت کے باوجود ایسا ہوگا۔مسلسل چار سالوں سے ہم ہدف پورا نہیں کر پا رہے۔پچھلے سال کی نسبت سے اس سال کپاس کیلئے حالات بھی سازگار ہیں مگر ہدف کا حصول مشکل ہوگیا ہے۔یہ بات وزارت خوراک وزراعت ولائیوسٹاک میں تعینات زرعی ترقیاتی کمشنر عبدالقادر بلوچ نے ڈان سے گفتگو کرتے ہوئے کہی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کم پیداوار کی وجہ سے ٹیکسٹائل کے شعبے کو دھاگہ درآمد کرنا پڑے گا۔پچھلے سال کی کمی کی وجہ سے شعبے کو اگست 2007ء سے جولائی 2008ء تک مجبوراً 1.291 ارب ڈالر خرچ کر کے 4.6 ملین گانٹھیں باہر سے منگوا کر اپنی ضرورت پوری کرنی پڑی تھی جبکہ اس سال درآمد پر زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ خرچ کرنا پڑے گا۔اس کی بنیادی وجہ کھاد کی قیمت میں ہونے والا اضافہ ہے جو پچھلے چھ ماہ کے دوران 600 روپے فی بوری سے بڑھ کر 3100 روپے فی بوری ہو چکا ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی دوسری اہم ضرورتوں بجلی' پانی اور ترسیل کے اخراجات بھی بے تحاشا بڑھ چکے ہیں۔یہ صورتحال چھوٹے کاشتکاروں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دے گی''۔(30)

دیہی علاقوں کے اندر منڈیاں امیر اور غریب کے مابین بدترین تفاوت کی حامل ہیں۔اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام UNDP کی رپورٹ کے مطابق غریب کسانوں کو ان کی ضروریات زیادہ داموں پر بیچی جبکہ اس کی پیداوار کم داموں پر خریدی جاتی ہیں۔یہ سلوک بڑے زمینداروں کے ساتھ نہیں ہوتا۔اس کے نتیجے میں چھوٹے کسان اپنی پیداوار کا ایک تہائی ان منڈیوں کے استحصال کی بھینٹ دے رہے ہیں۔رپورٹ کے مطابق 51% مزارعے اپنے قرضوں کے بوجھ تلے دب جانے کی وجہ سے مالکان کی قید وبند بھگتنے پر مجبور ہیں۔اس کا 57% حصہ بیگار مزدور بن کر بغیر اجرت ومعاوضے کے مالکوں کا کام

کر رہا ہے۔ جبکہ اس کا 14% منڈیوں کے نرخوں سے کہیں کم اجرت پر مزدوری کر رہا ہے۔ رپورٹ کہتی ہے کہ دیہات کے 65% غریب لوگ کم خوراک، صاف پانی کی عدم دستیابی اور سیوریج کی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے بیماریوں کی زد میں ہیں۔ بیماری ایک بڑا عنصر بن کر غریبوں کی غربت بڑھائے چلی جارہی ہے کیونکہ علاج معالجے کی مہنگائی، کم آمدنی کے ساتھ مل کر ان کی زندگی کو مزید ہولناک بنائے ہوئے ہے۔ اس سے ایک ایسا سٹرکچرل عنصر ترتیب پا رہا ہے جو غربت' نابرابری کو جنم اور فروغ دینے کے ساتھ ساتھ جی ڈی پی کی شرح ترقی کو غریبوں کی شرح پیداوار کو ترقی دینے سے بھی روک رہا ہے۔ موجودہ مالی سال 9-2008ء کے دوران بھی کپاس کے علاوہ دیگر فصلوں کیلئے اہداف اور پیداوار کی شرائط اور صورتحال بھی اسی جیسی ہیں۔ برکی کا تجویز کردہ 4.2% کی شرح ترقی کا ہدف توقع سے کہیں زیادہ برے طریقے سے ناکام ہوگا۔ امریکہ میں بینکوں اور سرمایہ کاری کے شعبوں میں ہونے والی گراوٹ ایک عالمی سست روی یا کساد بازاری کو جنم دے رہی ہے۔ اس کے پاکستان کی معیشت پر بہت بھیانک اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کیفیت میں جی ڈی پی کی شرح ترقی 2.1 تک محدود ہوسکتی ہے۔

لینن نے ایک بار قرار دیا تھا کہ سیاست سوائے مرتکز شدہ معیشت کے کچھ بھی نہیں ہوا کرتی۔ جہاں معیشت کا یہ عالم ہو وہاں سیاست کے کیا رنگ روپ اور کیسے انداز سامنے آئیں گے۔ اگر مخلوط حکومت کو، قائدین کو، ان کی سازشوں کو، سیاسی اور نظریاتی غداریوں کو دیکھیں تو پاکستانی سیاست کا سارا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے جو حالیہ دنوں میں تو اور بھی ابتر و بدتر ہو چکی ہے۔ ہمارے حکمران طبقات، ان کے جرنیل، ان کی افسر شاہی اور ان کے سیاسی نمائندے، عوام کے ساتھ جو گزر رہی ہے اس سے قطعی بے نیاز اور بے پرواہ ہیں اور عوام اس نظام کی بدولت جن حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں وہ ناقابل تصور اور ناقابل برداشت ہو چکے ہیں۔

1981ء کی عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ کے مطابق ''اس علاقے میں آج صحت کی جو کیفیت ہے، اس کے مقابلے میں 1857ء میں اس سے کہیں بہتر و برتر سہولتیں میسر تھیں''۔(31) 2005ء میں مملکت خداد کے اندر دس ہزار لوگ ہر ہفتے خط غربت کے نیچے گر جاتے تھے، اب یہ تعداد پندرہ ہزار فی ہفتہ ہو چکی ہے۔ یہ اعداد و شمار نہ بھی مستند ہوں تو بھی ایشیائی ترقیاتی بینک کے اعداد و شمار کے مطابق 47% آبادی مکمل غربت کی شکار ہے؛ جبکہ 78% آبادی دو ڈالر یومیہ سے کم پر زندہ ہے۔ 80% آبادی مالیاتی مسائل کی وجہ سے غیر سائنسی علاج کرانے پر مجبور ہے۔ ستمبر 2008ء

کے نیوزلائن جریدے میں شائع ہونے والی عالمی ادارہ صحت کی رپورٹ کے مطابق ''پاکستان میں فروخت ہونے والی 50% ادویات جعلی ہیں''۔(32) ورلڈ فوڈ پروگرام کے آفیشلز کے مطابق'' پاکستان کی 173 ملین آبادی کا نصف قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے غذائی قلت کا شکار ہو چکا ہے ۔مارچ سے ستمبر 2008ء تک غذائی عدم تحفظ کا شکار افراد کی تعداد 6 کروڑ سے بڑھ کر 7.9 کروڑ تک پہنچ گئی ہے''۔(33) قیمتوں اور اجرتوں میں اضافے میں خلیج میں شدید اضافہ ہو چکا ہے۔اکثریتی آبادی کی قوت خرید میں 50% کمی واقع ہو چکی ہے''۔یہ رپورٹ مارچ میں آئی تھی۔یونیسف کے مطابق پاکستان میں ہر سال دو لاکھ بچے گندا پانی پینے، ہیضہ، ٹائیفائیڈ اور گیس کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔137 غریب ترین ملکوں کی فہرست میں پاکستان تعلیم کے شعبے میں خرچ کرنے والوں میں 134 ویں جبکہ صحت میں 137 ویں نمبر پر ہے۔جبکہ دنیا میں تباہ کن اسلحے کے خریداروں میں پاکستان 11 ویں نمبر پر ہے۔(34)

''ہیومن ڈیویلپمنٹ ان ساؤتھ ایشیا''محبوب الحق انسٹیٹیوٹ کی طرف سے شائع ہونے والی دستاویز ہے جو دس سالوں کی تجزیاتی رپورٹ پر مشتمل ہے جس کے مطابق اس عرصے میں پاکستان میں؛اوسط شرح زندگی کم ترین سطح کو پہنچ چکی ہے' کم غذائیت کا شکار پانچ سال سے کم عمر بچوں کی شرح جو 1994ء میں 40 فیصد تھی' منجمد ہو کر اس عرصے میں 38 فیصد پر ہے'ایک لاکھ خواتین میں دوران زچگی 1993ء میں 340 کی شرح موت بڑھ کر 2000ء میں 500 تک پہنچ چکی ہے'1995ء میں صحت پر بجٹ کا حصہ 0.8 فیصد جبکہ 2004ء میں یہ کم ہو کر 0.4 فیصد رہ گیا'نصف سے زائد بالغ آبادی تاحال ناخواندہ ہے؛65 لاکھ بچے سکول جانے سے محروم ہیں ،یہ تعداد دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے' 1998ء میں پرائمری سطح پر استاد شاگرد تناسب 32 فیصد تھا جو 2004ء میں بڑھ کر 37 فیصد ہو گیا' 1995ء میں تربیت یافتہ اساتذہ کی شرح 82 فیصد تھی جو 2004ء میں کم ہو کر 78 فیصد تک آ گئی' 1992ء میں تعلیم پر جی ڈی پی کا 2.4 فیصد خرچ کیا جاتا تھا جو 2004ء میں 2 فیصد ہو چکا ہے'73.6 فیصد آبادی دو ڈالر روزانہ سے کم پر زندگی بسر کر رہی ہے؛1990ء میں دیہات میں غربت کی شرح 31 فیصد تھی جو 2004ء میں بڑھ کر 35.9 فیصد ہو گئی'1994ء میں خواتین کا لیبر فورس میں حصہ 27 فیصد تھا جو 2004ء میں کم ہو کر 26.5 فیصد ہو گیا'بغیر اجرت گھروں میں کام کرنے والی خواتین 46.9% ہیں جبکہ ایسے مردوں کی شرح 16.4% ہے۔

یہ رپورٹ بورژوا ماہرین کی تیار کردہ ہے۔جس سے ہمیں تعلیمی شعبے کی حالت زار کا پتہ چلتا ہے۔اسی رپورٹ میں آگے کہا گیا ہے۔''جو پروگرام ''تعلیم سب کیلئے'' شروع کیا گیا اس کی رپورٹ کہتی ہے کہ سکولوں سے باہر بچوں کی تعداد میں پاکستان نائیجیریا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔اس وقت ہمارے ہاں 65لاکھ بچے سکول جانے سے قاصر ہیں۔سکولوں میں اندراج نہ ہوسکنے والے کل بچوں میں سے 80%اندراج ہونے کے قابل نہیں ہیں، جو ہوئے ان میں سے بھی 10% سکولوں سے نکل چکے ہیں۔باقیوں کے بارے میں توقع ہے کہ وہ سکولوں میں داخل ہو جائیں گے۔کئی عوامل وعناصر ہیں جو اتنے بچوں کے سکول نہ جاسکنے کی وضاحت کرتے ہیں۔ایک سروے جو اس ضمن میں کیا گیا، والدین اس کی وجوہات یوں بیان کرتے ہیں۔74% بچے سکول جانے میں دلچسپی نہیں رکھتے' 73% کیلئے تعلیم کا حصول بہت مہنگا پڑتا ہے؛ 70% کیلئے سکول بہت دور پڑتے ہیں؛ 69% گھریلو ملازم کے طور پر کام کرتے ہیں؛ 67% اپنے گھر کی مدد کیلئے کام کاج کرتے ہیں؛ 66% سکولوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے محروم ہیں؛ 64% بچے پرائمری سکول سے آگے نہیں جاسکتے یا مہنگے ہونے یا اساتذہ کے ناروا سلوک کی وجہ سے۔غربت سکولوں تک بچوں کی رسائی میں سب سے بڑی وجہ ہے۔حکومت پاکستان کی طرف سے چودہ اضلاع میں کرائے گئے ایک سروے کے مطابق صرف 54% کو ہی پرائمری سکولوں تک رسائی میسر ہے''۔(35)

پاکستان میں 68% بیماریاں غربت اور صرف غربت کی پیداوار ہیں۔اموات کی اکثریت محض قابل علاج امراض کی وجہ سے ہوتی ہے مگر جن کا علاج غربت کے باعث کرایا ہی نہیں جا سکتا۔ 165000 خواتین دوران زچگی ہر سال محض اس لیے مرجاتی ہیں کہ ان کی دیکھ بھال کی مناسب سہولتیں موجود یا میسر نہیں ہیں۔جبکہ ہر ایک ہزار میں سے 137 بچے مناسب سہولتوں کی وجہ سے جنم لیتے وقت ہی مرجاتے ہیں۔انفراسٹرکچر کی زبوں حالی کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔بجلی کی کمی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔موجودہ ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے 6000 میگاواٹ بجلی درکار ہے۔ابتر ٹرانسمشن اور اوپن وائرنگ کی وجہ سے 35% بجلی ضائع ہو جاتی ہے۔رشوت اور بدعنوانی کی وجہ سے ایک بہت بڑی مقدار میں بجلی چوری الگ معاملہ ہے۔برطانوی راج میں بنائی گئی ریلوے کی حالت بھی دگرگوں ہے۔نام نہاد آزادی کے وقت بچھائی گئی ریلوے لائن میں اضافہ تو دور کی بات ہے اس میں کمی واقع ہو چکی ہے۔اسی طرح ریلوے سٹیشن نئے اور جدید بنائے جانے

کی بجائے بند یا ختم کر دیئے گئے ہیں۔آبپاشی کیلئے برطانویوں کا ہی قائم کیا گیا نہری نظام تباہ حال ہو چکا ہے۔نہروں کے بیڈز کی خرابی کی وجہ سے 30 فیصد پانی ضائع ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ایک طرف کاشت کیلئے پانی کام میں نہیں آتا تو دوسری طرف پانی کے زیادہ اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے یہ باہر نکل کر کاشت کی گئی فصلوں کو برباد کرتا چلا آ رہا ہے۔ملک میں چند بہت بڑی اور انتہائی جدید شاہراہیں تعمیر کی گئی ہیں مگر ملک کے طول وعرض میں دیہاتوں قصبوں اور شہروں کے اندر موجود سڑکیں انتہائی خستہ وشکستہ ہو چکی ہیں۔

ریاست ایک مضبوط و مستحکم سوشل اور فزیکل انفراسٹرکچر قائم کرنے میں مکمل ناکام رہی ہے۔ہر گزرتے سال میں معاشی وسماجی بحران اور حکمران طبقات کی بدعنوانی اور لوٹ مار کی وجہ سے پہلے سے موجود انفراسٹرکچر کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی آ رہی ہے۔پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت نے ترقیاتی کاموں کیلئے بجٹ میں مختص رقم میں سے 70 ارب روپے کٹوتی کر دی ہے۔عالمی بینک کی جانب سے ملنے والے فنڈز ہر سطح پر افسر شاہی کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ٹھیکیدار مافیا وزیر سے لے کر نچلے درجے کے ملازم تک نذرانے تحائف دے کر کام کرتا ہے جس کے بعد کام کیلئے رقم بہت ہی کم بچتی ہے۔اس طرز اور اس معیار کی بدعنوانی کی وجہ سے جو بھی تعمیر ہوتا ہے اس کا معیار انتہائی گھٹیا اور فرسودہ ہوتا ہے۔جو بھی نیا تعمیر ہوتا ہے وہ پہلے دن سے ہی ٹوٹ پھوٹ کی زد میں آ جاتا ہے۔

مگر سرکاری ٹھیکیداروں نے تعمیراتی منصوبوں وغیرہ میں خرچ ہونے والی رقم میں سے ریاستی بدعنوانی کے باوجود اربوں روپے کما لیے ہیں۔اس ٹھیکیدارانہ نظام نے ملک کی ترقی کا ستیاناس کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔کسی یونین کونسل کی کونسلری ہو یا قومی اسمبلی کی امیدواری، یہ ٹھیکیدار ہی سب سے بڑے فنانسر ہوتے ہیں۔کئی جگہوں پر تو یہی ٹھیکیدار خود عوامی نمائندگی کے منصب پر براجمان ہیں۔ پاکستان میں ہر سطح پر الیکشن پیسے اور مالیاتی سرمائے کا ہی کھیل بن چکے ہیں۔

احمد رشید کی 2000ء میں شائع ہونے والی کتاب میں پاکستانی جمہوریت کے ڈرگ مافیا کے ساتھ تعلقات کو عیاں کیا گیا ہے۔احمد رشید لکھتا ہے کہ ''ویسٹرن انسداد منشیات ایجنسیوں نے اسلام آباد میں منشیات مافیا کا پتہ کیا جو 1988/90ء کی پہلی پیپلز پارٹی حکومت اور بعد ازاں نواز حکومت کے دوران اسمبلی کے رکن بن کر آ چکے تھے۔منشیات کے تاجروں نے دونوں پارٹیوں کے امیدواروں کو بھاری فنڈز فراہم کیے۔منشیات کے تاجروں نے اپنے اس کالے دھن اور منشیاتی سرمائے کو صنعت اور

تجارت میں کھپایا۔ پاکستانی معیشت میں اس سرمائے کی مداخلت کا حجم 30% سے 50% تک ہے''۔(36) بیشتر وزارتیں اور عہدے پاکستان کی اس سیاسی بلیک مارکیٹ کے ذریعے ہی تفویض ہوتی ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جو پاکستانی جمہوریت کا اصل روپ ہے اور جو پاکستان کے غریب محروم عوام سے اپیل کرتی رہتی ہے کہ وہ ملک کے نام پر مسلسل قربانیاں دیتے رہیں اور اس ظالمانہ طرز حکمرانی کا کشتہ ستم بنے رہیں۔

ریاستی سرمایہ داری کے طور طریقوں سے پاکستان اپنا قومی انفراسٹرکچر قائم کرنے اور سماج کو ترقی دینے میں سراسر ناکام رہا ہے۔ مگر اس کے مہان ماہرین نے اس ناکامی کا جو حل نکالا وہ اس سے بھی زیادہ قبیح اور تباہ کن ہے۔ ریاستی سرمایہ داری کی جگہ اپنے سارے انفراسٹرکچر اور ریاستی سروسز سیکٹر کی نجکاری کرنے کا طریقہ اپنایا جانے لگا۔ 80ء کی دہائی کے بعد ریگنامکس اور تھیچرائٹ طرز معیشت کا یہ نیا مظہر تھا جسے ساری دنیا میں رواج دینا شروع کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کے معاشی ماہرین کس طرح اس سے گریز کر سکتے تھے! وہ تو مغربی یونیورسٹیوں میں سے نازل ہونے والے ہر فلسفے پر ایمان بجا لینے کو ہمیشہ سے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ نوآبادیاتی ذہنیت اور خوئے غلامی ہماری حکمران نسلوں کا شعار چلی آ رہی ہے۔

مگر انفراسٹرکچر کی اس نجکاری کے بھیانک اثرات مرتب ہوئے اور عوام کیلئے تو یہ ایسے ہے جیسے وہ آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب پاکستان کی 80% آبادی کو علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرنے سے انکار ہے۔ نجکاری زدہ علاج کرنے والے ادارے محض 15-25% مڈل کلاس کیلئے علاج فراہم کر رہے ہیں وہ بھی انہیں جو ان کے اخراجات برداشت کرنے کی توفیق رکھتے ہیں۔ نجکاری اور اس جیسی دوسری بہیمانہ انسانیت سوز پالیسیوں نے بڑے پیمانوں پر انسانوں کا حشر نشر کر کے رکھ دیا ہے۔ بیماری سے تڑپتے بزرگ اور بچے ہسپتالوں کے دروازوں پر دوائیوں سے بھرے میڈیکل سٹوروں کے بالکل سامنے ہی سسک سسک کے مر رہے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کی جیبوں میں ان کی زندگیاں بچانے والی دوائیوں کو خریدنے کیلئے مطلوبہ رقم ہی نہیں ہوتی۔ عوامی اثاثوں کی نجکاری سے کچھ غیر ملکی سرمایہ ضرور ملک میں آیا ہے مگر اس کی نوعیت اور نیت سرمائے کو فروغ دینے کی ہے محنت کو نہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ادارے یا کارخانے بیچنے سے لوگوں کیلئے روزگار کے مواقع پیدا ہونا تو دور کی بات' ہاں البتہ ہزاروں لاکھوں کو ان کے روزگار سے ضرور محروم کر دیا گیا ہے۔ پی ٹی سی ایل اور دوسرے سبھی نجکاری زدہ اداروں میں روزگار سے محرومی کے مناظر کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں

ہے۔ یہ تصور اور دعویٰ کہ نجکاری کے ذریعے اداروں میں سے بدعنوانی کا خاتمہ ہو جائے گا انتہائی غلط بیہودہ فضولیات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ 1977ء کے بعد سے ہر جمہوری و فوجی حکمران بنیادی طور پر اسی معاشی پالیسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے چلا آ رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی چوتھی حکومت جو اس وقت اقتدار کے مزے لے رہی ہے، انتہائی دائیں بازو کی حکومت ہے اور یہ جس طرح سے جس طرز کی مزدور دشمن پالیسیاں اپنائے چلی جا رہی ہے وہ اس سے پہلے کی کوئی ''پارٹی حکومت'' نہیں کر سکی۔ سب کی سب پارٹیاں اور قیادتیں جو اس وقت ملکی سیاست پر مسلط ہیں، ان کا میڈیا اور ان سب کا بنایا ہوا سیاسی ماحول یہ سب انہی معاشی پالیسیوں کی علمبرداری اور کاسہ لیسی کر رہے ہیں۔ بٹوارے کے اکسٹھ سالوں بعد حکمرانوں کی پالیسیوں نے اپنے عوام' اپنی قوم کی مسلسل تین نسلوں کو سوائے غربت' محرومی اور ذلتوں کے کچھ بھی نہیں دیا۔

ونسٹن چرچل برطانیہ کا سابق وزیراعظم ایک ایسا پرانی طرز کا قدامت پسند سیاستدان تھا جو اپنی طرز میں نسلوں تک چلی آنے والی کلاسیکل برطانوی اشرافیہ کے طور طریقوں کا حامل تھا۔ جب وہ عالمی جنگ میں شکست کھا چکا تھا تب بھی وہ اس خیال پر قائم تھا کہ برطانیہ اب بھی ہندوستان پر حکمرانی کے قابل ہے اور رہے گا۔ جس وقت وہ ہندوستان کو اقتدار کی منتقلی کرنے جا رہا تھا تب اس نے کہا ''طاقت بدمعاشوں، چوروں، ٹھگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ پانی کی ایک بوتل' روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ٹیکس سے نہیں بچ پائے گا۔ ان عوام کو صرف ہوا مفت ملے گی یا پھر لاکھوں بھوکے انسانوں کا خون مسٹر ایٹلی (چرچل کے بعد بننے والا برطانوی وزیراعظم) کی گردن پر ہوگا۔ یہ اقتدار ایسے کھوکھلے لوگوں کے ہاتھوں میں جا رہا ہے جن کا کچھ عرصے بعد نام و نشان تک بھی مٹ جائے گا''۔(37)

چرچل یہ باتیں جناح، نہرو اور گاندھی جیسے لیڈروں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ ایک الگ ملک کیلئے جناح کی حمایت کرنے والے نوخیز سرمایہ داروں اور جاگیردار اشرافیہ کا بھی کم سے کم کوئی خواب تو تھا۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے سامراجی ماہرین نے بھی سالوں نہیں بلکہ دہائیوں تک کیلئے منصوبہ بندی تو کی تھی۔ چرچل ان دنوں کو تاسف کے ساتھ یاد کر رہا تھا؛ اسے سمجھ آ رہا تھا کہ جس خوشحال ترقی پسند اور جدید پاکستان کا واویلا کیا جا رہا ہے وہ خواب زیادہ دیر نہیں بلکہ بہت جلد بکھر کر سامنے آ جائے گا۔ اور یہی ہوا ہے۔ مگر محنت کش اور عوام جو سرمایہ دارانہ نظام کی اس کالی رات کے وحشی جبڑوں میں آئے ہوئے تھے، کیسے اس سے جان چھڑا سکتے تھے؟ انہوں نے 1968/69ء کے انقلاب میں وہ کر کے دکھا دیا تھا جو

وہ تاریخی طور پر کر سکتے تھے۔

انقلاب کبھی ایک مارکسسٹ لینسٹ پارٹی کا نہ انتظار کرتا ہے نہ اس نے کیا تھا کہ ایسی قیادت اچانک بنے' ابھرے اور ہماری رہنمائی کرے۔اس وقت جب انقلاب ہو رہا تھا مزدوروں اور عوام کے پاس نہ تو وقت تھا نہ فرصت کہ وہ انقلاب بھی کرتے اور پارٹی بھی بناتے۔ہاں البتہ اس دوران انقلاب نے کم سے کم اپنی ایک عوامی روایت ضرور تخلیق کر دی جس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی ہے۔جس کا مرکزی اور بنیادی ہدف ہی یہی تھا کہ پاکستان میں سرمایہ داری کے نمائندہ بائیس خاندانوں کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا جائے۔اس انقلاب کا نعرہ تھا ''روٹی کپڑا اور مکان؛ مانگ رہا ہے ہر انسان''۔آج کے امیر ترین بائیس خاندانوں میں تو خود پارٹی کا شریک چیئرمین اور ملک کا موجودہ صدر بھی شامل ہو گیا ہے۔آج 1968/69ء سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کے پاکستان کے عوام کو ''روٹی کپڑا اور مکان'' کی شدید ضرورت ہے۔1968ء کے بعد سے پاکستان کے عوام کی سیاسی روایت پاکستان پیپلز پارٹی ہی چلی آ رہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ آج اس کی قیادت اپنی پارٹی کے اس بنیادی پروگرام کو ہی ترک کر چکی ہے جس کی تکمیل پر اس پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی تھی، یہ عوام کی روایت کو استعمال کرتی چلی آ رہی ہے اور وہ بھی غلط اور ناجائز استعمال۔اس تناظر میں پارٹی کی قیادت ہی محروم و درماندہ عوام کی خوشحالی کے رستے کی رکاوٹ بن چکی ہے۔پیپلز پارٹی کا قیام سوشلسٹ نظریات اور محروم طبقات کیلئے جدوجہد کی بنیادوں پر کیا گیا تھا مگر جن خطوط' جن پالیسیوں کو قیادت اپنائے ہوئے ہے وہ استحصال کا شکار عوام کی نہیں بلکہ استحصال کرنے والے سرمایہ دار طبقے کی خوشحالی پر مبنی ہیں۔ایسا زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا نہ ہی چلے گا۔دریا کبھی ایک کنارے نہیں بہا کرتے۔سماج میں حاوی رجعتیت کی پھیلائی ہوئی مایوسی اور بددلی کی کوکھ سے ہی جدوجہد کا ایک نیا دھارا پھوٹ نکلنے کا رستہ تلاش کر رہا ہے۔یہ دھارا جس دن بہہ نکلا اس وقت یہ پیپلز پارٹی پر بھی اپنے شدید اثرات مرتب کر کے رہے گا۔مقابل طبقات کا دباؤ پیپلز پارٹی میں سے سرمایہ دار عناصر کو ہٹا کے ایک طرف کر دے گا جو پارٹی کے پرولتاری عناصر پر مسلط چلے آ رہے ہیں۔یہ کیفیت ایک نئے عوامی انقلابی رجحان کی تخلیق کے امکانات کو پیدا کرے گی اور جو محنت کش طبقے کو درکار قیادت کی فراہمی کی طرف پہلا قدم ثابت ہو گی۔

نوٹس

1۔ان ٹوٹ دھارا،صفحہ 306

2۔پرولتاری انقلاب اور بھگوڑا کاؤتسکی ،(پراگریسو پبلشرز، ماسکو،1934ء)صفحہ 19-18

3۔کرسٹینا لیمب ،اللہ کا انتظار،(وائے کنگ)،صفحہ 295 ,21 ,20 ,19

4۔ایشین سروے،جلد 28 نمبر 10،اکتوبر 1988ء

5۔لارنس لف شلٹز،'بش، پاکستان اور منشیات: ہیروئین کی سلطنت'، دی نیشن،14 نومبر 1988ء

6۔ککس ،امریکہ اور پاکستان،صفحہ 257

7۔شجاع نواز،کراسڈ سورڈز،(آکسفورڈ)،صفحہ 379

8۔ایضاً صفحہ 281

9۔ایضاً صفحہ 385

10۔کرسٹینا لیمب ،اللہ کا انتظار،(وائے کنگ)،صفحہ 49

11۔بینظیر نے انٹرویو کے دوران اعتراف کیا کہ جماعت اسلامی کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے کمیٹی بنائی گئی تھی۔

کرسٹینا لیمب ،اللہ کا انتظار،(وائے کنگ)،صفحہ 52

12۔ کرسٹینا لیمب ،اللہ کا انتظار،(وائے کنگ)،صفحہ 56

13۔حسین حقانی، پاکستان: فوج اور مسجد کے درمیان،صفحہ 202

14۔افتخار احمد سروہے، سچ کبھی نہیں مرتا (انگریزی)، جنگ 1996،صفحہ 445

15۔جان وارڈ اینڈرسن اینڈ کامران خان، پاکستان نے جوہری دھماکے کر دیئے، واشنگٹن پوسٹ، 29 مئی 1998ء

16۔ڈان نیوز وائر سروس،23 ستمبر 1999ء

17۔شجاع نواز، کراسڈ سورڈز، (آکسفورڈ)، صفحہ 525

18۔مشرف، ان دی لائن آف فائر، (فری پریس 2006ء)، صفحہ 201

19۔ تھامس کین، چیئر اینڈ لی ایچ ہملٹن، 9/11 رپورٹ: امریکہ پر دہشت گرد حملوں پر نیشنل کمیشن، صفحہ 74-473

20۔ایڈرائن اینڈ کلارک، دھوکہ: پاکستان، امریکہ اور جوہری ہتھیاروں میں خفیہ تجارت، (واکر اینڈ کمپنی نیویارک)، 2007ء

21۔شجاع نواز، کراسڈ سورڈز، (آکسفورڈ)، صفحہ 533

22۔ڈان، 25 اگست 2007ء

23۔ایضاً صفحہ 547

24۔اکانومسٹ، 10 مئی 2008ء

25۔دی نیوز، 28 ستمبر 2008ء، صفحہ 9

26۔22 امیر ترین خاندانوں کی فہرست، اس کتاب کا ضمیمہ نمبر 2

27۔ایضاً

28۔ڈان، بزنس اینڈ اکنامک ریویو، 28-22 ستمبر 2008ء

29۔ڈان، بزنس اینڈ اکنامک ریویو، 29 ستمبر تا 5 اکتوبر 2008ء، شاہد جاوید برکی

30۔ڈان 28 ستمبر 2008ء

31۔لال خان، سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان، ایمسٹرڈیم، 1983ء، صفحہ 79

32۔نیوز لائن، ستمبر 2008ء، صفحہ 45

33۔دی نیوز آن سنڈے، ستمبر 2008ء

34۔ طبقاتی جدوجہد، شمارہ یکم تا 15 فروری 2008ء، صفحہ 12

35۔ہیومن ڈویلپمنٹ ان ساؤتھ ایشیا، 2007ء، محبوب الحق ڈویلپمنٹ سنٹر، صفحہ 147

36۔احمد راشد، طالبان: اسلام، تیل اور وسطی ایشیا میں نئی بڑی سازش، 2000ء، صفحہ 121

37۔ڈان 4 اکتوبر 2008ء

1968/69ء کے انقلاب کا تجدید عہد

انقلابی سوشلزم کا تناظر

انسانی سماج جو فطرتی اور تاریخی عمل کے طور پر انسان کے سامنے آتا ہے، اب ایک ایسا عمل بن گیا ہے جو اس کی رضا کارانہ کاروائی کا نتیجہ ہے۔ بے شمار معروضی قوتیں، جو تاریخ پر غالب رہی ہیں، اب انسان کے اپنے دائرہ اختیار میں آ چکی ہیں۔ اسی ایک نکتے کی وجہ سے ہی اب یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انسان آئندہ اپنی خود کی تاریخ شعوری طور پر مرتب کرے گا اور اس کا اپنا ہر ایک سماجی عمل اب اس کی خواہشات کے مطابق اثرات مرتب کرے گا۔ یہ ضروریات کی دنیا سے آزادی کی دنیا کی جانب انسانیت کی ایک بڑی چھلانگ ہوگی''۔

(فریڈرک اینگلز؛ 1820-1895ء)(1)

''انسان کی جسمانی اور روحانی فطرت کو کیسے پرورش دی جائے، اسے کس طرح مطابقت اور یگانگت سے لیس کیا جائے اور اسے کیسے بہتر بناتے ہوئے خوبصورت بنایا جائے؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے مگر جس کے جواب اور حل کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا صرف سوشلزم کے تحت ہی ممکن ہو سکتا ہے''۔

(لیون ٹراٹسکی؛ 1879-1940ء)(2)

1968-69ء کے انقلاب کے چالیس سال بعد پاکستان کے سماج کا تانا بانا بکھر چکا ہے۔ 18 اکتوبر 2007ء کو اچانک سامنے آنے والی تحریک جو سبھی مفروضوں اور کج فہمیوں کو لتاڑتے ہوئے سامنے آئی' اس پیاس اور تڑپ کا اظہار تھی جو ایک عرصے تک مایوسی اور بے بسی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ پاکستانی ریاست اپنے داخلی تضادات اور کمزوری کی وجہ سے اس ابھار کو دبانے میں ناکام رہی۔

کوئی بھی ریاست صرف فوج، عدلیہ، قانون ساز اداروں اور دوسرے محکموں پر مشتمل نہیں ہوا کرتی۔ پاکستانی ریاست اور اس کی تمام ایجنسیاں آج سیاسی پارٹیوں کی بالا پرت، اشرافیہ، مذہبی پیشوائیت اور ان کے اداروں مثلاً ذرائع ابلاغ اور سماج کے دوسرے موثر حصوں میں سرایت کر چکی ہیں۔ اس نے اپنے پنجے اتنی سختی سے گاڑے ہوئے ہیں کہ اس کے خلاف بغاوت کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ ریاست خواہ بادشاہت پر مبنی ہو، آمریت پر یا جمہوریت پر، یہ ہمیشہ حکمران طبقات کی طرف سے دیئے گئے بنیادی فرائض کو ہی پورا کرتی ہے۔ لیکن پاکستان میں جو سماج اور ریاست وجود رکھتی ہے وہ ایک مخصوص سماجی، معاشی ترقی کی پیداوار ہے جو صرف تقسیم کے بعد سے ہی نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے سے جاری و ساری ہے۔ چنانچہ ترقی کے ان طریقوں کو اچھی طرح سمجھنا بہت ضروری عمل ہے یعنی وہ سبھی سلسلے جن سے ریاست اور سماج تشکیل پاتے ہوئے بحران اور ابتری کی موجودہ کیفیت تک پہنچے ہیں۔ سیاسی معیشت کے نقطہ نظر سے پاکستان کو ایک نیم سرمایہ دار، اور نیم جاگیردار سماج قرار دیا جاسکتا ہے جو سرمایہ دارانہ طرز پیداوار اور طرز تبادلہ کے تسلط میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف پاکستان کا سرمایہ دار اپنی کمزور معاشی بنیادوں کی وجہ سے سامراج پر انحصار کرنے پر مجبور ہے جبکہ اسی دوران اس کی تاریخی کمزوری اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ جاگیرداری کی باقیات کے ساتھ اتحاد اور تعاون کرے۔ سب سے بڑھ کر یہ سرمایہ دارانہ سامراج کی سیاسی اور معاشی جکڑ بندیاں ہیں جس نے عالمی منڈی کو اپنے بدترین تسلط میں جکڑا ہوا ہے۔ اس تسلط کو آئی ایم ایف، عالمی بینک، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور ان جیسے دوسرے اداروں اور معاہدوں کے ذریعے قائم رکھا جاتا ہے۔

اس کتاب کا یہ موضوع نہیں کہ اس میں ایشیائی طرز پیداوار کو زیر بحث لایا جائے۔ لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ دنیا کے اس خطے میں یورپی سماج کی طرح کلاسیکل جاگیرداری کا کبھی وجود نہیں رہا۔ برصغیر پر مسلط یا متعارف کرائی جانے والی جاگیرداری برطانویوں کا تحفہ ہے۔ 1793ء میں بنگال اسمبلی میں لارڈ پالمرسٹن نے پرمانٹ سیٹلمنٹ ایکٹ (مستقل آبادکاری کا قانون) متعارف کروایا جو جنوبی

ایشیاء میں جدید جاگیرداری کی بنیاد بنا۔ برطانوی راج کے خاکے اس طریقہ سے ترتیب دیئے گئے کہ جن کے ذریعے مقامی وفاداروں کا ایک ایسا طبقہ تخلیق کیا جائے جو برطانوی سامراج کے کٹھ پتلی کے طور پر اپنی عوام سے غداری کرتے ہوئے انگریز سامراج کے مفادات کا نگران اور نگہبان بن جائے۔ پاکستان میں جاگیرداری کے وجود کی ساری تاریخ برطانوی راج کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔لیکن آج کل پاکستان میں سرمایہ داروں، جاگیرداروں، جرنیلوں، اعلیٰ افسر شاہی، ججوں اور بڑے سیاست دانوں کا ایک جالا سا(Nexus) قائم ہے۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے کہ ان سب کو ایک دوسرے سے کاٹ کر دیکھا یا سمجھا جاسکے۔بعض اوقات ایک ہی خاندان کے ارکان ریاست کے مختلف شعبوں کے مختلف عہدوں پر فائز ملتے ہیں۔ان کی آپس میں رشتہ داریاں اور شادیاں ہوئی ہوتی ہیں۔ان کے کاروبار، زرعی اور مالیاتی اداروں میں شراکت داری عیاں ہے اور کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

مشترک اور ناہموار ترقی

پاکستان کے حکمران طبقات کا یہ ملغوبہ اپنی اندرونی ساخت سے یہ بات ثابت کرتا ہے کہ نہ صرف ان کا کردار رجعتی اور عوام دشمن ہے بلکہ یہ قومی جمہوری انقلاب کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے درکار تاریخی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔ پاکستان کی نوخیز سرمایہ داری کی پاکستان کو ایک جدید سرمایہ دار جمہوریت میں تبدیل کرنے کے عمل میں ناکامی کی وجہ سے اس کا سماجی اور معاشی ارتقا ایک پیچیدہ اور بے ہودہ کردار کا حامل ہو چکا ہے۔ یہ پیچیدگی بنیادی طور پر ترقی کی نابرابری اور مشترکہ پن کا نتیجہ ہے۔سیاسی تناظر کو تشکیل دینے کے لیے اور سب سے بڑھ کر پاکستان کا ایک مارکسی تجزیہ تخلیق کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ارتقاء کے اس طرز کے سیاسی، ثقافتی، سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کے پاکستانی سماج پر پڑنے والے اثرات کا تجزیہ کیا جائے۔

پاکستان کی نام نہاد قومی سرمایہ داری ایک ایسا انفراسٹرکچر تعمیر کرنے میں ناکام رہی جس کی بنیاد پر ایک جدید صنعتی قوم کی تعمیر ممکن ہو سکتی۔ان رجعتی حکمران طبقات کے سماج کو ترقی دینے کے لیے موزوں اور مناسب منافع حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے یہ ہر قسم کے استحصال اور لوٹ مار میں ملوث ہوتے چلے گئے۔ پاکستان میں قومی مسئلہ ابھی تک حل نہیں کیا جاسکا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مظلوم قومیتوں کے استحصال کو فروغ دے کر اسے اور بھی شدید کر دیا گیا۔جس کے نتیجے میں پاکستان کبھی بھی ایک متحدہ قومی ریاست

بننے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ زرعی انقلاب کے ذریعے جاگیرداری کا خاتمہ نہ کر سکنے کی اپنی اندرونی معاشی کمزوری نے سرمایہ داروں کو جاگیرداروں کے ساتھ مصالحت اور باہمی تعاون پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح پاکستان کا سرمایہ دار یورپی یا دوسرے بورژوا طبقے کی طرز پر تاریخی طور پر ایک دہریہ (Athiest) طبقہ ہونے کا کردار بھی نہ نبھا سکا۔ اس کی بجائے اس نے پاکستان میں مذہب کو ہی ایک الگ ریاست کے قیام کی بنیاد بنا لیا تا کہ اس ریاست کی شکل میں وہ اپنے لیے ایک آزاد منڈی قائم کر سکے۔ لیکن بحران کے شدید ہونے اور اس کی وجہ سے نیچے سے جنم لینے والی تحریکوں کو روکنے کے لیے سرمایہ داروں نے مذہب کو سماج کی پسماندہ پرتوں کی حمایت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا تا کہ طبقاتی جدوجہد کے لیے درکار یکجہتی کو توڑا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولرازم، پاکستان کے سرمایہ داروں کے لیے انتہائی ناپسندیدہ شے بن چکی ہے۔ یورپ کے سرمایہ داروں نے جدید ملکوں میں سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے انقلابات کے دوران بڑی حد تک ایک روشن خیال کردار ادا کیا۔ لیکن پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت (جو سرمایہ داروں کا جدید ترقیاتی ملکوں میں انتہائی موثر طرز حکومت ہے) ہمیشہ سے غلامانہ، بانجھ اور ظالمانہ چلی آ رہی ہے۔ یہ کبھی اپنی جڑیں مستحکم نہیں کر سکی۔ ملک کی نامکمل صنعتی اور معاشی ترقی پر سامراجی تسلط کی کیفیت میں، پاکستان سامراج کی لوٹ مار کا بدترین ذریعہ بنا رہا ہے۔ اجارہ دار مالیاتی سرمایہ بے رحمی کے ساتھ مداخلت اور تسلط کو قائم کیے ہوئے ہے۔ پاکستان میں بڑے پیمانے کی بیرونی سرمایہ کاری کو پنپنے کے لیے جدید ترین صنعتی ٹیکنالوجی کی ضرورت تھی تا کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جا سکے۔ اس جدید اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی نے ایک پسماندہ ملک میں ترقی کے ایسے نمونے قائم کر دیئے جو کئی حوالوں سے متضاد تھے۔ پاکستان میں وقوع پذیر ہونے والے سماجی اور معاشی ارتقاء کا یہی مخصوص طرز چلا آ رہا ہے اور یہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ دیگر تمام ترقی پذیر ملکوں کا قصہ ہے۔ مشترکہ اور نابرابر ترقی کا قانون جسے مارکس، لینن اور ٹراٹسکی نے وضع کیا تھا، وہ اس پیچیدہ اور متضاد سماجی و معاشی ترقی کی طرز کی وضاحت کرتا ہے۔ نابرابر ترقی کا قانون پوری انسانی تاریخ پر حکمرانی کرتا چلا آ رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام انسانیت کے مختلف حصوں پر ترقی کی مختلف شکلوں میں سامنے آتا رہا ہے، ان میں سے ہر ایک شکل داخلی تضادات سے لبریز ہے۔ مختلف ادوار میں انسانیت کے مختلف حصوں میں شرح ترقی میں غیر معمولی نابرابری اور اس کی انتہائی مختلف اقسام اور سطحیں سرمایہ داری نظام کا آغاز اور شروع سے ہی خاصہ ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام اسی موروثی نابرابری سے

ہی بتدریج اپنی برتری قائم کرتا اور رکھتا ہے۔اس کے لیے وہ اپنے ہی پیدا کردہ طریقوں اور ذریعوں کو توڑتا مروڑتا اور تبدیل کرتا رہتا ہے۔

اس معاشی نظام کے مقابلے میں جسے یہ پیچھے چھوڑ آیا ہے سرمایہ دارانہ نظام مستقل طور پر معاشی وسعت کے حصول کی خاطر نت نئے علاقے دریافت کرنے کی خواہش رکھتا ہے جس سے معاشی تفریق میں اضافہ ہوتا ہے اور خود کفیل صوبائی اور قومی معیشتیں ایک آزاد مالیاتی تعلقات کے نظام میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ مارکس نے کمیونسٹ مینی فسٹو میں لکھا تھا کہ ''اپنی پیداوار کی فروخت کے لیے منڈیوں کو مسلسل فروغ دینے کی ضرورت سرمایہ داروں کو پوری دنیا میں لتاڑ پچھاڑ اور بھاگ دوڑ کرنے پر مجبور کیے رکھتی ہے۔ یہ ہر جگہ ہوتا ہے' ہر وقت ہوتا ہے اور ہر جگہ نئے تعلقات استوار کرتا ہے۔ سرمایہ داروں نے عالمی منڈی کے استحصال کے ذریعے دنیا کے ہر ملک میں پیداوار اور کھپت کا ایک آفاقی کردار اپنا لیا ہے۔ غوصیلے رجعتیوں کو ذہین نشین کر لینا چاہیے کہ اس نے صنعت کے پاؤں کے نیچے سے وہ قومی زمین کھینچ لی ہے جس پر یہ کھڑی تھی۔ تمام پرانی قائم شدہ صنعتیں تباہ ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں۔ انکو ایسی نئی صنعتوں نے مسترد کر دیا ہے جن کی موجودگی تمام مہذب قوتوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گئی ہے کیونکہ یہ نئی صنعتیں دیسی خام مال کی مرہون منت ہونے کی بجائے دور دراز کے علاقوں سے منگوائے گئے خام مال پر انحصار کرتی ہیں اور ان کی پیداوار صرف اپنے ہی ملک میں نہیں بلکہ کرہ ارض کے ہر خطے پر استعمال ہوتی ہے۔ ان پرانی ضروریات جن کی ملکی پیداوار سے تشفی ممکن تھی' کی جگہ ایسی ضروریات اور مانگ نے لے لی ہے جن کے لیے دور دراز کے علاقوں کی اشیاء اور پیداوار کی ضرورت ہے۔ مقامی اور قومی گوشہ نشینی اور خود کفیلی کی بجائے ہمیں ہر سمت میں طبع آزمائی نظر آتی ہے اور قوموں کو آفاقی اور باہمی انحصار کی لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ ایک انفرادی قوم کی دانشورانہ تخلیق اب مشترکہ ملکیت بن گئی ہے۔ قومی جانبداریت اور تنگ نظری ہر ممکن حد تک ناممکن ہو چکی ہے اور مختلف قومی اور مقامی ادب سے ایک عالمی ادب جنم لے چکا ہے۔

ملکوں کو معاشی طور پر ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان کی ترقی کے مختلف مراحل کو ہموار کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام اپنے ہی طور طریقوں سے کام کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو یہ پر انتشار طریقے استعمال کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کا اپنا ہی کام کمتر ہو جاتا ہے اور جس کے نتیجے میں ایک

ملک دوسرے کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے' صنعت کا ایک شعبہ دوسرے شعبے کے مقابلے میں آ جاتا ہے اور عالمی معیشت کے کچھ حصوں کو تعمیر کرنے کے لیے دوسرے حصوں کو تخریب اور تباہی کا شکار کر دیا جاتا ہے۔ دونوں بنیادی رجحانات کے باہمی تال میل جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کی فطرت سے جنم لیتے ہیں' سے اس تاریخی عمل کے زندہ تانے بانے کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ سامراجیت اپنی عالمگیر مداخلت وتحرک کی بدولت اور مالیاتی سرمائے کی تشکیل کی گردن توڑ رفتار (جو اس کی قوت متحرکہ ہوتی ہے)، ان دونوں رجحانات کو تقویت بخشنے کا باعث بنتی ہے۔ سامراجیت زیادہ تیزی کے ساتھ اور زیادہ گہرائی میں انفرادی قومی اور براعظمی یونٹوں کو ایک وحدت میں جوڑتی چلی جاتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے قریب ترین لاتی ہے اور ایک دوسرے پر حد سے زیادہ انحصار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور یوں ان کے معاشی طریق کار' سماجی ترتیب اور ترقی کی سطحوں کو اکائی میں ڈھالتی ہے۔ اسی دوران یہ پسماندہ ملکوں کے خلاف معاندانہ، اور جارحانہ طریقے استعمال کرتی ہے جس سے عالمی معیشت کو ہموار اور متحد کرنے کی اس کی کوششیں اس کے اپنے ہی ہاتھوں زیادہ وحشیانہ طریقے سے تہس نہس ہو جاتی ہیں۔

اپنی فقید المثال کتاب ''انقلابِ روس کی تاریخ'' میں ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے ''یورپی نوآبادیاتی حکمرانوں نے امریکہ میں تاریخ کی ابتداء قطعی طور پر نئے سرے سے نہیں کی تھی۔ یہ حقیقت کہ جرمنی اور امریکہ نے اب معاشی طور پر انگلینڈ کو پچھاڑ دیا ہے، صرف ان کی اپنی سرمایہ دارانہ پسماندگی کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔ دوسری طرف برطانیہ میں کوئلہ کی صنعت میں پیدا ہونے والا قدامت پرست انتشار، میکڈونلڈ اور اس کے دوستوں کے سروں میں بھی موجود تھا جو اب اس ماضی کا خمیازہ بن کر سامنے آ رہا ہے کہ جب برطانیہ نے طویل عرصے تک سرمایہ دارانہ رہبری کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ تاریخی طور پر پسماندہ ملکوں کی ترقی انہیں لازمی طور پر مختلف مراحل کے ایک مخصوص ملاپ کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کی ترقی مجموعی طور پر غیر منصوبہ بند، پیچیدہ، اور مشترکہ کردار کی حامل ہوتی ہے۔ تاریخ کے قوانین کسی لگے بندھے اصول وضوابط کے پابند نہیں ہوتے۔ تاریخی عمل کے سب سے عمومی قانون کے طور پر نابرابری، تیزی کے ساتھ اور پیچیدہ حالت میں اپنا اظہار پسماندہ ملکوں کی قسمت کی شکل میں کرتی ہے۔ خارجی ضرورت کا چابک ان پسماندہ ملکوں کو چھلانگیں لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نابرابری کے اس عالمگیر قانون میں سے ہی ایک اور قانون برآمد ہوتا ہے جسے ایک زیادہ بہتر نام نہ ہونے کے باعث ہم مشترکہ ترقی کا قانون کہہ سکتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد ایک ہی سفر کے مختلف مراحل کو ایک ہی نظر میں دیکھنا اور سمجھنا ہے۔ جس طرح دو

قدم الگ الگ اٹھتے ہیں لیکن ایک ساتھ۔اس قانون کواس کے مادی حوالوں سے سمجھے بغیر تاریخ کو سمجھنا ناممکن عمل ہے۔''(3)

اگر ہم پاکستان میں سماجی تعلقات کا جائزہ لیں تو یہ قانون پاکستانی عوام کی روزمرہ زندگی پر اپنے گہرے اور واضح اثرات مرتب کرتا ہے۔ جب ایک نسل آگے بڑھتی ہے تو اپنے آباؤاجداد کے ہاتھوں استعمال ہونے والے آلات کو اپنے کام میں لاتی ہے۔اسی طرح اسی ایک نسل کے لوگ بھی انہی آلات کو روزہ مرہ زندگی کے سماجی اور معاشی تسلسل میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

''مشترک اور نابرابر ترقی کا مارکس کا نظریہ اپنا مکمل اظہار روس میں اس صدی کے اختتام پر پائے جانے والے انتہائی پیچیدہ سماجی تعلقات میں کرتا نظر آتا ہے۔ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے جاگیردار، نیم جاگیردار یہاں تک کہ جاگیرداری سے پہلے کے سماجی رجحانات جدید ترین، تازہ ترین فیکٹریوں میں موجود اور کام کرتے نظر آتے ہیں جو برطانوی اور فرانسیسی سرمائے سے تعمیر کی گئیں۔یہی وہ مخصوص مظہر ہے جسے ہم نام نہاد تیسری دنیا کے ہر ملک کے اندر ہوتا اور پنپتا دیکھ رہے ہیں اور اس کا سب سے حیران کن اظہار 1990ء کی دہائی کے پہلے حصے میں جنوب مشرقی ایشیاء کے ملکوں میں ہونے والی ترقی میں نظر آتا ہے۔ یہ ویسی ہی شاندار ترقی ہے جو آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے روس میں ہوئی تھی اور یہ عین ممکن ہے کہ اس کے سیاسی نتائج بھی روس جیسے ہی برآمد ہوں۔صنعت کا ایسی کیفیت میں ترقی کرنا، انقلاب کے لیے مہمیز ثابت ہوتا ہے۔روس میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ عمل کس طرح ہوا تھا۔روسی سرمایہ داری کی 90-1880ء کی تیز ترین ترقی کے ساتھ ہی مزدور طبقے کے شعور میں بھی اسی تیزی سے بڑھوتری آئی۔ 1890ء کی دہائی میں ہونے والی ہڑتالوں کی ایک بہت بڑی لہر 1905ء کے انقلاب کا ابتدائی مکتب ثابت ہوئی''۔(4)

آج پاکستان میں ہزاروں لاکھوں انسان موبائل فون استعمال کرتے ہیں مگر وہ ساری زندگی عام لینڈ لائن فون استعمال نہیں کر سکے۔ یوں یہ لاکھوں، کروڑوں لوگ ٹیکنیکی ارتقاء کے ایک یقینی مرحلے سے تعارف یہاں تک کہ اس کا احساس کیے بغیر آگے نکل گئے۔مشترک اور نابرابر ترقی کے قانون کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک بچہ ایک گندی گلی میں کھڑا ہوتا ہے اور یہ خبر سن رہا ہوتا ہے کہ اس کا ملک ایٹم بم بنا چکا ہے مگر اس کے پاؤں میں جوتا فراہم نہیں کر سکا۔لوگوں کی اکثریت جو جدید موبائل فون استعمال کرتی ہے اس کے پاس صحیح معنوں میں بجلی کی فراہمی، پینے کا پانی، پختہ سڑکیں، سیوریج اور نکاسی آب کی سہولتیں میسر نہیں

ہیں۔اسی طرح یہ وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جو جدید موبائل فون استعمال کرنے والوں اوران کے گھروں اور اڑوس پڑوس کی بھی ہیں۔ ہمارے شہروں میں بہترین ہسپتالوں کے ساتھ اور ''انتہائی اعلیٰ آرٹ کا شاہکار'' بیوٹی پارلر، اور ہیلتھ فٹنس کلینک بھی پائے جاتے ہیں۔تاہم آبادی کی بہت بڑی اکثریت سادہ ترین قابل علاج بیماریوں مثلاً ملیریا کے علاج سے بھی محروم ہے۔ وہ خود اپنے بچوں اور بڑوں کو پیروں، فقیروں کے پاس لے جاتے ہیں جو چند مقدس الفاظ پڑھ کر انہیں پھونک مارتے ہیں تا کہ وہ صحت یاب ہوسکیں۔ان کروڑوں غربت اور محرومی کے مارے ہوئے لوگوں کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں ۔ایسے ہسپتال بھی موجود ہیں جو جدید ترین آلات سے مزین ہیں اور مریض بھی اتنی زیادہ تعداد میں ہیں جن کو علاج کی ضرورت ہے۔مگر صرف چند ایک کو ان ہسپتالوں کے بل ادا کرنے کی استطاعت حاصل ہے۔ بہت سے یا اکثر پبلک ہسپتالوں میں ایک بیڈ پر دو یا اس سے زیادہ مریض پڑے ہوتے ہیں۔ پاکستان شاید ان چند ملکوں میں سے ہے جہاں ڈاکٹروں کی تعداد نرسوں سے بہت زیادہ ہے۔

جدید ترین ریلوے کے انجن اور ڈبے بنائے اور درآمد کیے جارہے ہیں مگر ہمارے ملک کی ریلوے لائن ایک سو سال سے زیادہ پرانی ہے جن پر ٹرینیں اپنی مطلوبہ رفتار سے سفر نہیں کرسکتیں۔ یہ ہمیشہ تاخیر زدہ ہوتی ہیں اور ریلوے کے حادثات روزمرہ کا معمول بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان کی سڑکوں پر جدید ترین اور مہنگی ترین کاریں رواں دواں ہیں اوران کے ساتھ ساتھ انہی سڑکوں پر گدھا گاڑیوں، اونٹ گاڑیوں، بیل گاڑیوں کی لمبی قطاریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ٹرانسپورٹ کے وہ ذرائع ہیں جو قرون وسطیٰ سے بھی پہلے وقتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ سڑکوں اوران پر چلنے والی گاڑیوں کے درمیان ایک تضاد موجود ہے۔ گاڑیاں بہت زیادہ تعداد میں ہیں مگر ان کی ڈرائیونگ اور پارکنگ کے لیے جگہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

پاکستان کے اکثر دور دراز پسماندہ دیہاتوں میں واٹر سپلائی اور سیوریج کا نام نشان تک موجود نہیں مگر وہاں کیبل ٹیلیویژن کے نیٹ ورک موجود ہیں جن پر لندن ، نیو یارک، پیکنگ' ماسکو اور ٹوکیو کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ بلند و بالا انتہائی جدید اور پوش عمارتوں کے عقب یا پہلو میں ہی وہ جھونپڑیاں موجود ہیں جن میں رہنے والے انسانوں کو زندگی کی ایک بھی بنیادی سہولت میسر نہیں ہے پاک صاف علاقو کی یہ بدبودار جگہیں اسی مشترک اور نابرابر ترقی کے طرز کا بہترین نمونہ ہے اور اسی طرز ترقی کے حامل مجہول اور بانجھ سرمایہ دارانہ نظام کے اس ارتقائی کردار والے سماج پر پاکستان کے حکمران طبقات نسلوں

سے حکومت کرتے چلے آرہے ہیں۔ بہت سے شہروں اور صنعتی علاقوں میں عالمی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی جدید ترین کمپیوٹرائیزڈ ٹیکنالوجی سے لیس فیکٹریاں قائم ہیں لیکن انہی کے پہلو یا عقب میں اینٹوں کے پرانے بھٹے بھی موجود ہیں جو وادی سندھ کی سات ہزار سال پرانی تہذیب کی ٹیکنالوجی ہے۔ اسی طرح لاہور اور اسلام آباد کے بیچ بنائے جانے والی موٹر وے ایشیاء کی ایک جدید ترین ہائی وے ہے۔ اسی جدید ترین ٹیکنالوجی سے کچھ گز کے فاصلے پر ہمیں ہل چلاتے بیل، کچی مٹی سے بنے گھر، تاریخ کے کسی اور ہی عہد میں لے جاتے ہیں۔

لیکن ملک کے دیہاتوں تک میں بھی وحشی اور جارحانہ جدید سرمایہ داری نے وہاں کے رہنے والے دیہاتیوں کے طرز زندگی پر انتہائی تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔ اگرچہ وہاں پر قدیم، سماجی اور معاشی تعلقات ابھی تک قائم و دائم تھے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جابرانہ مداخلت اپنی وحشیانہ استحصال کی تمام شکلوں کے ساتھ قرونِ وسطی کی آئینہ دار زندگی کی ان صورتوں کو تبدیل نہیں کر سکی۔ اس کی بجائے اس جابرانہ مداخلت نے ان کو مزید تباہی کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ اس کی غیر مشترک طرز ترقی جو سرمایہ داری کا مکروہ چہرہ ہے اس نے دیہات کی پرسکون اور کھلی طرز زندگی کو پلاسٹک کے لفافوں، اور گندے نالوں کی نکاسی کا مرکز بنا دیا ہے جن سے دیہات کے کھیت اور جنگلات آلودہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ گلیوں کو پختہ کرنے کے لیے ناپختہ سیمنٹ کی اینٹیں، کھمبوں سے گلیوں تک لگی ہوئی بجلی کی بوسیدہ تاریں اور ترقیاتی کاموں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ پاکستان کی دیہاتی زندگی کا ایک مستقل المیہ بن چکا ہے۔ خوشحالی لانے کی بجائے اس نظام نے ایسی محرومی اور دکھ کو جنم دیا ہے کہ جس سے اکیسویں صدی میں دیہات میں رہنے والے لوگوں کی حالت آج سے ایک سو سال پہلے لوگوں کی حالت سے زیادہ بدتر ہو چکی ہے۔

ملاؤں کا بدلتا ہوا کردار

ان سماجی، معاشی اور نیم سرمایہ دارانہ تعلقات نے نام نہاد جاگیردارانہ طرز، طور طریقوں اور وہاں بسنے والی پرتوں کے باہمی تعلقات کو اور زیادہ تلخ کر دیا ہے۔ برطانویوں نے جاگیرداری کو مسلط کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ عمل مکمل نہیں ہو سکا تھا جس کی وجہ سے پاکستان کے کئی علاقے 1960ء کی دہائی تک قدیم ایشیائی طرز زندگی اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ اس تباہ کن سرمایہ دارانہ ترقی سے پیدا ہونے والے

اثرات کی ایک انتہائی طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے جس نے پاکستان کے سماج کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے مگر اس دوران ہونے والی اہم ترین تبدیلیاں جنہوں نے دیہی اور قصباتی زندگیوں کو شدید متاثر کیا ہے ان میں سے ایک اسلامی بنیاد پرستی کا عروج ہے۔ بیرونی سرمائے سے بے تحاشا مستفید ہونے والے ملاں جو اس سے پہلے کی دیہی سماجی و معاشی زندگی میں کسانوں، ترکھانوں، لوہاروں، حجام وغیرہ کی طرح ہی ایک معمول کا حصہ ہوتے تھے، اب یہ امیر ہو چکے ہیں اور ان کا بود و باش تبدیل ہو چکا ہے۔ ماضی میں محنت کی سماجی تقسیم کے تحت ملاؤں کا کردار شادی بیاہ، فوتیدگی اور دوسرے مواقع پر رسومات کی ادائیگی کرانا ہوتا تھا۔ ان میں سے کچھ ملاں خود بھی کاشتکار ہوتے تھے اور یہ انتہائی شریف النفس اور اچھے رویوں کے حامل ہوا کرتے تھے۔ یہ صورت حال کم و بیش 1970ء کی دہائی تک رہی۔ 1980ء کی دہائی میں ضیاء کی اسلامائزیشن نے ملاؤں کو انتہائی عروج سے نوازا۔ جاگیردار اشرافیہ نے اس دوران اپنی جاگیریں بینکوں کو رہن رکھ کر صنعتی کارخانوں میں تیزی سے سرمایہ لگانا شروع کر دیا۔ انہوں نے بھی ان مبلغین کو مذہبی تعصب اور منافرت پھیلانے کے لیے سرمایہ سے نوازنا شروع کر دیا۔ اسی دوران افغان جہاد کے بطن سے پیدا ہونے والے کالے دھن کو ایک تنگ نظر وحشی مذہبی نیٹ ورک کو قائم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تاکہ انقلابی تحریکوں کے خلاف ایک قوت تعمیر کی جاسکے۔ 69-68ء کا انقلاب دور افتادہ، پسماندہ اور پچھڑے ہوئے دیہاتوں تک بھی پھیل چکا تھا۔ ان کسانوں، کھیت مزدوروں اور غریبوں کے لیے بھٹو تبدیلی کی ایک علامت بن کر سامنے آیا۔ جس نے دیہات کے ''دیہہ خداؤں'' کے مفادات کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ ان خون چوسنے والے ان نئے سرمایہ دارانہ تعلقات نے دیہات کے ان مبلغین اور مسجدوں کا پورا کردار مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ لاؤڈ سپیکروں نے دیہاتوں میں پہنچ کر کوئی خوشحالی تو پیدا نہیں کی مگر اس کے خاموش اور پرسکون ماحول کو ضرور تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ہر چھوٹے چھوٹے گاؤں میں لاتعداد مسجدیں تو ہیں مگر ہسپتال اور سکول نہیں ہیں۔ اگر غلطی سے کوئی ہسپتال قسم کی کوئی چیز بھی ہے تو وہاں ڈاکٹر اور ضروری پیرامیڈیکل سٹاف نہیں ملتا۔ ہزاروں ''گھوسٹ'' سکول استادوں کے بغیر دیہاتوں میں بچوں کو تعلیم سے سرفراز کر رہے ہیں۔ ریاست کی طرف سے ان بنیادی سماجی ضرورتوں کی فراہمی میں ناکامی نے پرائیویٹ سکولوں اور ہسپتالوں کو تقریباً سبھی شہری اور دیہی آبادیوں میں وباء کی طرح پھیلا دیا ہے۔ یہ سب شہر اور دیہات ان بنیاد پرست جہادیوں سے متاثر ہیں۔ ایک ایسے سماج میں جہاں محروم عوام کی اکثریت اپنی روایتی قیادت کی طرف سے بار بار تحریکوں میں دھوکے پر دھوکہ کھاتی چلی

آ رہی ہے۔ان مذکورہ شعبوں میں کالے دھن کی مداخلت بہت بڑھ چکی ہے۔ مدرسے تیزی سے پھل پھول رہے ہیں اور وہ ان غریب کسانوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ۔ جو اپنے بچوں کو خوراک اور تعلیم فراہم کرنے کی سکت سے محروم ہیں۔ یہ غریب اور محروم لوگ انہیں ان متعصب مدرسوں میں بھیجنے پر مجبور ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے بچوں کے ساتھ کسی طور اچھا سلوک نہیں کیا جائیگا۔انہی بچوں میں سے کچھ خودکش بمبار بن کر اپنے آپ کو کئی بے شمار معصوم لوگوں سمیت موت کے منہ میں دھکیلتے چلے جارہے ہیں۔

ایسے المناک واقعات کی تعداد بھی بے شمار ہے جن میں غربت کے ہاتھوں مجبور والدین یا تو اپنے بچے بیچتے نظر آتے ہیں یا پھر اجتماعی خودکشی کررہے ہیں۔تحریکوں میں تاخیر،سماج میں پھیلی ہوئی بے زاری اور بے بسی ، انقلابی متبادل کے سیاسی افق پر نہ ہونے کی وجہ سے شہروں ،قصبوں اور دیہاتوں کے درمیانے طبقے کی بے صبری میں بے پناہ اضافہ ہوچکا ہے۔اس سے وحشت ، منافرت،اور چڑچڑے پن کی نفسیات جنم لے رہی ہے جوسماج کی پسماندگی اور ٹیکنیک کی جدت کے تضادات کا نتیجہ ہے اور پھر یہ عنصر پاکستان میں مشترک اور نابرابر طرز ترقی کا شاخسانہ ہے۔اس نفسیات کی وجہ سے درمیانے طبقے کے لوگوں کی اکثریت مذہب میں سکون اور نجات تلاش کرنے کی کوشش کررہی ہے جس سے ہمیں داڑھی رکھنے والوں اور سروں پر ضیائی ٹوپیاں پہننے والوں کی تعداد میں اضافہ نظر آتا ہے۔مذہب کی طرف مراجعت کی یہ کیفیت ایک سطح پر ان کے لیے اپنی بداعمالیوں اور گناہوں،غلط کاریوں اور دوسرے تجارتی جرائم کی معافی اور مغفرت کا بھی ذریعہ یا سبب بن جاتی ہے۔ترقی کی اس قسم کی طرز کے سماجی اور ثقافتی اثرات بھونڈے اور بھیانک ہیں۔شہروں یہاں تک کہ دیہاتوں میں زیادہ لڑکیاں اور خواتین اس اکیسویں صدی میں بھی برقعہ پہنتی اور پردہ کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ تعداد پچھلی صدی سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔منافقت اور جھوٹ سماجی تعلقات کا ایک معمول بن چکے ہیں۔اس کے نیچے پھیلتی ،پھلتی اور پھولتی فحاشی ، بدعنوانی ، بدمعاشی ،جسم فروشی اور زنا بالجبر اسی سماجی اور ثقافتی بھونڈے پن اور بے ہودگی کا نتیجہ ہے جسے تیزی سے بڑھتی ہوئی غربت اور بھی پھیلاتی چلی جارہی ہے۔سماجی تباہی کا باعث بننے والی یہ طرز ترقی موجودہ صورت حال میں اس بات کو واضح طور پر عیاں کرتی ہے کہ پاکستان میں یہ مجہول اور بانجھ سرمایہ داری سماج کو کن خطوط پر ترقی فراہم کرسکتی ہے۔

پارلیمنٹ کا کردار

پاکستان میں ترقی اور ارتقاء انہی مراحل سے نہیں گزر سکتا جن سے جدید سرمایہ دار ملکوں کی سرمایہ داری کا سرمایہ دار پچھلے تین صدیوں کے دوران گزرا ہے۔ آج سرمائے کا کردار انتہائی غاصبانہ ہو چکا ہے اور یہ حقیقت میں سماج کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف لے جانے کا موجب بن رہا ہے۔ بنیاد پرستی، نسلی منافرت، پدرسری، تنگ نظر قوم پرستی، جنسی اور مذہبی امتیاز سمیت ماضی کے تمام تعصبات کا بدترین عروج اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ ان تعصبات کا آپس میں بڑھتا ہوا تصادم ملک کے محروم طبقات کے مابین طبقاتی یک جہتی کو توڑنے اور ملک کی سماجی زندگی کو قتل و غارت گری کے سمندر میں دھکیلنے کا باعث بن رہا ہے لیکن اس تمام صورت حال کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ سماج اس اندھی اور وحشی رجعتیت کا زیادہ دیر تک شکار رہے گا۔ یہ رجعتیت عارضی مصنوعی اور بانجھ ہے اور یہ اس عمومی مایوسی، بے زاری اور بے بسی کی عکاسی کرتی ہے جو سماج کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ تاہم حکمران طبقات کے دانشور، تجزیہ نگار اور ماہرین ڈرے اور سہمے ہوئے انداز میں اس رجعتیت کی طاقت اور کردار کو بڑھا چڑھا کے پیش کر کے اس کے مقابلے میں ''لبرل ڈیموکریسی'' ایک خودمختار پارلیمنٹ، ایک لبرل روشن خیال اور ترقی پسند سرمایہ داری کے تصور کو اجاگر اور مسلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی حکمت عملی ایک ایسا سیاسی نظام قائم کرنے پر مبنی ہے جو برطانوی اور مغربی پارلیمانیت کی بھونڈی نقالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایلن وڈز پاکستان جیسے ملکوں میں پارلیمنٹ کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''پارلیمانی سرگرمی پر حاوی قوانین کا مشاہدہ ہم کسی بھی وقت اصلاح پسند ورکرز پارٹیوں کے پارلیمانی حصوں کو سامنے رکھتے ہوئے کر سکتے ہیں۔ حکمران طبقات کا دباؤ' اس کا نظریہ اور ادارے اتنی شدت کے ساتھ کسی اور جگہ نظر نہیں آتے جتنا ہمیں پارلیمنٹ کے ایوانوں میں نظر آتے ہیں۔ سرمایہ داروں نے ایک طویل عرصے کی محنت سے قائم ہونے والے ڈھانچے اور طریقہ کار کے ذریعے رشوت، مراعات، دباؤ، بدعنوانی کی ریل پیل کے لیے عوام اور مزدوروں، کسانوں، نوجوانوں کے ان عوامی نمائندوں کو اپنی پکڑ میں رکھنے کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے۔ جب تک کہ عوام کے ان نمائندوں کو طبقاتی شعور اور لازمی نظریاتی سمجھ بوجھ کے ذریعے اس قابل نہ کر دیا جائے کہ وہ اپنے دشمن طبقے کی ان چالوں اور سازشوں کو سمجھنے اور پرکھنے کے قابل ہو جائیں تب تک ناگزیر طور پر وہ اس ڈھانچے اور طریقہ کار کی

دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے اور اس پارلیمانیت کی کمیٹیوں، طریقہ ہائے کار، پوائنٹ آف آرڈر وغیرہ کے ذریعے اس کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہ کسی طور بھی ایک فرد کی ذاتی بدعنوانی' کیریئرازم یا رشوت خوری کا معاملہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سبھی ہتھیار مزدوروں کی قیادت کے علم برداروں کو خریدنے کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دائیں بازو کے اصلاح پسندوں کا جہاں تک تعلق ہے جن میں درمیانہ طبقہ، وکلاء، ڈاکٹر، اور معیشت دان اپنے معیارِ زندگی اور نفسیات کے حوالے سے سرمایہ داروں کے قریب ہونے یا ان جیسے نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں مزدوروں جیسا نظر آنا یا تاثر دینا بہت برا لگتا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے دیانت دار بائیں بازو کے اصلاح پسند' یہاں تک کہ سالوں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حق میں شاندار جدوجہد کرنے والے مزدور بھی پارلیمنٹ کی اس مصنوعی دنیا کی کھوکھلی جال ساز رنگا رنگی کا شکار ہو سکتے ہیں اور طبقاتی جدوجہد کی سچائی سے بہت دور بھٹک جاتے ہیں۔ ایک اصلاح پسند پارٹی کے لیے جو کسی بھی صورت میں پارلیمنٹ کا ممبر منتخب کرانے کے سوال پر جھکاؤ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پارٹی کے پارلیمانی حصے کو آزاد چھوڑ دیتی ہے تو اس کے نتیجے میں ہر انفرادی ممبر کا اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق مقدس قرار پاتے ہوئے ایک گھٹیا معمول بن جاتا ہے۔ یہ اصلاح پسند لیڈروں کا محنت کش طبقے سے الگ اور آزاد ہونے کا ایک اور ذریعہ اور راستہ ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ مکمل طور پر سرمایہ داروں کے چاپلوس بن کر ان کے رحم و کرم پر چلے جاتے ہیں۔ مگر ایک انقلابی پارٹی جس کے لیے پارلیمانی جدوجہد سماج کو بدلنے والی مزدور طبقے کی عمومی جدوجہد کا ایک معمولی عنصر ہوا کرتی ہے' محنت کش طبقے کے انتہائی باشعور عناصر پر مبنی ایک انقلابی پارٹی اپنے منتخب شدہ نمائندوں پر ہر حال، ہر کیفیت اور ہر سطح پر کنٹرول قائم اور برقرار رکھ سکتی ہے اور اسے ایسا ہر حال میں کرنا چاہیے۔ خاص طور پر وہ منتخب نمائندے جو پارلیمنٹ کے ممبر بنتے ہیں''۔(5)

یہ بورژوا اصلاح پسند بھی چاہتے ہیں کہ پاکستان کا سماجی اور معاشی ارتقا تیزی کے ساتھ ویسے ہی پھلے پھولے جس طرح جدید صنعتی ملکوں میں ہوا ہے۔ وہ ایک ''آزاد'' اور ''غیر جانبدار'' عدلیہ چاہتے ہیں۔ اگرچہ قانون کبھی بھی سماج کے معاشی ڈھانچے اور اس کی ثقافتی ترقی کی کیفیت سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ یہ بورژوا اصلاح پسند اس وقت کے فلسفوں، اقتباسات اور نظریوں کو پیش کرتے ہیں کہ جب سرمایہ دارانہ نظام اپنے عروج پر ہوتا تھا۔ مگر ان کا یہ موقف پاکستان میں سماجی اور ثقافتی سطح کو اور بھی بدصورت و غیر متوازن کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ یہاں ایک بار پھر مشترک اور نابرابر ترقی کا قانون

انتہائی شاندار انداز میں کارفرما نظر آتا ہے۔

اس مساوات کے دوسرے رخ کو دیکھا جائے تو پسماندگی، معاشی ترقی کے ایک مخصوص مرحلے پر عالمی سطح پر ایک مراعت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ضروری نہیں ہوتا یہ سب پسماندہ سماج معاشی ترقی کے ان مراحل کو اسی طرح پورا کریں جس طرح جدید صنعتی ملکوں میں ہوا۔ چنانچہ انہیں درمیان کے ان تمام ''لازمی تاریخی مراحل کو پھلانگ لگاتے ہوئے عبور کرنا پڑتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی سرمایہ دارانہ جدت کسی سماج کی پسماندگی پر قابو پانے میں ناکام رہتی ہے تو اسے ارتقاء کے اس عمل میں ایک پھلانگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک انقلاب اس سماج کی تاریخی، معاشی اور سماجی ضرورت بن جاتا ہے۔ جدید سرمایہ داری کے استحصال کے باوجود اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ایک یہ جدید باشعور محنت کش طبقہ پیدا کرتا ہے۔ یہ اس مزدور طبقے کا فرض ہوتا ہے کہ وہ انقلاب کے لیے درکار قوت کو پیدا کرے اور اس کا محافظ اور نگہبان بن جائے اور کسانوں اور دوسرے محروم طبقوں کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے اس تاریخی چھلانگ کو ایک انقلاب کی شکل میں سامنے لے آئے۔ اس کا سب سے جاندار ثبوت خود 69-68ء کا انقلاب تھا۔ تازہ نوخیز محنت کش کا ظہور جو پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں ہونے والی صنعت کاری کے دوران ہوا تھا' جس نے ایک انقلابی صورت حال پیدا کرتے ہوئے ایک واضح سوشلسٹ کردار کی حامل بغاوت کو جنم دیا تھا۔ ہم اس کتاب کے شروع میں اس مظہر کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں مگر چالیس سال گزرنے کے بعد بھی جمہوریت پسند دانشوروں نے اس انقلابی طوفان سے کچھ بھی نہیں سیکھا جو تاریخ کے اس دور میں پاکستان میں رونما ہوا تھا۔ یہ انقلاب اپنے اندر مشترک اور نابرابر ترقی کے قانون کی سچائی کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ ایک نام نہاد خود ساختہ مذہبی ملک کے اندر ہونے والا ایک سوشلسٹ انقلاب تھا۔

ہمہ قسم کے جمہوریت پسند دانشور اور ماہرین اپنی نظریاتی غلطیوں اور بے ہودگیوں کو دہرانے پر مجبور چلے آرہے ہیں کیونکہ وہ ان تاریخی واقعات کی فطرت اور کردار کے واضح ادراک میں ناکام رہے ہیں۔ لبرل ڈیموکریسی کی سرمایہ دارانہ پالیسیوں کے نتیجے میں ہونے والی سماجی اور معاشی کوششیں رجعتیت کو کمزور اور اس کا خاتمہ کرنے کی بجائے اسے مضبوط اور مستحکم کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ اس حوالے سے بنیاد پرستی اور دیگر رجعتی رجحانات کا ابھار یا فروغ انہیں جواز فراہم کرتا ہے کہ بدعنوان پاکستانی سرمایہ داری کا بھی دفاع کیا جائے بلکہ مغرب کی غلامی کو بھی جائز ثابت کیا جا سکے۔

سامراجیوں کو اس عدم استحکام اور ''نظریاتی'' تصادم کی ضرورت ہے تا کہ وہ اپنے سٹریٹیجک اور پالیسی مفادات حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سابقہ بائیں بازو کی طرف سے ان لبرل ڈیموکریٹس کی حمایت درحقیقت ان کی سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کے نظریے سے غداری کا ایک بھونڈا جواز ہے۔ سرمایہ داری کے تحت لبرل ڈیموکریسی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہوتا سوائے اس کے وہ سامراج کی دم چھلا بنی رہے۔ ایک بورژوا جمہوریت اپنی اصل میں بینکوں اور اجارہ داریوں کی ذلت آمیز آمریت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتی۔ جدید عہد میں سرمایہ ناقابل یقین حد تک مرتکز ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں ان بڑی اجارہ داریوں کی طاقت بھی اتنی ہی مضبوط اور مرتکز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عام طور پر سرمایہ دار طبقہ ایک جمہوری حکومت کو پسند کرتا ہے جو حکومت کی سب سے بہتر معاشی شکل ہوا کرتی ہے۔ اصل میں وہ عوام کو جمہوریت کا دھوکہ دینے کی اجازت دیتے ہیں حالانکہ طاقت کے سبھی ذرائع اور مراکز ان کے اپنے مضبوط شکنجے میں رہتے ہیں۔ وہ ان پارلیمانی نمائندوں کو سینکڑوں نادیدہ لگاموں کے ذریعے کنٹرول کرتے ہیں۔ وہ چونکہ بینکوں اور اجارہ داریوں کے مالک ہیں اس لیے وہ کسی بھی حکومت پر بدترین دباؤ ڈال سکتے ہیں اور اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ وہ ذرائع ابلاغ کے مالک ہیں اخبارات، ٹیلی ویژن ان کی ملکیت ہیں جن کے ذریعے وہ رائے عامہ کو جس طرف چاہے موڑ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مزدور تحریک کے ان بے بس قسم کے لیڈروں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر جاتے ہیں جن کا اس نظام کی حدود سے باہر جانے یا خلاف جانے کا کوئی ارادہ تک نہیں ہوتا۔ بورژوا جمہوریت ایک ایسا بے ثمر پودا ہے جس کے بارے میں عام طور پر حکمران طبقہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے انقلاب کا خطرہ ٹلا رہتا ہے۔ معاشی عروج کے ماحول میں سرمایہ دار طبقہ کسی بھی طبقاتی تنازعے سے بچنے کے لیے مزدوروں کو مراعات اور سہولتیں دینے کا متحمل ہوتا ہے لیکن جب طبقاتی جدوجہد ان حدود سے باہر نکلتی ہے تو سرمایہ دار جمہوریت کا ہنستا مسکراتا نقاب اتار کر پھینک دیتے ہیں اور فوجی بغاوتوں اور آمریتوں کو منظم کر کے مسلط کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ایک بار پھر اپریل 2002ء میں وینزویلا میں دیکھا کہ کس طرح سرمایہ دار جلدی سے جمہوریت سے آمریت کی طرف آسانی سے ویسے ہی سفر کرتے ہیں جس طرح ایک عام آدمی سگریٹ کے دھوئیں سے بچنے کے لیے ریل کے ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں چلا جاتا ہے۔

سوشلزم کے مقاصد

اگر آج سے چالیس سال پہلے کے پاکستانی انقلاب کا کردار سوشلسٹ ہوسکتا ہے تو آج اس سے بھی زیادہ سوشلسٹ ہوسکتا ہے اور ہوگا۔ جمہوری انقلاب کے اہداف مکمل نہ ہو سکنے کے باعث پاکستان کے وجود پر آئے روز شدید گھاؤ لگتے چلے آرہے ہیں۔ پچھلے ساٹھ سالوں میں یہ حقیقت اور بھی ثابت ہوچکی ہے کہ ان اہداف کو پاکستان کی بانجھ اور بدعنوان سرمایہ داری پورا کر بھی نہیں سکتی۔ ان اہداف کو پورا کرنے کے لیے بے شمار وسائل کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سوشلسٹ انقلاب کے بغیر قومی جمہوری انقلاب بھی طے یا مکمل نہیں کیا جاسکتا۔ ٹراٹسکی نے ''کمیونسٹ انٹرنیشنل'' میں لکھا تھا ''سرمایہ دارانہ نظام کی نابرابر ترقی کی طرز سے ہی سوشلسٹ انقلاب کا پر پیچ نابرابر اور غیر مسلسل کردار مرتب ہوتا ہے۔ مارکس سے لے کر اب تک ہم بار بار یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام نئی ٹیکنالوجی کی روح سے پوری طرح انصاف نہیں کرسکتا کہ جسے یہ خود اپنے آپ ہی ترقی دیتا ہے، جو آگے بڑھتے ہوئے نہ صرف نجی ملکیت کے سرمایہ دارانہ حقوق کو بھی تاراج کرتی ہے بلکہ خود سرمایہ دارانہ ریاست کی قومی حدود کو بھی توڑتے ہوئے باہر نکل جایا کرتی ہے۔ تاہم سوشلزم کو ہر حال میں نہ صرف سرمایہ دارانہ نظام سے یہ سب انتہائی جدید اور ترقی یافتہ ترین ذرائع پیداوار اپنے قبضے میں کرنا ہے بلکہ لازمی طور پر انہیں تیزی کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے ان کو بلند معیار پر لے جانا ہے''۔(6)

سماجی اور معاشی معیار کو سرمایہ دارانہ نظام کی بلندیوں سے بھی آگے اور اوپر لے جانے کے ساتھ ساتھ سوشلسٹ انقلاب کو ہر حالت میں قومی جمہوری تقاضے بھی پورے کرنا ہوتے ہیں۔ سامراجی اثاثوں، مالیاتی سرمائے کو ضبط کرنے اور کئی بار سود سمیت ادا کر دیئے گئے قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر کے معیشت کے بڑے شعبوں اور زمین کی بڑی ملکیتوں کو ریاستی کنٹرول میں لینے کے بعد سامراج اور سرمایہ داری کے نسلوں سے چلے آرہے استحصال اور لوٹ مار کا یکسر خاتمہ ہوجائے گا۔ یہ اقدامات تیزی سے سماج کو بدلنے اور اسے ترقی دینے کا باعث بنیں گے اور پیداواری ذرائع کو ایک کم مدت میں ہی سوشلسٹ معیشت میں ڈھال دیں گے۔ زرعی انقلاب، قومی مسئلے کا حل، سوشل اور فزیکل انفراسٹرکچر کی تعمیر و تشکیل سمیت کئی دوسرے ہدف ایک بہتر معیار اور کم وقت میں ممکن ہوجائیں گے جس سے منڈی کی معیشت کو ایک منصوبہ بند سوشلسٹ معیشت میں تبدیل کر دیا جائے گا اور یوں پیداوار کے حصول کا بنیادی مقصد

منافعوں کی بجائے انسانوں کی ضرورتوں کی تکمیل میں تبدیل ہو جائے گا۔قومی مسئلے کو مظلوم قومیتوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کیے جانے سے حل کر لیا جائے گا۔ایک سوشلسٹ نظام کی موجودگی اور پیش قدمی سے خوشحالی اور سماجی و معاشی ترقی میں حیرت انگیز و خوشگوار اضافہ ہونا شروع ہوگا اور اس بات کا قوی، روشن امکان پیدا ہو جائے گا کہ مظلوم قومیتوں کے محنت کش طبقات ایک سوشلسٹ فیڈریشن کے ساتھ وابستہ اور منسلک رہنے کو ہی ترجیح دیں گے جو جلد ہی ابھرنا مستحکم اور مربوط ہونا شروع کر دے گی اور اپنا پھیلاؤ کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ ریاست کی پیدا کردہ ریاستی حدود کو توڑتی چلی جائے گی۔لینن کو قومی مسئلے کی اہمیت اور حساسیت کا مکمل ادراک تھا اور وہ اس کے سوشلسٹ انقلاب کے ساتھ تعلق اور جڑت کو بخوبی سمجھتا تھا۔''سوشلزم کا مقصد صرف اس بہیمانہ تقسیم کا ہی خاتمہ نہیں جن کے ذریعے سرمایہ داروں نے انسانوں کو تقسیم کر کے رکھا ہوا ہے اور قوموں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے بلکہ سوشلزم نے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب بھی لانا ہے اور انہیں آپس میں باہم مربوط بھی کرنا ہے''۔(7)

سٹالنزم

بلا کسی تاخیر، بلا روک ٹوک قومی جمہوری مراحل مکمل کرتے ہوئے اور سوشلزم کو تعمیر کرتے ہوئے پاکستان کا انقلاب ایک مسلسل انقلاب کے کردار کا حامل ہو جائے گا۔یہ بھی حقیقت ہے کہ سرمایہ دارانہ ریاست کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ ایک مزدور ریاست کو قائم کرنے کا مرحلہ ایک کٹھن مرحلہ ہوگا۔حکمران سرمایہ دار طبقات کے گماشتہ دانشور اور ماہرین ایک صدی سے زیادہ عرصے سے پروپیگنڈہ کرتے چلے آ رہے ہیں کہ سوشلزم اور کمیونزم سوائے آمریت کے کچھ بھی نہیں۔پہلے تو انہوں نے بالشوازم کے جمہوری مرکزیت کے اصول کو سرمایہ دارانہ ملکوں میں قائم ہونے والی فوجی آمریتوں کا ہم پلہ اور مماثل قرار دیا۔اس کے بعد انہوں نے روس میں مسلط ہو جانے والے سٹالنزم کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا اور اسے جواز بنا کر سوشلزم کے خلاف تو آسمان کو ہی سر پر اٹھا لیا۔سٹالنزم کسی طور بھی مارکسزم نہیں تھا بلکہ سوشلزم کی ایک مطلق العنان بگڑی ہوئی شکل تھا جو سوویت یونین میں افسر شاہانہ زوال پذیری کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آیا تھا۔یہ ہرگز ہرگز انقلاب کی پیداوار نہیں تھا بلکہ سٹالن کی زیر قیادت مسلط ہونے والے افسر شاہانہ رد انقلاب کی پیداوار تھا۔اس کے ابھرنے میں ایک بڑی وجہ جدید ترقی یافتہ ملکوں کے اندر

انقلاب کا ممکن نہ ہوسکنا تھا، جرمنی میں 1918/19ء، فرانس 1924ء، برطانیہ 1926ء آسٹروہنگیری سلطنت 1920ء، چین 25-1924ء، سمیت کئی دوسرے ملکوں کے انقلابات ناکام ہو چکے تھے۔ بالشویک کیڈروں کے قتل، سامراج کی طرف سے انقلاب کو کچلنے کی تحریک اور روسی سماج کی پسماندگی یہ ان عناصر میں سے تھے جو سٹالنزم کے ابھار اور تسلط کا باعث بنے۔ سب سے بڑھ کر جولائی 1921ء میں خود لینن نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اگر انقلاب جدید ترقی یافتہ ملکوں میں نہیں پھیلتا تو روسی انقلاب کا دم گھٹ جائے گا۔ ٹراٹسکی، ٹیڈ گرانٹ سمیت کئی دوسرے انقلابی استادوں نے اس سٹالنسٹ مطلق العنانیت کے زوال کی کئی دہائیاں پہلے پیشین گوئی کر دی تھی۔ روس کے زوال کے بعد سب سے بڑا اور بے تحاشا پروپیگنڈہ یہ کیا گیا کہ سوشلزم ناکام ہو چکا ہے، مارکسزم ختم ہو چکا ہے، تاریخ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تہذیبوں کا تصادم، کمیونسٹوں کی آمریت اور حاکمانہ معیشت وغیرہ، یہ سب وہ گمراہ کن دھوکے تھے جو لوگوں کو دنیا بھر میں مالیاتی سرمائے کے جبر اور آمریت سے توجہ ہٹانے کے لیے گھڑے اور پیش کیے گئے۔

مالیاتی سرمایہ اپنے معاشی اور سماجی جبر و استحصال کو فوجی آمریتوں اور سرمایہ دارانہ جمہوریتوں دونوں شکل میں ایک ہی سطح اور کیفیت کے ساتھ قائم و دائم رکھتا ہے۔ سرمایہ دارانہ دانشوروں اور سامراجی ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے پروپیگنڈے کی یہ تمام تر مہم درحقیقت اپنے ہی نظام کے شدید تر ہوتے اور ڈبو دینے والے بحران سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے ہے۔ ایلن وڈز نے سرمایہ داروں کے نظریہ سازوں اور ماہرین کے اس واویلے اور شور و غل کو جو وہ مارکسی فلسفے اور نظریے پر مسلسل اور بے رحم بلا جواز حملوں کی شکل میں کر رہے ہیں، ان الفاظ میں سمیٹا ہے ''سرمایہ دارانہ نظام کا بحران' سرمایہ دارانہ معاشرے کی اقدار اخلاقیات، مذہبی رویوں، سیاست اور ان کے فلسفے سے صاف چھلکتا نظر آ رہا ہے۔ قنوطیت، مایوسی، اور چڑچڑا پن جو سرمایہ داروں اور ان کے نظریہ سازوں کے لہجوں، رویوں اور لفظوں سے ابل رہا ہے وہ ان کی پست سوچ کی عکاسی کرتا ہے جو ان کے آرٹ کی بے ہودگی اور ان کی روحانی، اخلاقی اقدار کا کھوکھلا پن ہے ہم سب کے سامنے عیاں اور واضح ہے۔ اس کا سب سے بلند و بالا اظہار ان کے پوسٹ مارڈرن ازم (مابعد الجدیدیت) کے فلسفے کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جو اپنے تئیں اب تک کے ہر فلسفے سے اپنے آپ کو بلند و برتر تصور کرتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک کا بے ہودہ ترین فلسفہ ہی یہی ہے۔ سرمایہ داری اپنی جوانی میں اس قابل تھی کہ وہ بڑے مفکرین اور دانشور لاک، ہابس، کانٹ، ہیگل، آدم سمتھ اور ریکارڈو پیدا کر رہی تھی مگر اپنے انحطاط کے دور میں یہ ''شاہ دولے کے چوہے'' پیدا کر رہی ہے۔

یہ وہ صاحبان دماغ ہیں جو نظریہ کے ختم ہو جانے اور تاریخ کے ختم ہو جانے کی ایک ہی سانس میں بات کرتے ہیں۔ ان کو آئندہ کسی قسم کی ترقی ہونے پر یقین ہی نہیں کیونکہ سرمایہ داری بہت عرصے سے ترقی کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو چکی ہے۔ جب وہ تاریخ کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خود تاریخ کے ہاتھوں ختم ہو چکے ہیں اور ان کو آگے کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ جب وہ نظریے کے خاتمے کی بات کرتے ہیں تو اس کی سیدھی سادھی وجہ یہ ہے کہ یہ خود نظریہ اور فلسفہ پیش کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔''(8)

یہ سچ ہے کہ انقلابی سوشلزم کے تحت جمہوریت، پارلیمانی جمہوریت ہوگی نہ ہی یہ قدیم ایتھنز کی جمہوریت جیسی ہوگی اور نہ ہی تاریخ میں تجربے کیے جانے والی دوسرے جمہوری شکلوں کی طرح ہوگی۔ کبھی بھی کوئی بھی انقلاب پارلیمانی جدوجہد کے ذریعے نہیں ہوا اور نہ ہی اسے کسی سرمایہ دار ریاست کے ادارے کے ذریعے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ 1917ء کے انقلاب کے دیوہیکل واقعات کے دنوں میں لینن نے اپنی شاہکار کتاب ''ریاست اور انقلاب'' لکھی جو بلاشبہ ایک مارکسی شاہکار ہے۔ اس سے نظریے اور سیاسی تعلیم وتربیت کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مارکسزم کے عظیم استاد ہمیشہ فتح مند انقلاب کی جدوجہد کے دوران بھی نظریے کی ترقی وترویج کے عمل سے منسلک رہے۔ لینن نے 1917ء میں لکھا تھا کہ ''استحصال کرنے والے طبقوں کو اپنا استحصال جاری رکھنے کے لیے سیاسی حکمرانی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے اقلیت، اکثریت کے خلاف اپنے خودغرضانہ مفادات کو حاصل کرنا اپنا نصب العین قرار دیتی ہے۔ اسی طرح استحصال کا شکار ہونے والے طبقات کو بھی اس استحصال سے بچنے اور اسے ختم کرنے کے لیے سیاسی حکمرانی کی ضرورت ہوتی ہے تبھی جا کر انسانوں کی وسیع اکثریت کے مفادات کو اقلیتی طبقے کے مفادات کے مقابلے میں یقینی بنایا جاسکتا ہے جس نے آج کے جدید دور میں بھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی شکل میں انسانوں کی اکثریت کو اپنا غلام بنایا ہوا ہے۔ ہم جمہوریت کا، یہاں تک کہ مزدور جمہوریت کا نمائندہ اداروں کے بغیر تصور بھی نہیں کر سکتے مگر ہم پارلیمانیت کے بغیر جمہوریت کا تصور کر سکتے ہیں اور ہر حال میں کرنا بھی چاہیے۔ بے شک سرمایہ دار ہم پر جتنی زیادہ تنقید کریں، ہاں سرمایہ داروں کی حکمرانی کے خاتمے کی خواہش ہماری سب سے بڑی اور سب سے سچی خواہش ہے اور یہ صرف مزدوروں کے ووٹ لے کر الیکشن میں حصہ لینے کی چیخ وپکار سے کہیں بلند اور برتر مقصد ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ پرانا انتظامی ڈھانچہ افسر شاہی جو سرمایہ داروں سے وابستہ اور منسلک چلا

آ رہا ہے' ایک مزدور ریاست کا نظام اور انتظام چلانے کے لیے غیر ضروری ہے۔ مزدور جمہوریت ریاست کی ایک ایسی شکل ہے جو ایک طرف منظم، مربوط طاقت پر مبنی ہوتی ہے جو لوگوں کے خلاف استعمال ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ عمومی طور پر تمام شہریوں کی برابری اور سب کے لیے ریاست کا ڈھانچہ اور نظم ونسق متعین کرنے اور اس کا انتظام چلانے کے برابر حق کا اعلان بھی کرتی ہے۔'' (9)

اپنی اسی کتاب میں لینن سوشلزم کے تحت جمہوریت کی تفصیل سے وضاحت کرتا ہے۔ اس مزدور جمہوریت کی طبقاتی نوعیت پوری تاریخ میں نسل انسانی کے لیے اعلیٰ ترین جمہوریت کی ایسی صورت ہوگی جو پہلے کبھی دیکھی اور سنی نہ گئی ہوگی۔ لینن کہتا ہے:

''ایک سوشلسٹ سماج میں پارلیمنٹ کی شکل وصورت مزدوروں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ جو یقینی طور پر کام کرنے کے لیے لازمی قوانین اور انتظامی ڈھانچے کی نگرانی کا فریضہ سرانجام دے گی مگر یہ ڈھانچہ بیوروکریٹک نہیں ہوگا۔ مزدور سیاسی طاقت حاصل کرنے کے بعد پرانے افسر شاہانہ ڈھانچے کو اس کی بنیادوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دیں گے اور اسے زمین میں دفن کر دیں گے۔ اس کی جگہ وہ ایک نیا اسی طرح کا مزدوروں اور دیگر ملازمین کا ایک ڈھانچہ تعمیر کریں گے اس کا قیام مارکس اور اینگلز کے بتائے گئے طریقوں سے ممکن ہوگا۔

(1)۔ ہر عہدہ نہ صرف منتخب ہوگا بلکہ اس عہدیدار کو کسی بھی وقت اس کے عہدے سے الگ کیا جا سکے گا۔

(2)۔ اس عہدے دار کی تنخواہ ایک عام مزدور کی اجرت سے کسی طور زیادہ نہیں ہوگی۔

(3)۔ کنٹرول اور نگرانی کو فوری طور اس انداز میں پر متعارف کرایا جائے گا کہ اس سماج میں ہر شخص بیک وقت خود ہی اپنا افسر ہوگا لیکن ان میں سے کوئی بھی افسر نہیں ہوگا۔

''مزدور طبقہ صدیوں سے لوٹ مار کا شکار چلا آ رہا ہے۔ محنت کرنے والے انسان سرمایہ داری کے ہاتھوں غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت جمہوریت محدود' بدعنوان اور مجہول ہوا کرتی ہے۔ اس کو اپنے غلاموں کی اجرت، غربت اور محرومی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس اور صرف اس ایک وجہ سے ہماری سیاسی اور مزدوروں کی تنظیمیں اور پارٹیاں یا تو بدعنوان ہو چکی ہیں یا پھر سرمایہ دارانہ نظام کی شرائط کی وجہ سے بدعنوانی اور غداری کی طرف مائل ہو جانے پر مجبور ہوتی ہیں اور ان میں عہدے کا لالچ پروان چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مراعات یافتگی کی زد میں آنے والے یہ افراد اپنے جیسے لوگوں سے

کٹ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے الگ اور بلند سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی افسر شاہی کی نفسیات کا نچوڑ ہے اور جب تک سرمایہ داری کو بے دخل نہیں کیا جاتا اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم نہیں کیا جائیگا تب تک مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے عہدیدار بھی بڑی حد تک افسر شاہی کے رجحان کو اپناتے رہیں گے۔ مہذب سماج کی تاریخ میں پہلی دفعہ انسانوں کی اکثریت اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ایک آزادانہ عمل کے ذریعے، صرف ووٹ ڈال کر یا الیکشن کا حصہ بن کر نہیں بلکہ روزمرہ کے ریاستی انتظامی معاملات میں شرکت کریگی۔ سوشلزم کے تحت ہر انسان حکمران ہوگا، اسے حق حکمرانی حاصل ہوگا اور یہ ایسی صورت بن جائے گی کہ کوئی انسان بھی حکمران نہیں ہوگا۔'' (10)

ریاست

اسی طرح کا ایک اور اہم سوال ریاست اور اس کے ادارے ہیں۔ موجودہ اور مروجہ ریاست کا فلسفہ، ڈھانچہ اور ترتیب سرمایہ داروں اور ان کے نظام کے تحفظ پر مبنی ہے۔ اس سے بالکل مختلف اور تبدیل شدہ سماجی اور معاشی نظام کسی طور اس قسم کی ریاست کے ہوتے ہوئے نہیں چلایا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مروجہ ریاستی ڈھانچہ اپنے موجودہ کردار اور شکل وصورت میں ہمیشہ سے ہی مزدوروں اور محروم انسانوں کی انقلابی تحریک کو کچلنے کی کوشش کرتا چلا آرہا ہے اور کرتا رہے گا۔ ایک انقلاب کو اس بارے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اسے ہر حال میں موجودہ ریاستی ڈھانچے کو تہس نہس کرنا ہوگا اور اس کے اوپر ریاست کے نئے ڈھانچے اور عمارت کو تعمیر کرنا ہوگا۔ اپنی تاریخ ساز کتاب ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' میں عظیم مارکسی استاد فریڈرک اینگلز نے ریاست کے بارے میں اپنا تاریخی تجزیہ ان الفاظ میں سمیٹا تھا ''ریاست ہر حوالے سے ایک ایسی مضبوط طاقت ہے جو سماج پر کسی اخلاقی عقیدے کی روشنی میں نہیں بلکہ ایک دلیل کی رو سے مسلط ہوتی ہے، جیسا کہ ہیگل نے کہا تھا اگرچہ یہ ترقی کے ایک مخصوص مرحلے پر سماج کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ اعتراف ہوتی ہے کہ سماج اپنے اندر ناقابل حل تضاد کا شکار ہو چکا ہے جس کے باعث یہ ناقابل مصالحت تصادم کی نہج پر پہنچ چکا ہے جس پر قابو پانا اس کے بس میں نہیں رہا۔ مگر اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کہ ان متحارب معاشی مفادات کے حامل طبقات خود کو اور سماج کو کسی بے معنی جدوجہد میں نہ الجھالیں، یہ لازمی ہوگیا کہ ایک ایسی طاقت کا ہونا ضروری ہے، جو سماج سے بالاتر ہو اور جو تصادم کو زیادہ شدید ہونے سے روکے اور اسے قانون اور نظم ونسق کے دائرے

میں پابند رکھنے کی کوشش کرے۔اس طاقت کو سماج کے اندر سے ہی پیدا کر کے اسے سماج پر مسلط کر دیا جاتا ہے اور پھر اسے سماج سے زیادہ سے زیادہ الگ تھلگ اور بے پرواہ رکھا جاتا ہے'اس طاقت کا نام ہی ریاست ہے''۔(11)

اس سے ریاست کے تاریخی کردار اور مفہوم کے حوالے سے مارکسزم کے بنیادی تصور کی مکمل وضاحت ہوتی ہے۔ریاست ناقابل مصالحت،طبقاتی تنازع کا اظہار اور پیداوار ہوتی ہے۔ریاست وہاں جنم لیتی ہے جہاں طبقاتی جھگڑا یا تصادم معروضی حوالوں سے کسی فیصلے تک نہیں پہنچ پاتا۔اس کے برعکس ریاست کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ طبقاتی تصادم ناقابل مصالحت ہوا کرتا ہے۔اپنی ابتدائی تحریروں میں مارکس نے ریاست کا ایک جامع تجزیہ تحریر کیا تھا۔''حقیقی تعلقات (سماج کا معاشی ڈھانچہ) کسی طریقے سے بھی ریاستی طاقت کے ذریعے پیدا نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس وہی ریاست کو پیدا کرنے والی طاقت ہوتے ہیں۔ان حالات میں کام کرنے والے افراد بھی ریاست کی تشکیل میں کردار ادا کرتے ہیں،انہیں بھی اپنی خواہش کو جس کا تعین مخصوص حالات کیا کرتے ہیں،ایک عالمگیر اظہار کے طور پر ریاست کی خواہش بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے ایک قانون کے طور پر یہ ایک ایسا اظہار ہوتا ہے جس کا متن اس طبقے کے تعلقات مرتب کرتے ہیں؛سول اور فوجداری قوانین اس کی ممکنہ واضح ترین شکل ہوتی ہے''۔(12)

سوویت یونین کے زوال اور دیوار برلن کے گرنے کے بعد شہروں کے درمیانے طبقے (اور ان کے ساتھ ساتھ) 1960ء کی دہائی کے فیشن ایبل سوشلسٹوں میں یہ بات عام ہوگئی کہ سرمایہ دارانہ ریاست کا خاتمہ اور انقلاب کا ہونا اب محض دیوانے کا ہی ایک خواب ہے۔ایک بالشویک لینسٹ پارٹی کی تعمیر و تشکیل'ایک جمہوری مزدور ریاست کا قیام اور سوشلسٹ انقلاب کا ایک متبادل راہ نجات ہونے کا امکان یہ سب پرانے کمیونسٹوں اور پاکستان پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کے لیے شجر ممنوعہ بن چکا ہے۔ایسا تاریخ میں کوئی پہلی بار نہیں ہو رہا۔ہر انقلابی پارٹی کو اس قسم کی ذلتوں اور حملوں کے ساتھ،اپنی انقلابی سوشلزم کے لیے جدوجہد کے دوران واسطہ پڑتا چلا آ رہا ہے۔لینن نے اس قسم کے اصلاح پسند دانشوروں کے بارے میں سخت الفاظ میں لکھا تھا''یہ وہ بہرے ہیں جنہیں اپنے کان میں پڑنے والی آواز سمجھ نہیں آتی، آج بھی سوشل ڈیموکریسی کے موقع پرست اس بارے میں ایک حرف بھی سننا گوارہ نہیں کرتے کہ ریاستی طاقت اور اس کے خون چوسنے والے وحشی اقتدار کو تباہ و برباد کیا جا سکتا ہے۔واقعات کا بے رحم سلسلہ

انقلاب کو مجبور کرتا ہے کہ وہ انسانوں کو محرومی اور ذلتوں کا شکار کرنے والی اس قوت پر اپنی توجہ مرکوز کرے جسے ریاست کہتے ہیں۔ ریاستی ڈھانچے کو تقویت دینے کیلئے نہیں بلکہ اسے تہس نہس اور تباہ و برباد کرنے کیلئے۔ ہم خواب دیکھنے والے لوگ نہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ایک ہی ہلے میں سب کچھ تہس نہس کیا جائے گا۔ یہ ایک انارکسٹ خواب ہوسکتا ہے جو پرولتاریہ کی آمریت کے اہداف کی بھونڈی تشریح کرتا ہے اور جس کا مارکسزم کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں۔ درحقیقت یہ لوگ سوشلسٹ انقلاب کو تب تک ملتوی کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں تاوقتیکہ لوگ اس سے الگ ہوجائیں۔ نہیں ہم سوشلسٹ انقلاب چاہتے ہیں، لوگوں کے ساتھ مل کر اسی کیفیت میں جس میں وہ اس وقت موجود اور زندہ ہیں۔ جو لوگ اپنی اطاعت، اپنی غلامی، اور اپنی مفاد پرستی ترک نہیں کرسکتے، انقلاب کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ وہ اطاعت جو محنت کش اور محروم طبقات کی مسلح محافظ بنے؛ وہ ایک آغاز ہوسکتا ہے اور اسے ہونا چاہیے، راتوں رات فوراً تاکہ جس سے ریاستی افسر شاہی کی خوئے حکمرانی کو سیدھے سادھے انداز میں معمولی کام کرنے والوں کے ذریعے ختم اور تبدیل کردیا جائے۔ یہ افسر شاہی جس قسم کے کام اور فرائض سرانجام دیتی ہے ایک عام مزدور میں بھی یہ کام کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ہم عام مزدور بڑے پیمانے کی پیداوار کو انہی بنیادوں پر منظم کریں گے جن پر یہ سرمایہ دارانہ نظام پہلے ہی کرتا چلا آرہا ہے۔ لیکن ہم ایسا کریں گے مزدوروں کے اپنے تجربات پر اعتماد کرتے ہوئے سخت، آہنی نظم و ضبط پیدا کرتے ہوئے جسے مسلح مزدوروں کی ریاستی طاقت کی تائید و حمایت حاصل ہوگی۔ ہم ریاستی افسر شاہی کے کردار کو کم کرتے جائیں گے اور انہیں اپنی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے کام میں لائیں گے۔ مگر ان کی تنخواہیں فورمینوں اور اکاؤنٹنٹ سے زیادہ نہیں ہوں گی اور ان سے انہی تنخواہوں پر بہترین کام لیا جائے گا۔ یہ ہمارا پرولتاری فریضہ بنتا ہے۔ اسی سے ہم شروع کرسکتے ہیں اور ہمیں لازماً اسی سے ہی مزدور انقلاب کو مکمل کرنے کی ابتداء کرنی پڑے گی۔ اس قسم کے آغاز سے بڑے پیمانے کی پیداوار ممکن بناتے ہوئے ہم بتدریج جلد ہی ہر قسم کی افسر شاہی کا خاتمہ کردیں گے اور یوں ہم ایک ایسا نظم و ضبط تخلیق کریں گے جو کسی کے لیے بھی مخصوص نہیں ہوگا۔ فوری طور پر تنخواہوں اور اجرتوں کا ایک ایسا نظام رائج کیا جائے گا جس سے اجرتوں کی غلامی کی نفسیات ختم ہوجائیگی۔ جس کے رفتہ رفتہ سب کام کرنے والے عادی ہوجائیں گے اور آخر کار آبادی افسر شاہی جیسے مخصوص مراعات یافتہ حصے سے پاک صاف ہوجائیگی۔'' (13)

69-68ء کے انقلاب کے عروج پر ہم نے اس عمل کی ابتدائی شکلیں وقوع پذیر ہوتی دیکھی ہیں۔

جب انقلاب ریاست کے خلاف صف آرا تھا تو وہ علاقے جن پر ریاستی طاقتوں کا قبضہ تھا انہیں آزاد کرا لیا گیا تھا مگر اس کی جگہ ایک متبادل نظام درکار تھا۔ ہمیں کارخانوں اور ان کے قرب و جوار یہاں تک دیہاتوں میں دیہی کمیٹیاں بنتی، منظم ہوتی اور معاملات سنبھالتے دکھائی دیتی ہیں۔ مزدوروں اور ملکیت سے محروم عوام نے اجتماعی اور باہمی صلاح مشورے پر مبنی کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جسے کچلے ہوئے عوام نے رضا کارانہ طور پر ہنسی خوشی قبول بھی کیا اور اس کی بھرپور حمایت بھی کی۔ عام لوگ، عام انسان، بھرپور طریقے سے اس سارے عرصے میں ان تمام انتظامی معاملات میں شریک ہوئے جب تک پاکستان میں دہرے اقتدار کی کیفیت موجود رہی۔

70ء کے الیکشن میں فوج کی طرف سے پڑنے والے ووٹوں کی شرح واضح اشارہ کرتی ہے کہ سپاہیوں اور چھوٹے رینک کے فوجی افسروں پر 69-68ء کے اس انقلاب نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ یوں تمام صورت حال ایک انقلابی پارٹی کا چیخ چیخ کر تقاضا کر رہی تھی۔ جو اپنے اندر کسی نہ کسی شکل میں ''ریاست کے اندر ایک ریاست ہوا کرتی ہے'' اگر پاکستان میں اس وقت 1917ء میں روس کی طرح کی بالشویک پارٹی جیسی کوئی تربیت یافتہ تنظیم موجود ہوتی تو اس ریاستی ڈھانچے کو توڑ کر اس کی جگہ ایک انقلابی ریاست کا قیام یقینی ہو جاتا۔ اس ریاست کو عوام کی تحریک کے انقلابی جوش و جذبے نے اس کی بنیادوں تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔

غیر ملکی جارحیت

پاکستان میں اس قسم کی انقلابی صورتحال کے حوالے سے ایک اور اہم پہلو اور عنصر غیر ملکی جارحیت کا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ سامراج ایسی کسی بھی تبدیلی کو نظر انداز کرتے ہوئے چشم پوشی نہیں کرے گا لیکن آج کل ایسی بہت سی چیزیں ہو رہی ہیں جنہیں سامراج نہ صرف نظر انداز کرنے پر مجبور ہو رہا ہے بلکہ بے بس بھی نظر آ رہا ہے۔ وینزویلا سے ایران تک، عراق سے افغانستان تک اور یقینی طور پر پاکستان کے علاقوں میں۔ سامراج اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے، اس سے آگے کہاں جا سکتا ہے؟ اس وحشیانہ جارحیت پر اٹھنے والے بے تحاشا اخراجات اور مالیاتی نظام کے زوال سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ اب سامراج کچھ کرنے کے لائق نہیں رہا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سامراج کے پاس کون سی صلاحیت رہ گئی ہے۔ وہ اپنے اس پاگل پن کو ان ملکوں پر کب تک اپنی جنونی جارحیت کے لیے استعمال کرے گا اور

تہذیبوں کو برباد کرتا رہے گا۔ ٹراٹسکی نے ایک بار لکھا تھا کہ امریکی سامراج ایک ایسا دیو ہے جس کے پاؤں مٹی کے ہیں۔ آج ہم سامراج کی موجودہ کیفیت کو دیکھیں تو ہمیں ٹراٹسکی کے الفاظ کی سچائی کھلے عام نظر آتی ہے۔ اپنی فوج اور مہذب کٹھ پتلی حکمرانوں کی بدولت جنہوں نے اپنی لوٹ مار سے کمایا ہوا پیسہ ان سامراجی ملکوں کے بینکوں میں جمع کرا رکھا ہے اور جن کو پھر یہ سامراج پاکستان پر کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔ انقلاب ان کٹھ پتلی حکمرانوں کو اور ان کے تمام ریاستی ڈھانچوں کو اکھاڑ کر پھینک دے گا اور زبردستی ان سے وہ اربوں، کھربوں روپیہ وصول کیا جائیگا جو انہوں نے پاکستان کے غریب عوام کے خون، پسینے اور آنسوؤں کے ہر قطرے سے نچوڑ کر جمع کیا ہوا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ 1917ء کے بالشویک انقلاب، 1949ء کے چین کے انقلاب 1959ء کے کیوبن انقلاب اور دوسرے ممالک کے دیگر انقلابات جو ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں برپا ہوئے، سامراج ان میں سے چند ایک کو ہی کچلنے میں کامیاب رہا ہے۔ آخر سامراجی وینزویلا کے انقلاب سے اتنے پریشان اور حواس باختہ کیوں ہیں۔ وہ اس پر گرم بھی بہت ہوتے ہیں مگر پھر ٹھنڈے بھی پڑ جاتے ہیں مگر امریکی شاویز کی طرف سے امریکہ کی دھونس دھاندلی اور اس کے تسلط کو بار بار چیلنج کرنے سے کیوں ڈر رہے ہیں۔ وہ شاویز کو قتل بھی کرا سکتے ہیں مگر وہ یہ جانتے ہیں کہ اس قتل سے لاطینی امریکہ میں انقلاب کی چلنے والی لہر کسی طور رکنے کا نام نہیں لے گی۔ جہاں ایک کے بعد دوسرا صدر اپنے منتخب ہونے کے بعد اپنے آپ کو ایک بائیں بازو کا صدر کہلواتا اور منواتا جا رہا ہے۔

69-68ء کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ برصغیر کے حکمران انقلاب کے اس خطرے کو ٹالنے کے لیے اور اس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنے پر بھی تیار ہو گئے۔ بھارت کے حکمران طبقات نے اپنی پوری عسکری طاقت نہ صرف پاکستان کی فوج کو شکست دینے کے لیے استعمال کی بلکہ اس طاقت سے مشرقی پاکستان کے آزاد کردہ علاقوں میں قائم ہونے والی انقلابی سوویتوں کو بھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا۔ اگر بھارت میں ایک بڑی انقلابی پارٹی موجود ہوتی تو وہ معاملات کو اس کے برعکس صورت حال میں لے جا سکتی تھی۔ بھارت کی کمیونسٹ پارٹیوں کے پاس عوامی طاقت موجود ہے لیکن ان کی قیادتیں لینسٹ نہیں سٹالنسٹ ہیں۔ ایک اچھے لیبل کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس پروڈکٹ یا جنس کا معیار بھی بلند ہو۔

سامراج کی انقلاب کے خلاف عسکری جارحیت کے مقابلے کی ایک اہم اور زندہ مثال بالشویکوں

نے 1918ء سے 1921ء کے عرصے میں قائم کی تھی۔ جب 21 سامراجی ملکوں نے ایک ساتھ مل کر نوزائیدہ انقلابی سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا۔ ٹراٹسکی جیسے عسکری نابغے کی سربراہی میں سرخ فوج کی تشکیل اور اس کی تیز ترین تنظیم سازی کی بدولت بالشویکوں نے ان حملہ کرنے والے ملکوں کی فوجوں کے عام سپاہیوں میں ایک اپیل تقسیم کی جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ ''ساتھیو! یہ انقلاب ایک طبقے کا کیا ہوا انقلاب ہے کسی قوم کا نہیں۔ آپ اپنے ہی طبقے کے انقلاب اور حکمرانی کے خلاف جنگ کرنے کے لیے لائے گئے ہیں۔ آپ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ آپ اپنے مزدور طبقے کے اقتدار پر حملہ کرنے کی بجائے اس کی حفاظت کریں''۔ اس اپیل کے نتیجے میں سامراج کی فوج میں بغاوتیں پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے روس کا سوشلسٹ انقلاب بچنے میں کامیاب ہو گیا۔

بین الاقوامیت

لیکن سوشلزم کبھی بھی ایک ملک میں تعمیر نہیں ہو سکتا اور ایک منصوبہ بند سوشلسٹ معیشت زیادہ لمبے عرصے تک اپنے آپ کو ایک ہی ملک کے اندر برقرار اور قائم نہیں رکھ سکتی چاہے اس کے وسائل کتنے ہی بے بہا اور بیش قیمت کیوں نہ ہوں اور اس ملک کی طاقت اتنی ہی زیادہ نہ بڑھ جائے۔ اگر روس جیسا ایک بہت بڑا ملک جس کا رقبہ دنیا کے پانچویں حصے کے برابر تھا، بھی قومی بنیادوں پر اپنے آپ کو برقرار نہیں رکھ سکا تو پھر دنیا کا کوئی دوسرا ملک کس طرح ایسا کر سکے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح سوشلزم پیداواری قوتوں کو اس طرح متحرک کرتا ہے جس کے ذریعے وہ شدت کے ساتھ ریاستی سرحدوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے، اسے کیونکر ایک قومی ریاست کی حدود میں محدود رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا خود سوشلزم کی تعمیر کے عمل سے ہی یہ ناگزیر ضرورت ابھرتی ہے کہ انقلاب کو قومی ریاست کی حدود سے باہر پھیلایا جائے، جہاں بھی اور جیسے بھی کامیابی سے ممکن ہو سکے۔ لینن نے روس کے انقلاب سے بھی پہلے 1915ء میں واضح طور پر کہہ دیا تھا'' مارکسی فلسفہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ سوشلسٹ انقلاب اپنی ابتداء ایک ملک سے کرے گا لیکن ایک ملک کے اندر رہتے ہوئے سوشلزم کی تعمیر و تشکیل ایک ناممکن عمل ہے اور آج تو اس بات کی اہمیت اور بھی دو چند ہو چکی ہے۔ آج کے جدید دور میں سامراج نے ان دونوں مخاصمانہ رجحانات کو جنم دیتے ہوئے ان کو تیز بھی کر دیا ہے اور گہرا بھی۔ نابرابر معاشی اور سیاسی ترقی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک غیر مشروط قانون ہے۔ لہٰذا اس سے ممکن ہو جاتا ہے کہ ابتدائی طور پر سوشلزم کی فتح چند

ایک یا صرف ایک سرمایہ دار ملک میں بھی ممکن ہوسکتی ہے۔اس ملک کا فاتح مزدور طبقہ سرمایہ داروں کو بے دخل کرتے ہوئے اور اپنے ملک کے اندر سوشلسٹ پیداوار کو منظم کرتے ہوئے باقی سرمایہ دار دنیا کے خلاف جدوجہد شروع کردے گا۔ وہ باقی دنیا کے ملکوں کے محروم طبقات کو اپنے انقلاب کی طرف راغب کرے گا۔ان ملکوں میں مزدوروں، کسانوں اور محروم طبقات کو اپنے اپنے ملکوں کے سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کرنے پر اور سرکشی کرنے پر مائل کرے گا اور ضرورت پڑنے پر استحصال کرنے والے طبقات اور ان کی حکومتوں کے خلاف فوجی طاقت کا استعمال بھی کرے گا۔'' (14)

ٹراٹسکی اس عمل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''سرمایہ دارانہ نظام ملکوں کی پیداواری قوتوں کی ترقیوں کے مابین تضادات کو شدت دیتے ہوئے عالمی معیشت کی قوتوں کو قومی ریاست کی سرحدوں کے مقابلے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ پیداواری قوتوں کا قومی ریاستوں کی حدود کے اندر دم گھٹنا شروع ہوجاتا ہے۔ غیر ملکی تجارت کا بہاؤ، سرمائے اور افرادی قوت کی برآمد، علاقوں پر قبضے، نوآبادیاتی پالیسی، اور پچھلی سامراجی جنگ سب اس کا شاخسانہ ہیں۔لیکن اسی کشمکش میں ایک خودکفیل سوشلسٹ سماج کا معاشی امکان بھی اس سے جنم لیتا ہے۔ سرمایہ دار ملکوں کی پیداواری قوتیں بہت عرصہ پہلے سے قومی سرحدوں کو توڑ کر باہر پھیل چکی ہیں البتہ سوشلسٹ سماج بجلی اور کیمسٹری سے لے کر زراعت سمیت پیداوار کی ہر شکل تک اور اسی کے ساتھ ساتھ جدید ٹیکنالوجی کے اعلیٰ ترین عناصر کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیتے ہوئے، انہیں عام کرتے ہوئے اور باہم مربوط کرتے ہوئے صرف انتہائی جدید پیداواری قوتوں کی بنیاد پر ہی قائم ہوسکتا ہے۔'' (15)

مارکسزم یا تو بین الاقوامیت ہے یا پھر کچھ بھی نہیں۔ انقلاب کو سوشلزم کی تعمیر کے عمل کے دوران سامراجی جارحیت سے بچاتے ہوئے، اس کو سرحدوں سے باہر فروغ دینا؛ یہی انقلاب کی شرط اول ہے۔ 69-68ء کے انقلاب نے پہلے ہی سارے جنوبی ایشیاء کے عوام کو ابھار دیا تھا۔ پاکستان میں ایک سوشلسٹ فتح افغانستان سے لے کر بھارت کے مشرق بعید تک کی سرحدوں میں انقلابی ابھار پیدا کرسکتی ہے جو اس سے بھی آگے اور دور اثرات مرتب کرے گا۔اس حوالے سے ایک انقلابی داخلی عنصر کی تعمیر براہ راست ایک مارکسی انٹرنیشنل سے جڑی ہوئی ہے جو اس خطے کے تمام ملکوں میں سرگرم عمل ہو۔ پاکستان کے انقلاب کی کامیابی کے لیے یہ پہلو انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی دوران ایک انقلابی انٹرنیشنل پر بھی یہ لازمی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ پاکستان سمیت کسی بھی اور ملک میں ہونے والے انقلاب کے دفاع کے

لیے بھرپور حمایت اور تائیدی مہم کو یقینی بنائے۔ عالمی سطح پر یہ مہم اور تائید خاص طور پر جدید ترقی یافتہ ملکوں کے مزدوروں اور نوجوانوں کی طرف سے میسر آنے والی تائید وحمایت، انقلاب کے دفاع میں فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔

کسی بھی صورت حال میں، ہمارے ایران اور افغانستان کے ساتھ طویل ثقافتی' معاشی اور سماجی رشتے قائم ہیں جو ہزاروں سال پر محیط ہیں۔ پھر بھارت اور پاکستان ایک واحد تہذیب کے طور پر سات ہزار سال پرانے رشتے سے جڑے ہوئے ہیں۔ صرف 61 سال پہلے اس وحدت کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ معمولی سا سیاسی ابھار بھی ان دونوں ملکوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ افغانستان، ایران، بنگلہ دیش، اور خطے کے دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے۔ ہر جگہ عوام بغاوت پر آمادہ نظر آتے ہیں وہ اپنی ذلتوں، اذیتوں ،محرومیوں سے نجات کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ آج کی انٹرنیٹ، سیٹلائٹ ٹیلی ویژن اور مواصلات کے دوسرے ذرائع کی بدولت ایک دوسرے کے انتہائی قریب آ چکی اس دنیا میں پاکستان میں ہونے والا انقلاب جرات اور تقلید کی ایک ایسی مثال بن کر سامنے آئے گا جس سے جنوبی ایشیاء سمیت دنیا کے کئی ملکوں میں انقلابی ابھار سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔ اس قسم کی تبدیلی تیزی کے ساتھ انقلاب کو ناقابل تصور حدوں تک پھیلانے کا باعث بن جائے گی۔ یہ جنوبی ایشیا کی رضا کار سوشلسٹ فیڈریشن کے قیام کی طرف پہلا قدم ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ''یونین آف سوشلسٹ سوویٹس ریپبلکس'' کی دوبارہ تعمیر وتشکیل ہوگی جو اس بار اپنی تکمیل کر کے ہی رہے گی اور اس سے لینن کا عالمی مزدور حکومت کا خواب USSR شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔ یہ جنوب ایشیائی سرحدوں سے بھی باہر اپنا پھیلاؤ جاری رکھے گی' یہ سامراج اور سرمایہ دارانہ استحصال کو ایک فیصلہ کن شکست سے دوچار کر دے گی۔

پاکستان کو اپنی متزلزل تاریخ میں کبھی بھی' کسی حال میں بھی استحکام کا ایک جھونکا تک نصیب نہیں ہو سکا۔ مگر جس قسم کے عدم استحکام کا اس وقت پاکستان کو، پاکستان کے اپنے ہی معیارات کے مطابق سامنا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں رہا۔ مشرف سے اقتدار لے کر زرداری کو منتقل کرتے ہوئے سامراج کو جتنا زور لگانا اور کشٹ کاٹنا پڑا ہے، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ حالت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ خود بورژوازی کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑ گیا ہے کہ ہم خسارے میں جا رہے ہیں اور ریاست کی وحدت اور جرأت میں انتشار کا عمل تیز سے تیز تر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ''ڈان'' نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے ''ہمارے عین وسط میں وحشی انتہا پسندوں کی موجودگی کوئی حیران کن بات نہیں' یہ دہائیوں سے ریاست کی مسلسل

آشیر باد اور سماج کی اسلامائزیشن کا ہی نتیجہ اور پیداوار ہے۔ان کی سخت گیری دن بدن بڑھتی ہی چلی جارہی ہے اور انہیں روز بروز اپنے غیر مسلح حمایتی دھڑوں، الہدیٰ، تبلیغی جماعت سمیت ہزاروں بے قاعدہ اور غیر قانونی طور پر قائم ہونے والے مدرسوں اور مسجدوں میں سے مالی و مادی معاونت فراہم کی جارہی ہے۔جس کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان کے بارے میں ایک ''نئی قدامت پرست بدو'' ریاست کا تاثر قائم ہوتا چلا جارہا ہے۔دہائیوں سے یہ عناصر ریاست کی سرپرستی سے لطف اندوز اور مستفید ہوتے آئے ہیں۔انہیں ریاست اپنے سٹریٹجک آلہ کار کے طور پر استعمال کرتی آئی جس کی وجہ سے ان کی طاقت اور نخوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اب یہ سرکش عناصر قابو سے باہر ہو چکے ہیں اور خود ریاست ان کا سب سے بڑا ہدف بن چکی ہے۔دہشت گردوں کو اس بات پر یقین ہے کہ سکیورٹی اداروں کے اندر کے باغی عناصر کی انہیں بھرپور حمایت اور امداد میسر آتی رہے گی اور سب سے اہم یہ ہے کہ ان دہشت گردوں کو پاکستانی ریاست کی انتظامی قابلیت اور صلاحیت کا درست ادراک ہو چکا ہے۔پاکستان کے سکیورٹی ڈھانچوں کی پیشہ ورانہ قابلیت اور وحدت سخت کمزور پڑ چکی ہے اور ان کا داخلی نظم و نسق تیزی سے عنقا ہوتا جارہا ہے، حالت یہ ہو چکی ہے کہ کسی بڑے حملے کی صورت میں ریاست ایک دو ہفتوں سے زیادہ کچھ کرنے کی صلاحیت سے ہی عاری ہو چکی ہے''۔(16)

آج کی صورتحال

امریکیوں کی خواہش اور کوشش ہے کہ ''نیا'' جمہوری تماشا کچھ کر دکھائے اور وہ کوشش کرے گا کہ یہ زیادہ لمبا چل جائے مگر مسئلہ اور المیہ یہ ہے کہ خود سامراجیوں کو سرمائے کے ہاتھوں شدید ہزیمت کا سامنا ہے، جس کی وجہ سے وہ زرداری کیلئے زیادہ سخاوت اور لڑکھڑاتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کی حیثیت میں نہیں ہیں۔وہ خود کو ایک ایسی پر پیچ اور گنجھلک صورتحال میں پھنسا چکے ہیں جس سے ان کا اپنا بھی بہت کچھ داؤ پر لگ چکا ہے اور خود پاکستانی ریاست کا بھی۔اگر ہم ''ڈان'' کے مذکورہ بالا مضمون کے مندرجات کا تجزیہ کریں تو یہ ایک انتہائی ناممکن ہدف نظر آتا ہے۔''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کی وسعت کے ساتھ خود ریاست کے اندرونی انتشار اور عدم استحکام میں بھی وسعت اور شدت آتی جائے گی۔فوج کی ہائی کمان پر دباؤ شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے گا جو پہلے ہی فوج کے امریکہ اور اس کے حاشیہ بردار سیاستدانوں کے ذریعے ''غلط'' استعمال کے مسئلے پر درمیانی پرت کے افسروں کی شدید تنقید اور

اضطراب کی زد میں آئی ہوئی ہے۔ پاکستان کے اندر واقعات بہت تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں اور پچھلے کچھ عرصے سے تو ان کے جھٹکوں کی نوعیت اور شدت میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

کوئی بھی بڑا واقعہ ہونے کی صوت میں فوج ایک بار پھر ''مداخلت کرنے پر مجبور'' ہو سکتی ہے۔ ریاست اور سکیورٹی فورسز کے اندر انتہا پسند عناصر کمزور نہیں ہوئے جبکہ پیپلز پارٹی کی حکومت ابھی تک ان کو خوش کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اسلامی پارٹیوں کے پارلیمنٹ میں اتنے زیادہ ارکان نہیں ہیں اور انتہا پسند بنیاد پرستوں کا دباؤ خود ریاست کے اندر سے بڑھ رہا ہے اور زرداری اس دباؤ کے آگے جھکتا چلا جا رہا ہے۔ دہشت گردی اور کچھ حادثات کے ساتھ ساتھ معاشی بحران کی بڑھتی ہوئی شدت، مہنگائی میں اضافہ' ان سب سے جنم لینے والے عوامی غم و غصے کو سنبھالنے کیلئے فوج ایک بار پھر اقتدار کو اپنے کنٹرول میں لے سکتی ہے تاکہ یہ عوامی غم و غصہ اپنا اظہار کسی بڑے پیمانے پر کر کے کوئی اور خطرناک شکل اختیار نہ کر لے۔

سماجی بے چینی سے جنم لینے والے دھماکے فوج کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کر سکتے ہیں جو ویسے بھی مداخلت کی ایک روایت کی حامل ہے۔ اب کی بار یہ فوجی مداخلت مشرف کی خصی آمریت سے کہیں زیادہ وحشی' آمرانہ اور جابرانہ ہوگی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بہت تھوڑی ہوگی کیونکہ وہ پاکستانی سماج کو درپیش کوئی بھی مسئلہ حل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ امریکی فوج پاکستان کی ہائی کمان پر جو (زیادہ تر ان کے اپنے ہی منتخب جرنیلوں پر مشتمل ہے) اپنا دباؤ شدید سے شدید تر کرتی چلی آ رہی ہے کہ وہ اور زیادہ تیزی سے حرکت کریں۔ مگر پاکستانی جرنیل شاید اس طرح تیزی سے ایسا کرنے پر تیار نظر نہیں آتے۔ پاکستان کے حکمران طبقات کے حکمت ساز کوشش کر رہے ہیں کہ درمیانی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ نام نہاد الیکشن بھی منعقد کرائے جا سکتے ہیں۔ جس میں نواز شریف یا کسی اور دائیں بازو کے سیاستدان کو ایک تبدیلی (مگر عارضی) کے طور پر سامنے لایا جا سکتا ہے لیکن دائیں بازو کا یہ اتحاد اور اقتدار بھی بہت جلد اور بہت زیادہ شدت کے ساتھ، ریاست معیشت اور سماج کو درپیش بحران کے باعث خود ریاست کے ساتھ تصادم کی کیفیت میں آ سکتا ہے۔ نواز شریف بڑی بے چینی سے ایسے کسی موقع کی تلاش میں ہے اور اسے دائیں بازو کی حمایت بھی حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس دھماکہ خیز بحران سے بچنے کے لیے کیا کر سکے گا۔ اگر فوج کے درمیانی رینک کے افسران کوئی بغاوت کرتے ہیں تو اس سے معاملات اور بھی خونریز ہو جائیں گے۔ اسلامی بنیاد پرستوں کے اقتدار پر قبضہ کو بھی کسی طور خارج از

امکان قرار نہیں دیا جاسکتا مگر ایسا ہونا بہت ہی محال نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر چند دائیں بازو کے انتہا پسند جرنیل اقتدار پر قبضہ کر لیتے ہیں تو ریاست اور معیشت کی موجودہ نحیف حالت کے پیش نظر وہ ہر صورت سماج کو بنیادی تبدیلی فراہم کرنے میں ناکام رہیں گے۔ اسلامی انتہا پسند ایسی کسی کوشش کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکیں گے کیونکہ ان کے مختلف گروپ' مختلف علاقوں میں مختلف لڑائیاں لڑنے میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کے مابین، ان مختلف علاقوں میں جاری لڑائیوں کے حوالے سے کسی قسم کی مفاہمت' مطابقت اور رابطہ نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور بسا اوقات تو وہ ایک دوسرے کے خلاف ہی یہ لڑائیاں لڑتے اور ایک دوسرے کو مارتے چلے آرہے ہیں۔ اگر ان کے مابین کسی قسم کی کوئی معمولی سی مفاہمت ہے بھی تو وہ ریاست کی کسی بدمعاش ایجنسی کی وجہ سے ہے۔ مگر بنیاد پرستوں کی طرف سے ایسی کسی مفاہمت کی کوشش کا امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ان کی سماجی بنیادیں زیادہ تر شہروں، قبائلی علاقہ جات کے پیٹی بورژوا علاقوں میں قائم ہیں اور وہ بھی سماج کے انتہائی پسماندہ ترین حصوں سے منسلک ہیں۔ مزدوروں اور عوام کے دیگر محروم طبقات میں ان کے لیے حمایت اور تائید انتہائی محدود ہے۔ اگر اسلامی شدت پسند اس جنگ کو نہیں جیت سکتے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ امریکی اور پاکستان کی باقاعدہ افواج بھی انہیں شکست دینے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی فوج کے حصے دونوں طرف کی لڑائی میں ملوث ہیں۔ سامراجیوں کو اس بات کا پتہ بھی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں مگر وہ اس پر کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم سوات میں ہونے والی سرکشی اور جنگ کا تجزیہ کریں تو خود ان ریاستی اداروں کی طرف سے جنگ کے لیے بھیجے جانے والے سکیورٹی ادارے آپس میں برسرپیکار ہیں جس کے ثبوت سب کے سامنے ہیں۔ پاکستانی فوج سالوں تک ان بنیاد پرستوں کے ساتھ شریک کار رہی ہے اس لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ پاک فوج کے مادی اور مالی مفادات طالبان کے مالیاتی نظام کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

لیکن اگر سامراجیوں کو اس جنگ میں شکست ہوتی ہے تو وہ اپنے حتمی اہداف اور اپنی حکمت عملی آسانی سے تبدیل کر دیں گے۔ پرانی کہاوت ہے کہ ''اگر تم ان کے ساتھ نہیں لڑ سکتے تو ان کا حصہ بن کر ساتھ شامل ہو جاؤ''۔ امریکی پہلے بھی طالبان کی سرپرستی اور حمایت کرتے رہے ہیں اور وہ جب افغانستان میں اقتدار میں تھے تو ان کے ساتھ معاہدے اور خوشگوار تعلقات بھی رکھ چکے ہیں۔ چنانچہ اب بھی ان اسلامی بنیاد پرستوں کے ساتھ ایک اور بڑے خوشگوار معاہدے کے امکان کو خارج از امکان قرار نہیں

دیا جاسکتا۔ ویسے بھی جدید اسلامی بنیاد پرستی جان فوسٹر ڈولس کے دماغ کی تخلیق ہے جو 1950ء کی دہائی میں امریکی صدر آئزن ہاور کا وزیر خارجہ تھا۔ 1956ء میں جب مصر میں جمال عبدالناصر نے برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے مشترکہ حملہ کو بدترین شکست سے دوچار کیا تھا تو امریکی سی۔آئی۔اے نے ایک منصوبہ تیار کرتے ہوئے بہت بھاری سرمائے کو بروئے کار لا کر مصر سمیت کچھ اور مسلمان ملکوں میں سوشلسٹوں اور ترقی پسند عناصر کو ختم کرنے کے لیے رجعتی اسلامی بنیاد پرستوں کو جنم دیا۔ 1980ء کی دہائی میں کابل میں قائم سوشلسٹ حکومت کے خلاف شروع ہونے والا افغان جہاد بھی امریکی CIA کی امداد اور معاونت سے ہی شروع کیا گیا تھا۔ CIA نے پاکستانی اور سعودی عرب کی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے اس جہاد کو منظم اور متحرک کیا۔

ایرکس ایس۔ مارگولیس جو امریکی انتظامیہ میں اعلیٰ افسر کے طور پر کام کرتا رہا ہے اور اب ایک نامور صحافی بن چکا ہے نے ''خلیج ٹائمز'' میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ'' طالبان کو ایک ایسی اسلامی تحریک کی شکل میں وضع کیا گیا تھا جس کے مقاصد میں کمیونزم کے خلاف لڑائی اور منشیات کی تجارت کرنا شامل تھا۔ مئی 2001ء تک انہیں امریکہ مسلسل فنڈ فراہم کرتا رہا۔ درحقیقت امریکی CIA کے طالبان کے ساتھ انتہائی گہرے روابط قائم تھے۔ ان میں سے بیشتر وہ مجاہدین تھے جو 80ء کی دہائی میں روس کے خلاف جنگ میں سرگرم عمل رہے۔ یہ روابط مستقبل میں وسطی ایشیاء میں قائم کمیونسٹ حکومتوں کے خلاف اور چین کے خلاف کام کرنے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ 11 ستمبر 2001ء کے حملوں نے CIA کو طالبان کے ساتھ اپنے رابطے ختم کر کے اس سے متعلقہ فائلوں کو جلا دینا پڑا۔ کرزئی حکومت کی صورتحال یہ ہے کہ اس کی کابل شہر سے باہر کوئی اتھارٹی نہیں۔ کابل سے باقی افغانستان میں اس اتھارٹی کے قائم کرنے کا مقصد ان جنگجو منشیات کے تاجر قبائلی سرداروں کے اختیار کا خاتمہ ہے جو کرزئی کے اتحادی بنے ہوئے ہیں۔ افغانستان میں کوئی حقیقی قومی فوج نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض تنخواہ لینے والے افراد کا ایک ایسا ٹولہ ہے جنہیں طالبان کے خلاف ایک بھونڈی اور کمزور لڑائی لڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تمام تر مغربی پروپیگنڈے کے باوجود طالبان دہشت گرد نہیں ہیں۔ اس تحریک کا 9/11 کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے اسامہ بن لادن کو پناہ دے رکھی ہے جو کہ روس کے خلاف جنگ میں ان کا قومی ہیرو بن چکا تھا۔ 9/11 کے حملوں کی منصوبہ بندی جرمنی اور سپین میں تیار کی گئی تھی، افغانستان میں نہیں۔ افغانستان میں محض چند ایک القاعدہ کے ممبر موجود ہیں۔

''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا حقیقی طور پر القاعدہ اور ''دہشت گردی'' کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس جنگ کے ذریعے پشتون، قبائلی علاقوں سے ایک محفوظ راستہ ممکن بنانا ہے تاکہ وسطی ایشیاء کے Caspian Basin کو علاقے میں موجود تیل اور گیس کے بیش بہا ذخائر کی مغرب میں فراہمی کو ممکن بنایا جاسکے۔ افغانستان میں امریکہ اور نیٹو فورسز درحقیقت پائپ لائنوں کے تحفظ کا فریضہ سر انجام دے رہی ہیں۔ امریکہ کے عظیم بانی مبانی صدر بینجمن فرینکلن نے کہا تھا ''کوئی جنگ اچھی نہیں ہوتی اور کوئی امن برا نہیں ہوا کرتا۔'' اب وقت آ گیا ہے کہ مغرب کو افغانستان میں حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے۔''(17)

یہ ایک انتہائی خونریز اور بھیانک بحران ہوگا جس کا خمیازہ سب سے زیادہ پھر وہی لاکھوں کروڑوں انسان ہی بھگتیں گے جو پہلے ہی ذلتوں کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے کسی قسم کی ترقی اور خوشحالی خارج از امکان ہے خواہ حکومت کسی کی بھی ہو اور کیسی بھی کیوں نہ ہو۔ ہاں البتہ ان تبدیلیوں سے عوام کی حالت زار بد سے بدتر اور بدتر سے بدترین ہوتی چلی جائے گی۔ قومی مسئلہ اس کے نتیجے میں ایک بار پھر شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آ جائے گا لیکن قوم پرستوں کے اپنی ہی محروم قومیتوں میں سماجی بنیادیں حاصل کرنے کے امکانات انتہائی کم ہیں۔ اس کے باوجود بھی بلوچستان میں جاری سرکشی مزید شدت اختیار کر سکتی ہے۔ غیر معمولی صورت حال میں پاکستان کی ٹوٹ پھوٹ کو خارج از امکان تو قرار نہیں دیا جاسکتا مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اسی دوران قومی تضادات تصادم اور خونریز جھگڑوں کی صورت میں پھٹنے شروع ہو جائیں گے جس سے ملک میں جاری عدم استحکام اور بھی گہرا ہو جائے گا اس سے ایک انتشار اور بدنظمی کی کیفیت جنم لے گی۔ ایک اور تناظر جو پاکستان کے بڑے نامی گرامی صحافیوں اور تجزیہ کاروں کی شعوری مجرمانہ خاموشی کا شکار چلا آ رہا ہے وہ ایک طبقاتی جدوجہد اور ایک بڑی عوامی تحریک کا تناظر ہے۔ 18 اکتوبر 2007ء کے بعد سامنے آنے والی تحریک کسی طور 69-68ء کی سرکش تحریک کے مقابلے اور معیار کی نہیں تھی۔ اسی لیے اسے پیپلز پارٹی کی قیادت نے آسانی سے تحلیل کر دیا۔

ایسا نظر آتا ہے کہ ایک فوری عوامی بغاوت کے امکانات موجود نہیں ہیں۔ موجودہ خطرناک صورت حال اس کے دونوں پہلوؤں پر مبنی ہے۔ آج کا عہد مسلسل ہڑتالوں اور مزدوروں کے جابجا ہوتے ہوئے مظاہروں پر مشتمل ہے جن میں سے کچھ تو انتہائی پرجوش نوعیت کے حامل ہیں۔ معاشی انحطاط میں آنے

والے ہلکے سے وقفے کی بدولت پاکستان میں ایک انقلابی صورت حال کم از کم ایک عوامی تحریک کے آغاز کو جنم دے سکتی ہے۔ایسے واقعات اور حادثات جنم لے سکتے ہیں جس کے باعث ایک بڑی پر جوش عوامی تحریک بھڑک سکتی ہے۔آنے والے دنوں میں ایسا تناظر ممکن نظر آرہا ہے۔لاطینی امریکہ اور دوسرے ملکوں میں پیش آنے والے واقعات اس تحریک کو تقویت اور ولولہ دینے کا باعث بن سکتے ہیں۔اس تحریک کے راستے میں ایک اور بڑی رکاوٹ پاکستان کے محروم عوام کی سیاسی روایت بھی ہے۔ایلن وڈز اس قسم کی روایتوں کے کردار کو اس طرح بیان کرتا ہے ''ایک بہت بڑی، کروڑوں کی تعداد میں عوام کے لیے لازمی نتائج اور اسباب اخذ کرنے کے لیے ایک نیا تجربہ حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔عام انسانوں کے لیے یہ ایک فطری بات ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم مزاحمت کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔یہاں تک کہ ایک انقلاب میں بھی، اس وجہ سے عوام ہمیشہ اپنی روایتی عوامی تنظیموں کی طرف امید بھری نظروں سے تکتے رہتے ہیں۔لوگوں کی یہ سوچ سہل پسندی پر مبنی ہوتی ہے کہ آخر کیوں پرانے آلے کو بے کار سمجھ کر پھینک دیا جائے کیوں نہ اسے ایک بار پھر، آخری بار تجربہ کر کے دیکھا جائے۔''(18)

پاکستان میں جونہی ایک انقلابی تحریک سر ابھارے گی تو پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جائیں گی۔پارٹی میں بڑی تعداد میں پھوٹ پڑ جائے گی۔اور بائیں بازو کی قیادت تیزی سے ابھرنا اور سامنے آنا شروع ہو جائے گی۔جن کا ان دنوں پیپلز پارٹی میں مکمل فقدان ہے۔اگر تحریک کچھ عرصہ تک اپنے آپ کو برقرار رکھتی ہے تو یہ دن بدن زیادہ سے زیادہ طاقت اور ولولہ حاصل کرتی جائے گی جو ایک خاص مرحلے پر ایک عام ہڑتال کا اعلان یا امکان پیدا کر دے گی جو کسی بھی ٹریڈ یونین یا اس تحریک سے ابھرنے والی سیاسی قیادت کی طرف سے کیا جا سکتا ہے جیسا کہ 69-68ء کی تحریک میں ہوا تھا۔اس مرحلے پر مارکسی رجحان کا کردار انتہائی اہم اور فیصلہ کن ہوگا۔

ریاض لوند

پچھلے دنوں میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مزدوروں اور نوجوانوں میں انقلابی امنگیں بیدار ہوتی جا رہی ہیں جو انقلابی سوشلزم کی تعمیر اور ابھار کے لیے مددگار ثابت ہونگی اور ایک مارکسی تنظیم کی طرف سے جرأت مندانہ مداخلت اس کیفیت کو اور بھی تقویت بخشے گی اس کا انتہائی شاندار قابل ذکر اظہار فروری 2008ء کے الیکشن کے دوران سامنے آیا۔کامریڈ ریاض لوند ایک

سٹیل ورکر تھا جسے سٹیل مل سے اپنی شاندار جدوجہد کے نتیجے میں نکال دیا گیا۔ کامریڈ ریاض فاشسٹ ایم کیو ایم کے خلاف پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہا تھا۔ ایک پر جوش انقلابی مارکسی ہونے کے ناطے ریاض کی کمپین ایک سوشلسٹ پروگرام کے ساتھ شروع کی گئی۔ اس کی الیکشن مہم کا سب سے بڑا نعرہ ''سوشلسٹ انقلاب تک ناقابل مصالحت جدوجہد'' تھا۔ الیکشن کے پوسٹر سرخ بینر اور جھنڈے نعرے اور مہم میں ہونے والی تقریریں انقلابی جوش اور جذبے اور ترنگ سے بھرپور تھیں۔ ملک بھر سے مارکسی کارکن کراچی کے صنعتی ضلع ملیر میں پہنچے تھے جہاں سے ریاض الیکشن لڑ رہا تھا۔ ایم کیو ایم کے غنڈوں نے کامریڈ کو ہراساں کرنے اور اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی جو ان کا عمومی فاشسٹ طریقہ کار ہے جسے وہ الیکشن جیتنے کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر اس دفعہ جیسا کہ بہت سے پارٹی لیڈروں نے بھی اعتراف کیا کہ ریاض کی یہ انتخابی مہم اور یہ ایم کیو ایم کی بدمعاشی کے خلاف ہونے والی مزاحمت انتہائی جاندار، منفرد اور جراتمندانہ تھی۔ مارکسی کارکنوں نے جوابی کاروائی کی اور ایم کیو ایم کے حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ جب بھی ٹرینیں ملیر، جو کراچی شہر کا سب سے پہلا ریلوے اسٹیشن ہے پہنچتی تھیں تو اسٹیشن پر ہر طرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے نعرہ پر مبنی ہزاروں پوسٹرز اور بینرز چسپاں تھے۔ پاکستان کے پیٹروگراڈ شہر کراچی میں آنے والے یا یہاں سے جانے والے لاکھوں مسافروں نے ایک انقلابی پیغام ان بینروں اور پوسٹروں کے ذریعے پڑھا۔ سوشلسٹ نظریات اور نعرے چار دہائیوں کے بعد کراچی کی گلیوں میں گونج رہے تھے۔ جن کی بازگشت دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ الیکشن والے دن ایسا لگتا تھا کہ یہ ایک انتخابی سرگرمی نہیں بلکہ ایک انقلابی جشن تھا۔ بیلجیم سے آئے ہوئے الیکشن مبصر ایرک ڈی برائن کی آمد پر ریاست گھبرا گئی۔ ایم کیو ایم اپنے روایتی دہشت گردانہ طریقہ کار سے پولنگ سٹیشنوں پر تو دھاندلی کرنے میں ناکام رہی جسے مارکسی کارکنوں نے ناکام بنایا۔ جب پاکستان کے انتہائی دور دراز علاقوں کے نتیجے آنا شروع ہوئے تو ریاست نے این۔اے 257 کے نتیجے کا اعلان کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ حلقہ پاکستان کے صنعتی علاقوں کے دل پر مشتمل تھا۔ رات کے آخری لمحوں میں کامریڈ ریاض کے حمایتیوں کی ریلیاں الیکشن آفس کے باہر جمع ہونی شروع ہو گئیں۔ ایم کیو ایم کے بدمعاشوں اور پولیس نے بیلٹ باکس اور پولنگ آفیسروں کو اغوا کر کے پچھلے دروازوں سے باہر نکال کر انہیں پولیس وین میں بٹھا کر گورنر ہاؤس پہنچا دیا۔ جہاں ایم کیو ایم کا ایک کارکن گورنر کی شکل میں موجود تھا۔ محنت کشوں کا اضطراب لمحہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انتظامیہ دھاندلی زدہ نتیجے کو کا اعلان کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ اگلے دن دوپہر کو

انہوں نے ٹیلی ویژن پر نتیجے کا اعلان کیا۔اس سرکاری نتیجے کے مطابق ریاض کو 46800 ووٹ ملے جو اس حلقے میں کراچی میں ایم کیو ایم کے خلاف پڑنے والے سب سے زیادہ ووٹ تھے۔شام کو ریاض نے ایک بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''سارا کراچی جانتا ہے، سارا پاکستان جانتا ہے اور آگے چل کر ساری دنیا کو یہ معلوم ہوگا کہ ہم الیکشن جیتے ہیں۔ ہماری فتح انقلابی سوشلزم کے پیغام کو عام کرنا تھا کہ یہی سرمایہ دارانہ نظام کے عفریت سے نجات کا واحد راستہ ہے۔ یہ پیغام اس مہم کے دوران لاکھوں مزدوروں اور نوجوانوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ایک فتحیاب سوشلسٹ انقلاب تک ہماری جدوجہد کبھی نہیں رکے گی۔ساتھیو! آگے بڑھو کامیابی محنت کش طبقے کا مقدر بن کر رہے گی''۔(19)

ایک سوشلسٹ مستقبل کے لیے جدوجہد

انقلابی پارٹی کی تعمیر اور اس کی عوام میں ٹھوس بنیادیں قائم کرنے کا فن مختصراً اس بات کے ادراک پر منحصر ہے کہ کس طرح ایک واضح سائنسی مارکسزم کا شعور ہم عوام کے نامکمل اور تضادات سے لبریز شعور کے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔اگر ایک انقلابی تنظیم جو اپنے اندر خاصی معیاری اور مقداری قوتوں سے لیس ہوتی ہے تو یہ معروضی صورتحال کو ایک فیصلہ کن کیفیت کی طرف لے جانے اور اسے انقلاب سے ہمکنار کرنے کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔جس سے ایک نیا 69-68ء ایک انتہائی بلند پیمانے پر اور برتر معیار کے ساتھ تاریخ کے سٹیج پر نمودار ہوسکتا ہے۔اس قسم کے ایک اور 69-68ء کا بھوت حکمران طبقات اور سامراج کی نیندیں حرام کردے گا۔پاکستان کے محنت کش اپنے روزمرہ کے تلخ ترین تجربات اور اپنے ساتھ تقریباً تین نسلوں سے ہونے والی قیادت کی بدترین غداریوں سے بہت کچھ سیکھ چکے ہیں۔ٹیکنیکی طور پر جدید ترین آلات اور ذرائع پیداوار پر کام کرنے والی پرولتاریہ کی ایک نئی نسل سامنے آچکی ہے۔یہ ضرور ہے کہ سماج اور طبقات میں کچھ نئی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں مگر اس سے تاریخی، سماجی اور معاشی طور پر محنت کش طبقے کا بنیادی کردار تبدیل نہیں ہوا۔آج کے پاکستان کے پرولتاریہ اور نوجوان کو شاید میدان عمل میں آنے اور اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے 69-68ء میں اپنے آباؤ اجداد کی نسبت آج زیادہ طاقت درکار ہو۔بہت سے واقعات سامنے آچکے، بہت سی غداریاں واقع ہوچکیں اور بہت سے نعرے لگائے جاچکے لیکن ابھی تک تبدیلی کا وہ کردار ادا نہیں ہوسکا جس نے ہونا ہے۔آج بحران کی شدت کی کیفیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی اپنی بدترین گراوٹ، سماج کو تباہی اور موت کی

طرف دھکیلتی چلی جارہی ہے۔اس لیے نظام کی تبدیلی اب محنت کش طبقے اور محروم عوام کے لیے بقا کا مسئلہ ہے اور یہی جدوجہد کا تقاضا اور مطالبہ ہے۔

ایک عام ہڑتال کے ذریعے محنت کش طبقہ سارے ملک کو معطل کر کے رکھ سکتا ہے۔بجلی کی سپلائی مزدوروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ایک ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں بج سکتی' ایک ہوائی جہاز نہیں اڑ سکتا' ایک ریل کا پہیہ نہیں گھوم سکتا' ایک کارخانہ کام نہیں کر سکتا' یہی عام ہڑتال ہوتی ہے اور یہی اس کا حقیقی مفہوم ہوتا ہے۔وہ محنت جو سماج کو چلاتی ہے وہ اسے اور اس کی تمام حرکت کو روک بھی سکتی ہے اور اسے اپنے کنٹرول میں بھی لے سکتی ہے۔ہم نے 17 اور 18 فروری 1969ء میں ہونے والی ریل کے پہیہ جام ہڑتال میں یہی ہوتے دیکھا تھا اور یہ دوبارہ ہو سکتا ہے۔ایک کامیاب عام ہڑتال پہلے سے کانپتے ،لڑکھڑاتے ، اور کمزور ہوتے حکمران طبقات اور ریاست کو ہلا کر رکھ دے گی۔ اقتدار کے سبھی ایوان اس سے لرز جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس ہڑتال سے مزدوروں کو اپنی ایک طبقے کے طور پر عظیم الشان طاقت کا بھی احساس ہو جائے گا۔اسی لیے طبقاتی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے جرأت اور اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔اس ہڑتال کے بعد شہروں کے غریب' کسان' اور سماج کے استحصال کا شکار دوسرے حصوں کا' پرولتاریہ پر اعتماد قائم اور مستحکم ہوگا۔وہ پرولتاریہ قیادت کی پیروی کریں گے۔نوجوان جدوجہد کے اس عمل میں پیش پیش ہونگے اور ان کا جوش جذبہ شروع سے ہی پرولتاریہ کو مزید تقویت اور حوصلہ فراہم کرتا جائے گا۔ایسی صورت حال میں سیاسی افق پر چھائے ہوئے سبھی نان ایشو اور غیر متعلقہ مسائل یکسر بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ مذہبی بنیاد پرستی، نسل پرست' نیو فاشسٹ اور دوسری رجعتی ردانقلابی قوتیں جو عمومی بے زاری کی کیفیت میں سماج پر عرصے سے حاوی چلی آرہی ہیں، وہ منظر سے یکسر غائب ہو جائیں گی اور یوں امید اور جذبے کی ایک نئی صبح پیدا ہوگی۔اس قسم کی نیم انقلابی یا انقلابی صورت حال فوج کے سپاہیوں پر بھی گہرے اثرات مرتب کرے گی کیونکہ وہ آخر کار وردی کے اندر کام کرنے والے مزدور ہی ہیں۔یہی نہیں بلکہ یہ فوج کے نوجوان افسروں اور دیگر عہدیداروں کو بھی مزدوروں کی اس جدوجہد کی طرف مائل کر دے گی اور یہ انقلاب کے عمل میں فیصلہ کن مرحلہ ہوگا۔لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن موجودگی ایک انقلابی پارٹی کی ہوگی جو واضح نظریات اور درست نظریاتی تناظر سے لیس ہوگی۔

ایک انتہائی سطحی ذہن رکھنے والا انسان ہی بڑے بڑے سیاسی واقعات کو شخصیات کے تناظر یا

حوالے سے دیکھتا، سوچتا اور پرکھتا ہے۔ یہ تاریخ اور سیاسیات کی ایک بے ہودہ اور نامکمل تفہیم ہے۔ یہ تفہیم جذباتی ناولوں یا گپ شپ کی حامل صحافت کا ہی وطیرہ ہو سکتی ہے۔ نظریہ انقلاب میں وہی اہمیت رکھتا ہے جو جنگ میں عسکری حکمت عملی کو حاصل ہے۔ جنگ کے لیے ترتیب دی گئی معمولی سی غلطی کی حامل حکمت عملی ناگزیر طور پر طریقہ کار اور عملی لڑائی میں غلطیوں کو جنم دے گی جس سے سپاہیوں کا حوصلہ بھی گرنا شروع ہو جاتا ہے اور یوں ہر قسم کی شکستیں، ہزیمتیں اور یہاں تک کہ غیر ضروری جانی نقصان بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ ایک انقلاب کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ نظریے میں غلطیاں جلد یا بدیر عمل کی غلطیوں میں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہونے والی ایک غلطی کو تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن ہر روز کی جانے والی غلطیاں زندگی اور موت کا مسئلہ بن جایا کرتی ہیں۔ انقلابات جدوجہد کی زندگی اور موت کا فیصلہ کیا کرتے ہیں اور اس دوران ہونے والی غلطیوں کا خمیازہ سفاک اور بھیانک ہوا کرتا ہے۔ اس لیے سنجیدہ انقلابیوں کو ہر حالت میں نظریے کی طرف سنجیدہ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ سیاسی، تنظیمی اور اخلاقی طور پر تیاری کی حالت میں ہو تو ایسی انقلابی پارٹی بہت ہی کم عرصے میں ایک بڑی عوامی قوت بن سکتی ہے۔ ایسی ہی ایک قوت ایک انقلاب کو منظم اور اسے کامیاب کرنے کی اہلیت سے مالا مال ہوگی۔ تاریخ میں کوئی بھی حکمران طبقہ اپنے اقتدار اور مراعات کو بدترین تشدد، قتل عام، خون ریزی کیے بغیر آسانی سے برقرار نہیں رکھ سکتا اور اسی کے ذریعے ہی وہ استحصال کے حامل اپنے نظام کو بچاتا اور قائم رکھتا چلا آ رہا ہے۔ اس لیے انقلاب کسی طور ایک پرامن معاملہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انقلاب بندوقوں کی نالیوں سے ہی نکلتا ہے۔ ایک طبقاتی جنگ میں انقلابی فتح کے پیچھے سب سے فیصلہ کن قوت ایک طبقے کا اتحاد، یک جہتی اور کر گزرنے کا جذبہ ہوا کرتا ہے۔ محنت کش طبقہ کبھی بھی نہ خواہش رکھتا ہے اور نہ کوشش کرتا ہے کہ پرتشدد ذرائع استعمال کر کے اپنا انقلابی مقصد حاصل کیا جائے۔ مگر مارکسی کارکن اور انقلابی محنت کش طبقہ کسی طور پر عاجز و نیاز مند بھی نہیں ہوا کرتے۔ تشدد کا جواب کبھی بھی عدم تشدد نہیں ہوا کرتا۔ سرمایہ داروں کی طرف سے کیے جانے والے پرتشدد حملے اسی شدت اور نوعیت کے ساتھ ان کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ریاستی قوت یا غنڈوں کے ٹولے اس میں شریک ہوں گے ان کو بھی ویسا ہی جواب دیا جائے گا۔ آخر کار یہ ایک جنگ ہے، ایک طبقاتی جنگ۔۔۔

لیکن مزدوروں کی اس مسلح جدوجہد کا مقصد یا ذریعہ نہ تو دہشت گردی کرنا ہے اور نہ ہی گوریلا لڑائی انقلابی مارکسزم کا کوئی کلاسیکل طریقہ ہے۔ انقلاب کا دفاع فیکٹری کے دروازوں پر ہڑتالوں کے دوران

قائم ہونے والی مزدوروں کی مسلح دفاعی کمیٹیوں کی تشکیل اور سرگرمی سے شروع ہوتا ہے اور چھاؤنیوں میں بھی سپاہیوں اور چھوٹے درجے کے فوجی افسران کی حکمران طبقات کے متشدد اور وحشی عناصر کے خلاف لڑائی بھی اس عمل کا ایک عنصر ہے۔ مگر انقلاب کے پیچھے حقیقی نامیاتی طاقت ایک عام ہڑتال ہوا کرتی ہے جو پورے سماج کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے اور جو عوام کو انقلاب کی کامیابی کے اعتماد سے بھر دیتی ہے۔ پاکستان کا حکمران طبقہ اور ان کی ریاست نحیف و نزار ہو چکے ہیں اور بحران کی شدت ان کو مزید حواس باختہ کیے ہوئے ہے یہ کیفیت ان میں چڑچڑاپن، بے رحمی اور سفاکی پیدا کرتی جا رہی ہے، اس لیے وہ وحشیانہ اور بے رحمانہ تشدد کے ذرائع استعمال کرنے کے رجحان میں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا اپنے آپ پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں ہونے والے انقلاب کو زیادہ سخت، سرکش، یہاں تک کہ کسی حد تک خونریز بھی ہونا پڑے گا۔ مارکسی کارکن، انقلاب کی جتنی زیادہ بہتر اور موثر تیاری کریں گے اتنا ہی محنت کش طبقے کا مزاج اور جرأت مضبوط اور ٹھوس ہوتی چلی جائے گی۔ جس کے نتیجے میں انقلاب پر ہونے والے حملوں اور تشدد کی نوعیت کمزور ہو سکے گی۔ ایک باشعور اور ولولہ سے لبریز عوام کو دنیا کی طاقت ور ترین فوجیں بھی مل کر شکست نہیں دے سکتیں۔ انقلاب کا دس میں سے نو حصہ عوام کو انقلاب کی طرف مائل کرنا اور جیتنا ہوتا ہے اور جیسا کہ مارکس نے کہا تھا کہ جب عوام ایسے نظریے کو اپنا لیتے ہیں تو یہ ایک زندہ اور ناقابل شکست مادی قوت بن جایا کرتے ہیں۔ اور یہی انقلابی ابھار کی حقیقی طاقت اور اس کی کامیابی کی کنجی ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی ریاست کو اکھاڑ پھینکنے کے بعد قائم ہونے والی ایک سوشلسٹ جمہوریہ استحصال کا شکار ہونے والوں کے لیے زندگی کے ایک نئے خوشگوار آغاز کا راستہ ہموار کرے گی۔ جب صدیوں سے اور نسلوں سے ان کے ذہنوں، ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی تو آزادی کا یہ احساس انہیں ایک ایسی جرأت اور طاقت اور اعتماد بخش دے گا جس سے عوام اور مزدوروں میں ایسی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ معجزے ممکن ہونا شروع ہو جائیں گے۔ پاکستان میں ایک فتحمند سوشلسٹ انقلاب ملک کی سماجی زندگی میں تبدیلیاں لانے اور مواقع پیدا کرنے کا ایسا ماحول بنا دے گا جس کا ماضی کی نسلوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ ان میں سے کچھ اقدامات فوری نتائج کے حامل ہوں گے۔ ٹراٹسکی نے اپنی کتاب ''انقلاب سے غداری'' میں لکھا ہے کہ ''سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام کے مابین عبوری دور سے قطعی یہ مراد نہیں ہوگی کہ تجارت کا یکسر خاتمہ ہو جائے گا بلکہ اس کے برعکس اس میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ صنعت کے تمام شعبے اپنے آپ کو بدلیں گے اور نئی ترقی کا رخ

اختیار کریں گے۔نئی صنعتیں مسلسل قائم کی جائیں گی اوران سب کو پابند کیا جائے گا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے باہم جڑی ہوئی ہوں۔خاندانی نظام کے خاتمے کے ساتھ ساتھ کسان کی صارفیت کی حامل معیشت کے خاتمے کا مطلب سماجی تبدیلی کے دائرہ کار کی اور معیشت کے گھن چکر کی تبدیلی ہے اوراس تمام قوت محنت کی بھی جس کا پھیلاؤ صرف میدانوں کی حدود تک محدود تھا یا پھر نجی شعبوں کی دیواروں میں قید تھا۔ ہر پیداوار اور ہر خدمت تاریخ میں پہلی بار ایک دوسرے کے لیے تبادلے کے کام میں لائی جائے گی''(20)

ذرائع پیداوار کو قومی تحویل میں لینا اور منصوبہ بند معیشت کا تعارف، منڈی کے انتشار اور نجی ملکیت کے خاتمے کی طرف ایک بڑا قدم ہوگا۔ ریاست معیشت کو اب بھی مضبوط اور مربوط کر سکتی ہے مگر یہ صرف ''قدر کے قانون'' کی تنگ حدود میں رہ کر کرتی ہے۔عبوری دور میں قدر کے اس قانون کو ختم نہیں بلکہ اس کی کیفیت بدل دی جائے گی۔ٹراٹسکی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ'' ذرائع پیداوار اور قرضوں کو قومی تحویل میں لیا اور اندرونی تجارت کو کوآپریٹو اور ریاستی شکل میں ترتیب دیا جائے گا۔غیر ملکی تجارت کی اجارہ داری کو ضبط کیا جائے گا، اجتماعی زراعت کاری کو پروان چڑھایا جائے گا' وراثت کے قانون اور دولت کے شخصی ارتکاز پر سخت پابندیاں عائد کی جائیں گی اور ایسی دولت کو اقتصادی اور صنعتی سرمائے میں تبدیل ہونے سے روکا جائے گا۔تاہم سرمائے کی ان شکلوں کو جو کہ استحصال کرنے کا ذریعہ بنی چلی آرہی تھیں، انقلاب کے آغاز پر فوری طور ختم نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کی شکل تبدیل کرتے ہوئے انہیں ریاست، عالمگیر تجارت، اور صنعت اور کریڈٹ سازی کے کام لایا جائے گا۔اسی دوران پیسے کی زیادہ ابتدائی شکلوں کو بطور قدر کے پیمانے' تبادلے کے ذریعے اور ادائیگی کے وسیلے طور پر قائم رکھا جائے گا۔ بلکہ انہیں سرمایہ دارانہ نظام سے کہیں زیادہ اور وسیع شکل مہیا کی جائے گی''۔(21)

ذرائع پیداوار کی مزید ترقی کے ذریعے اوقات کار میں کمی کی جائے گی اور پیداواری صلاحیت کو ناقابل تصور بلندیوں تک لے جایا جائے گا۔جس سے پوری آبادی کا معیار زندگی اور ثقافتی سطح بلند ہوتی چلی جائے گی اور یوں سماج میں ماضی کی بچ جانے والی پسماندگی اور محرومی کو سوشلسٹ عناصر کی مزید ترقی کے ذریعے ختم کر دیا جائے گا۔اس مرحلے کی رفتار اور آسانی کا دارومدار جو اس عبوری دور میں کیا جائے گا، اس سماج کے مادی حالات پر ہوگا۔ بلاشبہ قومی تحویل میں لی گئی ایک منصوبہ بند معیشت ہمیں ہر حال میں سرمایہ دارانہ نظام پر فوقیت دیتی ہے۔مزدوروں کی ریاست شعوری طور پر اپنی (محدود، معاشی اور سماجی

ترقی کی سطح کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے) پیداوار کی منصوبہ بندی اور اسے مربوط بنانے کی کوشش کرسکتی ہے۔ یہ سرمایہ کاری کی شرح پیداوار اور صارفیت کے ذرائع کے مابین توازن اور استعمال ہونے والی اشیاء کی قیمتوں کو متعین کرسکتی ہے۔ ایلن وڈز اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''اصلاح پسندی یا انقلاب'' میں سوشلزم کے تحت حقیقی مستقبل کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ''ایک منصوبہ بند معیشت انسانیت کو تمام قدرتی وسائل اور ذرائع کو ایک معقول اور سائنسی انداز میں انسانی صارفیت کی ضرورتوں کو متوازن رکھتے ہوئے اور اس خوبصورت اور رنگارنگ دنیا کی تمام خوبصورتی کو برقرار رکھتے ہوئے ان سبھی فطری مظاہر اور خوبصورتی کو آنے والی نسلوں کے لیے برقرار رکھنے کے قابل کردیگی۔ ہمارے آج کے اس دور میں سوشلزم قطعی کسی سخت گیر سنجیدہ حکومت کو قائم نہیں کرے گی مگر اس کے برعکس ایک خالص، سوشلسٹ سماج ان تمام بلندیوں سے آغاز کرے گا جس پر سرمایہ دارانہ نظام پہنچ چکا ہے۔ یہ معیار زندگی کو کم نہیں کرے گا بلکہ اسے ہر سطح، ہر شعبے میں ممکن بلندی تک لے جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ کام کے اوقات میں عمومی کٹوتی کرے گا۔ شراکتی جمہوریت کے لیے یہی اولین شرط ہے اور یہی ایک حقیقی مزدور جمہوریت ہوگی۔ اس کے بغیر سوشلزم کے بارے میں ہر قسم کی بات، گفتگو اور دعویٰ ایک کھوکھلے نعرہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ سوشلزم کے ذریعے جیسا کہ مارکس اور لینن نے قرار دیا ہے، ذرائع پیداوار کی ترقی اس مناسب سطح تک پہنچ چکی ہے کہ جس سے دنیا میں ہر قسم کی مادی نابرابری کا خاتمہ ممکن ہوسکتا ہے۔ طبقات کا خاتمہ عدالتی فیصلوں سے نہیں ہوسکتا اس کے لیے بہت سی چیزوں کو ترک کرنا اور اکھاڑ پھینکنا ہوگا تب جا کر زندگی کا معیار ناقابل یقین بلندیوں کو چھو سکے گا۔ ہر بنیادی انسانی ضرورت کی تکمیل ممکن بنادی جائے گی جس کے نتیجے میں زندہ رہنے کی جدوجہد کی ہر ذلت آمیز شکل کا خاتمہ ہوجائے گا۔ کام کرنے کے اوقات میں عمومی کٹوتی، ایک اعلیٰ اور خوشگوار ثقافتی ارتقاء، کو جنم دے گی۔ یہ ہر مرد و زن کو صنعت، ریاست اور سماج کے انتظامی معاملات میں برابر اور بھرپور شرکت کے قابل بنائے گی۔ اپنے آغاز سے ہی مزدور ریاست کسی بھی سرمایہ دار جمہوری ملک سے کہیں بلند جمہوری شراکت کو نئی اور بلند سطحوں سے ہمکنار کردے گی۔ جس کے نتیجے میں طبقات سماج میں تحلیل ہونا شروع کردیں گے اور آخر کار اس کے نتیجے میں ایک طبقاتی سماج کی آخری بے ہودہ نشانیاں سرمایہ اور ریاست دونوں ناپید ہوجائیں گے۔'' (22)

ایک سوشلسٹ انقلاب صرف معیشت اور ریاست کو ہی تبدیل نہیں کیا کرتا بلکہ اسے گلے سڑے ثقافتی، اخلاقی، اور سماجی اقدار اور معیار کو بھی اکھاڑ کر ایک طرف پھینکتا ہے جو حکمران طبقے نے اس سماج

میں رائج کیے ہوتے ہیں۔ یہ سوشلسٹ انقلاب انسانی روح میں ایک نیا جوش، جذبہ امنگ، خوشی بھر دیگا۔ سماجی اور اخلاقی معیار کو بدلتے اور بہتر کرتے ہوئے محرومیوں کا شکار عوام کو مایوسی، بے بسی اور گھٹن کی نفسیات سے باہر نکال دے گا جو سرمایہ دارانہ نظام نے نسلوں سے ان پر مسلط کر رکھا تھا۔ انقلاب کا یہ نیا منور، سرشار، روح اور جذبہ عوام کو ایک نئے عزم اور سرشاری کے ساتھ زندہ رہنے کا حوصلہ اور رستہ فراہم کرے گا جس کے ذریعے وہ اپنی جسمانی، نفسیاتی جکڑ بندیوں کو توڑ کر تہس نہس کر دیں گے۔

سرمایہ دارانہ نظام نے پاکستان کے چہرے کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا ہے جو پہلے ہی خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ گلیاں، محلے، جھونپڑ پٹیاں اور دیہات جن میں آبادی کا بہت بڑا حصہ زندگی بسر کرتا ہے، حقیقی معنوں میں کوڑے خانے میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ہسپتالوں کی حدود کے اندر مریضوں کے وارڈوں کے بالکل نزدیک، استعمال شدہ اور ضائع شدہ سامان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جس سے یہ ہسپتال بیماریوں کا خاتمہ کرنے کی بجائے ان میں اضافہ کرنے کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ سیوریج پائپ سے بہنے والے اور گٹروں سے ابلنے والے گندے پانی کی وجہ سے گلیاں آلودہ ہو چکی ہیں اور وہاں سے گزرنا محال ہو چکا ہے۔ محروم انسان مایوسی کی اس کیفیت کے عادی ہو چکے ہیں۔ اسی گندگی اور تعفن زدگی میں سانس لینے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے پاس اتنی سکت ہی نہیں کہ وہ اپنے کچے گھروں کے سامنے گزرنے والی اس گندگی کے ڈھیر کو ہٹا سکیں مگر انہی مفلوک الحال انسانوں کو انقلاب ایک ایسی شکل اور طاقت عطا کر دے گا کہ وہ صرف اپنی گلی محلے کے ہی نہیں بلکہ اپنے سماج کی بھی ہر گندگی کو صاف کر کے رکھ دیں گے کیونکہ استحصال کرنے والے امیر طبقے اور ان کے بنائے ہوئے اداروں نے سارے پاکستان کو گندگی اور تعفن کے مرکز میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

دسمبر 1917 میں لینن نے لکھا تھا کہ ''اگر سب سے اہم ترین نہ سہی پھر بھی آج کے اہم ترین فریضوں میں سے ایک فریضہ یہ ہے کہ محنت کشوں کی آزاد پہل گامی کو فروغ دیا جائے اور سبھی محنت کشوں اور استحصال زدہ لوگوں کو ایک وسیع پیمانے پر جتنا ممکن ہو سکے ایک تخلیقی، تنظیمی کام کی طرف راغب کیا جائے۔ ہر قیمت پر ہمیں اس پرانے، تنگ نظر، جابرانہ، توہین آمیز، تعصب' تاثر اور تصور کا خاتمہ کرنا چاہیے کہ صرف اور صرف نام نہاد بالا دست طبقہ، صرف امیر، صرف وہی امیروں کے بنائے ہوئے تعلیمی اداروں میں جا سکنے والے ہی، ریاست کا نظم و نسق چلانے کی اہلیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ہمیں ان مزدوروں اور غریبوں کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر، تشکیل اور ترقی انہی کے ہاتھوں

ممکن ہوگی''۔(23)

انقلاب کا ایسا ہی عمومی ولولہ نوجوانوں اور مزدوروں کو ایک ایسے اعتماد ایک ایسی جرأت سے روشناس اور مالا مال کردے گا کہ جس کا انہیں اپنی زندگیوں میں پہلے کبھی نہ احساس ہوا ہوگا نہ تجربہ۔اپنے آپ کو طاقتور سمجھتے ہوئے' معاشی اور سماجی طاقت کے شعور کے ساتھ جب یہ اٹھیں گے اور انقلاب کے لیے درکار تاریخی فرائض کو ادا کرنے کے لیے پیش قدمی کریں گے تو یقینی فتح سے ہمکنار ہوں گے۔

* ہر سطح پر ہر کسی کے لیے تعلیم اور علاج مکمل طور پر مفت فراہم کیا جائیگا۔صحت، علاج معالجہ، اور تعلیم کے شعبوں میں نجی منافع کو ایک سوشلسٹ نظام میں جرم قرار دے دیا جائیگا۔

* بیروزگاری کو کم سے کم وقت میں ختم کیا جاسکتا ہے۔فوری طور پر ایک انقلابی حکم کے ذریعے ہفتہ وار اوقات کار کم کر کے بیس گھنٹے کر دیئے جائیں گے۔صرف اس ایک اعلان سے لاکھوں بیروزگاروں کو روزگار میسر آجائے گا۔ووکیشنل ٹریننگ سکولز، پولی ٹیکنیک ادارے اور ان جیسے دوسرے فنی ادارے قائم کیے جائیں گے جن میں نوجوان اور بالغ افراد کو مختلف شعبوں کے حامل کریش ٹریننگ پروگرام کی تربیت دی جائے گی۔جس کے نتیجے میں تیزی سے ایک ایسی افرادی قوت تعمیر ہوگی جو انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے والی پیداوار میں اضافہ کے لیے مدومعاون ثابت ہوگی۔

* ایم۔بی۔اے وغیرہ جیسی ڈگریاں اور اہلیتیں ایک سرمایہ دارانہ سماج میں محض ایسے افراد کی تعلیم وتربیت کی حامل ہوتی ہیں جنہیں کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ محنت کرانے اور اس سے لوٹ مار کرنے کا کام لیا جاتا ہے مگر خود مزدوروں کے اپنے ہی کنٹرول میں ،صنعت اور معیشت کو ایک سوشلسٹ پیداواری منصوبے کے ذریعے حاصل ہونے والی بھاری رقوم کو جو سرمایہ دارانہ نظام میں منیجروں، نام نہاد ماہرین اور کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو کی بھاری تنخواہوں پر خرچ کی جاتی ہے، معیشت اور صنعت کی ترقی کے کام میں لایا جائیگا۔

* تمام بڑی جاگیروں کا خاتمہ کردیا جائیگا۔زمین ان کاشتکاروں میں تقسیم کی جائیگی جو کاشتکاری کے مقصد کے لیے زمین لینے کے خواہش مند ہوں گے۔سوشلسٹ ریاست کا بنیادی محور زراعت کو صنعت میں تبدیل کرنا اور اس کے ذریعے مشینی زراعت کو جدید ترین تیکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑے پیمانے کے زرعی یونٹ قائم کرنا ہے۔یہ سب سماج کی ملکیت ہوگا اور اس کا انتظام وانصرام ایسے اجتماعی فارموں پر کام کرنے والے زرعی مزدوروں کی منتخب کمیٹیاں کریں گی۔زائد پیداوار کا حصہ جدید ترین

ٹیکنالوجی کے حصول پر خرچ کیا جائیگا۔لیکن اس کا بڑا حصہ اجتماعی ملکیت کی حامل معیشتوں کے لیے وقف کر دیا جائیگا اور ایک تیز رفتار پانچ سالہ پروگرام تشکیل دے کر عوام کے معیار زندگی کو بلند کیا جائیگا اور معیار زندگی کی اس بلندی کو تیز تر اور مستقل کیا جائیگا۔

*عالمی اجارہ داریوں، بڑے بینکوں، قومی سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور حکمران طبقہ کے دوسرے لٹیروں سے دولت چھین کر گھروں کی تعمیر، اعلی معیار کے حامل بجلی، پانی، گیس کی سپلائی، اور محروم علاقوں میں بجلی کی فراہمی، جدید آب پاشی کے نظام کی ترویج، سیوریج، واٹر سپلائی کے منصوبوں، جدید ریلوے سسٹم، سڑکیں اور عام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بروئے کار لایا جائیگا۔ بنیادی انسانی ضروریات کی اشیاء کی پیداوار اور فراہمی کو سب سے بڑی ترجیح قرار دیا جائیگا۔ پٹرولیم کی مصنوعات' گیس، بجلی اور پانی کی فراہمی سے حاصل ہونے والا زائد منافع حکومت اکٹھا کرے گی اور اسے عالمی تجارت اور درآمد ہونے والی اشیاء کی قیمتوں کو کم کرنے کے کام میں لائے گی اور عوام اپنی جمہوری کنٹرول کی کونسلوں کے ذریعے خود ہی یہ فیصلہ کریں گے کہ ان کی بنیادی ضرورتیں کیا ہیں اور ان کی اجتماعی تقسیم کیسے ممکن بنائی جائے۔

* ایک ایسا سیاسی نظام رائج کیا جائے گا جہاں تمام سیاسی پارٹیاں سرمایہ داری کو ترک کر دیں گی اور ان کے سیاسی ڈھانچے جو مفاد پرست، بدمعاش، سرمایہ داروں، سامراجی اداروں کی مدد سے قائم ہوتے ہیں کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ان کو مزدوروں، سپاہیوں، کسانوں، اور طلباء وغیرہ کی بنائی ہوئی کونسلوں کے سیاسی ڈھانچوں کے اندر رہ کر کام کرنے کی اجازت ہوگی۔عوام کے بنائے ہوئے یہ نئے انقلابی ڈھانچے ہی درحقیقت سماج کو چلائیں گے۔ان کے کام کرنے کا طریقہ اور میکنزم ''جمہوری مرکزیت'' کے اصول پر قائم ہوگا۔ایک ایسی پارٹی جسے عوام کی حمایت حاصل نہ ہوگی، اسے اقتدار میں آنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ہم پہلے ہی اس کتاب میں لینن کے وہ الفاظ بیان کر چکے ہیں جس میں اس نے کہا ہے کہ کس طرح انسانی تاریخ میں پہلی بار سوشلسٹ نظام سماج میں جمہوریت کی بلند ترین شکل مرتب کرے گا۔

* ایک منصوبہ بند معیشت کے حامل نظام میں الیکشن مالیاتی سرمائے، طبقاتی امتیاز اور سماجی نابرابری سے پاک صاف کر دیئے جائینگے۔کسی بھی امیدوار کے پاس اس کے سماج میں مالیاتی یا سماجی مرتبے سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔پاکستان میں پہلی بار ایک سوشلسٹ انقلاب ''انتخاب'' choice کے آزادانہ حق سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرے گا۔انقلاب، انقلابی پارٹی کے کم

ازکم اورزیادہ سے زیادہ پروگرام کے مابین فرق اور فاصلے کوختم کردیگا۔خارجہ پالیسی کے حوالے سے ایک سوشلسٹ حکومت دنیا کے ہر ملک میں چلنے والی طبقاتی جدوجہد کی مکمل حمایت کرے گی اور خاص طور پر اپنے پڑوسی ملکوں میں جاری جدوجہد پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔ یہ ایک جرأت مندانہ سامراج مخالف پالیسی اپناتے ہوئے دنیا بھر میں محرومی اور مظلومیت کا شکار،قومیتوں، اقلیتوں اورنسلوں کی طبقاتی بنیاد پر حمایت کرے گی اور سامراجی وسرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف علم بلند کرے گی۔خارجہ پالیسی میں طبقاتی جدوجہد کی حمایت خود ایک سوشلسٹ انقلاب کے اپنے دفاع کی بہترین حکمت عملی ہوگی۔

* ضرورت کی نفسیات کی طبقاتی بنیاد کا خاتمہ کردیا جائیگا۔ایک انقلاب سب سے بڑھ کر سماج کی اس بیگانگی کوختم کرے گا جہاں ہر فرد کسی نہ کسی شکل میں ایک دوسرے کے ہاتھوں شکار ہوتا اور کرتا چلا جارہا ہے۔ یہ بیگانگی انسانوں کوخود انسانوں سے خوف زدہ کردیتی ہے جو اپنی نوعیت اور ہئیت میں غیر حقیقی اور غیر فطری ہے۔اس سے انسانوں میں فرار کی کیفیت اور نفسیات پیدا ہوجاتی ہے۔جس کے نتیجے میں سماجی خوف، انہیں انسان نہیں بلکہ حیوان بنادیتا ہے۔انقلاب بھائی چارے، ایثار اور شراکت کا خوبصورت ماحول تخلیق کرے گا۔لوگ اس سے ایک دوسرے کے قریب آئیں گے‘ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے اور ایک دوسرے کو برابر کا انسان سمجھ کر زندگی کے حقیقی رنگ وروپ سے لطف اندوز ہوں گے۔اس سے ہاؤسنگ،ٹرانسپورٹ اور دوسرے شعبوں میں انتہائی گہرے اور وسیع اثرات مرتب ہونگے اور ضروریات کا حامل ڈھانچہ،سماج میں تنہائی اور بیگانگی کے منظم خاتمے کے ساتھ ہی بدل کے رہ جائے گا۔امیر سرمایہ داروں اور سامراجی اجارہ داریوں کے وسائل کو قبضہ میں لیتے ہوئے جدید ترین اور اجتماعی سڑکیں اور ریل ٹرانسپورٹ متعارف کرائی جائے گی۔اور ایسے ماحول میں لوگ اپنی نجی گاڑیوں میں الگ الگ سفر کرنے کی بجائے بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرنے کو ترجیح دیں گے۔

* جنسی امتیاز کا یکسر خاتمہ کردیا جائے گا۔ پارلیمنٹ میں ایسی خواتین کی نمائندگی جن کا تعلق سرمایہ داروں کے اشرافیہ خاندانوں سے ہے جو اپنے گھروں میں کام کرنے والی خواتین سے اپنے بچوں کی پرورش اور گھریلو کام کراتی ہیں‘ کھیتوں اور کارخانوں میں مشقت کرنے والی لاکھوں مزدور خواتین کی توہین ہے جن کا دہرا اور تہرا استحصال کیا جاتا ہے۔یہی وہ عورتیں ہیں جنہیں سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے انقلاب اس جبر سے آزاد کرائے گا۔ ہر دیہات‘ مضافات اور کارخانے کی سطح پر خصوصی کنڈر گارٹن قائم کیے جائیں گے جہاں عورتوں کے لیے زیادہ محفوظ، پرسکون کام اور تفریح کے مواقع بھی فراہم

کیے جائیں گے۔ گھریلو کام کے استحصال کا خاتمہ کر دیا جائیگا جن کا زیادہ تر شکار خواتین ہی ہوتی ہیں۔ وہ جو اپنے اپنے کارخانوں، کھیتوں میں کام کرنا چاہتی ہیں انہیں آزادی ہوگی کہ وہ گھر اور خاندان کی اطاعت سے آزاد ہو کر اس کام کو جاری رکھ سکیں۔ کام کرنے والی عورتوں کو ہر شعبہ میں دوران زچگی اور دیگر سماجی مواقع کے لیے درکار مراعات اور سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ہر انسان کو حق حاصل ہوگا کہ وہ جس مذہب اور عقیدہ پر قائم رہنا اور عمل کرنا چاہے کرے۔ انسانوں کی نجی زندگیوں پر ریاست کی طرف سے ہر قسم کی مداخلت ختم کر دی جائیگی۔ مذہب یا عقیدے کو استعمال کرتے ہوئے منافرت پھیلانے، استحصال کرنے یا تشدد اور ذلت کا نشانہ بنانے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائیگی۔ ریاست اپنے کردار میں حقیقی طور پر سیکولر ہوگی اور مذہب فرد کا خالص ذاتی معاملہ قرار دے دیا جائیگا۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کی طرف سے اس کے عقیدے کو بدلنے' اس پر انگلیاں اٹھانے یا اس بنیاد پر اسے ختم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

* آرٹ' ادب' ثقافت' فلم' کھیل، تھیٹر' موسیقی سمیت سماج کی سبھی تفریحی سرگرمیوں کو مالیاتی سرمائے کے ہوسناک پنجوں سے آزاد کر دیا جائے گا۔ پہلی بار حقیقی معنوں میں سماج کو فن کی دلنشیں دنیا سے لطف اندوز ہونے تک رسائی ممکن ہوگی۔ لوگوں کی اس قدر دلچسپی و رغبت کی بنیاد پر فن کو بلند و بہتر پیمانے پر نشوونما پانے کے مواقع میسر آجائیں گے۔ آزاد ہو چکے انسانوں کی تیار کی گئی موسیقی کی دھنیں ترنم اور لطف کی نئی مگر نا آشنا روح پروری سے روشناس ہوں گی۔

سماج کے ہر میدان اور شعبے میں اس قسم کے اور بھی کئی انقلابی اقدامات محنت کش طبقے کی جمہوری طور پر منتخب پرولتاریہ کی انقلابی ریاست کی طرف سے فوری طور پر عمل میں لائے جائیں گے۔ اشیائے ضرورت کی پیداوار اور معیار زندگی میں ہونے والی بڑھوتری اور بہتری اس معیار پر پہنچا دی جائے گی جس کا کبھی تصور بھی نہ کیا گیا ہوگا۔ اس سے جنم لینے والی خوشحالی اور خوشی کا ایک دھارا بہہ نکلے گا جو سماج کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ کو بھی منور و معتبر بناتا جائے گا۔ ثقافت اور تہذیب اس نہج اور معیار پر پہنچ جائیں گے کہ جن کی بدولت ہر قسم کے استحصال، تعصب اور توہم کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو جائے گا۔ فطرت اور کائنات پر انسانی غلبے کا تاریخی عمل شروع ہو جائے گا۔ 1968/69ء کے انقلاب کا یہی حقیقی کفارہ ہوگا۔

نوٹس

1۔فریڈرک اینگلز،اینٹی ڈیورنگ،(پراگریسو پبلشرز،ماسکو،1956ء)صفحہ 142

2۔لیون ٹراٹسکی،روزمرہ زندگی کے مسائل،(پاتھ فائنڈر)صفحہ 67

3۔لیون ٹراٹسکی،انقلاب روس کی تاریخ،صفحہ 27,28

4۔ایلن وڈز،بالشوازم راہ انقلاب،صفحہ 63

5۔ایضاً صفحہ 384-383

6۔لیون ٹراٹسکی،لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل،صفحہ 40,41

7۔لینن،مجموعہ تصانیف،جلد 22

8۔ایلن وڈز،اصلاح پسندی یا انقلاب،صفحہ 37

9۔لینن،ریاست اور انقلاب،صفحہ 27,48,57,95

10۔ایضاً،صفحہ نمبر 110 ,103, 104,109

11۔مارکس اور اینگلز،منتخب تصانیف،جلد 3،(ماسکو 1973ء)،صفحہ 27-326

12۔مارکس،جرمن آئیڈیالوجی،صفحہ 184

13۔لینن،ریاست اور انقلاب،صفحہ 53,32,49

14۔لینن،مجموعہ تصانیف،(پراگریسو پبلشرز ماسکو،جلد 13)،صفحہ 133

15۔لیون ٹراٹسکی،لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل،صفحہ 206

16۔ڈان،4 اکتوبر 2008ء

17۔ایرک ایس مارگالس،خلیج ٹائمز،6 اکتوبر 2008ء

18۔ایلن وڈز،بالشوازم راہ انقلاب،صفحہ 516

19۔ریاض لوندنے تقریر کے بعد فون پر مصنف کو بتایا، 19 فروری 2008ء

20۔ لیون ٹراٹسکی، انقلاب سے غداری، صفحہ 67

21۔ ایضاً، صفحہ 66

22۔ ایلن وڈز، اصلاح پسندی یا انقلاب، صفحہ 67-266

23۔ لینن، مجموعہ تصانیف، جلد 26، صفحہ 409

ضمیمے

ضمیمہ 1

پاک فوج کا کردار

پاکستان کی تاریخ میں پاک فوج نے ایک ریاستی ادارے کے طور پر پس پردہ حکمرانی کرنے کی بہ نسبت کھلے عام حکمرانی کی ہے۔ ہر سرمایہ دار ملک کی طرح یہاں بھی یہ منظّم ترین اور طاقتور ترین ادارہ اثاثوں، سماجی مرتبوں، مراعات یافتگان اور اقلیتی حکمران طبقات سمیت سامراج کے معاشی استحصال کے تحفظ اور بچاؤ کا فریضہ ادا کرتا چلا آ رہا ہے۔ بھارت سمیت دیگر سبھی ملکوں میں بھی یہ ادارہ یہی کردار ادا کرتا ہے۔ ہاں البتہ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں یہ کردار پس پردہ رہ کر ادا کیا جاتا ہے۔ یہ کردار اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ لاکھوں' کروڑوں محروم و مظلوم انسانوں کو مالیاتی سرمائے کے جبر و استحصال کے تحت زندہ رکھنے اور رہنے پر مجبور رکھا جائے۔ اور اس ضمن میں مزدوروں کا سب سے زیادہ استحصال کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے اندر فوج کے اس بڑھے ہوئے بلکہ حاوی کردار کو اب وسیع پیمانے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، فوج کے کردار پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

بائیں بازو کے کئی مہان دانشوروں نے بھی فوج پر لکھتے وقت اسے ایک ''کُل'' کے طور پر ہی لیا ہے اور اس بات کی تکلیف کرنا گوارا نہیں کی کہ اس ادارے کے ڈھانچوں کی فطرت و نوعیت، ان کے باہمی تال میل، فوج کے اندر مختلف پرتوں اور حصوں کے مابین تضادات اور تنازعات پر کچھ کہا یا لکھا جائے۔ بنیادی طور پر یہ کمی ایک ایسے ذہن کی وجہ سے ہے جو اس نظریے پر پختہ ہو چکا ہے کہ ہم ابھی تک ترقی کے ''بورژوا جمہوری'' مرحلے سے گذر رہے ہیں جو کہ موجودہ جاری و ساری بحران کا حل ہے۔ اس ذہنیت نے ان کی بصیرت کو تنگ نظری کا حامل کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ ارتقا کے حوالے سے ایک مخصوص تعصب کا شکار ہو چکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کے نظریات اور تصورات ''اصلاح پسندی'' کی دلدل میں دھنس چکے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے مطابق فوج کی مزید اصلاح اور بہتری درکار ہے تاکہ یہ ادارہ ''جمہوری، لبرل اور ترقی پسند بورژوازی'' کی سماج میں صنعتیں لگانے کے فریضے کی ادائیگی کیلئے (جو

تاریخ نے ان پر عائد کیا ہوا ہے) صحیح معنوں میں اپنا دفاعی، معاونت اور امداد کا کردار ادا کر سکے۔ یہ نظریہ اور تصور سر سے پاؤں تک غلط ہے۔فوج بورژوا ریاست کے ادارے کے طور پر اپنا یہ ترقی پسندانہ کردار ترقی یافتہ ملکوں کے اندر اس وقت ہی ادا کر سکی تھی جب خود سرمایہ دار طبقہ، ریاست کے ادارے اور ان کا معاشی نظام قومی جمہوری انقلابات کے مرحلے میں ترقی پسندانہ کردار ادا کر رہے تھے۔آج کے وقت میں ایسی نہ تو کوئی کیفیت ہے اور نہ صورت۔

پاکستان کے حکمران طبقات اپنی تاریخی نااہلی کے سبب پاکستان کے وسائل اور قدر زائد میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کو ہڑپ کر کے اسے کمزور ونحیف بناتے چلے آئے ہیں۔ پاکستان کا سرمایہ دار طبقہ سماجی وفزیکل انفراسٹرکچر تشکیل نہیں دے سکا۔اور یوں یہ وہ فرائض سرانجام نہیں دے سکا جو تاریخی طور پر اس کو ادا کرنے چاہیئے تھے۔اپنی شرح منافع کو برقرار رکھنے کیلئے اسے ریاست اور سماج کو جونک کی طرح لپٹ کر اس کا خون چوسنا پڑا۔اس کیفیت میں پاکستان کو اس کی ابتدا سے ہی بدترین بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا جو ملک کو مستقل ہلاتے چلے آرہے ہیں۔اس سے جو بھی عدم استحکام جنم لیتا رہا اسے کنٹرول کرنے کے نام پر فوج بار بار مداخلت کر کے اقتدار پر قبضہ کرتی چلی آرہی ہے کہ ہم آکر معاملات کو درست اور بہتر کریں گے لیکن معاملات درست اور بہتر ہونے کی بجائے مزید بدتر ہوتے رہے ہیں ۔اور اب تو صورتحال اتنی بدحال ہو چکی ہے کہ خود سرمائے کی حکمرانی کو سنجیدہ خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔

پاکستان کے اندر فوجی مداخلتوں اور ان آمریتوں کی وحشت و بربریت کی تائید وحمایت کیلئے پیش کیے جانے والے دلائل صرف بے معنی ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ایسی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں جو کہ مرحلہ وار انقلاب کے نظریے کے پنجرے میں قید ہے۔یعنی یہ فوج کیلئے لازمی ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ حکمرانی کو یقینی بنائے ۔جب بھی کبھی مروجہ قانونی طریقوں سے یہ حکمرانی کرنا محال ومشکل ہو جائے تو پھر ایسی کیفیت میں فوج کو یہ فریضہ مختلف اور غیر معمولی انداز میں سرانجام دینے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔خواہ یہ انداز کتنا ہی وحشی اور غیر انسانی کیوں نہ ہو۔ایک بورژوا سماج میں فوج اور ریاست کا یہی کردار ہوتا ہے۔لہٰذا ایک بحران زدہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر فوج کو اس کے آئینی کردار تک محدود رکھنے کا تصور ہی غلط اور احمقانہ ہے۔''قانون کی حکمرانی''''عدلیہ کی آزادی''''گڈ گورننس''''اداروں کی اصلاح''اور ''جمہوریت کی دھیرے دھیرے ترقی وترویج'' یہ سب محض نیک خواہشات کا ایک ایسا پلندہ ہیں جو کہ زندہ سماجی معاشی حقائق سے قطعی طور پر بے بہرہ اور پاکستانی سماج کو درپیش موجودہ ہولناک بحران کے حقیقی

ادراک سے محروم ہے۔

لینن نے بہت عرصہ پہلے کہا تھا کہ سیاست اور کچھ نہیں ہوا کرتی ، یہ محض معیشت کا مرتکز شدہ عکس ہوا کرتی ہے۔اس حوالے سے ہمیں ان سماجی و معاشی عوامل کو دیکھنا ہوگا جو کہ ان فوجی مداخلتوں کا باعث بنتے ہیں۔لیکن پاکستان کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں براہ راست فوجی مداخلتوں اور وحشیانہ آمریتوں کے ادوار کتنے ''مختصر'' ہیں۔اگر ہم زیادہ قریب اور گہرائی سے مارشل لا کے جبر واستبداد کے حقیقی ادوار کا جائزہ لیں تو وہ ہمیں فوج کی مسلسل و مستقل در پردہ مداخلت کے عرصے کا ہی مختصر اظہار نظر آتے ہیں۔ایسا معلوم پڑتا ہے کہ براہ راست فوجی آمریت کا ہتھیار سماج میں اپنی کارفرمائی کیلئے فوراً سے پیشتر خونی اور وحشی ہو جایا کرتا ہے۔اور شاید اسی وجہ سے ہر فوجی آمر سول حکمرانی کا بہروپ دھارنے کیلئے سول ایڈمنسٹریشن، سیاستدانوں اور سول سوسائٹی کے نمائندوں کو اپنی حکمرانی کا حصہ بناتا ہے تاکہ اپنی حکمرانی کو طول دے سکے۔

عمومی حالات میں عدلیہ بھی حکمران طبقات کے مفادات کے تحفظ کیلئے فوج کے معاون ادارے کا کردار ادا کرتی چلی آرہی ہے۔ بوقت ضرورت یہ فوجی آمر بڑی مہارت سے عدلیہ، آئینی ماہرین، کروڑ پتی وکلاء اور اس وقت کے نامی گرامی دانشوروں کے ساتھ ساز باز کر کے سول حکمرانی کا لبادہ اوڑھنے میں کامیاب ہوتے چلے آرہے ہیں اور با آسانی سول صدر اور سربراہ مملکت قرار پاتے چلے آرہے ہیں۔فیلڈ مارشل ایوب خان واحد آمر تھا جس نے فوج کو صرف دو سال سے کم عرصے کیلئے اپنا جابرانہ تسلط قائم کرنے دیا، بعدازاں اس نے 1960ء میں ایک نیا آئین تشکیل دیا اور سویلین سربراہ بن گیا۔یہاں تک کہ 27 اکتوبر 1958ء کی فوجی بغاوت کے بعد بھی اس نے سول کابینہ کو برقرار رکھا جو کہ سکندر مرزا کے ساتھ کام کر رہی تھی، جسے ایوب خان نے انتہائی شرافت کے ساتھ اقتدار سے الگ کیا تھا۔یحییٰ خان نے بھی اپنے ساتھ سول کابینہ ہی رکھی اور چلائی۔یہاں تک کہ ضیاء الحق جیسے وحشی آمر نے بھی جس کا مارشل لاء انتہائی سفاکی اور بربریت کا حامل تھا، سویلین وزرا کو ہی اپنے ساتھ ملائے رکھا۔اس کی یہ وزارتی ٹیم دائیں بازو کی پارٹیوں کے افراد پر مشتمل تھی جن میں سب سے اہم نئی فاشسٹ جماعت اسلامی تھی۔ان رجعتی جماعتوں کو ضیاء آمریت کے دور میں بائیں بازو کے انقلابی نوجوانوں اور پاکستان کے عوام کے خلاف ڈھائے جانے والے بدترین مظالم سے کسی طور بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خاص طور پر سندھ کے اندر ہونے والے قتل عام کو کسی طور فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ضیاء نے اے کے بروہی اور شریف الدین

پیرزادہ جیسے ''انتہائی نامور اور معزز'' ماہرین قانون وآئین کو اپنی آمریت کے قانونی وآئینی جواز فراہم کرنے کیلئے استعمال کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو جو ایک سوشلسٹ پروگرام کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے، کو کسی فوجی عدالت یا ٹریبونل نے نہیں بلکہ ''سویلین عدالتوں'' نے پھانسی کے گھاٹ تک پہنچا کر اسے موت کے سپرد کر دیا تھا۔

مشرف آمریت اپنے پیشرو آمروں سے کہیں زیادہ آگے نکل گئی۔ اس نے پہلے ایوب اور ضیاء آمریت کی پیروی کرتے ہوئے 2000ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر ''بلدیاتی جمہوریت'' متعارف کرائی۔ اس ابتدائی بیہودہ عمل میں سبھی پارٹیوں نے ڈھٹائی کے ساتھ حصہ لیا اور اس طرح انہوں نے مشرف آمریت کو قانونی جواز فراہم کرنے کی بنیاد مہیا کر دی۔ بعدازاں مشرف نے 2002ء میں عام انتخابات کرائے۔ پارٹیوں کی اکثریت نے اس میں حصہ لیا۔ یہ پہلی منتخب اسمبلی تھی جس نے اپنا آئینی عرصہ پورا کیا۔ اس دوران مشرف نے کئی پینتروں اور وطیروں سے معاملات چلائے اور اقتدار کو طول دیا۔ لیکن اس کے وطیروں سے کہیں زیادہ، سیاسی پارٹیوں خاص طور پر پاکستان پیپلز پارٹی (جو غالباً واحد پارٹی ہے جسے 1968/69ء کے انقلاب کے دوران عوام نے شکل وصورت عطا کی تھی) کی عملیت پسندی اور نظریاتی مصالحت پر مبنی نااہلیت نے اس کے اقتدار کے قائم رہنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن پھر مشرف کی اپنی پالیسیوں نے پچھلی پانچ دہائیوں سے بگاڑ کا شکار اداروں کی کمزوری اور کسمپرسی کو اور بھی شدید کر دیا۔ فوج کی سیاست اور سماجیات میں مداخلت آج ہر کس وناکس کا موضوع بن چکا ہے۔ لیکن یہ عمل پھر فوج کی افسر شاہی کی معیشت اور مالیاتی سرمائے میں بڑھتی ہوئی مداخلت اور عملداری کا ہی نتیجہ اور عکس ہے۔

برطانوی راج کے دوران یہ ایک عمومی رجحان تھا کہ فوجی افسر کو اس کے رینک کے مطابق زرعی زمین الاٹ کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ برتری کا یہ احساس JCO,s (جونیئر کمیشنڈ آفیسرز) اور NCO,s (نان کمیشنڈ آفیسرز) کے اندر بھی فروغ پاتا چلا گیا کیونکہ ان کے رقبے ان کے علاقے کے کسانوں کی ملکیت سے زیادہ ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ خود بھی اسی ''طبقے'' سے ہی آئے ہوئے ہوتے تھے۔ اس عمل میں ایک اور اہم مادی عنصر وفاداری کا بھی ہوتا تھا جو فوج کی ملازمت کے دوران دیکھا جاتا تھا اور یہ کسی طور ثانوی نوعیت کا عنصر نہیں تھا۔ برطانوی راج کے دوران افسروں کی تقریباً ساری کی ساری پرت ہی زمیندار اشرافیہ گھرانوں سے سامنے آئی۔ چنانچہ افسر نوازی کے اس عمل نے زمینداروں کے

رقبوں اور ان کی سماجی و سیاسی حیثیت میں اور بھی اضافہ کردیا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ برصغیر میں جاگیرداری کو برطانوی راج نے ہی متعارف اور مسلط کیا تھا اور اس کا مقصد و منتہیٰ اپنے اقتدار کو طاقت، تقویت اور طول دینا تھا۔ اس کا آغاز بنگال سے کیا گیا جہاں لارڈ پالمرسٹن نے بنگال اسمبلی میں (Permanent Settlement Act)1793ء میں پیش کیا۔ اس کا مقصد ایک نیا جاگیردار طبقہ پیدا کرنا تھا جن کو نوازتے ہوئے، جن پر احسان کرتے ہوئے اپنی اطاعت و معاونت کے حاملین تیار کیے جاسکیں۔ چونکہ بنگال برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کا ہراول تھا، اس لیے وہیں سے اس نئے طبقے کا پیدا کیا جانا ضروری تھا۔ اس طبقے کو استحصال کرنے اور اپنے مفادات کے لیے کام میں لانا تھا۔ تاکہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں کسانوں جو راج کے خلاف سرکشی اختیار کیے ہوئے تھے، کا مناسب توڑ کرسکیں۔ مذہبی اشرافیہ کو اس نئے طبقے کی پیدائش کے عمل میں امداد و معاونت کیلئے شریک کار بنایا گیا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس مذہبی اشرافیہ کو بھی بڑی حد تک ویسی ہی مراعات سے نوازا گیا۔

پاکستان بننے کے بعد فوج کا وہی ڈھانچہ اور وطیرہ قائم رہا جو تقسیم سے پہلے تھا۔ یہاں تک کہ 1958ء کی فوجی بغاوت سے پہلے بھی فوجی اشرافیہ اسی طرح سے ہر سول حکومت سے بڑے زرعی رقبے حاصل کرتی رہی۔ ایوب خان کے براہ راست اقتدار کے دوران، افسروں کو رقبوں کی ملکیت کے ساتھ ساتھ ہی ریاست کے مختلف اداروں کے اندر کھپانے کا سلسلہ شروع کیا گیا جو صنعت، مالیات، کامرس، تعمیرات اور دیگر شعبوں کو چلاتے تھے۔ فوجی افسروں نے سٹاک اور شیئرز خریدنے کا سلسلہ شروع کردیا اور ان میں سے کئی نے تو خود اپنے ادارے بھی قائم کرلیے۔ لیکن یہ معمول نہیں تھا بلکہ مستثنیات تھیں۔ ریٹائر ہوجانے والے درمیانے اور اونچے رینک آرمی افسروں کو ریاستی اور سول اداروں کے اندر بہت زیادہ مشاہروں کے ساتھ کھپایا جانے لگا۔ اگرچہ فوج معیشت اور مالیاتی سرمائے سے بڑی حد تک منسلک ہوچکی تھی تاہم یہ شرکت محدود تھی۔ فوج اس وقت تک قومی حمیت، یکجہتی اور وحدت سے لیس ایک لڑاکا ادارے کے طور پر اپنا تاثر اور وجود برقرار رکھے ہوئے تھی۔ جبکہ برطانوی دور سے چلا آرہا فوجی ڈھانچہ ویسے ہی سرگرم اور قائم تھا۔

برطانوی سامراج نے اپنے عسکری طور طریقے اپنے نوآبادیاتی اور بین السامراجی جنگوں کے تجربات کے پیش نظر ترتیب اور تشکیل دیئے تھے۔ برطانوی سارجنٹ اور ڈرل ماسٹرز بدنام شہرت کے

حامل تھے۔ان کے فوجی اکیڈمیوں میں زیر تعلیم کیشنڈ افسروں اور زیر تربیت سپاہیوں کے ساتھ (جنہوں نے آگے چل کر فوج کی کمان سنبھالنا ہوتی تھی) بدتمیزی، رعونت اور ذلت افزائی کے بڑے شہرے تھے۔ جو برطانوی سارجنٹ جتنا زیادہ اکھڑ، بدمزاج، بدتمیز ہوتا تھا اس کی قدر و قیمت اتنی ہی زیادہ ہوا کرتی تھی۔ برطانوی راج اور سامراج کے نقطہ نظر سے ایسا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسی سے ایک منظم اور چاک و چوبند فوج کی تشکیل ممکن تھی۔ برصغیر کے پرانے شہروں میں دو شہر اور دو ریلوے سٹیشن ہیں۔ان میں سے ایک کو سٹی اور دوسرے کو چھاؤنی کہا جاتا تھا۔فوجی بیرکیں، مشقیں اور تنصیبات چھاؤنی میں ہوتی تھیں جو کہ شہر کے دوسرے حصے سے بالکل الگ تھلگ اور کٹا ہوا ہوتا تھا۔ سپاہیوں اور افسروں کی اکثریت کو اپنے اپنے کوارٹرز چھوڑنے پر پابندی ہوتی تھی اور اس دوسرے ''شہر'' میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ان کو چھاؤنی سے باہر جانے اور واپس آنے کیلئے سارجنٹ سے ''سپیشل نائٹ پاس'' لینا ہوتا تھا۔اگر کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی۔کوارٹرز گارڈوں کی شکایت پر اس غلطی کی سب سے کم سزا کورٹ مارشل تھی جو عام طور پر غداری اور قتل جیسے جرائم کیلئے ہی ہوا کرتی تھی۔ذلت کا یہ وہ بدترین احساس تھا جو بعد میں ساری زندگی کا حصہ بن کر ساتھ رہتا تھا۔ برطانیہ کے رائج کردہ ان قوانین کی عملداری پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں آزادی کے بعد بھی جاری و ساری رہی۔

جنگ کے دنوں میں اس قسم کے قواعد و ضوابط پر عملدرآمد زیادہ تیزی اور شدت کے ساتھ شروع کر دیا جاتا تھا۔تاہم بعد میں فوج کی نیم امریکنائزیشن اور اسلامائزیشن کے بعد سے اور فوج کی کاروباروں اور نجی اداروں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی شرکت نے چھاؤنیوں کو کھول دیا۔جائیدادوں کا کاروبار چھاؤنیوں میں خوب پھلا پھولا کیونکہ یہ چھاؤنیاں شہروں کے بارونق علاقوں میں قائم کی گئی تھیں، ان کی رسائی آسان تھی، سڑکیں اور انفراسٹرکچر بہت بہتر تھا۔ پاکستان کی بورژوا فوج میں ڈسپلن کی تنزلی کی یہ ایک بہت بڑی وجہ تھی۔لیکن جنگ بھی ایک انتہائی اہم وجہ تھی جس نے ضابطوں اور ڈسپلن کو کمزور کر کے رکھ دیا۔خصوصی طور پر جبکہ اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ 1971ء کی جنگ میں شکست کے بعد فوجی افسروں اور سرخ فیتے کے خلاف انتہائی بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے۔بھٹو چاہتا تو آسانی کے ساتھ 13 ٹاپ جرنیلوں کو برخاست کر سکتا تھا کیونکہ اس کیلئے وقت اور حالات انتہائی موزوں تھے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔بھٹو کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی پاکستان پیپلز پارٹی کے 1970ء کے منشور پر عملدرآمد کرتے ہوئے

''باقاعدہ فوج'' کو تحلیل کرتے ہوئے متبادل ''عوامی ملیشیا'' قائم کرنے کا اعلان کر دیتا جو ملکی دفاع کا فریضہ سنبھال لیتی۔ لیکن یہ نہ ہوا اور یوں فوج کو محفوظ اور قائم ودائم رکھا گیا جس کا نتیجہ خود بھٹو کی اپنی موت کی شکل میں سامنے آ گیا۔

یہ سب اس حقیقت کے باوجود ہو رہا تھا کہ جدید عسکری تربیت جو پہلے برطانیہ کرتا تھا، 1950ء کی دہائی سے امریکہ فورٹ بریگ (Fort Brag) اور ڈیٹریاٹ (Detriot) وغیرہ منتقل ہو چکی تھی۔ 1965ء میں بھارت کے ساتھ 17 دنوں کی جنگ میں شکست اتنی واضح نہیں تھی اور سرکاری میڈیا اسے فتح قرار دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کشمیر سمیت دیگر گھمبیر ایشو جو برطانیہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا کو ریاستی انتظامیہ اور سرکاری میڈیا بری طرح استعمال کرتے رہے اور اپنے اپنے مذموم مقاصد کیلئے کام میں لاتے رہے۔ ان تنازعات کو بھاری بھرکم دفاعی بجٹوں اور فوجی اخراجات کیلئے جواز بنایا جاتا رہا۔ سامراجیوں' حکمران طبقات' ریاستی انتظامیہ' متعصب دانشوروں اور سرکاری میڈیا کی طرف سے ان بھاری بھرکم دفاعی اخراجات کی وکالت اور پروپیگنڈے کا بنیادی مقصد خارجی جارحیت سے کہیں زیادہ اندرونی ''خطرات'' سے نمٹنا تھا۔ پاکستانی فوج کی 1965ء اور 1971ء کی جنگ میں عسکری مہارت کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں بیرونی محاذ پر لڑنے کی کتنی اور کیسی صلاحیتیں ہیں!

لیکن یہ ضیاء دور تھا جس نے فوج کی ہئیت وحیثیت کو یکسر بدل کے رکھ دیا۔ اسلامی بنیاد پرستی اور مذہبی دہشت گردی کے سب سے بڑے سرپرست اور خیر خواہ امریکی سامراج نے اس وقت ضیاء آمریت کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فوج کو اسلامائز کرنے کی ابتدا کی۔ اگرچہ خود یہ عمل منافقت اور تضادات سے بھرپور تھا اور اسرائیل کی انٹیلی جنس ایجنسی موساد سمیت کئی مغربی ملکوں کی ایجنسیوں کی پاک فوج کی اسلامائزیشن کے مقدس عمل میں دامے درمے سخنے ہر قسم کی مدد ومعاونت شامل تھی۔ جس کی وجہ سے فوج کی بنیادیں ہی تبدیل کر کے رکھ دی گئیں۔ پاکستانی فوج نے جس طویل ترین لڑائی میں حصہ لیا وہ افغانستان کے اندر ایک بائیں بازو کی حکومت کے خلاف ''جنگ'' تھی۔ یہ ''جہاد'' جس کے دوران انتہائی بدترین اور سفاک دہشت گردی کو بروئے کار لایا گیا، کروڑہا امریکی ڈالروں کی امداد سے شروع کیا گیا۔ جہاد کیلئے ابتدائی رقم سعودی بادشاہت، امریکی دائیں بازو، یہودی لابی اور امریکی وزارت خزانہ کی طرف سے مہیا کی گئی۔ تاہم بعد میں امریکی سی آئی اے (CIA) نے افغانستان کے دور دراز کے علاقوں اور پاک افغان سرحد کے قریب واقع 1500 کلومیٹر علاقے جہاں کسی قسم کا کوئی ریاستی

کنٹرول نہیں ہے، میں جدید ترین مشینیں نصب کر کے وہاں کاشت کی جانے والی افیون سے اعلیٰ قسم کی ہیروئن کشید کرنا شروع کر دیا۔

پاکستانی فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی اعلیٰ ترین پرتیں سی آئی اے (CIA) کی سرپرستی میں اس آپریشن میں شریک تھیں لیکن وہ اس سب کچھ سے اپنے لیے بھی فضل ربی اکٹھا کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ مقدس افغان جہاد کے اخراجات پورے کرنے کیلئے انہوں نے سی آئی اے (CIA) کی طرف سے شروع کیے جانے والے ''منشیات کے کاروبار'' میں سے اپنی تجوریاں بھرنی شروع کر دیں۔ ضیاء الحق کی طرف سے پاکستان کے ''دیرینہ و روایتی دشمن'' بھارت کے ساتھ دوستی کا کھیل اور اس کے لیے امن و آشتی کا ہاتھ بڑھانے کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ افغانستان میں جہاد کو جاری رکھا جائے اور وہاں سے زیادہ سے زیادہ کمائی کی جا سکے۔ طالبان پر اپنی کتاب میں احمد رشید اس جرائم سے لبریز جہاد اور اس منشیات کی تجارت میں پاکستانی فوج کی مداخلت کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔

''آئی ایس آئی اور سی آئی اے کی چھتری کے نیچے افغان مجاہدین کے ذریعے منشیات کی تجارت بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ 1992ء میں ایک عالمی ادارے کی اہم رپورٹ کے مطابق ''80ء کی دہائی کی کرپشن میں خفیہ آپریشن اور منشیات اس طرح یکجا ہو گئے کہ انہیں پاکستان میں خطے کی سلامتی اور سٹریٹجک جنگ سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں رہا''۔ ویتنام کی طرح جہاں CIA کمیونسٹ دشمن گوریلا فوجیوں کی منشیات کی تجارت کو نظر انداز کرتی تھی افغانستان میں بھی CIA نے مجاہدین، منشیات کے اسمگلروں اور پاک فوج کے افسران کے درمیان بڑھتے ہوئے تعلق کو نظر انداز کیا۔

80ء کی دہائی میں جو واقعات سامنے آئے وہ ایک بہت بڑے آتش فشاں کے نمونے تھے۔ 1983ء میں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمان کو کوئٹہ میں آئی ایس آئی کا تمام سٹاف برطرف کرنا پڑا کیونکہ وہ منشیات اور مجاہدین کے لیے آنے والے اسلحے کی تجارت میں ملوث تھے۔ 1986ء میں میجر ظہور الدین آفریدی کو کراچی سے پشاور جاتے ہوئے 220 کلوگرام ہیروئین کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں ہیروئین کی پکڑی جانے والی سب سے بڑی مقدار تھی۔ دو ماہ بعد ائیر فورس کے افسر فلائٹ لیفٹیننٹ خلیل الرحمان کو 220 کلوگرام ہیروئین کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے معصومیت کے ساتھ اعتراف کیا کہ یہ اس کا پانچواں چکر تھا۔ ان دو گرفتاریوں کی مالیت امریکہ میں ساٹھ کروڑ ڈالر تھی جو اس سال امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی کل امداد

کے برابر تھی۔ دونوں افسران کو کراچی کی جیل میں رکھا گیا جہاں سے وہ نامعلوم طریقے سے فرار ہو گئے۔

لارنس لف شلٹز نے لکھا کہ ''آفریدی۔رحمان کیس فوج اور آئی ایس آئی کے افغانستان میں ہیروئین کے نیٹ ورک سے تعلق کو آشکار کرتا ہے''۔ امریکی ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی (DEA) کے 80ء کی دہائی میں پاکستان میں 17 فل ٹائم افسر تھے جنہوں نے یہاں 40 بڑے گروہوں کی نشاندہی کی جن میں اعلیٰ افسران بھی شامل تھے۔ اس پوری دہائی میں ایک بھی گروہ پکڑا نہیں جا سکا۔ یہاں CIA اور DEA کی پالیسی میں واضح تضاد تھا، CIA ''نیک'' مجاہدین اور پاک فوج اور ہیروئین کے اسمگلروں کے درمیان تعلق کو سامنے نہیں لانا چاہتی تھی۔ DEA کے کئی افسران نے رخصت کی درخواست دی اور ایک نے تو استعفیٰ دے دیا کیونکہ CIA نے انہیں اپنے فرائض کی انجام دہی سے روک دیا تھا۔

CIA اور ISI پشتون قبیلوں کے سرداروں کو ان کے علاقوں سے اسلحے کے ٹرک گزارنے کے لیے بھاری رقم دیتی تھی۔ جلد ہی یہ قبائلی سردار ہیروئین کے ٹرک گزارنے کے لیے بھی رقم لینے لگے۔ NLC نیشنل لاجسٹک سیل جو فوج کا ٹرانسپورٹ کا شعبہ ہے' CIA کا افغان مجاہدین کے لیے اسلحہ کراچی سے پشاور اور کوئٹہ ٹرانسپورٹ کرتا تھا، انہی ٹرکوں کو بہت سے منشیات کے ڈیلر واپسی پر ہیروئین کراچی بھیج کر بیرون ملک برآمد کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ 80ء کی دہائی میں ہیروئین کی پائپ لائن، اگر تعاون نہیں تو کم از کم اعلیٰ فوجی افسران کے علم کے بغیر کام نہیں کر سکتی تھی۔ ہر کسی نے اسے نظر انداز کیا تا کہ بڑے مقصد جو کہ سوویت یونین کی شکست تھا، کو حاصل کیا جا سکے۔ منشیات پر کنٹرول کسی کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھا''۔(1)

CIA اور ISI کی قانونی چھتری کے تلے افغان مجاہدین کو فراہمی' سفاکی، تباہی اور لوٹ مار کے اس مکروہ اور قبیح عمل کے دوران جنرل ضیاء اور اس کے شریک کار جرنیلوں نے کالے دھن کے گرانمایہ انبار جمع کیے۔ اس کے باوجود کہ فوج کو اسلام کے نظریے کے نام پر اور امریکی سرپرستی میں جہاد میں دھکیلا گیا تھا، ضیاء کے ماتحت فوجی جرنیل منشیات کی تجارت سے جنم لینے والے کالے دھن سے بے بہرہ نہ تھے اور وہ مجبور تھے کہ وفاداریاں بدلتے جنگجو قبائلی عمائدین، مختلف اسلامی جماعتوں کی قیادتوں اور ان اسلامی مجاہدین کو جو اس رجعتی عمل میں ملوث تھے، بھی اس کالے دھن میں حصہ دار بنائیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس جدید ترین امریکی اسلحے کو بھی سمگل کرنا شروع کر دیا جو پاک فوج کی سپلائی لائنوں کے ذریعے سی آئی اے (CIA) اس جہاد میں کام میں لانے کیلئے منگوا رہی تھی۔ انہوں نے اسلحہ و بارود کے ذخائر قائم

کر لیے اور ان کو خطے کے دیگر جہادی گروپوں کو مہیا کیا جانے لگا۔ان اسلامی جہادیوں نے اس اسلحے کو کہیں زیادہ شرح منافع کے ساتھ بیچا۔امریکی اس وقت ششدر رہ گئے جب 80 کی دہائی کے وسط میں ایرانی اسلامی انقلابی گارڈز نے اس کے ہیلی کاپٹر پر امریکہ کے ہی جدید اور نفیس ترین سٹنگر میزائل کے ساتھ حملہ کر دیا۔تب ان پر اس ''بدعنوانی'' کا بھید کھلا۔اس کی تفتیش و تحقیق کیلئے جب ایک امریکی طیارہ 1988ء میں پاکستان کی فضاؤں میں داخل ہو رہا تھا،تو راولپنڈی میں اوجڑی کیمپ جو امریکی جہادی اسلحے کا بہت بڑا ڈپو تھا،اڑا دیا گیا۔ہزاروں راکٹ وہاں سے نکلے اور جہاں جہاں جا سکتے تھے گئے اور تباہیاں مچا دیں۔سینکڑوں ہلاک، ہزاروں زخمی ہوئے۔اسلام آباد سمیت راولپنڈی میں کئی عمارتیں بھی تباہ ہوئیں۔اس ''سانحے'' کے ذمہ دار آج تک سامنے نہیں لائے گئے، یہاں تک کہ خود امریکیوں کی طرف سے بھی یہ تکلیف نہیں کی گئی اور وہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

افغانستان کے جہاد سے کمائی کرنے والی اعلیٰ فوجی پرت ،ملکی معیشت،صنعت اور خدمات کے شعبے میں بڑے حصوں کی مالک بنتی چلی گئی۔پرانے اعلیٰ افسر جن کو پہلے بڑے رقبے الاٹ کیے گئے تھے،افغان جہاد کے کالے دھن سے کمائی کرنے والی اس پرت کے مقابلے میں مالیاتی طور پر پست قرار پا گئے۔کالے دھن کی پروردہ یہ پرت اپنے سویلین کاروباروں کا سینئر پارٹنر بنتی چلی گئی اور یوں پاکستان کی مجموعی معیشت میں ان کی ملکیت اور اثر و رسوخ تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔

افغان جہاد کے بعد دوسرا بڑا عسکری ذریعہ پاکستان کا نیوکلیر پروگرام تھا جس سے منسلک اور وابستہ افسران نے قسمت کی دیوی کو اپنے چرنوں میں بیٹھنے پر مجبور کیا۔امریکی ابتدا سے ہی اس سارے کھیل سے بخوبی آگاہ تھے لیکن اس وقت ان کو جو تکلیف لاحق ہو رہی ہے اس کی وجہ ایران کے ساتھ چلنے والا تنازعہ ہے۔اس نیوکلیر پروگرام کی خرید و فروخت سے پاکستان کی عسکری و نیم عسکری اشرافیہ نے خوب مفادات کمائے ہیں۔لیکن اس نیوکلیائی تجارت سے بھی پہلے سویلین اور فوجی حکومتوں نے ایک غریب ملک اور اس کی مفلوک الحال عوام کی قومی آمدنی کا انتہائی بڑا حصہ فوجی ضروریات کیلئے مختص کیے رکھا۔یہ ان کروڑوں بدترین حالات میں زندہ رہنے والوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کی مروجہ سیاسی قیادتیں اور سیاسی پارٹیاں نیوکلیر طاقت کے اس پاگل پن کا مکمل دفاع اور حمایت کرتی چلی آ رہی ہیں۔

ماضی میں یہ ہوتا تھا کہ ریاست اور نجی میڈیا اس سوچ کو فروغ دیتا رہا کہ ایٹم بم سے ہی ملک و قوم کا ناقابل تسخیر دفاع ممکن ہو سکتا ہے۔اور یہ بھی کہ اس کی وجہ سے فوج اور روایتی ہتھیاروں پر اٹھنے والے دفاعی اخراجات انتہائی کم ہو جائیں گے۔تاہم مئی 1998ء میں چاغی بلوچستان کے مقام پر ہونے

والے ایٹمی دھماکے کے بعد سے فوج کے روایتی ہتھیاروں کی خریداری اور دفاعی اخراجات میں شدید اضافہ ہوا ہے۔ نہ صرف فوجی حکومتیں بلکہ خود ''سویلین جمہوری'' حکومتیں بھی انسانی تباہی کے ان آلات کی خریداری کیلئے درکار فضول اخراجات کو کم کرنے کی بجائے بڑھاتی چلی گئیں۔ پچھلے دو سالوں سے یہ کیفیت ہو چکی ہے کہ بجائے ایٹم بم ملک کی حفاظت کرتا، الٹا ساری قوم کو کہا جا رہا ہے کہ وہ ایٹم بم کی حفاظت کرے۔ ہزاروں فوجیوں کو انتہائی جدید ترین اینٹی وارمیزائلوں سمیت نیوکلیر تنصیبات کے تحفظ کیلئے متعین کیا گیا ہے تاکہ وہ امریکہ بھارت یا اسرائیل کی طرف سے کسی ممکنہ حملے کی صورت میں ان کا دفاع کر سکیں۔ ان کو اس بات کا بھی خطرہ اور اندیشہ ہے کہ یہ نیوکلیر ہتھیار کہیں بنیاد پرست جہادیوں یا پھر دہشت گردوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔

فوجی اشرافیہ کی طرف سے کالے دھن کی وسیع پیمانے پر نقل وحمل کیلئے بدنام زمانہ BCCI بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کو استعمال کیا گیا۔ اس بینک کی تعمیر وترقی میں پس پردہ امریکی سی آئی اے (CIA) کا بھی عمل دخل تھا۔ منی لانڈرنگ کے اس دھندے میں بینک سکینڈلوں کے کئی بدنام ترین لوگ شامل تھے۔ تاہم سبھی ذمہ داری انہی اعلیٰ افسران پر ہی ڈال دی گئی جنہوں نے اس سارے دھوکہ دہی کے عمل کو بے نقاب کیا تھا لیکن پھر اس معاملے کے اندر کئی افراد اور کمپنیاں ملوث تھیں جنہوں نے اس سرمائے کو جائیدادوں، تعمیرات، مینوفیکچرنگ، سٹاک ایکسچینج، خدمات، الیکٹرانک / پرنٹ میڈیا اور دیگر معاشی شعبوں میں کھپا دیا۔ ابھی تک بھی پاکستان کی خلیجی ممالک خصوصاً دوبئی کے اندر کالے دھن کی ایک بہت بڑی مقدار ''رواں دواں'' ہے۔ طالبان سمیت کئی بنیاد پرستوں کی معاشی بنیادیں اسی کالے دھن پر قائم ہیں۔

پچھلی کچھ دہائیوں سے بالا فوجی پرت کی اس مالیاتی گھن چکر میں مداخلت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے فوجی جرنیلوں، سپریم کورٹ و ہائی کورٹ کے ججوں، نامور وکلاء، سینئر سویلین بیوروکریٹس، جید علمائے کرام، سابقہ سینئر سفارتکاروں، بڑے تاجروں، اداروں زرعی اشرافیہ اور سب سے بڑھ کر میڈیا کے بڑے ناموں کا ایک ''ادارہ برائے مفادات باہمی'' تشکیل دے دیا گیا ہے۔ اس مایا جال کی بالاترین پرتوں میں ہم نام نہاد ''سول سوسائٹی'' کے بڑے بڑے مہان کھلاڑیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو کسی نہ کسی شکل میں پاکستان پر حکمرانی کرتا چلا آ رہا ہے خواہ اس کا کوئی ڈھانچہ بھی ہو۔ طاقت کا یہی منبع فوج، ریاست اور سیاسی پارٹیوں کی قیادت کو کنٹرول کرتا ہے۔ مشرف کے دور میں اس

''مرکز'' نے خود کو اور بھی مضبوط و موثر کر لیا ہے اور اپنی دولت میں بھی شدید اضافہ کیا ہے لیکن پھر ان کے تضادات بھی اسی دوران مزید بھڑک اٹھے ہیں۔ اور یہ سب ایک دوسرے کی گردنیں دبوچنے پر اتر آئے ہیں۔

لیکن پھر جیسا کہ ہم نے 2007ء کے آخر میں دیکھا کہ جونہی عوام کی طرف سے ان کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے یہ سب اچانک پھر سے متحد ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ کا مطمع نظر صرف اور صرف لوٹ مار اور دولت ہی ہے، اس کھیل میں غالب عنصر فوج اور امریکہ ہیں۔ اپنی لوٹ مار کیلئے ان کو فوج کے تحفظ اور امریکی سامراج کی آشیر باد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ان کو اپنا کمیشن ایجنٹ بنا لے اور ان کو اپنے محنت کش طبقے کا خون پسینہ نچوڑنے اور زیادہ سے زیادہ مالیاتی سرمایہ اکٹھا کرنے کے مواقع ملتے رہیں۔ تاہم اس گروہ کے اندر تیزی کے ساتھ اختلافات ابھر کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ تضادات خود ریاستی اداروں کے مابین لڑائی کی شکل میں بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ بصورت دیگر ان کی لڑائیاں مسلسل بدترین ہوتے پاکستانی سرمایہ دارانہ نظام کے اندر اپنے اپنے مفادات کے حصول اور تحفظ کیلئے ہی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں حکمرانی کے اس انتہائی پیچیدہ اور گنجلک نیٹ ورک کو سمجھے بغیر اصل معاملات کا حقیقی ادراک بھی پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے۔ اس ادراک کے بغیر سچے مقاصد سے لیس ان حقیقی تحریکوں کو سمجھا نہیں جا سکتا جو سیاسی جوڑ توڑ کے اس کھیل میں موجود ہوتی ہیں۔ تاہم فوج کی بالا پرت میں مالیاتی سرمائے کے اس قدر گہرے عمل دخل نے ان سبھی اداروں میں تضادات اور بے چینی کو انتہاؤں تک پہنچا دیا ہے۔ فوج کے حقیقی کردار کو سمجھنے اور اس کا تناظر بنانے کیلئے لازمی ہے کہ ہم اس وقت کو اپنے دھیان میں رکھیں جس وقت ہم یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں فوج کے اندر موجود طبقاتی امتیاز اور تفاوت کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ فوج بھی سماج کے اندر چلنے والی مختلف تحریکوں سے وقتاً فوقتاً متاثر ہوتی رہتی ہے۔

عمومی حالات میں فوج ایک متحد و مربوط ادارے کے طور پر حکمران طبقات کے احکامات پر عملدرآمد کرتی ہے اور وہ ان کے مفادات کے تحفظ کیلئے محنت کشوں پر ہر قسم کے جبر و تشدد کو روا رکھتی ہے۔ فوج کا یہ ارتباط و اتحاد دیگر وجوہات کے علاوہ روایت، تسلسل اور جبری ڈسپلن کے باعث قائم کیا اور رکھا جاتا ہے لیکن یہ عناصر عمومی حالات ہی میں موثر اور کارفرما رہتے ہیں، یہ عمومی حالات تاریخ میں کچھ طویل ہی چلا کرتے ہیں۔ آخری تجزیے میں فوج سماج سے ہی آتی ہے اور سماج کی ہی عکاسی کیا کرتی

ہے۔ان عمومی حالات میں یہ صرف فوج ہی نہیں سارا سماج ہی سستی ،کاہلی اور بے حسی کا شکار رہتا ہے۔روایت کا بوجھ، مذہب کا دباؤ، میڈیا کی یلغار، درس وتدریس کے ادارے اوران کے نصاب، زندہ رہنے کے حاوی فلسفے، دانش، سیاست وغیرہ یہ سب مل کر حکمران طبقات کی ثقافت، نفسیات، عادات اور شعور کوسماج پر مسلط کرتے ہیں تا کہ حکمرانوں کے طبقاتی استحصال کیلئے عمومی قبولیت کا ایک متذبذب ماحول قائم ودائم رکھا جاسکے۔حکمران طبقات محض ریاست اس کی فوج اوراس کی پولیس کے ذریعے سے ہی اپنے طبقاتی استحصال کو جاری وساری نہیں رکھا کرتے۔البتہ جب کبھی یہ دیکھتے ہیں کہ اب صورتحال عمومی طور طریقوں سے سنبھلنے لائق نہیں رہی تو پھر وہ جبر وتشدد پر اتر آتے ہیں۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس قسم کی عمومی کیفیتیں اور صورتحال زیادہ دیر تک تو چل سکتی ہیں لیکن ہمیشہ نہیں۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ واقعات اچانک عمومی شعور کو ہلا کے رکھ دیتے ہیں اور سب کچھ ڈرامائی طور پر بدل جایا کرتا ہے۔اس سے تحریکیں جنم لینا شروع کر دیتی ہیں اور کبھی کبھی تو یہ تحریکیں پھیل کر انقلاب کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی ہیں۔اس قسم کی نیم انقلابی یا انقلابی کیفیات فوج کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔اگر چہ یہ فوج ہی وہ ادارہ ہوتی ہے جو سب سے آخر میں انقلابی تحریک میں شامل ہوتی ہے، ایسا تب ہوتا ہے جب خود فوج کے اندر کے طبقاتی تضادات پھٹ کر سامنے آجاتے ہیں جو تب تک دبے ہوئے ہوتے ہیں۔عام سپاہی، چھوٹے نوجوان فوجی افسر ایسے میں انقلاب کے ساتھ شامل ہوجاتے ہیں۔یہ کسی بھی انقلاب کا فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔تب پھر، ایک مارکسی پارٹی اور حقیقی انقلابی قیادت کی موجودگی میں سوشلسٹ انقلاب اپنی حتمی منزل کی طرف فیصلہ کن پیش قدمی کرتا ہے۔

پاکستان کے اندر ہم 1968/69ء کے انقلاب کی شاندار مثال کو سامنے دیکھ سکتے ہیں جب اس انقلاب نے فوج کے اندر انقلابی اثرات مرتب کرنے شروع کر دیئے تھے۔چھاؤنیاں اس انقلاب کی وجہ سے متاثر ہوتی چلی جارہی تھیں۔نیچے سپاہیوں کا مزاج افسروں کو اپنی گرفت میں لیتا جارہا تھا۔اگر چہ تحریک کا ہدف ایوب خان تھا لیکن خود اس کے اپنے جرنیل اس کا ساتھ دینے سے ہچکچا رہے تھے۔ 1969ء کے اوائل میں برطانیہ اور امریکی سفیروں نے اپنی اپنی حکومتوں کو مطلع کیا کہ ''اگر صورتحال کو ہاتھ میں نہ لیا گیا تو نوجوان افسران تختہ الٹنے کی طرف بڑھ سکتے ہیں اور ایک سوشلسٹ حکومت قائم کر سکتے ہیں۔''اگر صدر ایوب نے صدارت چھوڑی تو فوج کسی صورت مارشل لاء نہیں لگائے گی، یہ بات ایوب کے کمانڈر انچیف اوراس کے لاڈلے جنرل یحییٰ خان نے کئی بار ایوب خان کے گوش گزار کی تھی۔

1958ء کے بعد سے نوجوان افسروں کا سماجی پس منظر بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ ایوب کے دور میں ہونے والی صنعتی ترقی نے سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ایک نوخیز و تروتازہ پرولتاریہ نے جنم لیا بلکہ درمیانے طبقے کی نچلی پرت سے تعلق رکھنے والے نوجوان افسروں کی بڑی تعداد فوج میں شامل ہوئی۔ نوجوان سپاہیوں اور افسروں کی یہ کھیپ کارخانوں کے نوجوان محنت کشوں اور طالب علموں کے انقلابی جذبات کے ساتھ ہمنوا ہوتی چلی گئی۔ 1970ء کے الیکشن میں جسے پاکستان پیپلز پارٹی ایک سوشلسٹ پروگرام کے ساتھ لڑ رہی تھی، چھاؤنیوں سے پڑنے والے ووٹوں کی بھاری اکثریت پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے حصے میں آئی۔ فوج کے اندر انقلاب کا خطرہ اتنی شدت اور گہرائی سے موجود تھا، فوج میں طبقاتی تفاوت پھٹ چکا تھا۔ یہ خطرہ ہی بعد میں 1971ء کی پاکستان کی بھارت کے ساتھ مغربی محاذ پر جنگ کی شکل میں سامنے آیا تا کہ اس جنگ کے ذریعے انقلاب کے خطرے کو ختم کر دیا جائے جو کہ سماج میں سے سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور ایک سوشلسٹ انقلاب کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تاہم انقلاب کو روک دیئے جانے اور پھر بھٹو دور میں اصلاح پسندی کی ناکامی نے فوج پر جرنیلوں کی گرفت کو دوبارہ سے مضبوط کر دیا۔ 1980ء کی دہائی میں، سوویت یونین کے انہدام، چینی سٹالنسٹوں کی غداری اور پاکستانی بائیں بازو کے تباہ کن انحطاط نے سماج میں ردانقلاب کو حاوی اور مسلط کر دیا۔ بائیں بازو کے انحطاط سے پیدا ہونے والے خلا کو مذہب اور بنیاد پرستی نے پر کرنا شروع کر دیا۔ ضیاء الحق نے اپنے جبر و تشدد اور بربریت کو طول دینا اور مستحکم کرنا بھی شروع کر دیا۔ تاہم آنے والے دنوں میں تحریک کے پھوٹتے ہی فوج کے اندر شعور کی تبدیلی کا عمل کہیں زیادہ موثر انداز میں سامنے آئے گا۔ ایسی رپورٹیں موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فوجیوں کی بڑی تعداد اپنے افسروں کی بالا پرت کی دولت مندی کی انتہاؤں سے سخت متذبذب اور ان کے خلاف شدید منافرت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ان کی شان و شوکت، ان کے معیار زندگی، ان کی لوٹ مار نے سپاہیوں سے لے کر افسر رینک تک کے فوجیوں میں طبقاتی نفرت بھڑکا دی ہے۔ نچلے درجے کے افسر پہلے سے ہی شدید نفسیاتی دباؤ کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ امریکی سامراج کیلئے لڑی جانے والی جنگ نے فوج کے اندر بھگوڑے پن میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ فوج کے اندر حوصلہ کم ترین سطح کو پہنچا ہوا ہے۔ اور یہ کسی طور کوئی حادثہ نہیں ہے کہ پاکستانی فوج کو قبائلی علاقے کے اندر لڑائی میں شکستوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان اسباب کو دیکھتے

ہوئے ہی جنرل کیانی کو فوج کی تنخواہوں اور دیگر مراعات میں اضافہ کرنا پڑ گیا۔ تیزی کے ساتھ سویلین عہدوں سے فوجی افسران کو واپس بلایا جا رہا ہے، مشرف دور میں فوج کی پوری ایک کھیپ کو ان اداروں میں کھپایا گیا تھا۔ سی آئی اے ٹیکساس کے قائم کردہ نیوز انٹیلی جنس ادارے Stratfor جو تجزیاتی خدمات سرانجام دیتا ہے، نے لکھا ہے کہ موجودہ سیٹ اپ تیزی سے سمٹتا چلا جا رہا ہے۔ مشرف حکمرانی کو ایک سول ملٹری اختلاط (hibrid) میں بدل دیا گیا ہے جو کہ جوش وجذبے سے عاری ہے یا پھر دوسرے الفاظ میں انتہا پسندی اور جنگجوئی سے نمٹنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ اس تجزیے کے مطابق سول حکومت اور فوجی انتظامیہ صورتحال پر اپنا کنٹرول کھوتے جا رہے ہیں۔ یہ ادارہ لکھتا ہے کہ ''جہادیوں'' کے ساتھ مذاکرات کمزوری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پاکستانی اتھارٹی ہر ''غیر ریاستی مسلح'' فرد اور گروپ کو بوکھلا کر ایک پیغام دے رہی ہے کہ ہر قسم کے جہادی حکومت کو زیادہ نقصان پہنچانے کیلئے پہلے سے زیادہ ہتھیار استعمال کریں گے۔ اس پیغام نے پاکستان بھر میں طالبان کو پھیلنے کا موقع فراہم کر دیا۔ دہشتگردی اور جہاد میں کوئی وقفہ اس وجہ سے نہیں ہو رہا کہ حکومت سرکشی پر قابو پانے میں کامیاب ہو رہی ہے' ایسا ہرگز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہادیوں نے وقفے کا طریق کار اپنا لیا ہے اور وقفے کو اپنی حکمت عملی میں بدل دیا ہے۔ اس دوران جب کہ ان جہادیوں کے اعتماد میں اضافہ ہو رہا ہے، اسلام آباد مذاکرات اور فوجی آپریشن کی دوعملی اور بے یقینی کی زد میں آیا ہوا ہے۔ ادارے کے تجزیے کے مطابق، حکومت اس معاملے میں کوئی ٹھوس پالیسی سے ہی محروم نظر آتی ہے۔

پاکستانی فوج میں تضادات کی مختلف بنیادیں ہیں۔ اس میں قوم پرست بھی ہیں اور مذہبی بھی' بنیاد پرست بھی ہیں اور لبرل بھی' چین کے حمایتی بھی ہیں اور امریکہ کے بہی خواہ بھی۔ لیکن ان تضادات میں سب سے بنیادی اور انتہائی فیصلہ کن تضاد طبقاتی تضاد ہے۔ غریب سپاہی اور افسر اپنے ادارے کے انتہائی مراعات یافتہ افسروں کی شان وشوکت کے خلاف حقارت ومنافرت سے لبریز ہو چکے ہیں۔ یہ مراعات یافتگان ارب پتی ہو چکے ہیں اور ان کی بیگمات کے ٹھاٹھ باٹھ اور دولت کی جابجا نمائش ان کی بیہودگی کو عیاں کرتی نظر آتی ہے۔

انقلاب کے ساتھ فوج کی ہمیشہ سے ایک وابستگی رہی ہے۔ 1917ء کے روس کے بالشویک انقلاب میں جس کی قیادت لینن اور ٹراٹسکی کر رہے تھے، رجمنٹوں اور بیرکوں کے اندر سپاہیوں کی سوویتوں نے ہی سب سے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اور اس انقلابی ابھار کو حتمی کامیابی تک پہنچایا تھا۔ کوئی ایک

انقلاب بھی ایسا نہیں ہے جس میں سپاہ اور رینکروں نے اہم کردار ادا نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ خود برصغیر کے اندر سب سے پہلے بالشوازم اور کمیونزم کو متعارف کرانے والے بھی برٹش انڈین آرمی کے سپاہی ہی تھے جنہیں روسی انقلاب کو کچلنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ یہ بات عجیب وغریب ہے کہ جب یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹے تو اپنے ساتھ انقلابی مارکسزم کا پیغام بھی لائے اور اسے برصغیر میں عام کیا۔ یہی وہ اہم عنصر تھا جس نے جنوبی ایشیا میں کمیونسٹ تحریک کی بنیادیں رکھی تھیں۔

آنے والے انقلابی عہد میں جب ایک بڑی عوامی تحریک 1968/69ء کی طرح شدت اور زور پکڑے گی تو فوج کے اندر سے بھی ایسا ہی پرزور جذبہ سامنے ابھر کر آئے گا۔ پچھلے چالیس سالوں کے دوران طبقاتی تضادات، بجائے ختم یا کم ہونے کے اور بھی شدید تر ہو چکے ہیں۔ اور یہ ایک زیادہ شدت اور طاقت کے ساتھ پھٹیں گے۔ تاہم اس بار یہ ہونا چاہئے اور یہ ہوگا بھی کہ ایک مارکسی تنظیم اور قیادت مزدوروں، نوجوانوں، غریب کسانوں اور سماج کے دیگر استحصال زدگان سمیت فوج کے سپاہیوں اور نوجوان افسروں کو انقلابی تحریک اور پارٹی میں منظم کرے گی تاکہ سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کا ہدف حاصل کیا جا سکے۔ جب یہ صورتحال پیدا ہوگی تو دنیا کی کوئی طاقت اس قابل نہیں ہوگی کہ وہ اس گلے سڑے سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے کی اس انقلابی سرکشی کو روک سکے، اسے شکست دے سکے۔

نوٹس: (1)

احمد رشید ''طالبان، اسلام، تیل اور مشرقِ وسطیٰ نیا عظیم کھلواڑ'' 2000ء، آئی بی تاؤرس، صفحہ نمبر 120، 121

ضمیمہ 2

پاکستان کے امیر ترین افراد کی فہرست 2007ء

پاکستان کے سب سے زیادہ بااثر کاروباری افراد یا گروپوں کی فہرست بنانا کبھی بھی آسان کام نہیں رہا کیونکہ کچھ تو ایسے ہیں کہ جو پچھلے 60 سال کے دوران تقریباً ہر دور حکومت میں انتہائی طاقتور رہے ہیں اور پھر وہ موسمی قسم کے لوگ بھی ہیں جنہوں نے کسی طریقے سے اقتدار کی غلام گردشوں میں اپنی صدا کی شنوائی دوسروں سے زیادہ یقینی بنائی لیکن آخر کار کسی بھی وجہ سے گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ ہم نے صرف ان بڑے سرمایہ داروں کا انتخاب کیا ہے جنہوں نے ملکی تاریخ کے بیشتر حصے میں اپنے وجود کا احساس دلوایا ہے، جو مسلسل کماتے رہے ہیں، جو ہر تھوڑے عرصے بعد نئے یونٹ لگاتے رہے ہیں یا پھر سٹاک، کرنسی اور جائیداد کے کاروبار میں بہت بڑے نام رہے ہیں۔

اس فہرست میں بہت سے ایسے نام نہیں ہیں جو ماضی میں اس کا حصہ رہے ہیں اور پاکستان کے تمام بڑے جاگیردار بھی جو کہ آسانی سے پہلے 10 میں آسکتے ہیں، ماسوائے ان چند جاگیرداروں کے جنہوں نے اپنے اثاثے اور ملازمین کی تفصیل سی بی آر اسلام آباد میں جمع کروائی ہے۔ نئے اور ''گمنام'' پاکستانی آقاؤں کی حوصلہ افزائی کے لیے پرانے نام نکال دیئے گئے ہیں۔

بدقسمتی سے ہماری جامع تحقیق میں بااثر افراد کی کہکشاں کے ماضی کے درخشاں ستارے شامل نہیں ہیں مثلاً بی ای سی او کا سی ایم لطیف جو کہ پاکستان میں فولاد کا بادشاہ تھا، جس نے ایک زمانے میں بہت نام کمایا لیکن پھر اسے قناعت کی دولت میسر آ گئی اگرچہ مرحوم بھٹو کی 1970ء کی نیشنلائزیشن سے بہت بری طرح متاثر ہوا۔ یہ نیشنلائزیشن اس وقت کے تمام کاروباری افراد کے لیے ایک زوردار دھچکا تھی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو شاید ہمارے بہت سے سرمایہ دار بل گیٹس اور وارنر بفٹ تک نہ سہی تو اس مقام تک پہنچنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے جہاں ہندوستان میں برلا اور ٹاٹا کھڑے ہیں۔ ان خوش نصیب افراد میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو سیاست سے کاروبار میں آئے، کاروبار سے سیاست میں آئے اور وہ بھی جو

کاروباری اور ساتھ ہی سیاست دان ہیں۔کسی کے خلاف عداوت اور کسی کی تعریف کی نیت کے بغیر، ہم ان ناموں کو شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ہم امید کرتے ہیں کہ یہ دستاویز ایک لمبے عرصے تک اپنی قسم کی سب سے مستند کاوش کے طور پر کارگر ثابت ہوگی۔اس کو نہایت احتیاط سے اور جائیداد، سٹاک اور کاروباری دنیا کی ممتاز شخصیات اور سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے سینئر بیوروکریٹوں کے ساتھ مشاورت کے بعد بنایا گیا ہے۔

1۔میاں محمد منشا

رینک: 1 اثاثہ جات: 1.25 ارب پاؤنڈ (2.5 ارب ڈالر) صنعت: کاروبار

منشا کی 40 کے قریب کمپنیاں ہیں۔منشا جو کہ مسلم کمرشل بینک کا مالک ہے 17 ملین ڈالر کی کاغذ کی مل بھی لگا رہا ہے۔یہ پاکستان کا امیر ترین آدمی ہے۔نشاط گروپ 1970ء میں پندرہواں، 1990ء میں چھٹا اور 1997ء میں ملک کا سب سے امیر ترین خاندان تھا۔منشا 50 کے قریب کمپنیوں کے بورڈ میں ہے۔یہ مانا جاتا ہے کہ منشا نے پاکستان اور اس سے باہر بہت سے سٹاک بازاروں، کرنسی اور دھاتوں کے کاروبار میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔وہ یونائیٹڈ بینک بھی خرید لیتا لیکن پھر مخالفین کس کے نہیں ہوتے۔نشاط گروپ آف کمپنیز میں کپڑے، سیمنٹ، لیز، انشورنس اور مینجمنٹ کی کمپنیاں شامل ہیں۔اگر منشا کو 1970ء کی بھٹو کی نیشنلائزیشن کے دور میں نقصان ہوا تو دوستوں کی رائے میں نواز شریف کے نجکاری کے پروگرام میں اس کا بہت حد تک ازالہ کر دیا گیا۔منشا کو کوئی بھی روک نہیں سکتا اور وہ اب بھی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

نشاط گروپ کے اثاثوں کی مالیت 4.4 ارب ڈالر ہے۔اس کو سب سے امیر پاکستانی سمجھا جاتا ہے اور اس کے دوستوں کے بقول وہ اس کی ''نمائش'' نہیں کرتا۔

2۔آصف علی زرداری

رینک: 2 اثاثہ جات: 90 کروڑ پاؤنڈ (1.8 ارب ڈالر) صنعت: سیاست

آصف علی زرداری جسے ''مسٹر 10%'' بھی کہا جاتا ہے، ایک چھوٹے کاروباری شخص کا گمنام لا ابالی بیٹا تھا جس کے ہاتھ دنیا کی سب سے زیادہ مقبول ترین خواتین میں سے ایک، پاکستان کی سابقہ وزیر

اعظم بے نظیر بھٹو کے ساتھ شادی کی وجہ سے سونے کی کان لگ گئی۔ یہ مانا جاتا ہے کہ اپنی بیوی کے اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے پاکستان کے اندر اور باہر بہت سے سودوں میں سے کمیشن لیا ہے۔ ان میں سب سے مشہور فرانسیسی کمپنی ڈسالٹ سے 32 میراج طیارے خریدنے کے لیے 4 ارب ڈالر کا سودا ہے۔ دستاویزات جن میں ڈسالٹ کے ایگزیکٹوز کی جانب سے خطوط شامل ہیں، کے مطابق برطانوی ورجن جزائر کی کمپنی مارلیٹن بزنز جسے زرداری کنٹرول کرتا ہے، کو 5% جو کہ 200 ملین ڈالر بنتا ہے بطور ''فیس'' دینے پر اتفاق کیا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سی کمپنیوں کے ساتھ کمیشن کے سودے کیے گئے جن میں اے آر وائی گولڈ، ایس جی ایس، کوٹیکنا اور زیڈ پی سی ارسس جو کہ پولینڈ کی ٹریکٹر بنانے کی کمپنی ہے، شامل ہیں۔ زرداری کی جائیداد کے اثاثے با آسانی کروڑوں ڈالروں میں ہیں، اس کی برطانیہ میں 8 بڑی جائیدادیں ہیں جن میں سے ایک 365 ایکڑ پر پھیلی سرے میں راک وڈ کا محل ہے جس کی مالیت 4.35 ملین پاؤنڈ ہے اور جس کو بیچ کر پیسے واپس حکومت پاکستان کو بھیجے جا چکے ہیں۔ امریکہ میں کئی ملین ڈالر مالیت کے 14 وسیع مکانات ہیں اور ہیوسٹن ٹیکساس میں ہولی ڈے ان ہوٹل ہیں جس کے مالک ''مسٹر 10%''، اقبال میمن اور صدا الدین ہاشوانی ہیں۔ ان (زرداری اور بینظیر بھٹو) کے مشرق وسطیٰ میں بڑے پیمانے کے کاروبار ہیں جن کی مالیت اگر اربوں میں نہیں تو کروڑوں میں ضرور ہے۔ زرداری صاحب کی پورے پاکستان میں چینی کے کارخانوں میں بڑی شراکت داری ہے جن میں سرکند شوگر مل نواب شاہ، انصاری شوگر مل حیدر آباد، مرزا شوگر مل بدین، پنگر یو شوگر مل ٹھٹھہ اور باچانی شوگر مل سانگھڑ شامل ہیں۔

3۔ سر انور پرویز (برطانیہ)

رینک: 3 اثاثہ جات: 750 ملین پاؤنڈ (1.5 ارب ڈالر) صنعت: کاروبار

یہ بیسٹ وے گروپ کے چیئرمین ہیں۔ بیسٹ وے گروپ 1976ء میں قائم ہوا جب اس نے پہلا بیسٹ وے کیش اینڈ کیری لندن میں کھولا۔ آج اس کے پورے برطانیہ میں 50 کے قریب کیش اینڈ کیری ہیں جن میں مخالف گروپ بیٹلیز کا حال ہی میں 100 ملین پاؤنڈ میں خرید لینا بھی شامل ہے۔ 1995ء میں بیسٹ وے گروپ نے پاکستان میں سیمنٹ کے بڑے کاروبار میں سرمایہ کاری کی اور 120 ملین ڈالر کی رقم سے سیمنٹ کی تیاری کا پلانٹ لگایا۔ پاکستان کی بڑھتی ہوئی معیشت سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے انہوں نے 2002ء میں یونائیٹڈ بینک میں 25.5% شیئر خرید لیے۔آج بیسٹ وے گروپ کے تھوک کے کیش اینڈ کیری، جائیداد میں سرمایہ کاری، پرچون فروشی، چاول صاف کرنے کے کارخانوں، دالوں، سیمنٹ کی پیداوار اور حال ہی میں بینکاری کے شعبے میں سرمایہ کاری ہے۔گروپ کی مجموعی فروخت 2ارب پاؤنڈ سے زیادہ ہے۔

4۔نواز شریف اور شہباز شریف کا خاندان (سعودی عرب / پاکستان)

رینک:4 اثاثہ جات:700ملین پاؤنڈ(1.4ارب ڈالر) صنعت:سیاست/کاروبار

شریف صاحب کاروبار سے سیاست میں آئے اور پاکستان کے سابقہ وزیراعظم ہیں۔1999ء میں فوجی بغاوت میں اس کا تختہ الٹ دیا گیا اسے 9 ملین ڈالر اور کچھ اثاثوں سے محروم کر دیا گیا جس میں 5 ملین ڈالر کا لاہور کے قریب رائے ونڈ محل بھی شامل ہے۔وزیراعظم بننے سے قبل وہ اپنے بھائی اور رشتہ داروں کے ساتھ اتفاق گروپ کا بڑا شراکت دار تھا جس کے اثاثے 90ء کی دہائی میں 50 ملین پاؤنڈ سے زیادہ تھے۔تاہم وہ پاکستان میں تعمیرات کے لیے بیرونی کمپنیوں سے کمیشن لے کر مزید امیر ہوا۔اس نے پہلے موٹروے اور پھر بہت سی نئی سڑکیں بنائیں اور بھاری کمیشن اور منافعے کمائے۔پھر اس نے اقرا فنڈز سے 100 ملین ڈالر چرائے۔اس نے ''گھر اپنا'' نامی ایک نئی سکیم شروع کی جس میں اس نے قریباً 40 ملین ڈالر کی لوٹ مار کی،''ملک سنوارو'' سکیم میں پاکستان کا قرض اتارنے کے لیے عوامی اور سرکاری پیسے سے بھی جیبیں بھری گئیں۔آج کل وہ سعودی عرب میں جلاوطن ہے جہاں اس نے مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری کی ہے۔

5۔صدرالدین ہاشوانی (پاکستان)

رینک:5 اثاثہ جات:550ملین پاؤنڈ صنعت:کاروبار

صدرالدین ہاشوانی ہاشو گروپ کا چیئرمین ہے اور اس کی وجہ شہرت پاکستان میں ہوٹل کی صنعت پر اس کا غلبہ ہے لیکن ہاشوانیوں کا جائیداد کے کاروبار میں بھی بہت مقام ہے۔ہاشوانی کپاس، اناج اور فولاد کے تاجر تھے اور 1974ء میں کپاس کی برآمدات کی نیشنلائزیشن تک انہیں پاکستان میں کپاس کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔آج یہ گروپ چاول، گندم، کپاس اور جو کی برآمد میں ممتاز ہے۔یہ کپڑا بنانے کے یونٹوں کا

مالک ہے اور اس کے علاوہ اس نے کانکنی، معدنیات، ہوٹل، انشورنس، بیٹریوں، تمباکو، رہائشی جائیداد، تعمیرات، انجینئرنگ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اربوں کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ 1984ء میں ہاشوانی نے لاکھانیوں کو پریمئر تمباکو کی بولی میں ہرا دیا لیکن 1986ء میں سیگریٹوں پر کسٹم ڈیوٹی کی چوری میں اپنے بھائی اکبر کے ہمراہ گرفتار ہو گیا۔ صدرالدین کا بھائی اکبر اور مرحوم بھائی حسن علی ہاشوانی کی اولاد مل کر 45 کے قریب کمپنیاں چلا رہے ہیں۔ اکبر دوسرا ہاشوانی گروپ چلاتا ہے۔ وہ پاکستان کے مشہور ترین کاروباری افراد میں سے ایک ہے اور ڈپلومیٹک انکلیو کی تقاریب میں اکثر مدعو کیا جاتا ہے۔ ہاشوانی کو ذاتی طور پر جاننے والی مقامی اور غیر ملکی اہم شخصیات کی فہرست لامحدود ہے۔

6۔ ناصر شون اور خاندان (متحدہ عرب امارات / پاکستان)

رینک: 6 (چھٹے نمبر پر برابر ہے) اثاثہ جات: 500 ملین پاؤنڈ (1 ارب ڈالر) صنعت: کاروبار

ناصر شون پاکستان کی ممتاز کاروباری شخصیت اور شون گروپ کا سی ای او ہے۔ ناصر شون پی آئی اے کے سابقہ پائلٹ اطہر حسین شون کا بیٹا ہے۔ شون خاندان پاکستان میں کامیاب چند مہاجر اردو خاندانوں میں سے ایک ہے۔ 1982ء میں سنگاپور میں شروع ہوئے شون گروپ کے عروج کی انتہا 1995ء تھی جب یہ نیشنل فائبر، شون بینک، شون ٹیکسٹائل اور پاک چین فرٹیلائیزرز کا مالک تھا۔ شون سرکل نئے رجحانات متعارف کرانے کے لیے مشہور ہے۔ ناصر شون پاکستان میں رولز رائس رکھنے والا پہلا شخص ہے۔ شون گروپ کے ڈائریکٹر 1997ء میں سابقہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی برطرفی کے بعد دوبئی چلے گئے۔ شون گروپ کے ڈائریکٹروں کے سابقہ وزیراعظم کے شوہر آصف زرداری سے قریبی تعلقات تھے۔۔ شون گروپ کے بہت سے اثاثے نواز شریف حکومت میں نیلام کر دیئے گئے۔ شون گروپ وہ واحد گروپ ہے جس نے جلاوطنی سے واپسی کے لیے حکومت کو 3 ارب روپے (65 ملین ڈالر) سے زائد ادا کیے۔ دوبئی میں رہائش سے ناصر شون کو وہاں کاروبار شروع کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت 830 ملین ڈالر کے جائیدادوں کے کاروبار کے پراجیکٹ دوبئی لاگون پر کام کرنے کے ساتھ شون گروپ ان اثاثوں کی واپسی کے لیے بھی تگ و دو کر رہا ہے جو کبھی ان سے چھن گئے تھے۔ ان دنوں شون گروپ پاکستان میں شون ائیر نامی پائیلٹوں کی تربیت کا ایک ادارہ چلا رہا ہے۔

7۔عبدالرزاق یعقوب اور خاندان (متحدہ عرب امارات)

رینک:6(چھٹے نمبر پر برابر ہے) اثاثہ جات:500 ملین پاؤنڈ (1ارب ڈالر) صنعت: کاروبار

یعقوب دوبئ میں مقیم ایک ممتاز پاکستانی تارک وطن کاروباری شخصیت ہے۔وہ اے آر وائی گروپ(نکاسی کا حجم 1.5ارب ڈالر) اور میمنوں کی عالمی تنظیم World Memon Organization(WMO) کا صدر ہے۔وہ پاکستان کے میڈیا کے سب سے بڑے مالکوں میں سے ایک ہے اور 7 کے قریب چینل چلاتا ہے۔اس کے علاوہ اس کی کراچی،اسلام آباد اور دوبئ میں بہت سی جائیداد ہے جس کی مالیت 200 ملین ڈالر سے زائد ہے۔سونے کے کاروبار میں بھی وہ ایک بڑا نام ہے اور اس کے ایشیا میں 20 کے قریب کاروباری مراکز ہیں۔ وہ 1990ء کی دہائی میں سونے کی درآمدات و برآمدات کی اجازت کے لیے زرداری کو 5 ملین ڈالر دینے میں بھی ملوث رہا ہے جس سے وہ انکار کرتا ہے اور حکومت پر جعل سازی کا الزام لگاتا ہے۔

8۔رفیق حبیب اور رشید حبیب (پاکستان)

رینک:7 اثاثہ جات:450 ملین پاؤنڈ (900 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

کہا جاتا ہے کہ دولت کی دیوی پاکستان میں سب سے زیادہ تجربہ کار حبیب خاندان کی محبت میں گرفتار ہے۔زیادہ تر پنڈتوں کا ماننا ہے حبیب خاندان پوری دنیا میں پھیلی کم از کم 100 کمپنیوں کے مالک ہیں لیکن یہ قناعت پسند سرمایہ دار کبھی نمائش نہیں کرتے،جس کی وجہ سے ان کی مالیاتی حیثیت کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔صنعت کار حبیب گروپ کی بنیاد سیٹھ حبیب مٹھا نے رکھی تھی،جو 1878ء میں بمبئ میں اسماعیل علی نامی صنعت کار کے گھر پیدا ہوا۔حبیب خاندان کی مالی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی حبیب نے 1948ء میں قائداعظم کو 80 ملین روپے کا چیک دیا اس وقت جب حکومت پاکستان ریزرو بینک آف انڈیا کی جانب سے اسکے 750 ملین روپے کے حصے کے انتقال میں تاخیر کی وجہ سے دیوالیہ ہو چکی تھی۔انکے 1912ء میں یورپ میں دفاتر تھے۔انہوں نے 1941ء میں حبیب بینک کی بنیاد رکھی۔وہ حبیب بینک اے جی زیورخ، بینک الحبیب، انڈس موٹرز جہاں کرولا

کاریں بنتی ہیں اور پٹ سن، کاغذ کی بوریاں، معدنیات، فولاد، ٹائیلیں، مصنوئی شکر، شیشہ، تعمیرات، کنکریٹ، زرعی مشینری، بینکاری، تیل، کمپیوٹر، موسیقی، کاغذ، پیکج، لیز اور کیپیٹل مینجمنٹ جیسے شعبہ جات میں درجنوں یونٹوں کے مالک ہیں۔ آج کل حبیب خاندان کی سربراہی رفیق حبیب اور راشد حبیب دو الگ گروپوں کی شکل میں کر رہے ہیں۔ جو چیز انہیں ہر دور میں بااثر ترین بناتی ہے وہ یہ کہ آج کے درجنوں امیر ترین کاروباری افراد کے لیے حبیب ایک زمانے میں افسانوی مقام رکھتے تھے۔

9۔ طارق سہگل اور نسیم سہگل (پاکستان)

رینک: 8 اثاثہ جات: 425 ملین پاؤنڈ (850 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

جہلم سے تعلق رکھنے والے امین سہگل نے 1890ء اس خاندان کے کاروبار کی بنیاد رکھی، اس نے جوتوں کی دکان کھولی اور بالآخر اسکو کوہ نور ربر ورکس بنایا۔ اور پھر وقت نے انہیں صحیح معنوں میں کوہ نور کی مانند چمکتے دیکھا جب تک ان کی ترقی نیشنلائزیشن کی وجہ سے رک گئی جس میں ان کی دو تہائی دولت ان سے چھن گئی۔ 1976ء میں انہیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اثاثے امین سہگل کے چار بیٹوں کی پندرہ اولادوں میں تقسیم ہوئے۔ دنیا کے اس خطے میں سہگل نام بیش بہا دولت کا مترادف بن چکا ہے۔ اس کے بعد یوسف سہگل اور اس کے بھائیوں سعید سہگل، بشیر سہگل اور گل سہگل نے بہترین طریقے سے کاروبار کو آگے بڑھایا۔ 1948ء میں سہگلوں نے 8 ملین روپے کی لاگت سے کوہ نور ٹیکسٹائل مل کی بنیاد رکھی اور یہ سٹیٹ بینک آف پاکستان کے ساتھ ایل سی کھولنے والا پہلا گروپ ہے۔ 1959ء میں انہوں نے یونائیٹڈ بینک خریدا اور پھر اپنے پانچ یونٹوں کو نیشنلائز ہوتے دیکھا۔ وہ بھٹو دور میں سعودی عرب میں رہے۔ آج طارق اور نسیم جو آپس میں کزن ہیں خاندانی کاروبار کو سنبھالے کھڑے ہیں اور ذاتی حیثیت میں بے مثال کامیابیوں کے مالک بنے ہیں۔ نیب نے نسیم کا پیچھا کیا ہے مگر طارق نے زیادہ وقت پرکشش آسامیوں کو قبول یا مسترد کرنے میں گزارہ ہے۔ طارق اس وقت کے بہترین کاروباری دماغوں میں سے ایک ہے۔

10۔ دیوان یوسف فاروقی (پاکستان)

رینک: 9 (9 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 400 ملین پاؤنڈ (800 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

فاروقی جو اس گروپ کا سربراہ ہے سندھ کا وزیر برائے مقامی حکومت، صنعت، لیبر، ٹرانسپورٹ، کانکنی اور معدنیات رہ چکا ہے۔ دیوان مشتاق گروپ پاکستان میں پولیسٹر ایکریلک فائبر، پیداوار اور گاڑیاں بنانے جیسے شعبوں میں سب سے بڑے گروپوں میں سے ایک ہے۔ ان کی چھ کمپنیاں کراچی اور ایک لکسمبرگ سٹاک ایکس چینج میں رجسٹر ہے۔ دیوان فاروقی موٹرز سالانہ 10,000 گاڑیاں کوریا کی ہنڈائی اور کیا موٹرز کے ٹیکنیکل لائسنس کے تحت بناتی ہے۔ دیوان سلیمان فائبر اس کے تاج کا ہیرہ ہے اور پیداواری گنجائش کے اعتبار سے دنیا میں گیارہویں نمبر پر ہے۔ اس گروپ کی ملکیت میں تین ٹیکسٹائل یونٹ، ایک موٹر سائیکل بنانے کا یونٹ اور چینی بنانے کا ملک کا سب سے بڑا یونٹ ہے۔ دیوان کا ہندوستان میں بھی کاروبار ہے۔ سعودی سیمنٹ اور پاک لینڈ سیمنٹ میں ان کے لاکھوں شیئر ہیں۔ انکے پاس پاکستان میں بی ایم ڈبلیو BMW کا فرینچائز لائسنس اور اب رولز رائس کا شوروم ہے۔

11۔ سلطان علی لاکھانی اور خاندان (پاکستان)

رینک: 9 (9 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 400 ملین پاؤنڈ (800 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

ان دنوں لاکھانیوں پر نیب کی وجہ سے کڑا وقت ہے۔ سلطان لاکھانی اور اس کے تین بھائی اس معروف گروپ اور پاکستان میں میک ڈونلڈ ریستورانوں کو چلاتے ہیں۔ نیب نے لاکھانیوں پر بے وقعت ڈائریکٹروں کے ذریعے جعلی کمپنیاں بنانے اور ان کے لیے مختلف بینکوں اور مالیاتی اداروں سے قرضہ لینے کا الزام لگایا ہے۔ سلطان اس وقت اپنے چھوٹے بھائی امین کے ساتھ جیل کی سزا کاٹنے کے بعد بیرون ملک ہے اگرچہ موخرالذکر کو جلد رہا کر دیا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق نیب نے 7 ارب روپے کا تقاضا کیا تھا لیکن بعد میں صرف 1.5 ارب پر معاملہ طے پا گیا جس کو دس سال کی مدت میں ادا کرنا ہو گا۔ لاکھانی اپنے پرانے روایتی حریفوں ہاشوانیوں کی طرح اسماعیلی سرمایہ داروں میں سب سے زیادہ معروف ہیں۔ ان کے کاروباروں میں میڈیا، تمباکو، کاغذ، کیمیکل اور سامان جراحی سے لے کر کپاس، پیکیج بنانا، میل کاٹ (detergents) اور دوسری گھریلو استعمال کی اشیا شامل ہیں جن میں سے بہت سے بڑے بین الاقوامی گروپوں کے ساتھ شراکت (joint ventures) پر مبنی ہیں۔ اگرچہ لاکھانیوں پر ابھی کڑا وقت ہے لیکن پچھلے 25 سالوں میں انہیں ملنے والی کامیابی بہت شاندار رہی ہے۔ اپنی خلیق طبیعت کی شہرت کے باوجود بڑے کاروباری گروپوں کے ساتھ ان کے تنازعات

ہیں۔سندھ اور مرکز میں بھلے کوئی بھی حکومت ہو لاکھانیوں کے ہر جگہ قابل اعتماد دوست موجود رہے ہیں اگر چہ موجودہ دور ایک تکلیف دہ استثنا ثابت ہوا ہے۔

12۔ملک ریاض حسین (پاکستان)

رینک:9(9 پر برابر ہے) اثاثہ جات:400 ملین پاؤنڈ (800 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

ملک ریاض حسین بہت بڑے پراجیکٹ کا سربراہ ہے جو لاہور، کراچی اور راولپنڈی/اسلام آباد میں جدید ترین سکیمیں تعمیر کر رہا ہے۔گوشہ گمنامی سے نکل کر اس نے اطلاعات کے مطابق پاکستان کے با اثر حلقوں میں بے پناہ تعلقات بنا لیے ہیں جو کہ اس کے منصوبوں کے بغیر کسی رکاوٹ کے وقت پر تکمیل کی چند وجوہات میں سے ایک ہے۔ملک کی اہم شخصیات کو بنگلے اس نے تحفتاً مفت یا انتہائی رعایتی قیمتوں پر دیئے ہیں زمینی حقیقت تو یہ ہے کہ ملک نے اپنی سخاوت سے بہت سوں کو مسحور کر دیا ہے۔پاکستان اور اس سے باہر اس کی زمین کی مالیت ایک ارب ڈالر کے قریب ہے۔بحریہ ٹاؤن کو بنانے والا بھی یہی ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ کون اقتدار میں ہے وہ گھر پہ گھر بیچ رہا ہے جس سے اس کی دولت بڑھتی جا رہی ہے۔وہ پاکستان کی سرزمین پر بینٹلی گاڑی چلانے والا پہلا شخص ہے۔

13۔شیخ عابد حسین عرف سیٹھ عابد (پاکستان)

رینک:10 اثاثہ جات:390 ملین پاؤنڈ (780 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

شیخ عابد حسین عرف سیٹھ عابد ملک کے سب سے زیادہ با وسائل ڈیویلپرز بلڈرز (developers/builders) میں سے ایک ہے اور اس کی بڑے شہروں میں بے پناہ زمین ہے۔اربوں روپے مالیت کی اس زمین پر سیٹھ نے ''گرین فورٹ'' کے نام سے رہائشی سکیمیں تعمیر کی ہیں۔سیٹھ کئی دہائیوں تک سرحد پار سمگلنگ کا بدنام زمانہ سرغنہ رہنے کے بعد اس کاروبار میں آیا۔جہاں بہت سے لوگ سیٹھ کو غیر قانونی تجارت کے حوالے سے یاد کرتے ہیں وہیں باخبر حلقے وثوق کے ساتھ اب بھی کہتے ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی کامیابی کے پیچھے ڈاکٹر قدیر اور سابق وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی تھا۔سیٹھ کے قریباً تین درجن قریبی رشتہ دار، دوست اور بھتیجے ملک کی سٹاک ایکس چینجوں کے ممبر ہیں اور اب کئی برسوں سے سیٹھ عابد گروپ ان سٹاک ایکس چینجوں کے سالانہ انتخا

بات میں بادشاہ گر کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ سٹاک، دھاتوں اور کرنسی میں ممتاز سرمایہ کار ہے لیکن جو چیز اسے انتہائی خوشی دیتی ہے وہ اس کا رفاہی ادارہ حمزہ فاؤنڈیشن ہے جس کی وہ گونگے اور بہرے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرپرستی کرتا ہے۔ پاکستان میں کوئی ایسا حکمران، سیاست دان، بیوروکریٹ یا فوجی جنرل نہیں گزرا جو کہ سیٹھ کو نہ جانتا ہو، جو کہ زیادہ تر افراد کے لیے افسانوی قسم کی شخصیت ہے۔ بیشتر صحافی جانتے ہیں کہ سیٹھ نے ساری عمر تشہیر سے اجتناب کیا ہے۔

14۔ میاں محمد لطیف (پاکستان)

رینک: 11 اثاثہ جات: 350 ملین پاؤنڈ (700 ارب ڈالر) صنعت: کاروبار

چناب گروپ کو میاں محمد لطیف اپنے بھائی میاں اشفاق کے ساتھ مل کر چلاتا ہے جو پاکستان کی قومی اسمبلی میں قانون ساز ہے۔ 1975ء میں اپنے قیام کے بعد چناب لمیٹڈ نے اپنا پہلا فیشن سٹور ''چین ون'' کھولا۔ ''چین ون'' کے پورے پاکستان میں سات سٹور ہیں۔ سعودی عرب کے بہت سے شہروں میں سٹور کھولنے کے بعد اب گروپ بحرین، متحدہ عرب امارات، قطر، کویت اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں اپنے سٹور کھولنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ جہاں چناب گروپ آٹھ دفعہ برآمدات کی ٹرافی جیت چکا ہے وہیں اس کے مالک میاں لطیف کو چار مختلف موقعوں پر مختلف اداروں کی جانب سے سال کے بہترین کاروباری کے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ چناب گروپ بنیادی طور پر کپڑوں کی تیاری اور فروخت، فرنیچر، بشمول non-iron suit، لحافوں کے غلاف اور پردوں کا کاروبار کرتا ہے۔ چناب گروپ سالانہ 50 ملین مربع میٹر کپڑا بنتا اور 75 ملین مربع میٹر کپڑا رنگتا ہے اور اس نے پانچ براعظموں پر پھیلا فروخت کا نیٹ ورک بنایا ہے۔ چناب کے پاس سویڈن کی ٹیکسوٹ (Texcote) ٹیکنالوجی کا ٹیکسٹائل کے سامان، کپڑوں اور ٹیکسٹائل کی گھریلو استعمال کی مصنوعات کی تیاری اور فروخت کا لائسنس ہے۔ گروپ کی ٹیکسٹائل مصنوعات کو Oekotex 100 کا سرٹیفکیٹ بھی دیا جا چکا ہے۔

15۔ حاجی عبدالغفور اور حاجی بشیر احمد (پاکستان)

رینک: 12 اثاثہ جات: 330 ملین پاؤنڈ (660 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

ستارہ گروپ نے کپڑے کی بنائی کا کام 1956ء میں برادران حاجی عبدالغفور اور حاجی بشیر احمد کی

سربراہی میں شروع کیا۔آج یہ گروپ کپڑے کی تیاری اور پراسیسنگ، کپڑے کی بنائی، کلور الکلی (chlor-alkali)اور بجلی بنانے کے شعبے سے وابستہ ہے۔اس کی ملکیت میں شامل یونٹوں میں ستارہ کیمیکل،ستارہ کیمیکل (ٹیکسٹائل ڈویژن 1)،ستارہ کیمیکل (ٹیکسٹائل ڈویژن 11)،ستارہ ٹیکسٹائل،ستارہ انرجی اور ستارہ سپننگ شامل ہیں،ستارہ گروپ کی زیر سرپرستی چلنے والے خیراتی اداروں میں عزیز فاطمہ ہسپتال،غفور بشیر ہسپتال برائے اطفال اور عزیز فاطمہ گرلز سکول شامل ہیں۔ستارہ اور صنعتی شہر فیصل آباد کا نام مترادف بن چکے ہیں۔وہ کئی دہائیوں سے آزمودہ کار تاجر ہیں اور انہوں نے دن دگنی رات چگنی ترقی کی ہے۔ان کے یونٹوں میں جاپان، برطانیہ اور جرمنی سے درآمد شدہ ٹیکنالوجی استعمال کی جاتی ہے اور جنوبی امریکہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ،کینیڈا، نیوزی لینڈ اور یورپ کو بستروں اور کپڑے کی برآمدات میں سب سے نمایاں ہیں۔ان کے ٹیکسٹائل ڈویژن کل ملا کر 33,984 سپنڈل (spindles) کی تعداد پر کام کر رہے ہیں۔عام آدمی کے لیے ستارہ گروپ ستارہ سپنا اور مغل اعظم جیسے لان کے برانڈوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ستارہ کے کرتا دھرتا افراد درجنوں یونٹ بنانے میں یقین نہیں رکھتے اگرچہ وہ اس کی صلاحیت بخوبی رکھتے ہیں۔

16۔شیخانی خاندان (پاکستان)

رینک:13 اثاثہ جات:300 ملین پاؤنڈ (600 ملین ڈالر) صنعت: کاروبار

یہ ملک کے زمینی جائیداد کو بنانے والے (land developers) معروف ترین لوگوں میں سے ایک ہیں۔شیخانیوں کی جو کہ کسی بھی طرح سے کوئی بہت بڑی صنعتی قوت نہیں ہیں سربراہی ابوبکر شیخانی کرتا ہے۔شیخانی تعمیرات اور جائیداد کی تیاری کے منصوبوں کے لیے مشہور ہیں۔ابوبکر کو گوادر کی بندرگاہ میں زمینی جائیداد کے کاروبار میں سب سے بڑے سرمایہ کاروں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔اس نے وہ تمام تعلقات بنا رکھے ہیں جو ایسے کاروبار کے لیے ضروری ہیں۔اگرچہ ملک کے سیاسی حلقے اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن عام آدمی تک اس کی شہرت مارچ/اپریل 1991ء میں پہنچی جب وہ اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف کے قرض اتارو فنڈ کے لیے 8 ملین ڈالر کا سب سے زیادہ چندہ دینے والے شخص کے طور پر سامنے آیا۔آج اس کے مخالف اسے لینڈ مافیا کا آدمی کہتے ہیں اور الزام لگاتے ہیں کہ اس نے گوادر میں اپنی زمین صرف 4000

ڈالر فی ایکڑ کے حساب سے سینیئر فوجی افسران کو بیچ دی جبکہ وہی زمین سول سرمایہ کاروں کو 2,50,000 ڈالر فی ایکڑ میں بیچی جارہی تھی۔مگر شیخانی اپنی جائیداد اور تعمیرات کی وسیع سلطنت اسی طرح چلاتا ہے۔ان الزامات سے شیخانی کو کوئی فرق نہیں پڑتا،جس نے جائیداد کے بہت سے بیوپاریوں کی رائے میں اس کاروبار میں بہت نام بنایا ہے۔اس کی پاکستان کے کسی بھی شہر میں زمین خریدنے کی غرض سے آمد کی خبر سے جائیداد کی قیمتیں راتوں رات چڑھ جاتی ہیں۔

17۔رزاق داؤد (پاکستان/متحدہ عرب امارات)

رینک: 14 (14 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 250 ملین پاؤنڈ (500 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

داؤد اس وقت پاکستان میں سب سے بڑے تعمیرات اور انجینئرنگ کے گروپوں میں سے ایک داؤد گروپ/ڈیسکان گروپ کا سربراہ ہے۔اس کے گاہکوں کی فہرست بہت متاثر کن ہے۔اس کے گروپ کو دوبئی،سعودی عرب اور عراق میں بہت سے ٹھیکے مل چکے ہیں اور 1,000 سے زائد افراد براہ راست ملازم ہیں۔اس کا نام 1970ء میں بھٹو کی نیشنلائزیشن تک امیر ترین 22 خاندانوں میں زیادہ معروف تھا جس کے بعد اسے بیرون ملک اپنا کاروبار بنانا پڑا،وہ 90ء کی دہائی کے آغاز میں پاکستان واپس آیا اور نئے سرے سے شروعات کے بعد آسانی سے بہت اوپر آ گیا۔گروپ کی بنگلہ دیش میں بھی کھاد،توانائی،انفراسٹرکچر اور تعمیرات کے شعبے میں 300 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری ہے۔

18۔بیرام ڈنشاجی آواری (پاکستان)

رینک: 14 (14 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 250 ملین پاؤنڈ (500 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

بیرام ڈنشاجی آواری کراچی،سندھ اور پاکستان کا ممتاز پارسی سرمایہ دار ہے۔اپنے بیٹوں ڈنشا اور زرکسس اور ان کے خاندانوں کے ساتھ وہ آواری گروپ کو چلا رہا ہے جس کا وہ چیئرمین اور مالک ہے۔آواری گروپ کا بنیادی کاروبار ہوٹل چلانے کا ہے۔پاکستان میں یہ گروپ آواری ہوٹلوں کو چلاتا ہے اور ان کا مالک ہے جس میں لاہور میں 5 سٹار ڈیلکس ہوٹل،کراچی میں 5 سٹار آواری ٹاور اور سی فرنٹ

بیچ لگژری ہوٹل(seafront Beach Luxury Hotel)شامل ہیں۔گروپ پاکستان کے دوسرے علاقوں میں 3 اور 4 سٹار ہوٹلوں کوخریدنے اورانہیں چلانے کے اختیار کے لیے کوششیں کر رہا ہے۔آواری گروپ پاکستان کی پہلی کمپنی ہے جسے ہوٹل چلانے کے بین الاقوامی ٹھیکے ملے ہیں۔انہوں نے دوبئی میں 200 کمروں کا 4 سٹار ہوٹل اورٹورانٹو کینیڈا میں پئرسن ہوائی اڈے پر 200 کمروں کا رمادہ ان(Ramada Inn)نامی ہوٹل چلایا ہے۔

19۔رفیق رنگون والا (پاکستان)

رینک:15(15پر برابر ہے)اثاثہ جات:240ملین پاؤنڈ(480ملین ڈالر)

صنعت:کاروبار

رفیق رنگون والا، کپولا گروپ آف کمپنیز کا چیف ایگزیکٹو آفیسر،کراچی میں پیدا ہوا، جامع کراچی سے بی اے(آنرز) کیا، 1979ء میں امریکہ چلا گیا اور وٹ مور سکول آف بزنس (Whittemore School of Business)یورنیورسٹی آف نیوہیمپشائر سے ایگزیکٹو ڈویلپمینٹ کا کورس کیااوراس کے علاوہ برطانیہ،امریکہ،کینیڈا،آسٹریلیااورسنگاپور سے مینجمنٹ کے متعدد کورس کیے۔1980ء میں ہیوسٹن میں کے ایف سی فاسٹ فوڈ سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔تب سے اس نے کے ایف سی کے علاوہ بہت سے برانڈوں کو چلایا جن میں پیزا ہٹ، ہیری رامسڈ نز (Harry Ramsden's)،ٹی جی آئی فرائیڈز(TGI Fridays)اور پیزا ایکسپریس وغیرہ شامل ہیں،اکتوبر 1999ء میں اس نے ارٹال ریستوران انٹرنیشنل میں بطورسی ای او شمولیت اختیار کی اور اس وقت کپولا گروپ آف کمپنیز کا سربراہ ہے جس کے پاس پاکستان میں کے ایف سی، انڈلج، فریشنز(Freshens)اور کاسا(Casa)کے فرینچائز کے حقوق ہیں۔کپولا کی ساتھی انوسٹمنٹ کمپنی الابراج ہے جس کی مالیت 400ملین امریکی ڈالر کے قریب ہے۔

20۔شمی قریشی (امریکہ)

رینک:15(15پر برابر ہے) اثاثہ جات:240ملین پاؤنڈ(480ملین ڈالر)

صنعت:کاروبار

جیٹ پر سفر کرنے کا شوقین یہ بین لاقوامی تاجر دنیا کے بہترین کھلاڑیوں کے ساتھ پولو کھیلتا ہے۔قریشی کاروبار میں کامیابی کا ایک مثالی نمونہ ہے۔شمی کا بنیادی کاروبار جائیداد کا ہے اور جس میں عروج کی وجہ سے اس کی دولت میں بے شمار اضافہ ہوا ہے۔تاہم لوگ اسے 90ء کی دہائی میں ارب پتی اور سیلولرون کے بانی جارج لنڈمین(George Lindemann) کے ساتھ ہوئے وقوعے کے حوالے سے زیادہ یاد کرتے ہیں جب لنڈمین نے عدالت میں الزام لگایا اس نے لنڈمین کو ہرلنگہم ڈرائیو(Hurlingham Drive)ولنگٹن پر 3.5 ملین ڈالر کا گھر خریدنے کے سودے پر دھوکہ دہی سے آمادہ کیا۔لنڈمین کے دعوے سے ایک سال قبل قریشی نے ایک اور امیر خاندان سے کیمین جزائر (Cayman Islands) میں گلف یونین بینک خریدنے کے لیے لین دین کیا، یہ عرب ملک قطر کا حکمران ال تھانس خاندان تھا۔مئی 1997ء میں ال تھانس گلف یونین بینک کو قریشی کی ملکیت میں کیمن جزائر کی کمپنی انٹرنیشنل بزنس ہولڈنگ(International Business Holdings) کو عدالتی ریکارڈ کے مطابق 4.5 ملین ڈالر میں بیچنے پر آمادہ ہوگئے۔ابھی کیمین جزائر کے سرکاری اہلکار اس سودے کی پڑتال کر رہے تھے کہ قریشی نے ایک ساتھ کاظمی کو گلف یونین بینک اور سبسڈری(subsidiary) فرسٹ کیمین بینک(First Cayman Bank) کو چلانے کے لیے نامزد کیا۔تین ماہ کے اندر ہی کاظمی نے قریشی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے 5 ملین ڈالر سے زائد رقم فرسٹ کیمین سے اپنے، قریشی اور ال تھانس کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی۔شمی قریشی امریکہ میں آصف زرداری کی تمام جائیداد کا مکمل نظم نسق چلاتا ہے۔

21۔فاروق خان (پاکستان)

رینک: 15 (15 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 240 ملین پاؤنڈ (480 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

مرحوم خان بہادر غلام فاروق خان(1992-1899) پاکستان کی ایک کاروباری اور سیاسی شخصیت تھی۔اس کا تعلق ضلع نوشہرہ کے گاؤں شیدو سے تھا،نوشہرہ پاکستان کے صوبہ سرحد کے مشہور پشتون قبیلے خٹک کا مسکن ہے۔پاکستان کی صنعتی ترقی میں اس کے کردار کی بدولت بعض اوقات اسے ''پاکستان میں صنعت لگانے والا دیو'' کہا جاتا ہے۔آج اس کے خاندان کی ملکیت میں چراٹ سیمنٹ کمپنی لمیٹڈ،

چراٹ پیپر سیک لمیٹڈ، چراٹ الیکٹرک لمیٹڈ، میر پور خاص شوگر ملز لمیٹڈ، فاروق پرائیویٹ لمیٹڈ، گریوس ایئر کنڈیشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، گریوس انجینئرنگ سروسز پرائیویٹ لمیٹڈ، یونیکول لمیٹڈ، شراکتی کمپنی مدین ہائیڈرو پاور لمیٹڈ، شراکتی کمپنی زینسوفٹ پرائیویٹ لمیٹڈ اور پورے پاکستان میں بڑی جائیدادیں شامل ہیں۔

22۔شاہد لقمان (برطانیہ)

رینک: 16 (16 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 230 ملین پاؤنڈ (460 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

شاہد لقمان گجرات میں پیدا ہوا اور مانچسٹر میں مقیم فائنانسر ہے اس نے جائیداد اور مالیاتی منڈی کے لیے 'پرل ہولڈنگز' (Pearl Holdings) کے نام کی کمپنی بنا رکھی ہے۔ وہ برطانیہ اور پاکستان میں ایک ممتاز جائیداد کو تیار کرنے والا ہے اور اس کے پراجیکٹ کروڑوں پاؤنڈ مالیت کے ہوتے ہیں۔ وہ قرضے بھی دیتا ہے۔ اگرچہ ماضی میں اس کو دیوالیہ پن ظاہر کرتے اور قرضے ہڑپ کرتے پایا گیا ہے۔

23۔مختار احمد (پاکستان)

رینک: 16 (16 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 230 ملین پاؤنڈ (460 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

ابراہیم گروپ کے بانی مرحوم حاجی شیخ محمد ابراہیم نے 1947ء میں ہندوستان سے ہجرت کے بعد فیصل آباد میں سکونت اختیار کی اور کپڑے کی تجارت کے اپنے آبائی پیشے کو ''ابراہیم ایجنسیز'' کے نام سے دوبارہ شروع کیا۔ آج کاروباری دنیا میں ابراہیم گروپ کے نام سے جانے جانے والے گروپ جس نے مختلف النوع کاروباروں میں جہاز رانی سے لے کر پی ایس ایف، مالیاتی اداروں سے لے کر بینکاری اور توانائی شامل ہے، کی شروعات کپڑے کی تجارت کی ایک ایجنسی سے صرف نصف صدی پہلے کی۔ حال ہی میں احمد نے الائیڈ بینک میں 300 ملین ڈالر کے شیئر خریدے ہیں۔

24۔عقیل کریم ڈھیڈی (پاکستان)

رینک: 16 (16 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 230 ملین پاؤنڈ (460 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

1947ء میں جائیداد اور سٹاک بروکر سے شروعات کر کے مرحوم حاجی عبدالکریم ڈھیڈی نے آج کے اے کے ڈی (AKD) گروپ آف کمپنیز کی بنیاد ڈالی جو کہ پاکستان کے سب سے بڑے مقامی گروپوں میں سے ایک ہے اور اس کی کل مالیت 1 ارب ڈالر سے زائد ہے جس میں کریم کا حصہ 400 ملین ڈالر ہے۔ عقیل کریم ڈھیڈی ولد مرحوم حاجی عبدالکریم ڈھیڈی اے کے ڈی گروپ کا چیئر مین ہے۔ اس نے اے کے ڈی گروپ کو ایک ممتاز اور متحرک گروپ بنایا ہے جو پاکستانی معیشت کے اہم شعبہ جات میں کام کر رہا ہے جن میں سٹاک اور شیئر، ذرائع ابلاغ، ٹیکسٹائل، جائیداد اور تیل اور گیس کی تلاش شامل ہیں۔ اے کے ڈی آگے کی طرف بڑھے جا رہا ہے۔

25۔سیّد خاندان (پاکستان)

رینک: 17 (17 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 220 ملین پاؤنڈ (440 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

پاکستان کی تمام سٹاک ایکس چینجوں میں رجسٹرڈ پیکیجز لمیٹڈ نے ایک لمبے عرصے سے اے اے (AA) کی کریڈیٹ ریٹنگ (credit rating) برقرار رکھی ہے۔ دنیا کے چند بڑے ناموں کے ساتھ شراکت داری اور کاروباری اتحاد ہماری اپنے گاہکوں کو ملنے والی قدر میں پیداوار میں بہتری کے ذریعے مسلسل اضافے کی جستجو میں پیش بینی کی حکمت عملی کی عکاسی کرتے ہیں۔ گروپ نے پاکستان میں کوکا کولا کے بہت سے پلانٹ بھی خرید لیے ہیں۔ اس کے مشہور برانڈوں میں عبیلے ملک پیک، ٹریٹ، میچلز اور ٹرائی پیک فلمز شامل ہیں۔ اس کی ٹیکسٹائل، دودھ، زراعت اور چاول کے شعبے میں بھی سرمایہ کاری ہے۔ گروپ کا آزاد پاکستان کے عظیم مقصد میں کردار بے مثال ہے کیونکہ یہ پاکستان میں مکمل پیکیجنگ کا واحد ادارہ ہے جو انفرادی اور پوری دنیا میں پھیلے کاروباروں کو ہر طرح کے پیکیجنگ کی سہولت مہیا کرتا ہے جیسے پرنٹ شدہ کارٹن، کنٹینر اور لچکدار پیکیجنگ۔ ان کی ملازمت میں 4000 سے زائد افراد ہیں۔

26۔سیف خاندان (پاکستان)

رینک: 17 (17 پر برابر ہے) اثاثہ جات: 220 ملین پاؤنڈ (440 ملین ڈالر)

صنعت: کاروبار

صوبہ سرحد کی مشہور خاتون سیاست دان بیگم کلثوم سیف اللہ کے بیٹے اس کاروبار کے مالک اور اسے چلاتے ہیں۔سب سے بڑا بیٹا جاوید اس طاقتور کاروباری گروپ کا سربراہ ہے۔جاوید نے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری 1973ء میں یونیورسٹی آف پٹسبرگ (Pittsburgh) امریکہ سے حاصل کی اوراس کے بعد 30 سال میں ٹیکسٹائل، ٹیلی مواصلات، سیمنٹ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبوں میں وسیع البنیاد تجربہ حاصل کیا۔وہ کل پاکستان ٹیکسٹائل مل ایسوسی ایشن (APTMA) کا دو سال اور صوبہ سرحد میں سات سال چیئرمین رہا۔وہ ٹاسک فورس برائے انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ٹیلی مواصلات مشاورتی بورڈ وزارت سائنس اور ٹیکنالوجی اور ٹاسک فورس (برائے لبرلائزیشن ونجکاری، پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی لمیٹڈ) وزارت سائنس اور ٹیکنالوجی کا رکن بھی رہا ہے۔جاوید سیف اللہ خان پچھلے بیس برس سے گروپ کے کاروبار کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔سیف اللہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں اقتدار میں رہتے ہیں۔ جاوید کے بھائی انور سیف اللہ خان (سابقہ وفاقی وزیر)، سلیم سیف اللہ خان (صوبہ سرحد کی سیاست میں بادشاہ گر) اور عثمان سیف اللہ (APTMA کا رکن) ہیں۔

Source:

http://www.teeth.com.pk/blog/2007/12/08/pakistan 2008

ضمیمہ 3

پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور۔ 1970ء

اہم نکات

تعارف

پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور باقی پارٹیوں کی طرح فرسودہ نہیں ہے۔ یہ عوام سے کیا گیا عہد و پیمان ہے کہ پارٹی، انتخابی یا غیر انتخابی ہر طریقے سے، اس میں دیئے گئے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کرے گی۔

I۔ بحران

وہ طبقات جو قوم کے خلاف کیے گئے اپنے جرائم سے بخوبی واقف ہیں اور وہ ردانقلابی سیاسی پارٹیاں جن کی نظریں ہمیشہ سے ماضی پر لگی ہیں، اب توجہ ہٹانے کے لیے خود کو ان تخیلاتی نظریات کا علمبردار کہلوا رہے ہیں جو ان کے خیال میں پاکستان کا حقیقی مقصد ہیں۔

دوسری جانب، ہم بات کرتے ہیں عقل کی، انسانی علم کی جمع کردہ دولت کی، صدیوں پر محیط انسانی تخلیق کے نتیجے میں ایجاد ہونے والے طریقوں اور تکنیک کی تاکہ قوم کو ذلت سے نکال کر عظیم لوگوں کے شایان شان زندگی گزارنے کا راستہ دکھایا جائے۔ قوم کو درپیش حقیقی مسائل سیاسی اور معاشی ہیں نہ کہ مذہبی کیونکہ استحصال کرنے والے اور استحصال زدہ دونوں کا عقیدہ ایک ہے۔۔۔ دونوں مسلمان ہیں۔

بہت سی حکومتیں آئیں اور گئیں لیکن عوام کی بربادی کا رجحان، مراعات یافتہ طبقات کی دولت میں

اضافہ اور طفیلی ذاتی مفادات کا بڑھنا بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔ پچھلی تمام حکومتیں ان غلطیوں کے لیے لازماً قصوروار ہیں، لیکن جو کچھ انہوں نے کیا وہ اس کے برخلاف نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وہ طبقاتی اور ذاتی مفادات کی نمائندہ تھیں ان سے نظام کو بدلنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ ان کی اپنی نشوونما کا انحصار اس پر تھا کہ اس نظام کو ترقی دے کر ان طبقات کے منافعوں کو بڑھایا جائے جن کے بل بوتے پر وہ حکومت میں ہیں۔

براہ راست نوآبادیاتی اقتدار نے پاکستان میں ایک ایسا سیاسی اور سماجی نظام وراثت میں چھوڑا جسے جاگیردارانہ، فوجی، بیوروکریٹک کہا جا سکتا ہے۔ تب سے آج تک ہونے والی تمام ترقی اس نظام کی ایک اپاہج سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیلی کی ہے جو کہ سامراجی نوآبادیاتی حلقہ اثر میں موجود غیر ترقی یافتہ ممالک کا خاصہ ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر مغربی نوآبادیاتی طاقتوں نے امریکی رہنمائی میں استحصال کے طریقوں کو نئے حالات کے مطابق ڈھالا۔ محکوم عوام پر براہ راست حکومت ختم کر دی گئی مگر سابقہ نوآبادیاں معاشی، سیاسی اور فوجی مجبوریوں کی زنجیروں سے سابقہ حکمرانوں کے چنگل میں گرفتار رہیں۔

نئی سامراجی طاقتوں کے زیر اثر ہمارے حکمرانوں کے غلط اقدامات، ایک ایسے معاشی نظام کے اپنانے جس میں عوام کو بلا روک ٹوک لوٹنے کی اجازت ہو، چند افراد کے ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز، طاقت، روزگار اور دولت کے ذرائع کی بیوپاریوں، جاگیرداروں اور حکومت کی فوجی اور سول افسران کے طبقے کے درمیان بندر بانٹ، ان سب کی وجہ سے ملک بحران میں مبتلا ہو چکا ہے، جو کہ بڑے پیمانے کی تباہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ یاد رہے کہ سرکاری اہلکاروں کی بدعنوانی بیماری کی وجہ نہیں بلکہ صرف ایک علامت ہے؛ بدعنوانی جو سماج کی پرتوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔

بینکاری کی صنعت اور کاروباری شعبے کے مفادات کا تحفظ کرتے حکمران ٹولے کے پاس بجٹ فارمولوں اور ترقیاتی منصوبوں کا وہی پرانا جادوئی منتر پڑھنے کے سوا اس بحران سے نکلنے کا کوئی حل موجود نہیں۔ بڑھتی قیمتوں کے ساتھ محنت کش طبقہ، نچلا درمیانہ طبقہ اور لگی بندھی تنخواہوں والے تمام ملازمین تیزی سے بدحالی کا شکار ہو رہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کی آخری کوشش میں حکومت نے پاکستان کے غیر مراعات یافتہ عوام کو بڑے پیمانے پر لوٹنے کی اجازت دے دی ہے۔

یہ بحران ہمارے بوسیدہ نظام کی ہڈیوں میں سرایت کر چکا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا پروگرام اس نظام کو ہی ختم کر ڈالے گا اور ذرائع پیداوار کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا جو کہ چند افراد کے ہاتھوں میں آ کر ذرائع استحصال بن چکے ہیں۔

آئین جو کہ صرف ساخت میں جمہوری ہو اس ملک کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہوگا جب تک کہ اسکو اس طرح سے نہ بنایا گیا ہو کہ وہ معاشی اور سیاسی نظام میں تبدیلی کو نہ صرف ممکن بنائے بلکہ ضروری طور پر اسکا آغاز بھی کرے۔ سرمایہ دار اور مالکان طبقات کے مفادات جب تک بے لگام ہیں تب تک آئین ایسا ہی ہوگا جو ان کی ضروریات کے عین مطابق بنایا جاتا رہے گا۔

حقیقی حل ایک سوشلسٹ پروگرام کے اپنانے ہی سے ممکن ہے، جیسا کہ اس منشور میں دیا گیا ہے کہ سارے پاکستان کی معیشت میں بنیادی تبدیلی لائی جائے جس سے استحصال کا خاتمہ ہو اور دستیاب وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے سرمایہ دارانہ مداخلت کے بغیر ملک کو ترقی دی جائے۔

دسمبر 1967ء میں لاہور کنونشن کے موقع پر پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے قیام کے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اصولوں کا اعلان کیا۔ پارٹی کی پالیسی کا حتمی مقصد طبقات سے پاک معاشرے کا قیام ہے جو کہ ہمارے دور میں صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

چونکہ پارٹی کے بنیادی مقاصد کا حصول چھوٹی چھوٹی مفاہمتوں کے ذریعے ناممکن ہے اور اس وقت تک بھی جب تک سماج میں غیر منصفانہ نظام موجود ہے، پارٹی سمجھتی ہے کہ اصلاح پسند نعرے لگانا لوگوں کو جھوٹی امید دلا کر دھوکہ دینا ہے جبکہ ملک موجودہ اور مزید بربادیوں کی گہرائیوں میں گرتا جا رہا ہے اور آخر کار یاس کے عالم میں دھماکہ خیز تشدد سامنے آتا ہے۔

II۔ خارجہ پالیسی

پہلا قدم لازمی طور پر سامراج اور نئی نوآبادیاتی طاقتوں کے چنگل سے رہائی پانا ہے۔ پاکستان سامراج اور نئی سامراجی طاقتوں کے خلاف جدوجہد میں تمام محکوم لوگوں کی حمایت کرے گا، خاص طور پر ویتنام کے بہادر لوگوں کی جدوجہد کو جو کئی سال سے کامیابی کے ساتھ سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہم دوسری اقوام کے ساتھ مل کر ایشیاء کی سرزمین کو امریکہ اور دوسری مغربی سامراجی طاقتوں کی افواج کے قبضے سے چھڑانے کی جدوجہد کریں گے۔

III۔ صنعتی اقدامات

تمام دولت انسانی محنت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں استحصال سرمایہ داروں کی ذرائع پیداوار پر ملکیت پر منحصر ہے۔ بڑی صنعتوں میں سرمایہ دار کسی طرح سے بھی قومی طور پر مفید کردار ادا نہیں کرتا، وہ صرف اپنا منافع لیتا ہے اور دوسروں کی محنت کا استحصال کرتا ہے، جبکہ اس کے کارخانوں کو تیکنیکی ماہرین چلا رہے ہوتے ہیں، اس کا مال اجرتی مزدوروں کی محنت سے بنتا ہے اور حتیٰ کہ کارخانے کا نظم و نسق بھی مالک نہیں چلاتا۔

تعلیم، صحت اور رہائش کی ضروری سہولیات اور عوامی ضروریات نظر انداز کی جا رہی ہیں کیونکہ پیداوار کی قدر زائد استحصالیوں کی جیبوں میں یا پھر انتظامیہ اور دفاع پر خرچ ہو رہا ہے اور اس لیے قوم کی عوامی فلاح و بہبود کے لیے بہت کم پیسہ بچتا ہے۔ یہ مسئلہ نظام کا ناگزیر جزو ہے۔ محصولات کا ہیر پھیر، چھوٹی چھوٹی اصلاحات، اخلاقی لفاظی نظام کو بچانے کے لیے لوگوں کو بیوقوف بنانے کے ڈھونگ ہیں۔

IV۔ صنعت کو قومی تحویل میں لینا

سرکاری شعبے میں تمام بنیادی اور اہم صنعتیں ہوں گی۔

تمام بڑی صنعتیں قومی تحویل میں لی جائیں گی۔ اس کا مطلب ہوگا کہ ایک خاص پیداواری صلاحیت سے اوپر کی تمام کپڑے اور پٹ سن کے تمام کارخانوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ نجی ملکیت میں یہ بے پناہ منافعوں، پیداوار کی نااہلی، وسائل کے ضیاع اور محنت کشوں کے نہ رکنے والا استحصال کا سرچشمہ بن چکی ہیں۔

سرکاری شعبے میں نہ صرف بجلی بلکہ توانائی کے باقی تمام ذرائع جیسے ایٹمی، گیس، تیل اور کوئلے کی بڑے پیمانے پر پیداوار ہوگی۔

سرکاری شعبہ مکمل طور پر پبلک ٹرانسپورٹ کے بڑے ذرائع کا مالک ہوگا جیسے ریلوے، بحری اور ہوائی جہاز۔ جہاں پر بھی اسے بڑے پیمانے پر چلانے کی ضرورت محسوس کی جائے گی سڑک کے ذریعے پبلک ٹرانسپورٹ خواہ مال یا مسافر بردار کو بھی قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ محنت کشوں اور ملازمین کے

لیے ان کے گھروں سے کام کرنے کی جگہ تک آمدورفت پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

V ۔اقتصادی اقدامات

مالیاتی اداروں کی نجی تحویل استحصال کا ماخذ ہے جو قومی دولت اور نجی کھاتوں کو استعمال کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ اجارہ داروں کو سرمایہ فراہم کرنے کے وسائل پیدا کرتا ہے۔تمام بڑی صنعتیں کلی طور پر بینکوں سے قرضے لے کر کھڑی کی گئی ہیں جو کہ کھاتہ داروں کا پیسہ ہے۔جب تک ریاست تمام بینکوں کو اپنی تحویل میں لے کر انہیں قومی ملکیت نہیں بناتی وہ افراطِ زر پر قابو نہیں پا سکتی۔

تمام بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو فوری طور پر قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ایک سوشلسٹ نظام کا قیام قدرتی طور پر ٹیکسوں کے نظام کی بنیاد تبدیل کر دے گا جو کہ سرمایہ دارانہ سماج کے لیے بنایا گیا ہے اور دولت کے مراعات یافتہ طبقات کے ہاتھوں میں ارتکاز کا باعث ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ٹیکس صرف سرکار کو پیسہ فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے،لیکن یہ پیسہ صنعت، زراعت اور دوسرے شعبوں میں پیدا ہونے والی قدر زائد سے آنا چاہیے جن میں انسانی محنت اور کاوش صرف کی جاتی ہے۔

VI۔زرعی اقدامات

خشک سالی اور سیلاب جیسی قدرتی اور طبعی مشکلات کے علاوہ جاگیرداری، مزارعت، زمین کی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور انتہائی مختصر پیمانے کی کاشت کاری جیسے ملکیتی رشتوں کے مسائل سے بھی نمٹنا پڑے گا۔

جاگیرداروں کی طاقت کے خاتمے کے لیے جاگیروں کی تقسیم ایک قومی ضرورت ہے جس کو سیاسی اقدامات سے عملی جامہ پہنانا پڑے گا،ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنا اس کا صرف ایک حصہ ہے۔

زرعی مسائل سے نمٹنے کے لیے پارٹی کی پالیسی کو 1967ء میں منظور کردہ بنیادی اصولوں کے پروگرام میں وضع کیا گیا ہے۔بنیادی اصولوں کے پروگرام کے آرٹیکل 6 میں لکھا ہے:

''پارٹی جاگیرداری کے خاتمے کے حق میں ہے اور سوشلزم کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں کسانوں کے مفادات کا تحفظ اور ان کی ترقی کے لیے ٹھوس اقدامات کرے گی''۔

VII۔عوام کے حقوق

چونکہ بڑے پیانے کی تمام صنعت کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا اس لیے محنت کشوں کا صنعتی پیداوار کی حاصلات سے مستفید ہونا حقیقی طور پر ممکن ہو سکے گا۔کارخانوں کے نظم ونسق کو چلانے میں مزدوروں اور تکنیکی ماہرین کی شمولیت کو بتدریج متعارف کروایا جائے گا۔

کارخانوں میں ملازمت کے لازمی حصے کے طور پر محنت کشوں کو رہائش سے کام کرنے کی جگہ تک کے مناسب ذرائع آمدورفت مہیا کیے جائیں گے۔ان کو تنخواہ کے ساتھ چھٹیوں کی سہولت دی جائے گی اور تفریحی کیمپ قائم کیے جائیں گے جہاں وہ اپنی چھٹیاں صحت افزا مقامات پر گزار سکیں۔انہیں اپنی پیشہ ورانہ صلاحتوں کو بہتر بنانے کے لیے تکنیکی تربیت کا حق حاصل ہوگا۔ہسپتال اور مفت طبی سہولیات کو محنت کشوں کے لیے فلاحی نظام کا حصہ بنایا جائے گا۔تکنیکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف کو محنت کشوں کے بچوں کے لیے تعلیمی سہولیات میں شامل کیا جائے گا۔عمر رسیدہ افراد کے لیے پینشن کا نظام وضع کیا جائے گا اور معذور اور پینشن یافتہ محنت کشوں کے لیے رہائش گاہیں تعمیر کی جائیں گی۔

سوشلسٹ نظام کے تحت مقامی حکومتیں مناسب حجم کی شہری میونسپل کمیٹیوں اور شہری علاقوں پر مشتمل ہوں گی۔دیہی علاقوں میں یہ ضلع کونسل سے ملتی جلتی ہوں گی۔

انتظامیہ کا موجودہ نظام نوآبادیاتی اقتدار سے ورثے میں ملا ہے جو کہ اپنے وقت کے لیے موزوں تھا۔اگر ایمانداری سے بھی دیکھا جائے تو یہ نظام اس وقت تک ٹھیک کام کر رہا تھا جب تک اس کو باہر سے کنٹرول اور باہر سے اس پر نظر رکھی جا رہی تھی۔اس میں کی جانے والی تمام تبدیلیاں ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کی ضروریات اور ان گروہوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کی گئی ہیں جو حکومت اور انتظامیہ کے اندر طاقت رکھنے کی وجہ سے دولت جمع کر رہے تھے پھر انتظامیہ خود مالک بن بیٹھی۔لیکن یہ صرف سرمایہ داروں کے ساتھ اتحاد سے ممکن تھا جو کہ استحصال کرنے کے لیے، مراعات لینے کے لیے بیتاب تھے۔

سوشلسٹ حکومت کو انتظامیہ کا ایک مختلف ڈھانچہ درکار ہوگا اور سوشلسٹ سماج اپنے قیام کے ساتھ ان ضروری ڈھانچوں کو خود ہی پیدا کر لے گا۔

پاکستان کے ہر شہری کو، بلاتفریق رنگ، نسل اور مذہبی عقیدہ، مساوی سیاسی حقوق، قانون کا تحفظ، حکومتی عہدوں تک رسائی حاصل ہوگی اور روزگار کے لیے کسی بھی قسم کا تعصب نہیں ہوگا۔

VIII۔ تعلیم اور ثقافت

تعلیم کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ نئی نسل کو نہ صرف اپنے گردوپیش میں موجود کائنات کا ادراک حاصل ہو بلکہ انہیں اسے بدلنے کے لیے تیار کیا جائے۔ انہیں سماجی تبدیلی اور تاریخ کے ناگزیر عمل کے کردار کو گہرائی میں سمجھنا پڑے گا۔

حقیقی غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لیے لازمی ہے کہ علم کے متلاشی سماج کو کلی طور پر دائرہ نظر میں لائیں۔ ہمیں سرمایہ دارانہ نظام کے اس نظریئے کو رد کرنا ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم کو شعبوں کے اندر محدود کیا جائے۔ تعلیم کی تقسیم کے اس عمل سے سرمایہ دارانہ نظام کا مفاد وابستہ ہے کیونکہ یہ اہل علم کو سیاسی اور معاشی اقدار کے موجودہ نظام کی افادیت پر سوال اٹھانے سے روکتا ہے۔

یورنیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب پر بھرپور طریقے سے نظر ثانی کرنا ہوگی اور یورنیورسٹیوں کی سماجی زندگی سے علیحدگی کو ختم کرنا ہوگا۔ لازمی فوجی تربیت کے علاوہ جو کہ ثانوی سکولوں سے ہی شروع کر دی جائے گی، طلبا کو ایک مخصوص وقت فیکٹریوں، قصبوں اور کھیتوں میں قومی خدمت میں صرف کرنا پڑے گا۔

میٹرک تک تعلیم مفت ہوگی اور بنیادی تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔ ایک پانچ سالہ منصوبہ شروع کیا جائے گا جس کے اختتام تک تمام ضروری سکول تعمیر کیے جائیں گے اور پرائمری اساتذہ کو تربیت دی جائے گی۔

تعلیمی اداروں سے سامراجی، نوآبادیاتی اور نوسامراجی اثرات کا خاتمہ کیا جانا لازمی ہے۔

ان طبقاتی مفادات کی طرف سے قوم کی آنکھوں پر علمی پٹی باندھی گئی ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے لوگ خود اپنے لیے سوچنے لگ پڑیں۔

IX۔ قومی صحت

درج ذیل اہداف کا حصول ممکن بنایا جائے گا۔

1۔ پاکستان میں اوسط عمر کو 33 سال سے بڑھا کر ایک نسل کے اندر 60 سال کیا جانا۔

2۔ دس سال کے اندر 1 سے 5 سال تک کی عمر کے بچوں کی شرح اموات کو 35% سے کم کر کے 7.5% تک لانا۔

3۔ دس سال کے اندر ٹی بی، ہیضہ، چیچک، ٹائیفائڈ، ٹائفس، ملیریا، باؤلا پن اور جذام جیسی بیماریوں کا مکمل خاتمہ۔

صحت کے پروگرام میں ہسپتالوں کا قیام اور ان کی بہتری، شہروں اور دیہات میں صفائی کے نظام کو بہتر بنانے کے اقدامات، زیادہ سے زیادہ ضروری ادویات کی اندورن ملک تیاری، سکول کے بچوں کو صحت کی سہولیات کی فراہمی اور جہاں غذائی کمی ہو وہاں سکولوں میں متوازن خوراک کی فراہمی شامل ہوں گی۔

X۔ قومی دفاع

ملک کے تمام علاقوں میں ایک ''عوامی فوج'' کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس سے جغرافیائی طور پر دفاع میں مضبوطی کی کمی کا مسئلہ حل ہوگا۔

عوامی فوج کا وجود بیرونی جارحیت کے خلاف بہترین ہتھیار ہے۔

XI۔ آئین

آئین کا قانونی ڈھانچہ ترقی کی کی ضمانت نہیں دے سکتا جب وہ حکمران طبقے کے مفادات کے لیے بنایا جائے۔ کوئی بھی آئین خواہ وہ جمہوری بھی ہو، حقیقتاً اس وقت تک بے کار ہوتا ہے جب تک وہ ترقی کے لیے سازگار حالات کو پروان نہیں چڑھاتا اور اس کے لیے ضروری اداروں کو قائم نہیں کرتا۔

موجودہ انتخابی نظام ملکیت والے طبقات کو پارلیمان میں بالادستی دینے کا نہایت کارگر طریقہ ہے۔ انتخاب لڑنے کے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ انہیں کوئی بھی غریب امیدوار برداشت نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کو نجی اثاثوں سے مالا مال امیر سرپرستوں کی پشت پناہی حاصل نہ ہو۔

انتخابی نظام میں ایسی اصلاحات کی جائیں گی کہ سیاسی پروگرام کو اہمیت حاصل ہو۔ انفرادی امیدوار کی بجائے پارٹی لسٹوں کے لیے ووٹ کے نظام کے قیام سے یہ ممکن بنایا جائے گا۔

اس نظام میں یہ سیاسی جماعتوں پر منحصر ہوگا کہ وہ کس طرح سے اپنے امیدواران کو کس فوقیت سے اپنی لسٹ میں رکھتی ہیں۔ اگر شروع میں صرف امیر آدمی ہوں گے یا کسی مخصوص طبقے کے افراد تو ووٹران کو یکدم معلوم ہو جائے گا کہ وہ پارٹی دراصل کن طبقاتی مفادات کی نمائندگی کر رہی ہے، اس کا شائع کردہ پروگرام بھلے جو بھی ہو۔

نتیجہ

پارٹی سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچوں میں ایک انقلابی تبدیلی کا منصوبہ پیش کر رہی ہے۔ پاکستان کے عوام اور صرف پاکستان کے عوام ہی اس انقلاب کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اس لیے پارٹی کا نعرہ ہے

طاقت کا سرچشمہ عوام

حوالہ جات

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز

کمیونسٹ مینی فیسٹو

برصغیر کی پہلی جنگ آزادی

لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز

فلسفے کا افلاس

اینٹی ڈیورنگ

جرمن آئیڈیالوجی

سرمایہ جلد(3)

منتخب تصانیف جلد(3)

ولادیمیر لینن

ریاست اور انقلاب

بائیں بازو کا کمیونزم ایک طفلانہ بیماری

پرولتاری انقلاب اور بھگوڑا کاؤتسکی

منتخب تصانیف جلد 26,22,13

لیون ٹراٹسکی

انقلاب سے غداری

روزمرہ زندگی کے مسائل

لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل

انقلاب روس کی تاریخ

مارکسزم کے دفاع میں

1905ء میں ہمارے اختلافات

ٹراٹسکی تصانیف 1939ء

عبوری پروگرام

ٹیڈ گرانٹ

ان ٹوٹ دھارا

روس: انقلاب سے ردانقلاب تک

آئبیریا کا انقلاب، مارکسزم اور بین الاقوامی صورتحال کی تاریخی پیشرفت

ایلن وڈز

بالشوازم راہ انقلاب

اصلاح پسندی یا انقلاب

مارکسزم اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ

جمہوریہ کی انقلابی جدلیات

چیکوسلواکیہ (1968ء) سٹالنزم کو بحران کا سامنا

لال خان

بٹوارہ، کیا اسے ختم کیا جاسکتا ہے

سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان

کشمیر کی آزمائش، ایک انقلابی حل

فلپ ای جونز

پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتدار میں آنا

ڈاکٹر مبشر حسن

پاکستان کے بحران اور ان کا حل

ذوالفقار علی بھٹو

اگر مجھے قتل کر دیا گیا

ذوالفقار علی بھٹو کی تقریریں اور بیانات جلد 1

ایک نئی شروعات

خشونت سنگھ

ٹرین ٹو پاکستان

طارق علی

کیا پاکستان بچ سکتا ہے؟

مولانا ابوالکلام آزاد

آزادیء ہند

کولن اور لیپیئر

فریڈم ایٹ مڈنائٹ

سٹینلے والپرٹ

پاکستان کا زلفی بھٹو

ظفر شہید

پاکستان میں مزدور تحریک

فیلد مارشل ایوب خان

ایوب خان کی ڈائریاں 72-1966ء

آقا نہیں دوست

روئیداد خان

برطانوی اخبارات 69-1958ء

پاکستان ایک بھیانک خواب

کرسٹینا لیمب

اللہ کا انتظار

لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان

لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان کی یادداشتیں

میجر جنرل حکیم ارشد قریشی

پاک و ہند جنگ 1971ء ایک سپاہی کی زبانی

احمد رشید

طالبان، اسلام، تیل اور مشرق وسطیٰ میں نیا عظیم کھلواڑ

شجاع نواز

کھنچی تلواریں، پاکستان اس کی فوج اور داخلی جنگیں

سر جان کمنگ

سیاسی انڈیا

کے ڈیموڈاران

انڈین کمیونزم کی یادیں، نیا بائیں بازو کا تبصرہ نمبر 93 لندن

ونسٹن چرچل

فتح اور المیہ

گستاف پاپانیک

پاکستان کی پیشرفت (ہارورڈ) 1967ء

ہنری کسنجر

وائیٹ ہاؤس کے سال

پرویز مشرف

ان دی لائن آف فائر

آرکائیو

ڈان

پاکستان ٹائمز

بزنس ریکارڈر

دی نیشن

پاکستان آبزرور ڈھاکہ کراچی

مارننگ نیوز

کمبیٹ کراچی

ہفت روزہ لیل ونہار

نصرت

مساوات

دہقان لاہور

امروز لاہور

مزدور مورچہ فرید آباد انڈیا

ٹائمز آف انڈیا

اکانومسٹ

لندن ٹائمز اشاعت مئی 1968ء

خلیج ٹائمز

دیگر

فرانس میں دوہری طاقت (ملیٹینٹ کا لیفلٹ)

ریوولوشنری ریہرسل

www.marxist.com

نیوز لائن کراچی اکتوبر 2008ء

اقبال کا جناح کو خط، لاہور اشاعت 1942ء

ہیومن ڈویلپمنٹ ان ساؤتھ ایشیا 2007ء، محبوب الحق سنٹر

مصنف کے بارے میں

لال خان 1956ء میں بھون پاکستان میں پیدا ہوئے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم ڈھاکہ، راولپنڈی اور حسن ابدال میں حاصل کی۔انہوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں 1975ء میں داخلہ لیا جہاں پر انہوں نے بنیاد پرست اسلامی جماعت کے خلاف 1978ء میں الیکشن لڑا اور سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ملتان میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث وہ کئی مرتبہ گرفتار بھی ہوئے۔ 1979ء جو کہ میڈیکل کالج میں ان کا آخری سال تھا، میں ضیاء آمریت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ گرفتار ہوئے اور تشدد کا نشانہ بنے۔رہائی کے بعد انہیں جبراً راولپنڈی میڈیکل کالج میں بھیج دیا گیا۔یہاں پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باعث 10 مئی 1980ء کو ملٹری کمانڈ کونسل نے انہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دے دیا۔یہاں پر تشدد کے باعث وہ شدید زخمی ہو گئے مگر کسی نہ کسی طرح ملک سے فرار ہو کر ایمسٹرڈیم، ہالینڈ پہنچ گئے۔یہاں انہوں نے ایمسٹرڈیم یونیورسٹی میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔اسی دوران وہ جلا وطنی میں فوجی آمریت کے خلاف عملی طور پر تحریک چلاتے رہے۔ان کا شمار انقلابی پرچے ''طبقاتی جدوجہد'' کے بانی ارکان میں ہوتا ہے جس کا پہلا شمارہ نومبر 1980ء میں شائع ہوا۔یہ پرچہ خفیہ طور پر پاکستان میں بھیجا اور تقسیم کیا جاتا تھا۔اکتوبر 1987ء میں وہ پاکستان واپس آ گئے۔تب سے اب تک وہ اردو پرچے ''طبقاتی جدوجہد'' کے سیاسی مدیر اور انگریزی پرچے ''ایشین مارکسسٹ ریویو کے مدیر کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔وہ اب تک سیاسی اور معاشی موضوعات پر مارکسی نقطہء نظر سے 28 کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔مصنف نے 1968-69ء کی تحریک میں سکول کے طالب علم کی حیثیت سے عملی طور پر حصہ لیا۔لال خان ان کا

قلمی نام ہے کیونکہ انہوں نے اپنا زیادہ تر تحریری کام آمریت کے جبر میں خفیہ طور پر کیا۔

مصنف کی دیگر تصانیف

1۔سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان 1 (اردو)	لندن (برطانیہ) جنوری 1983ء
2۔پاکستان میں قومی سوال اور کنفیڈریشن کا نظریہ (اردو)	لندن (برطانیہ) جنوری 1983ء
3۔سوشلزم کیا ہے؟	بیلجیئم جون 1983ء
4۔پاکستان میں بائیں بازو کا کردار (اردو)	لندن (برطانیہ) مارچ 1986ء
5۔جدلیاتی مادیت۔مارکسی فلسفے کا تعارف (اردو)	لاہور اپریل 1987ء
6۔سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان 2 (اردو)	لاہور جولائی 1987ء
7۔افغان انقلاب (اردو)	لاہور مئی 1988ء
8۔بالشویک انقلاب اور آج کا روس	لاہور مئی 1989ء
9۔پاکستان۔سوشلسٹ انقلاب یا خونی کھیل (انگریزی)	لاہور مئی 1998ء
10۔نجکاری، جدوجہد یا موت (اردو)	لاہور اپریل 1993ء
11۔سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان 3 (اردو)	لاہور جنوری 1994ء
12۔اسلامی بنیاد پرستی	سپین اپریل 1995ء
13۔پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمپین (پروگرام اور حکمت عملی) (اردو)	لاہور جون 1996ء
14۔پاکستان تناظر (اردو)	لاہور فروری 1997ء
15۔چین۔انقلاب کی تلاش میں (اردو)	لاہور 1997ء
16۔مارکسزم اور قومی سوال (اردو)	لاہور مئی 1999ء
17۔پاکستان پیپلز پارٹی، مجوزہ منشور (اردو)	لاہور اپریل 2000ء

18۔ پاکستان تناظر 2000ء (اردو) لاہور مئی 2000ء

19۔ چین۔ موجودہ دور، کردار اور تناظر (اردو) لاہور مارچ 2001ء

20۔ سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان (اردو) لاہور فروری 2002ء

21۔ برصغیر پاک و ہند میں بحران۔ بٹوارہ، کیا اسے ختم کیا جا سکتا ہے (انگریزی)

پہلی اشاعت لندن 2001 ء

دوسری اشاعت وارسا (پولینڈ) 2003ء

تیسری اشاعت دہلی (بھارت) 2007ء

22۔ قومی سوال اور مارکسی بین الاقوامیت (ٹیڈ گرانٹ اور ایلن ووڈز کے ساتھ) (اردو)

لاہور اکتوبر 2004ء

23۔ کشمیر کی آزمائش (انگریزی) لندن (برطانیہ) اکتوبر 2005ء

24۔ کشمیر کی آزمائش (اردو) لاہور جنوری 2006ء

25۔ لبنان اسرائیل جنگ (اردو) لاہور اکتوبر 2006ء

26۔ پاکستان تناظر (اردو) لاہور فروری 2006ء

27۔ اکیسویں صدی کا سوشلزم (اردو) لاہور مارچ 2007ء

28۔ سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان تناظر (اردو) لاہور مارچ 2008ء